ڈاکٹر ذاکر نائیک کے خطبات اور مناظروں کی روشنی میں

اسلام اور جدید سائنس نئے تناظر میں

کیا مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے

محمد ظفر اقبال

ڈاکٹر ذاکر نائیک کے خطبات اور مناظروں کی روشنی میں

اسلام اور جدید سائنس نئے تناظر میں

کیا مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے

محمد ظفر اقبال

E-mail:nawadraat8@gmail.com

۲۳۲۔ فتح شیر کالونی نزد ایوب مسجد مین مارکیٹ ساہیوال پنجاب

اشاعت اوّل — محرم الحرام ۱۴۳۳ ہجری دسمبر ۲۰۱۱

زرِ تبادلہ — ۱۶۰ روپے

تقسیم کنندگان — فضلی سنز اردو بازار، کراچی،

دار الکتاب: کتاب مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

کتاب سرائے: پہلی منزل، الحمد مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

مکتبہ عمر فاروق ۴/۵۰۱ شاہ فیصل کالونی کراچی فون: ۰۲۱-۳۴۵۹۴۱۴۴

ادارۂ پاکستان شناسی — ۲/۲۴ سوڈھیوال کالونی ملتان روڈ، لاہور، ۰۳۲۲۴۰۰۵۹۵۲

اسلامک سینٹر ایم ڈی اے چوک، ملتان،

بلال اسلامک سینٹر، ۲۳۸-ای بی، جھوک نواز وہاڑی

نوادرات معلومات، سوالات، موضوع پر تفصیلی مطالعے اور حوالہ جاتی کتب کی فراہمی کے لیے SMS کے ذریعے رابطہ کیجیے ۰۳۲۲۷۰۶۱۰۸۷

E-mail:nawadraat8@gmail.com

۲۳۲۔ فتح شیر کالونی نزد ایوب مسجد مین مارکیٹ ساہیوال پنجاب

فہرستِ عنوانات

تیسرا باب ۱۵۴-۲۲۹

چھٹا باب ۲۶۴-۲۶۳

ساتواں باب ۲۷۱-۲۶۵

آٹھواں باب ۲۷۲-۲۷...

مقدمہ

محدثین علم نبوت کے امین ہیں اور متکلمین اس کے پہرے دار۔ اسلام پر جب کسی نے فکری حملہ کیا متکلمین نے انھیں ان ہی کے ہتھیاروں سے شکست دی، لیکن دائرۂ امت کے اندر جلنے والے چراغ محدثین کے دم ہی سے فروزاں ہیں۔ فقہاء نے یہ کوشش کی کہ ان چراغوں کی روشنی کی وسعت کو جہاں تک ممکن ہو بڑھائیں اور زمین کے گوشے گوشے کو علم نبوت کے نور سے منور کردیں اور کتاب وسنت کے منصوص مسائل کو غیر منصوص حدود تک پھیلا دیں ــــــ اللہ تعالیٰ نے مجادلہ حسنہ کو داعی کی صفات میں سے ایک صفت قرار دیا ہے، دین حق کو جس طرح حکمت وموعظت کے ساتھ پیش کیا جانا ضروری ہے، ٹھیک اُسی طرح دلائل و براہین اور حجت واستدلال کی راہ سے دین اور دینی عقائد پر لگائے جانے والے الزامات اور شبہات واعتراضات کا جواب دینا بھی دین کی اہم خدمت اور فریضہ ہے۔ شروع سے آج تک امت کا ایک گروہ ہر عہد میں اس طرح کی خدمت انجام دیتا آیا ہے۔ اس کاوش ہی نے ایک مستقل فن کی بنیاد رکھی جسے ''علم الکلام'' کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب تعلیمی اعتبار سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر ہیں۔ لیکن اس وقت ان کی شہرت اور مقبولیت معروف مناظر اور داعی کی حیثیت سے ہے۔ ان کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو مختلف ادیان و مذاہب کی کتابوں پر ایسا غیر معمولی نظر و تحقیق اور استحضار حاصل ہے کہ گویا وہ ان کے حافظ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید سائنس اور اس کی تحقیقات، اکتشافات اور ایجادات سے متعلق بھی شد بد رکھتے ہیں، وہ جدید سائنسی تحقیقات کے مختلف حوالوں کے ذریعے قرآنی آیات کی صداقت وحقانیت کا ثبوت نہایت وضاحت اور شرح وبسط کے ساتھ پیش فرماتے ہیں۔ ان کی اس تمام تر مناظرانہ کاوش سے مخالفین اسلام مبہوت اور پریشان ہیں جب کہ مسلمانوں کا سر فخر سے بلند ہوگیا ہے ــــ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے مناظر ہونے کا تعلق ہے تو سطور گزشتہ میں بیان فرمودہ دعاوی کے پیش نظر جب ایک طالب العلم ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کے مطبوعہ خطبات اور مناظروں کا مطالعہ کرتا ہے تو اگر ایک طرف مختلف ادیان و مذاہب کی کتابوں کے حوالہ جات کے استحضار اور برمحل جواب دینے سے متاثر ہوتا ہے وہیں یہ امر اس کے لیے انتہائی حیرت کا موجب ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی اپنے پیش رو جدیدیت پسندوں کی طرح سائنس کی حقیقت، اصلیت، ماہیت اور حیثیت سے محققانہ واقفیت کے بغیر قرآن مجید کی بعض آیات سے سائنسی ایجادات ثابت کرتے ہیں، اور عہدِ حاضر کی سائنسی ایجادات کی

ا بہ زعم خود ا قرآن مجید میں صدیوں پہلے پیشین گوئی سے قرآن مجید کی حقانیت پر دلائل مہیا فرماتے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب اسلام کو ایک ''سائنسی مذہب'' سمجھتے ہیں اور قرآن مجید میں ''سائنسی غلطیوں'' کے امکان کو محال تصور کرتے ہیں۔ ان کے اس موضوع سے متعلق مختلف بیانات کو پڑھ کر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف سائنسی علمیت اور طریقہ کار کو برتر، افضل، اولیٰ، عظیم تر اور فائق سمجھتے ہیں اور سائنس کے ذریعے قرآن کے وحی برحق ہونے کا ثبوت مہیا کرتے ہیں، لیکن ان کے مطبوعہ خطبات اور مناظروں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ موصوف مرعوبیت کے باوجود سائنس اور فلسفہ سائنس پر مغرب میں لکھی گئی کسی کتاب کا سرے سے حوالہ ہی نہیں دیتے۔ سادگی اور بھول پن کی انتہا ہے کہ اسلام اور سائنس میں تطبیق بیان کر کے دفاع اسلام کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے اس موقف پر ایسا اصرار ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں آئن اسٹائن کا یہ قول پیش کرنے سے بھی نہیں شرماتے:

''مذہب سائنس کے بغیر لنگڑی ہے اور سائنس مذہب کے بغیر اندھا ہے''۔[1]

آئین اسٹائن کا یہ جملہ: Science without religion is lame and religion without science is blind.[2] اس کا مشہور aphorism مذہبی اور غیر مذہبی لوگوں میں ایک بے نتیجہ مباحثے اور دائمی کش مکش کا سبب بن گیا۔ مغرب میں مذہبی اور ملحد دونوں مکاتب فکر آئن اسٹائن سے اپنے نقطہ نظر کی تائید حاصل کرتے تھے، غیر مذہبی لوگوں کا نقطہ نظر تو سمجھ میں آتا ہے لیکن مذہبی لوگوں کا نقطہ نظر خود مذہب کے لیے تباہ کن تھا، عیسائی علما کی تقلید میں ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب نے آئن اسٹائن کا مشہور جملہ اپنالیا، ایسے نقطہ نظر کی تشہیر مذہب اور خصوصاً دین اسلام کے لیے توہین و تضحیک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جولائی ۲۰۰۸ء کے پہلے ہفتے میں لندن کے نیلام میں پیش کردہ آئن اسٹائن کے خطوط کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایک مذہب دشمن تھا جو مذہب کو childish superstition قرار دیتا تھا۔ مغربی فلسفی Eric Gutkind کے نام ۳ جنوری ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں جو اس کی کتاب: *Choose Life: The Biblical Call to Revolt,* [New York: Henry Schuman, 1952] کی وصولی کے جواب میں شکریے کے طور پر لکھا گیا تھا، اس میں آئن اسٹائن مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

The word 'God' is for me nothing more than the expression and product of human weaknesses, the Bible a collection of honorable but still primitive legends which are nevertheless

---

۱ ڈاکٹر ذاکر نائیک، ''قرآن اور سائنس''، مشمولہ خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک، لاہور: دارالنور، ۲۰۰۸ء، صفحہ ۷۔

2. Albert Einstein, *Ideas and Opinions,* [ed., Carl Seelig] Crown Trade Paperbacks, 1995, p.46.

pretty childish no interpretation no matter how subtle can [for me] change this.[1]

کوانٹم تھیوری کی تشریح کے حوالے سے ۱۹۲۶ء میں آئن اسٹائن کے جملے:

God does not throw dice.[2]

سے لوگوں نے اسے مذہبی آدمی سمجھ لیا، اگر اسے مذہبی آدمی مان بھی لیا جائے تب بھی وہ مذہب کو سائنس کے بغیر اندھا تصور کرتا ہے، افسوس کے ہمارے نائیک صاحب اس جملے کی حقیقت کی تفہیم سے قاصر رہے، اصل بات یہ ہے کہ اسلام اور سائنس کی کوئی بحث اس وقت تک درست اور با معانی نہیں ہوسکتی جب تک عروج وزوال کا قانون قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ نہ کیا جائے، اگر اس قانون کی روشنی میں مذہب اور سائنس کے تعلق کو دیکھا جائے تو تمام شبہات دور ہوسکتے ہیں، کیوں کہ اسلام اور سائنس کی بحث اصلاً زوال امت کا سبب جاننے اور عروج کی آرزو پوری کرنے کے مخمصے سے طلوع ہوتی ہے، سطحی نظر سے جائزہ لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زوال کا واحد سبب علوم عقلیہ اور وسائل ارضی سے مسلمانوں کی محرومی کو قرار دے کر عروج کا واحد راستہ اور طریقہ سائنس کا حصول قرار پاتا ہے، البتہ سائنس حاصل کر کے اس پر بسم اللہ پڑھ لی جائے اور ایٹم بم پھینکنے سے پہلے قنوت نازلہ کا ورد کرلیا جائے تو یہ تمام ہتھیار اور جدید سائنس اسلامی ہوجائیں گے۔ لیکن ہمارے جدیدیت پسندوں اور ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ مذہب کو اپنے اثبات ودفاع میں خارجی دلائل سے زیادہ داخلی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، مذہب کے دفاع و دعوت کا فریضہ درست ذہن سے زیادہ اس کا وجودی مصداق احسن طریق پر ادا کرسکتا ہے، دین کی معجزانہ شان کا ظہور داعی کے کردار کی تصدیق کے بغیر مؤثر نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے حضرات انبیا علیہم السلام اپنی دعوت وتبلیغ کا معرکہ عقل کی جولان گاہ میں نہیں بلکہ قلب کے کارزار میں برپا کرکے اسے فتح کرتے ہیں، پھر صیقل کرکے اسے مجلّی و مصفّی بنادیتے ہیں۔ قرآن مجید سائنس کی تصدیق وتوثیق کے لیے نازل نہیں ہوا ہے اور نہ ہی سائنس کسی مذہبی کتاب کی آیات کی تصدیق وتائید کے لیے ایجاد ہوئی ہے۔ یہ نور، فرقان، برہان، اور میزان سائنسی تصورات، نظریات اور مفروضات ونتائج کی امداد یا سائنسی تصورات سے اعانت وصول کرنے کے لیے نہیں آیا۔ اصل مسئلہ جس کا شکار ہمارے تمام

1. Craig A. James, *The Religion Virus: Why You Believe in God: An Evolutionist Explains Religions Incredible Hold on Humanity*, O Books, 2010, p.105.

2. Bob Tostevin, *The Promethean Illusion: The Western Belief in Human Mastery of Nature*, USA: McFarland & Company, Inc., Publishers, 2010, p. 84.

مقدمہ

جدیدیت پسند بہ شمول ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب ہیں وہ یہ کہ ایسے تمام حضرات دین کی تفہیم و تسہیل اور ترسیل و تبلیغ کے لیے مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق دلیل دینے کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق جدید انسان سو فیصد سائنسی ذہن رکھتا ہے اسے مسلمان کرنے یا اسلام پر باقی رکھنے کے لیے اسی طریقے اور منہاج سے دلیل مہیا کی جانی چاہیے جسے وہ حجت اور قطعی تسلیم کرتا ہے، اس طرح اسلام کی دعوت اور دفاع زیادہ موثر انداز میں ہوسکتا ہے یہ طریقہ کار ''اصول تطبیق'' کہلاتا ہے۔ جس کے مطابق علم کلام کا کام یہ واضح کرنا ہے کہ حقائق دینی اور فلسفہ و سائنس میں کوئی عدم مطابقت نہیں ہے، مذہب پر یقین کامل اور عمل راسخ کے ساتھ اس سے کسب ہدایت کرتے ہوئے فلسفہ و سائنس کی تعلیمات میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ بالفاظِ دیگر یہ محققین کفر کے ہتھیاروں سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی واحد دلیل یہ ہے کہ غیر مسلم قرآن، اسلام اور اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے، اس لیے اگر انھیں سائنس کے ذریعے دعوت دی جائے تو کیا حرج ہے؟ سوال یہ ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام نے جن قوموں کے سامنے اپنی دعوت حق پیش فرمائی کیا وہ مسلمان تھیں؟ کیا مشرکین عرب اور ملحدین اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے تھے؟ اگر ہمارے مصلحین قرآن مجید اور قصص الانبیاء کا مطالعہ فرمالیتے تو ان پر واضح ہو جاتا کہ حضرت انبیا نے کفار کو اپنے منہاج سے دعوت دی۔ کفر کے طریقوں کو اختیار کر کے دعوت دین کا فریضہ اختیار کرنا ہی جدیدیت ہے، اسلامی تاریخ و تہذیب اور علمیت اسے قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ ہمارے یہ مفکرین قرآن اور سائنس میں تطبیق اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے قرآن ہی کی طرح سائنس کو سمجھنے کا بھی کوئی نبوی منہاج انھیں میسر ہے۔ بگ بینگ تھیوری [Big Bang Theory] جو خود اب تک محض ایک نظریہ ہے، نائیک صاحب نے سورۃ الانبیاء: ۳۰ سے کھینچ تان کر جیسے یہ نظریہ ثابت فرمانے کی سعی کی ہے، اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کے مطبوعہ خطبات اور مناظروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ اسلام اور سائنس پر گفتگو کے دوران ان سے نہایت اخلاص کے ساتھ فاش اور گمراہ کن غلطیاں سر زد ہوئی ہیں۔ لیکن اخلاص اغلاط کا ازالہ نہیں کرسکتا ان اغلاط کے علمی محاکے اور نقد کے سلسلے میں یہ کتاب تحریر کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب کے باب اول میں جدید سائنس اور اس کی حقیقت پر گفتگو کی گئی اور بالتفصیل بتلایا گیا ہے کہ مغرب میں عیسائیت کی شکست کی اصل وجہ اس کا سائنس سے نزاع تھا، جس کے باعث مغرب میں عیسائیت کو عبرت ناک شکست ہوئی، عیسائیت کو شکست فی الاصل سائنس نے نہیں یونانی فلسفے نے دی، کیوں کہ کلیسا نے یونانی فلسفے اور منطق سے متاثر ہو کر یونانی سائنس کو، جو فلسفے کی ایک شاخ تھی، عیسائی الٰہیات و دینیات کا حصہ بنالیا، چرچ فادرز یونانی منطق سے متاثر ہونے کے باوجود خود اس درجے کے فلسفی نہ تھے کہ اس میں مضمر کفر کا ادراک کر سکتے لہٰذا انھوں نے اسے عیسائی اعتقادات والٰہیات کا حصہ بنالیا مثلاً زمین کے ساکن ہونے کا نظریہ یونانی سائنس سے مستعار لیا گیا تھا، مذہب، فلسفہ اور سائنس

دو ہزار برس تک زمین کے ساکن ہونے پر متفق رہے تھے اور یہ ایسی ٹھوس حقیقت تھی جو مذہب سائنس اور فلسفے کے منہاج میں دو ہزار سال تک نا قابلِ تغیر رہی۔ مگر جدید سائنس نے جب زمین کو متحرک ثابت کیا تو عیسائیت منہدم ہو گئی۔ اس باب میں کلیسا کی اس طرح کی نادانیوں اور حماقتوں کی ایک طویل فہرست پیش کی گئی ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مغرب میں عیسائیت کو شکست سائنس اور فلسفے کے اختلاط کے باعث ہوئی۔ ہمارے جدید مصلحین اب اسی طریق پر اسلام کی فتح چاہتے ہیں لیکن عملاً یہ طریقہ اسلام کی شکست کا سبب بنے گا۔ عیسائیت کی تاریخ اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے۔

باب دوم میں اس بات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے کہ سائنس اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ مغربی سائنس دانوں کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ سائنسی نتائج قطعیت اور حتمیت سے عاری و خالی ہوتے ہیں۔ سائنس کے منہاج میں موجود رہ کر مذہب پر ایمان لانا ممکن نہیں چہ جائیکہ اس سے حقانیت و صداقت مذہب کی دلیل مہیا کی جائے۔ مذہب اور سائنس دو الگ الگ مناہج ہیں ایک کی دلالت سراسر مابعد الطبیعی ہے اور دوسرا اپنی سند طبیعیات سے متعین کرتا ہے، یہ طبیعیات بھی غیر متعین ہے اور ہمہ وقت متغیر۔ لہٰذا ان دو مختلف و متباین مناہج کو ملانا خود سائنس دانوں کے نزدیک غیر سائنسی رویہ ہے۔

تیسرے باب میں ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اور ڈاکٹر ولیم کیمپ بل کے مابین ہونے والے مناظرے کا ایک بسیط جائزہ لیا گیا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب سائنس ہے اور سائنس مذہب، یا اسلام سائنسی مذہب ہے تو اس دعوے میں دین کے بنیادی مآخذ یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس میں اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کذب، شک، تردید، تنسیخ اور ترمیم کا امکان محذوف ہوتا ہے۔ کیوں کہ سائنسی علم کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس میں شک کیا جا سکے، جس قضیے میں کذب کا شبہہ نہ ہو وہ سائنسی علم نہیں ہو سکتا، علمی قضیے کی تین شرائط ہیں: [۱] اس علم پر شک کیا جا سکتا ہو، [۲] اس علم کو اسی طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہو، جیسا کہ علم پہنچانے والے نے سیکھا [۳] اس میں غلطی کے امکان کو تسلیم کیا جاتا ہو اور اسے درست بھی کیا جا سکتا ہو۔ اگر سائنس اور مذہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے والے افراد کے مطابق اس تعریف کا انطباق مذہبی علمیت پر کر دیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن و سنت اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر دعوے پر شک کرنے کی آزادی ہو، ایسا طریقہ کار وضع کیا جا سکے جس پر چل کر ہم خود بھی وحی کا تجربہ اسی طرح کر سکیں جس طرح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور وحی کا علم اسی طرح اللہ تعالیٰ سے حاصل کر سکیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین علیہ السلام سے حاصل کیا تھا اور وہ طریقہ ہر ایک کے لیے لائق تجربہ اور قابل مشاہدہ ہو۔ اگر اس مؤقف کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ذاکر نائیک صاحب کی طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن سائنس ہے اور سائنس قرآن یا مذہب سائنس ہے اور سائنس مذہب۔ اس روشنی میں دیکھا جائے تو ایمان عقیدہ ہے اور علم عقیدے کی توجیہہ ہے، جس آیت کی عقلی اور سائنسی توجیہہ نہ ہو سکے وہ رد کر دی جائے گی۔ سائنسی منہاج میں قرآن اور اسلام کی تشریح و توضیح کا آخری اور حتمی نتیجہ [ultimate result] یہی نکلے گا۔ قدیم زمانے میں

سائنسی نظریات بہت سادہ ہوتے تھے جو اگر رد ہو جاتے تھے تو پورا نظریہ ڈھے جاتا تھا،لیکن عہد جدید میں سائنسی نظریہ سادہ نظریہ نہیں ہوتا بلکہ وہ کئی سائنسی نظریات پر مشتمل پیچیدہ نظریہ [complex structure of different theories]ہوتا ہے،اس کا ڈھانچہ نہایت پیچیدہ ہوتا ہے لہٰذا لے کاٹوش کہتا ہے کہ عصر حاضر میں ایک نظریہ رد ہوتا ہے لیکن اس کے رد ہونے سے پورا سائنسی ڈھانچہ [complex structrue]رد نہیں ہوتا لہٰذا قرآن کی آیات کی سائنسی تشریح کا قدیم طریقہ یا قران سے سائنس کی تصدیق کا پرانا طریقہ اب زیادہ کار آمد نہیں رہا۔ کوہن کے الفاظ میں کسی بڑے سائنسی ڈھانچے اور اس کے نظریات کی عصر حاضر میں تصدیق کی جا سکتی ہے نہ تردید [neither verify nor falisfy]، یہ ایمانیات کا مسئلہ ہے۔ کوہن یہ بھی کہتا ہے کہ ایک منہاج سائنس سے دوسرے منہاج سائنس میں جانے کی کوئی عقلی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک فرد ایک مذہب ترک کر کے دوسرے مذہب کو اختیار کر لے، عہد حاضر میں سائنس جب ایمانیات کی سطح کو چھوڑ کر مذہب کا درجہ حاصل کر چکی ہے تو اس عہد میں ہمارے جدیدیت پسند اور ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب قرآن کو سائنس سے ثابت کر رہے ہیں یہ بڑی عجیب بات اور بہت زبردست معذرت خواہی ہے۔

ذاکر نائیک صاحب اور کیمپ بل کے مناظرے یا مکالے میں عموماً دیکھنے والوں نے یہی دیکھنا چاہا کہ دونوں کی دلیل کیا ہے؟ حالاں کہ دیکھنا یہ چاہیے تھا کہ دونوں کی دلیل کا اصول کیا ہے؟ کس منہاج میں گفتگو ہو رہی ہے؟ مناظرہ علم کے کس دائرے میں ہو رہا ہے؟ مذہب کے دائرے میں؟ فلسفے یا سائنس کے دائرے میں؟ یہ تین مختلف مناہج ہیں ان تینوں کے اصول الگ ہیں، کلیات مختلف۔ گفتگو ''اصول تطبیق'' کے تحت ہوئی یا ''اصول تفریق'' کے مطابق؟ یہاں اس سوال سے بحث نہیں کہ نائیک صاحب کیا دلیل دیتے ہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ ان کی دلیل کی قوت کو پہچاننے کا دائرہ کیا ہے؟ دائرے کے دو امکانات ہیں: [۱] دلیل قرآن وسنت کے مطابق ہو، [۲] دلیل بہ ظاہر مسلمہ ٹھوس [absolute truth] لیکن فی الحقیقت ممکنہ ٹھوس [probable truth] یعنی امکانی سائنسی سچ کے مطابق ہو یعنی عصری سائنسی علم سے ہم آہنگ ہو۔

افسوس یہ کہ ڈاکٹر کیمپ بل اور نائیک صاحب نے دلیل اور حوالے کے لیے ایک ہی منہاج منتخب کیا یعنی سائنس۔ یہاں تک کے حوالے کے لیے بھی ایک ہی سائنس داں ڈاکٹر کیتھ مور کی کتاب: *The Developing Human Clinically Oriented Embryology,* [U.S.A: W.B, Saunders Company, 1998] اور اس کی تحقیقات پر انحصار کیا، یعنی دونوں کی دلیل امکانی سچ [Probable Truth] سائنس کے منہاج سے تقویت حاصل کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کے مطالب و معانی اہم ہیں یا اسے سائنسی معلومات سے ہم آہنگ کرنا اہم ہے؟ یا اس کا سائنس سے ہم آہنگ ہونا اہم ہے؟ اگر قرآن سے [Embriology] کی جدید تحقیقات کو ہم آہنگ ثابت کر دیا جائے تو کیا اس سے قرآن کی عظمت ثابت ہوگی یا سائنس کی؟ جب کہ بائبل کو رد

کرنے کے لیے اور قرآن کی عظمت ثابت کرنے کے لیے نائیک صاحب نے ایک مشرک سائنس داں کی ممکنہ درست سائنسی تحقیقات کو، جس کے سو فی صد رد ہونے کا امکان ہر اگلے لمحے موجود ہے، واحد منہاج اور کسوٹی کے طور پر قبول کرلیا تو اصلاً نائیک صاحب کے منہاج اور اصول کے مطابق کسی علم کو پرکھنے، اسے سچ اور حق ثابت کرنے کی کسوٹی اور پیمانہ وحی کے اندر نہیں سائنس کے اندر ہے۔ لہٰذا اصل علم اور واحد کسوٹی تو سائنس اور سائنس داں ٹھہرا۔ اگر انجیل اور کیمپ بل کی اغلاط ایمبر یالوجی سے ثابت کردی جائیں تب بھی برتر علم تو سائنس ثابت ہوا، زیادہ سے زیادہ یہ عقلی دلیل دی جاسکتی ہے کہ قرآن جدید سائنس کا ماخذ ہے گویا اصل علم یعنی سائنس قرآن سے نکلا۔ یہ بات بھی طے ہوگئی کہ انجیل کی تردید قرآن کی روشنی میں تو ممکن نہیں البتہ جدید سائنس کی روشنی میں ممکن ہے لہٰذا جو خیر، معیار اور منہاج علم قرار پایا وہ سائنس ہے، مذہب یا قرآن نہیں۔ رہ گئی یہ دلیل کہ سائنس تو قرآن کا عطا کردہ علم ہے اور اسی سے نکلا ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر سائنس کا سرچشمہ قرآن ہے تو مسلمانوں کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں کتنے صحابہؓ اور بزرگ سائنس داں نکلے؟ کسی مسلمان کو یہ توفیق نہ مل سکی کہ قرآن پڑھ کر تمام جدید سائنسی علوم منکشف کردیتا؟ قرآن سائنس کا مخزن تھا لیکن قرآن پڑھے بغیر ایک مشرک سائنس داں نے ایمبر یالوجی کی تحقیقات بیان کردیں یعنی سائنس کا علم حاصل کرنے کے لیے قرآن پڑھنے، سمجھنے اس پر ایمان لانے کی بھی بالکل ضرورت نہیں، بلکہ مشرک و کافر ہونا مسلم ہونے پر، ایک لحاظ سے، فائق ہے کیوں کہ جو مسلمان ہیں انھیں قرآن کی درست تفہیم نہ ہوسکی، اور کافر جنھوں نے کبھی قرآن نہیں پڑھا وہ مسلمانوں کو ان کے رب کی آیات کے مطالب و معارف سکھا رہے ہیں۔ یعنی معارف و مطالب قرآن سمجھنے کے لیے نہ مسلمان ہونے کی ضرورت ہے، نہ ایمان لانے کی، نہ قرآن پڑھنے کی، بلکہ سائنس کی کسی شاخ میں پروفیسر کا درجہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ مغرب کے تمام بڑے سائنس دانوں میں سے کسی ایک نے بھی قرآن کا مطالعہ نہیں کیا تھا لہٰذا بڑا سائنس داں بننے کے لیے قرآن کا مطالعہ بھی ضروری نہیں۔

اگر ایمبر یالوجی کا اتنا عمیق علم ایک مغربی سائنس داں نے قرآن پر ایمان لائے بغیر حاصل کرلیا تو اب اہل مغرب کو اس قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت کیا ہے؟ جسے پڑھے، سمجھے اور اس پر ایمان لائے بغیر ہی اس کے فوائد و ثمرات اہل مغرب اٹھا چکے، اب ایمان کی کیا ضرورت؟ مسئلہ یہ ہے کہ نائیک صاحب اگرچہ قرآن کے ماخذ ہونے کا انکار نہیں کرتے لیکن ماخذ [source] جس مقتدرہ [authority] سے شناخت [identify] ہوتا ہے اسے گنجلک اور متنازعہ بنا دیتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ماخذ کو مسترد کیے بغیر اس پر سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں۔ اگر قرآن سے سائنس کے حق میں دلیل لائی جائے تو کیا اہم بات ہے سائنس میں تو یہ پہلے سے موجود ہے، اگر سائنس سے قرآن کو ثابت کیا جائے تو قرآن کم تر ہوا سائنس برتر۔ دونوں صورتوں میں عظمت سائنس کی ثابت ہوتی ہے، اگر قرآنی علم سے سائنس نکلی تو مغرب نے قرآن پڑھے بغیر حاملین قرآن سے بہت بہتر بلکہ زبردست سائنسی ترقی بھی حاصل کرلی، اگر قرآن سائنس سے نکلا ہے تو بھی عظیم سائنس ہوئی قرآن نہیں۔ جب سائنس کے میدان

[scientific discource] میں جا کر مذہب کے اثبات کی بات کی جاتی ہیں تو اس سے فی الاصل سائنسی طریقہ علم ہی کو تقویت اور برتری حاصل ہوتی ہے، اسی لیے انبیا ہمیشہ اپنے مابعد الطبیعیاتی میدان میں [metaphysical discourse] میں دعوت دیتے ہیں، جب بائبل یا قرآن کا جائزہ، ان کی تردید یا تصدیق جدید سائنسی تحقیقات سے کیا جاتا ہے تو اصلاً سائنسی منہاج علم کو ہی مثالی [ideal] اور عالی [superior] علم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور یہی علیت معیاری [ideal] قرار پاتی ہے، دنیا یہ باور کرتی ہے کہ سائنسی علیت ہی اہم ہے کہ اسی کے ذریعے ہم مذہب کی حقانیت، اصلیت اور سچائی کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر کہ اصلاً [نعوذ باللہ] مذہب بھی سائنس، سائنسی ترقی، اور بیسویں صدی میں منکشف ہونے والے سائنسی حقائق کو جنم دینے کے لیے آیا تھا ایک بے بنیاد مؤقف ہے جس کی کوئی علمی، عقلی اور تاریخی دلیل موجود نہیں۔ اگر جدید سائنس قرآن کا ثمر ہے تو پندرہ سو سال تک مسلمان وہ سائنسی علوم کیوں حاصل نہ کر سکے جو مغرب نے صرف تین سو سال میں حاصل کر لیے؟ جب سائنس کو قدر [value] کے طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے تو پھر مذہب کی صرف وہی تشریح قابل قبول سمجھی جاتی ہے جو سائنسی علم سے مطابقت رکھے، اس لیے مذہب و سائنس کی مطابقت ثابت کرنے کے لیے کم زور دلیل دینے سے بہتر ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے، سائنس بنیادی طور پر نتائجیت [consequationlist] کے رویے کو فروغ دیتی ہے۔ سائنس میں نتیجہ اہم ہوتا ہے، نتائج کی بنیاد پر تعمیر کیا جانے والا فلسفہ فلسفے کی دنیا میں نہایت کم زور فلسفہ تصور کیا جاتا ہے، مقاصد نتائج کے تابع ہیں یا نتائج مقاصد کے تابع ہے؟ مقصد اہم ہے یا نتیجہ اہم ہے؟ اگر نتائج کی وجہ سے مقصد ترک کر دیا جائے کہ مقصد کے حصول کے اسباب میسر نہیں ہیں تو اصل مقصد تو اسباب ہو گئے مقصد تو نہیں رہا یعنی ذریعہ خود مقصد بن گیا۔ مقصد کا تعین نتائج سے بے پروا ہو کر اصول کی بنیاد پر کیا جاتا ہے نتائج کی بنیاد پر نہیں، اسلامی منہاج کفار مکہ سے گریز اور صلح حدیبیہ، منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد صدیق اکبر، لشکر اسامہ کی روانگی جیسے واقعات اسلامی تاریخ میں مقصد اور ذریعے کی حیثیت اور مرتبہ متعین کرنے کے لیے کافی ہیں، جب بھی نتائج پر پہلے نظر ہو گی لامحالہ مقصد پس منظر میں بلکہ پاتال کی تہہ میں چلا جائے گا۔ نتائجیت کی بنیاد پر عمل کرنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہدف [end] تبدیل ہو جاتا ہے کیونکہ ہدف کا حصول عقل کے خلاف لگتا ہے، ذرائع [means] جب ہدف [end] کو طے [determine] کرنے لگیں تو ایک pragmatic رویہ ظہور کرتا ہے جو guilt کو جنم کر دیتا ہے پھر انسان مقصد کے بجائے خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے جس سے غلامانہ اخلاقیات [slave morality] پروان چڑھنے لگتی ہیں۔ سائنس سے اسلام کو ثابت کرنا اس فلسفے کو تقویت پہنچانا ہے کہ what is useful is good، جب کہ سائنس جزئیات سے کلیات اخذ کرتی ہے اور ایسا علم کام چلانے کے لیے تو کارآمد ہو سکتا ہے، زندگی کی گہرائیوں، مابعد الطبیعیاتی سوالات کی گھاٹیوں کو اس کام چلانے والے علم کے ذریعے عبور نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھے باب میں خطبات ذاکر نائیک [لاہور: دارلنور ۲۰۰۸ء] میں موجود ڈاکٹر صاحب کے

معرکہ آرا خطبوں: قرآن اور سائنس، اسلام: دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ، اسلام میں خواتین کے حقوق: جدید یا فرسودہ؟ پر گفتگو کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ عقلی اور کلامی دلائل ہمیشہ وقتی اور محدود افادے کے حامل ہوتے ہیں، جس سے اسے ہی مطمئن کیا جا سکتا ہے جس کی عقلیت صاحب کلام سے فروتر ہو، ورنہ مذہبی منہاج میں دلائل اور براہین عقل کے منہاج میں نہیں کردار اور اخلاق کے منہاج میں مہیا کیے جاتے ہیں جس سے زبانیں گنگ نہیں ہوتیں مقفل قلوب مفتوح ہو جاتے ہیں۔ یہی اسلام کی مسلسل داعیانہ روایت کا اختصاص ہے۔

پانچویں باب میں بعد نائیک صاحب کے جمہوریت کی حمایت میں دیئے گئے بیان پر گفتگو کی گئی ہے۔ نائیک صاحب جمہوریت کی اصل روح سے ناواقفیت کے باعث قرآن میں عورتوں کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت ہونے کو ''ووٹ'' سے تعبیر فرما کر اس سے جمہوریت کشید کرنے کی غلطی کی مرتکب ہوئے، جس کے بعد مردوں سے ووٹ کا حق سلب ہو جاتا ہے اور عورتیں ہی اس کی واحد حق دار قرار پاتی ہیں۔ اس باب میں اجمال و اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مغربی تصور جمہوریت پر حوالوں کے ساتھ بحث کی گئی ہے، اور ڈاکٹر نائیک صاحب سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ جمہوریت کی ان گنت اقسام و مناہج میں اپنا منہاج واضح کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کے حوالے سے یہ بحث کی گئی ہے کہ عورتوں کے حقوق اسلام کے کل کا ایک جز ہیں، یہ بحث اس وقت تک ثمر آور نہیں ہو سکتی جب تک اس جز کو اس کے کل کے تناظر میں نہ دیکھا جائے۔

چھٹے باب میں عقلی موشگافیوں کے اثرات ونتائج پیش کیے گئے ہیں کہ عقل محدود ہے جب محدود شے سے لامحدود کام لیے جائیں گے تو وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائے گی اور بڑی بڑی گمراہیوں کا سبب بنے گی۔ اس لیے ہر مسئلے کا جواب دینے سے بہتر ہے کہ اہل علم ''لا ادری'' کہنا سیکھیں۔

اس کتاب کے اختتام پر تین ضمیمے شامل کیے گئے ہیں، پہلا ضمیمہ فلسفہ سائنس کے مفکر A.F.Chalmers کی کتاب *What is This Thing Called Science* کے مختلف اقتباسات پر مشتمل ہے۔ اپنی اس معرکہ آرا کتاب میں چامر نے سائنس کے میدان کے صفِ اول کے لوگوں کی کتابوں کے اقتباسات اور حوالہ جات سے سائنس کی حقیقت کو سورج کی طرح روشن کر دیا ہے۔

دوسرا ضمیمہ شہرۂ آفاق کتاب *Development Dictionary* کے باب *Science* سے لیا گیا ہے جس کا مصنف Claude Alvares ہے، مصنف نہ مسلمان ہے نہ روایتی، مذہبی معاشروں کا مفکر بلکہ بائیں بازوں کا ایک ماہر عمرانیات ہے اس نے سائنس کو خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھا اور اسی منہاج میں اس کے عیوب، خامیاں، گمراہیاں، کوتاہیاں اندرونی شہادتوں سے واضح کر دیں یہ مضمون سائنس کو سمجھنے کے لئے اہم دلائل مہیا کرتا ہے۔

تیسرا اور آخری ضمیمہ اس صدی کے آئن اسٹائن فائن مین [Richard Feynmer] کی کتاب The character of Physical Law کا باب Seeking New Laws

of Nature ہے،اس مضمون میں فائن مین نے سائنس سے مرعوب اُن اذہان وقلوب پر پڑے ہوئے غلافوں کو اٹھایا ہے جو نور سے محروم اور ظلمت میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہ علوم سائنس کی شہ رگ طبیعیات [Physics] کی مشکل ترین شاخ کوانٹم فزکس کا نوبل پرائز یافتہ اہم سائنس دان ہے، لیکن وہ خود سائنس کی دنیا میں رہتے ہوئے سائنس کو ایک اعلیٰ، برتر، اہم تر، بہترین، احسن، عظیم الشان، واحد منہاج علم اور کسوٹی تصور نہیں کرتا، اس کا خیال ہے کہ سائنس کام چلاتی ہے، یہ محض قیاس، اندازہ اور گمان ہے، یا فیرابینڈ کے الفاظ ہیں یہ محض [Chimaera] ہے، اس اصطلاح کا کیا مطلب ہے اس کے لیے کسی بھی اردو انگریزی لغت کا سہارا لیا جاسکتا ہے تو آیئے اب ہم اس [Chimaera] کے چہرے سے اس نقاب کو اُلٹتے ہیں جس نے گزشتہ دوسو برس سے عالمِ اسلام کے ذہین ترین اور عبقری صفت لوگوں کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے، لیکن ان اسیرانِ سائنس میں افسوس ایک بھی مفکر ایسا نہیں ہے جس نے سائنس، فلسفۂ سائنس اور فلسفہ کے مبادیات کو عمیق نگاہ سے پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہو، چند مستثنیات اس فہرست میں ضرور ہیں مگر وہ سائنس سے اس قدر مرعوب اور مغلوب تھے کہ انھیں ان کا علم فلسفہ اور علم سائنس بھی ان کے کسی کام نہ آسکا۔ بالکل اسی طرح جس طرح صوفیہ کے یہاں جب علم پر عمل نہ ہو تو وہ علم ہی حجابِ اکبر بن جاتا ہے صوفیہ اس حجابِ اکبر کی مخالفت کرتے ہیں جس کے باعث ہمارے علمی حلقوں میں بہت کم سطح کے علمی لوگ یہ استدلال شروع کر دیتے ہیں کہ صوفیہ علم کے دشمن ہیں حالانکہ اصل علم، یعنی معرفتِ رب، تو صوفیہ کے پاس بہ درجہ کمال موجود ہوتا ہے، وہ علم کے دشمن کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ مستند، محقق اور کبار صوفیہ احسان وتصوف کو ہمیشہ شریعت کے منہاج پر پرکھتے ہیں اور خلافِ شریعت کسی قول وفعل کو قبول نہیں کرتے حتیٰ کہ امام ابنِ تیمیہؒ جیسے محدث، فقیہہ اور محقق اور غیر اسلامی تصوف کے شدید ترین ناقد بھی علی الاطلاق تصوف کے منکر نہیں، بلکہ اُس کے محاسن کے قائل اور اُس سے پھیلنے والے خیر کے معترف ہیں، بلکہ بعض معتبر شہادتیں خود ان کے صوفی ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس سلسلے میں ایک تحقیقی اور تفصیلی کتاب زیر قلم ہے، ان شاء اللہ، وہ قارئین کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔

اپنی بات:

زیر نظر کتاب کا موضوع اپنی اہمیت کے اعتبار سے انتہائی معرکہ آرا، یک سوئی اور توجہ سے بار بار پڑھے جانے کا متقاضی ہے، اب تک اردو زبان میں اسلام اور سائنس کے مابین مطابقت یا مخالفت میں موجود کتب و مقالات میں اتنی تفصیل اور بسط سے گفتگو نہیں کی گئی، اس لیے اس موضوع اور عنوان پر اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے یہ شاید پہلی کتاب ہو، اس لیے چند مزید امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے:

کتاب میں زیر بحث مضامین کی تفہیم کے لیے فلسفیانہ اور سائنسی شُد بُد بہت ہی ضروری ہے،

حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ تحریر کو فنی، قاموسی اور اصطلاحی زبان واسلوب میں پیش کرنے سے گریز کیا جائے اور روزمرہ کی عام فہم مثالوں سے مبحث کو اس طرح واضح کیا جائے کہ تقریب فہم اور ترسیل معانی میں آسانی ہو۔ لیکن اس کے باوجود زیر بحث موضوعات کا سمجھنا، اس کا اخذ وجذب اور اس کی تبلیغ وترسیل مطالعے میں انہماک، استقلال واستقامت کے ساتھ ساتھ رضا کارانہ جذبہ محنت پر موقوف ہے۔

کتاب خالصتاً دینی جذبے اور فریضے کے زیر اثر لکھی گئی ہے، اس لیے شکوہِ الفاظ، طلاقت لسانی اور انشا پردازی کی کوئی شعوری کوشش اس میں نہیں کی گئی۔ بس صحت الفاظ کے ساتھ جو طریقہ بھی فہمِ مطالب میں ممد ومعاون محسوس ہوا، اسے اختیار کر کے مدعا کو جوں کا توں سپردِ قلم کر دیا گیا ہے۔ الفاظ بنانے، سنوارنے، نکھارنے اور قاری کو الفاظ کی نیرنگی اور اسلوب کی شوکت سے مرعوب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس احتیاط نے تحریر میں خطابت کا آہنگ اور گفتگو کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

چوں کہ اس پوری کاوش سے مقصود ابلاغ، ترسیل اور تبلیغ ہے، اس لیے ندرت، اختصار اور علامتی گفتگو کی بجائے موضوع کو پھیلا کر لکھا گیا ہے۔ اسی لیے بادی النظر میں قاری کو کہیں کہیں تکرار بھی محسوس ہوگی۔ اسلاف کی سند نے ہمارے اس انداز کو مزید تقویت بخشی، اگر احادیث اور فقہ کی کتابوں کو سامنے رکھا جائے تو یہی انداز نظر آتا ہے۔ صحیح بخاری کی مثال تو سب کے سامنے ہے، ایک ہی روایت اس میں کئی کئی مقامات پر روایت کی گئی ہے اور بین السطور اشارات ملتے ہیں کہ یہی حدیث فلاں فلاں مقام پر بھی گزر چکی ہے، بلکہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تو ترتیب ابواب کے لیے تقطیع حدیث بھی گوارا کر لیتے ہیں، یعنی جو ٹکڑا جس مقام کے مناسب جانا اسے وہاں روایت کر دیا۔ اس لیے اگر کہیں تکرار محسوس ہو تو اسے تکرار نہیں ''استطراد'' پر محمول کیا جائے۔ وہاں وہ تکرار، ان شاء اللہ، نئے اضافوں اور فوائد کے ساتھ ہوگا۔

جب بھی کسی غالب فکر اور متداول رجحان کی تردید کی جاتی ہے تو ناقدین اور مخالفین کی طرف سے ایک عمومی اعتراض یہ ہوتا ہے کہ زیر بحث موضوع کے تردید میں حوالہ جات اور اقتباسات کے اندراج میں دیانت اور سیاق وسباق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ کوئی اہم بات بلا حوالہ بیان نہ کی جائے اور حوالہ جات واقتباسات کے اندراج میں پوری دیانت وامانت اور اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ اگر پیش کردہ حوالہ جات کا اصل مآخذ سے تقابل کیا جائے تو بشری کوتاہی تو نظر آ سکتی ہے، لیکن، ان شاء اللہ خیانت کے آثار نہیں ملیں گے۔

کتاب میں موضوع سے متعلق مختلف فلسفیوں اور سائنس دانوں کے نسبتاً طویل اقتباسات کو بہ طور استناد پیش کیا گیا ہے، اس سے دو فوائد مقصود تھے: ایک یہ کہ زیر بحث نقطۂ نظر پوری صحت اور صراحت کے ساتھ قارئین کے مطالعے میں آ جائے، دوسرے معترضین کے مذکورہ بالا الزام سے بھی محفوظ رہا جا سکے۔ البتہ ان اقتباسات کا، جو زیادہ تر انگریزی میں ہیں، اردو خلاصہ بیان کرنے کے باوجود لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں دیا جا سکا۔ اس کی بھی دو وجوہ تھیں: ایک مجبوری، دوسرا قارئین کا نفع۔ مجبوری یہ تھی کہ کتاب میں حوالہ جات واقتباسات بہت کثرت سے دیئے گئے ہیں، جن کی مجموعی ضخامت نصف کتاب سے کچھ کم

بنتی ہے، اگر نقل کردہ تمام عبارات کے ترجمے بھی شامل کتاب کر دیئے جاتے تو کتاب کی ضخامت میں خاطر خواہ اضافہ گرانی کا باعث بنتا۔ قارئین کے نفع سے مقصود یہ ہے کہ کتاب کو پڑھنے والے عموماً دو طبقات ہیں، ایک سیکولر تعلیمی اداروں اور جامعات کے فارغین جو، الا ماشاء اللہ، انگریزی زبان کی تفہیم اور اس سے استفادے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ دوسرے حضرات علمائے کرام اور طلبائے مدارس عربیہ جو بالعموم انگریزی سے واقفیت نہیں رکھتے، اس کتاب میں ہمارے اصل اور بالذات مخاطب یہی حضرات ہیں۔ ان کی خدمت میں درخواست ہے کہ آپ تھوڑی سی محنت سے عربی جیسی وسیع، فصیح اور بلیغ زبان کے ادب، بیان، معانی اور بدیع پر حاوی ہو جاتے ہیں، معقولات و منقولات جیسے ادق اور مشکل فنون پر درک، دسترس اور کمال حاصل کر لیتے ہیں تو انگریزی عبارات کا ترجمہ سمجھنے میں آپ حضرات کو کیا مشکل پیش آسکتی ہے، جب کہ آپ حضرات کتابوں اور مطالعے کے عاشق اور محنت کے خوگر ہوتے ہیں، اگر تھوڑی سی توجہ اس احساس کے ساتھ فرمائی جائے کہ عصر حاضر ان ہی علوم وفنون سے عبارت ہے، ان ہی مسائل نے ہماری تہذیب، معاشرت، معیشت، ثقافت، نظریہ وعلم غرض ہر سطح پر سوالات، اشکالات، شبہات اور اعتراضات کا انبار جمع کر دیا ہے، چوں کہ ہم عموماً ان سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے انھیں لاینحل سمجھ لیتے ہیں، حالاں کہ یہ سوالات ایسے نہیں ہیں کہ ان کی عقدہ کشائی نہ کی جا سکے، ان کے مسکت اور مسقط جوابات نہ دیئے جا سکیں۔ تھوری سی توجہ، لگن اور محنت اس عزم و یقین کے ساتھ درکار ہے کہ عصر حاضر میں ان "امور جاہلیہ" سے ماہرانہ واقفیت اس کی تردید وتنسیخ کے لیے بہت ضروری ہے، اسی لیے حضرات فقہائے کرامؒ کا ارشاد ہے: من جهل باهل زمانه فهو جاهل[1] "جو شخص اپنے اہل زمانہ سے ناواقف ہو وہ جاہل ہے"۔ یعنی زمانے کی حقیقت و نوعیت، تہذیب و معاشرت، سیاست و حکومت، ریاست، معاشی امور، مزاج و مزاق اور اس کے غالب تعقل سے ایسی آگہی اور واقفیت، جس کی بنیاد پر کھرے کھوٹے اور حق و ناحق کی تمیز کی جا سکے، عالم وفقیہہ کی ذمہ داری ہے۔

جہاں تک ذاکر نائیک صاحب کا تعلق ہے تو اختلاف کی اس طویل ترین روداد اور داستان کے باوجود اس تاویل کی بہ ہر حال گنجائش ہے کہ متکلمین جوش بیان میں عموماً غلطیاں کرتے ہیں اس لیے ان کے بیانات پر اصل عقائد کی تعمیر نہیں کی جاتی، یہ دفاعی نوعیت کے بیانات ہوتے ہیں اور الزامی مقدمات پر ان کی بنیاد رکھی جاتی ہے، یہ کلامی مباحث ہیں جو اکثر حالت جنگ میں نقشہ جنگ کے مطابق کوئی بھی حکمت عملی اختیار کر لیتے ہیں، جو کبھی کبھی عارضی طور پر قبول کر لی جاتی ہیں۔ متکلمین اسلامی تہذیب و معاشرت کے حفاظتی فوجی دستے ہیں جو سرحدوں پر گشت میں رہتے ہیں۔ دشمنوں کا تعاقب کرتے اور ہمہ وقت چوکس رہتے ہیں، بہ شرط یہ کہ وہ صحیح معنوں میں متکلم ہوں، مگر متکلمین اپنے مناظرانہ التزامات کے سلسلے میں عقائد کا جو دفتر تیار کرتے ہیں اس کو ملت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں ہوتا وہ تو ان

---

[1] ابن عابدین الشامیؒ، شرح عقود رسم المفتی، ملتان: مکتبہ حقانیہ [س-ن]، صفحہ ۳۹۔

کے فنی مفروضات اور الزامی جوابات ہوتے ہیں جن کو دشمن کے مقابلے میں ان کو خاموش کرنے کے لیے وضع کر لیے جاتے ہیں، لہٰذا متکلمین کے فنی مفروضات پر ان کو ملت کا باغی و طاغی ٹھہرانا مناسب رویہ نہیں جب تک کہ وہ یہ دعویٰ نہ کرنے لگیں کہ ان مدافعی مناظروں اور الزامی جوابات کا پلندہ عین اسلام ہے، اسی لیے یہ بات اصول کے طور پر اسلامی علمیت میں تسلیم کی گئی ہے کہ ''لازم مذہب مذہب نہیں''، یعنی متکلمین کے آرا و نظریات سے جو غلط نتائج لازم آ جائیں وہ ان کا عقیدہ نہیں قرار پائیں گے۔ اگر اس اصول کا اطلاق کسی حد تک علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب پر کیا جائے تو شاید ان کے بہت سے تفردات اور الزامی جوابات اور غلطیوں کی معقول توجیہ سمجھ میں آ سکتی ہے، ہماری رائے میں متکلمین کے ایسے تمام بیانات کی علمی بنیادوں پر کامل تردید، تشریح اور توجیہ کے ساتھ ساتھ امت کو ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ ہمدردانہ نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیے۔

زیر نظر تحریر سے ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کے داعیانہ اخلاص اور ان کی مناظرانہ صلاحیتوں کا انکار مقصود نہیں بلکہ ان کی اس مخلصانہ جدوجہد کی کمزور بنیادوں کی طرف توجہ دلانا پیش نظر ہے، ہمیں اپنی کسی رائے پر کوئی اصرار نہیں۔ اہل علم دیانتہً ہماری تحریر کا ناقدانہ و مبصرانہ جائزہ لیں، اغلاط کی اصلاح فرمائیں۔ غلطی واضح ہو جانے پر، ان شاء اللہ، اسلاف کی اتباع میں ہمیں رجوع میں کوئی تردد نہ ہوگا۔ کتاب میں کسی غلط مؤقف اور رجحان کی تردید کرتے ہوئے اگر قلم سے کوئی ایسی عبارت، جملہ یا لفظ نکل گیا ہو جو زیر بحث شخصیت کے مناسب حال نہ ہو تو راقم اپنے مؤقف پر قائم رہتے ہوئے اس جملے یا لفظ سے برأت اور رجوع کا اعلان کرتا ہے، راقم کا مقصد کسی کی دل آزاری یا تنقیص نہیں بلکہ محض اپنا مؤقف عند اللہ مسؤلیت کے استحضار کے ساتھ پیش کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے ایک طویل انتظار کے بعد یہ کتاب مختلف سنگین ترین حالات و مسائل سے گزرتی ہوئی قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری نیتوں کو خالص بنا دے، ہمارے دلوں کو قبولیت حق پر آمادہ و تیار فرما دے، ہمیں غلطیوں اور خطاؤں سے رجوع اور توبہ کی توفیق عطا فرما دے، اس کتاب کو اپنے مقصد میں نافع بنا دے، اسے محض اپنی رضا و رضوان کا سبب اور مؤلف اس کے والدین و اساتذہ و احباب کو، فردائے قیامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا مستحق بنا دے، آمین یا رب العالمین۔ انتہائی ناسپاسی ہوگی کہ اگر راقم اپنے کرم فرماؤں کا شکریہ ادا نہ کرے۔ میں نہایت ممنون احسان ہوں اپنے محبوب اور باصفا دوست طلحہ رحمٰن اعوان، برادر مکرم جناب سلیمان عامر صاحب اور عزیزم حافظ غلام اکبر صاحب کا، ان حضرات نے اپنی زیست کے نہایت قیمتی لمحات پورے ایمانی جوہر اور دینی جذبے کے ساتھ اس کتاب کی حروف چینی میں انتہائی اخلاص اور جاں فشانی سے میرے ساتھ صرف کیے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس خدمت کی جزا اپنی شان کے مطابق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

ــــــ ظفر اقبال

پہلا باب

جدید سائنس اور مذہب: حقیقی تناظر

مذہب اور سائنس کی کش مکش: ایک تاریخی جائزہ

۲۸۰ ق:م [280 BC] سے لے کر پندرھویں صدی تک فلسفہ، سائنس اور عیسوی مذہب کا اجماع تھا کہ زمین ساکن ہے۔ فلاسفہ یونان، یونانی سائنس اور عیسوی مذہب مشترکہ طور پر زمین کے سکون کے قائل تھے۔ کاپرنیکس انقلاب [Copernican Revolution] نے دو ہزار سال کی اس مسلمہ، متفقہ اور اجتماعی سائنسی علمیت کو جس پر مذہب، فلسفے اور سائنس کی تینوں اقالیم کا اجماع تھا اور جو ذاکر نائیک صاحب کی اصطلاح میں ''ٹھوس سائنسی حقیقت'' تھی اس ٹھوس حقیقت کو سوال بنادیا۔ دو ہزار سال کی تاریخ اور علم غلط، بے اعتبار اور جھوٹ ٹھہرے، اس عہد کے نامور عیسائی مذہبی سائنس داں بطلیموس یا ٹالمی [Ptolemy] نے زمین کی گردش سے متعلق ریاضیاتی حسابات، اور مختلف قضایا و سائنسی مشاہدات سے بھی ثابت کیا کہ زمین ساکن ہے، یہ مرکز کائنات بھی ہے البتہ سورج اور چاند حرکت میں ہیں، اس عہد کا مذہب بھی یہی کہتا تھا۔ انسانی مشاہدہ بھی یہی بتاتا تھا ٹالمی نے Geocentric Theory کو علمی اور ریاضیاتی طور پر زرخیز کیا، کیلنڈر بنایا، اس عہد کی سائنسی علمیت تنہا نہیں تھی بلکہ ارسطو سے لے کر چرچ فادرز [Church Fathers] آگسٹین، ایزلم، ایکوناس [Saint Augustine, Anselm & Aquinas] وغیرہ کی مذہبی فلسفیانہ علمیت اس کے ہم رکاب تھی اور اس عہد کی غالب عیسوی علمیت کا نظام بھی زمین کی سکونت کے تصور سے ہم آہنگ تھا۔ اہل کلیسا کی نظر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمین پر نزول اس کا ثبوت ہے کہ یہی مرکز کائنات ہے۔ یونان کا تصور سائنس اور ارسطو کا فلسفہ بھی یہی تھا کہ زمین مرکز ہے۔ ارسطو کا نظریہ حرکت اسی نتیجے تک پہنچاتا تھا۔ دو ہزار سال تک ارسطو کا نظریہ حرکت [Theory of Motion] دنیا بھر میں تسلیم کیا گیا لیکن کاپرنیکس [Copernicus] گیلیلیو اور نیوٹن نے حرکت کا نیا تصور دنیا کو دیا۔ یہ تصور حرکت بھی دو سو سال بعد آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت [Theory of Relativity] نے مسترد کر دیا اور حرکت کا تیسرا تصور سائنس کی دنیا میں قبول کر لیا گیا۔

کلیسا اور سائنس کی دشمنی: ایک چلتا خیال:

عام طور پر جدیدیت پسند مفکرین تاریخ سائنس کے عمیق مطالعے کے بغیر چند چلتے ہوئے مشہور افسانے سن کر عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ سترہویں صدی میں کلیسا اور سائنس میں تصادم ہو گیا تھا۔ کلیسا سائنس کا دشمن تھا اس سے مذہب بدنام ہوا جبکہ یہ بالکل غلط اور لغو الزام ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ کلیسا منطق، سائنس اور فلسفے کے سائے میں مذہبی تعلیمات اور عیسوی اعتقادات کی عقلی اور سائنسی توجیہات پیش کر رہا تھا، یہ سلسلہ نہایت کامیابی کے ساتھ اٹھارہ سو سال تک چلتا رہا، سائنس، منطق، فلسفہ عیسوی مذہب کئی صدیوں تک قدم بہ قدم ایک دوسرے کے ہمراہ چلتے رہے، کلیسا نے کاپرنیکس کے علمی و سائنسی دعوے کا جواب علم سائنس اور عملی تجربات سے دیا، کاپرنیکس ان سائنسی علمی دلائل کا جواب نہ دے سکا لہٰذا اس کے خلاف مزید کارروائی کی گئی کلیسا نے سائنس کے اعتراضات کا جواب سائنسی دلائل سے دیا اور تجربے سے دلائل کو ثابت بھی کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ اصلاً کاپرنیکس کے خلاف صرف مذہبی بنیاد پر کارروائی نہیں کی گئی۔ کاپرنیکس اور کلیسا کی جنگ مذہب اور سائنس کی جنگ نہیں تھی بلکہ یہ جنگ فی الاصل قدیم یونانی فلسفہ و سائنس اور جدید فلسفہ و سائنس کی جنگ تھی کیونکہ مذہب عیسوی نے منطق سائنس و فلسفے کو ایک دینی رویے کے طور پر اختیار کر لیا تھا لہٰذا عیسائیت کا گلا جدید سائنس فلسفے اور جدید منطق نے کاٹ دیا، اگر عیسائیت سائنس کے ساتھ منسلک نہ ہوتی اور فلسفے کے منطقی دلائل کو اپنے حق میں استعمال نہ کرتی تو سائنس اس پر اثر انداز نہ ہو سکتی۔ عیسائیت کی غلطی یہ تھی کہ اس نے مذہبی منہاج علم کو فلسفیانہ، سائنسی اور منطقی یونانی علوم کے منہاج سے مخلوط کر لیا، جن کی مابعد الطبیعیات دینی علم کے منہاج و مابعد الطبیعیات سے یکسر مختلف تھی، جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اسی طرح دو مختلف مناہج اور دو مختلف مابعد الطبیعیات ایک ساتھ علم کی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے، لہٰذا سائنسی، منطقی اور فلسفیانہ یونانی منہاج نے عیسائی مذہبی اور کلامی منہاج علم کو شکست دے دی سائنسی منہاج کے باعث عیسائیت کا مذہبی منہاج علم شکست کھا گیا۔ ہمارے ننانوے فیصد جدیدیت پسند مسلم مفکرین کو یہ معلوم ہی نہیں کہ عیسائیت کی شکست کا سبب سائنس سے جنگ نہیں بلکہ عیسائیت کی سائنس میں شمولیت، سائنس سے محبت اور سائنسی طریقہ کار کی قبولیت ہے، اگر عیسائیت سائنس سے مذہب کی تطبیق کے بجائے عالم اسلام کے طریقے یعنی سائنس اور مذہب کی تفریق کے اصول پر چلتی تو کبھی تباہ نہ ہوتی، عیسائیت نے نقل کی بنیاد پر مذہب کی دعوت اور دلیل کو کمتر سمجھا اور عقل کو اس کے مقام سے بڑھ کر فوقیت دی۔

عیسائیت کے زوال کا سبب: یونانی منطق کی عیسوی توجیہات:

عیسائیت کی سب سے بڑی غلطی سائنسی اصولوں کو مذہبی عقائد کا حصہ بنانا تھا۔ ارسطو کے نظریہ کائنات کو کلیسا کے اسقف نے کیوں تسلیم کیا؟ اس کے نتیجے میں عیسائی عقائد کے نظام میں یونانی سائنس فلسفے اور منطق کے آمیختے سے تیار شدہ نظریات کس طرح داخل ہوئے؟ اور کس طرح عیسائیت شکست کھا کر رہ گئی؟ اس کا مختصر جائزہ *Essential Philosophy* کا مصنف James

Mannion کے الفاظ میں پڑھیے:

Mankind assumed that he, second to God, was the center of the universe. Earth was the center of it all, and the sun and all celestial bodies revolved around it. The Aristotelian view held that the heavens were immutable, or absolute, and the moon, other planets, and stars were smooth, pristine orbs. This view was the one adopted by the Catholic Church.

The Heliocentric Theory

This long-held belief was eventually challenged by Nicolas Copernicus [1473-1543] and mathematically confirmed by Johannes Kepler [1571-1630]. Their theory was called heliocentric, meaning that the sun was the center of our solar system, and Earth and the other planets revolved around it. This theory was regarded as poppycock and ultimately turned into heresy. Great controversy surrounded the hypothesis while it was still only mere speculation. When Galileo invented a telescope and was able to prove the theory via empirical and indisputable observation, things really hit the fan.

Galileo Galilei [1564-1642] was an Italian mathematician and scientist who proved the heliocentric theory. His telescope also showed that the moon had peaks and valleys, crags and craters, and that the sun had spots that appeared and disappeared, disproving the Aristotelian/Christian belief of pristine heavens. In 1616, he was called before the Inquisition and forbidden to teach the heliocentric theory. Knowing what fate befell those who

defied the Inquisition, he sensibly consented to this demand. You cannot keep a good scientist down, however, and in 1623, he published a work called "The Appraiser," which reiterated his heliocentric belief. He was tried and found guilty, but he recanted, and his life was spared.

Legend has it that Galileo offered the then-pope the opportunity to look through his telescope and see for himself the true nature of the cosmos. The pope refused. He had no need to look through the telescope because his mind was already made up.

The Catholic Church ultimately suffered as a result of their stubborn condemnation of the Copernican heliocentric view of the cosmos and the persecution of Galileo, not to mention the murder of Bruno and numerous other "heretics." In 1993, Pope John Paul II more or less apologized for past indiscretions and acknowledged that the Earth did indeed revolve around the sun.[1]

جدید فلسفے کے بانی ڈیکارٹ نے جو کیتھولک عیسائی تھا، جدید مابعد الطبیعیات کی اساس شک پر رکھی تاریخ فلسفہ کا مشہور ترین جملہ فلسفے میں آج بھی اس کی ذہانت کا کمال تصور کیا جاتا ہے: I think therefore I am ''میں سوچتا ہوں اس لیے کہ میں ہوں'' اصل لاطینی جملہ یہ تھا: *"Cogito, ergo sum"* اس بظاہر سادہ مگر نہایت تہہ دار اور خطرناک الحادی جملے کے ذریعے ڈیکارٹ نے مابعد الطبیعیات کو غیر معمولی نقصان پہنچایا اور وجود انسانی کے سوا ہر شے کو قابل سوال بنا دیا کہ صرف ذات انسانی شک و شبہے سے بالا ہے اس کے سوا کوئی چیز شک کی گرد سے خالی نہیں خود خدا بھی نہیں، اس جملے کے ذریعے ہر شے کو شک کی نظر سے دیکھنے کا نقطۂ نظر ظہور پذیر ہوا اور علم کی بنیاد یقین کے بجائے شک پر رکھ دی گئی، انسان اور اس کے فکر کے سوا ہر وجود قابل شک ہے صرف thinking of the thinker

1. James Mannion, *The Scientific Revolution in Essential Philosophy*, U.S.A.: David & Charles, 2006, pp.69-70.

پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا، ڈیکارٹ نے یہ بھی بتایا کہ wherever you go there you are اس کفر کے ساتھ ساتھ اس نے وجود خداوندی کے دلائل بھی دیے تاکہ کلیسا اس سے ناراض نہ ہو اور اس کا کفر ایمان کے لباس میں جلوہ گر ہو:

French philosopher René Descartes [1596-1650] is often called the Father of Modern Philosophy. He started out his career as a mathematician and is credited with discovering the concept of Analytic Geometry. He also was a physicist of great repute. Descartes was a faithful Catholic, but he privately knew the Church was wrong-headed in its resistance to and persecution of men of science. He knew that these men and their philosophies were the way of the future, and if the Church did not adapt, it would suffer as a result.

Doubt Everything

Descartes sought nothing less than the formidable task of a radically revisionist look at knowledge. He started with the premise of doubt. He decided to doubt everything. He believed that everything that he knew, or believed he knew, came from his senses, and sensory experience is inherently suspect. This is the classic Skeptic starting point.[1]

ڈیکارٹ نہایت ذہین آدمی تھا اس نے اپنے کفر کی اشاعت کے لیے کلیسا سے ٹکر لینے کے بجائے کلیسا کے سائے اور اس کی سرپرستی میں اس کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اس نے اپنی کتاب *Meditations* کا انتساب پادریوں کے نام کر دیا، پادری خوش ہو گئے اور مذہبی سند کے ساتھ ڈیکارٹ کا فکر قبولیت عام حاصل کرتا چلا گیا، وہ ڈیکارٹ کے اس معصوم جملے I think therefore I am کی تہہ در تہہ معانی سے سرسری گزر گئے، اس نے انسان کو بھی شک کی میزان پر رکھا مگر فکر [thinking] کی فرقان سے، اس کو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر قرار دے کر اسے واحد اور یقینی وجود قرار دیا، لہٰذا

1. Ibid.,p.75.

یہی انسان خدا قرار پایا اور غیر محسوس طریقے سے حقیقی خدا شک کے دائرے میں آ کر علم کے دائرے سے خارج کر دیا گیا۔ وہ یہ سمجھ نہیں پائے کہ اس ایک جملے کے ذریعے ڈیکارٹ نے مابعد الطبیعیات کو سوال بنادیا اور پہلی مرتبہ علم کی بنیاد یقین سے شک میں تبدیل کر دی، جو علم شک کے ذریعے ہی حاصل ہو اس میں یقین کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ جس کی بنیاد خود شک ہو یقین سے کیسے استفادہ کر سکتا ہے؟ ڈیکارٹ نے کلیسا کو کس طرح بے وقوف بنایا اس کی تفصیل پڑھیے:

Descartes was hesitant to publish much of his work because it supported the findings of Galileo. He eventually "hid" his controversial theories in a philosophy book called *Meditations*, which he dedicated to the local Church leaders in an effort to curry favor.

Descartes quickly discovered that to doubt absolutely everything is to be poised on the precipice of madness. Is it real, or is it a dream? Descartes came to believe that he could not even know if he was awake or if he was dreaming things. There is no absolute certainty, not even in the realm of mathematics. This was called the Dream Hypothesis and is radical skepticism taken to the max.

Descartes went on to speculate that there might not be an all-loving God orchestrating things from a celestial perch. Perhaps there was an Evil Demon who had brainwashed us into believing that all we see and sense is reality, but is really an illusion devised by thisdiabolical entity. This is called the Demon Hypothesis.[1]

مغرب ان دنوں عالم اسلام میں ڈیکارٹ کی طرز کے کسی راسخ العقیدہ مفکر کی تلاش میں ہے، کیوں کہ ہمارے متجددین اپنی تمام تر جدیدیت پسندی کے باوجود مغرب کے راسخ العقیدہ حلقوں کے لیے بہت زیادہ کارگر نہ ہو سکے۔ لیکن تازہ شکست کے بعد مغرب عالم اسلام میں دوبارہ ذہین لوگوں کی خریداری یا قلب ماہیت پر کام کر رہا ہے، بہت سے راسخ العقیدہ علما بھی اپنی سادہ لوحی اور مغرب کی بے

1. Ibid., p75.

پناہ مادی ترقی کے سامنے سرنگوں نظر آتے ہیں، یہ وہ علما ہیں جن کے قلب اس علمیت کے ادراک سے قاصر ہیں جس کا محور وہ حدیث ہے جس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کے بارے میں فرمایا کہ: خیر القرون قرنی اگر اس قرن کا مقابلہ عہد حاضر کی مادی ترقی سے کیا جائے تو وہ آج کے عہد کے سامنے کچھ بھی نہ تھا، صحابہ کرام تیل کے سمندر پر مسند نشین تھے مگر انھوں نے نہ تیل دریافت کیا، نہ قوت و طاقت اور توانائی کے ذخیرے ڈھونڈے، نہ طیارے، سیارے، میڈیا ایجاد کیے، ورنہ اسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری دنیا میں بہ نفس نفیس خود جا کر دین کی دعوت دیتے اور پوری دنیا اسلام قبول کر لیتی، پس ثابت ہوا کہ اسلام کی وسعت میں کمی کا سبب عہد صحابہ کا سائنس میں ترقی نہ کرنا تھا [نعوذ باللہ]۔ یہ عجیب مسلمان ہیں جو خیر القرن عہد رسالت کو سمجھتے ہیں اور اس کی مادیت سے دوری کو جدیدیت اور مغرب کی ٹیکنالوجی سے پُر کرنا چاہتے ہیں اس عہد کا کمال ہی یہ تھا کہ آخرت دنیا پر غالب تھی، سب سے بہتر وہ تھا جو دنیا سے کم سے کم تمتع کرتا ہو، سب سے افضل وہ تھا جو دین کی خاطر پوری دنیا ترک کر دیتا ہو، جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی االلہ عنہ کہ غزوہ تبوک کے موقع پر اپنا پورا مال واسباب لے آئے تھے اور جواب میں فرمایا تھا کہ گھر میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے سوا کچھ نہیں چھوڑا، اس قرن کی طرف رجعت، دنیا کو حقیر سمجھنا اور مادیت سے گریز اختیار کرنا امت مسلمہ کا خاص شیوہ ہے، اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اختیاری فقر امت کے مفکرین کے لیے باعث شرم ہو جائے تو پھر مغرب کی پیروی ممکن بلکہ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

نقل کا حصار: مذہب کی حفاظت کا اصل ضامن:

جب تک عیسائیت کے دلائل نقلی بنیادوں پر رہے، اس کی گرفت مضبوط رہی، جب صرف عقلی و منطقی اور فلسفیانہ سائنسی دلیلیں عیسائیت کی الٰہیات، مابعد الطبیعیات اور ایمانیات کا حصہ بنیں تو عیسائیت کمزور ہوتی چلی گئی۔ مذہب کے نام پر ہر عمومی معاملے، عقلی قضیئے، منطقی کلیے، فلسفیانہ گتھیوں اور سائنسی امور و معاملات اور مسائل میں کلیسا نے بلاجواز مداخلت شروع کی تو عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو گئی۔ الحمدللہ اسلامی تاریخ کے کسی دور میں ایسی عبرت انگیز صورت حال نہیں ملے گی جو یورپ میں درپیش تھی۔

سائنس کی مذہبی توجیہات: چند اہم مثالیں:

چرچ فادرز کا کلیسا کی فکری تاریخ پر بے حد اثر تھا۔ لہٰذا سائنس اور فلسفے کی ترقی کے بعد اہل یورپ اور مغرب نے پندرہویں صدی میں کلیسا کے سائنسی و فلسفیانہ افکار کو نقد اور رد کے قابل قرار دیا تو انھیں کلیسا کے بے رحمانہ رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ اکثر پادری سائنسی عقلی اور حسی امور میں بغیر علم اور تجربات کے منہمک رہتے تھے اور انجیل و سائنس کے آمیختے سے عجیب و غریب نتائج اخذ کرتے تھے، مثلاً:

زمین کے آغاز و انجام کے متعلق کلیسا کی رکیک منطقی توجیہات

[۱] آرچ بشپ اشر Ussher نے انجیل کے مطالعے سے یہ نتائج اخذ کیے کہ اس دنیا کا آغاز اتوار ۲۳ر اکتوبر ۴۰۰۴ء قبل مسیح میں ٹھیک نو بجے دن کو ہوا، اس کے مقابلے پر ایک سائنس دان

Wycliffe نے علم طبقات الارض اور مختلف ڈھانچوں [Fossils] کے مشاہدے اور مطالعے کے بعد آرچ بشپ کے نتیجے سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ زمین کے آغاز کو چند ہزار سال ہی گزرے ہیں، کلیسا نے مرحوم سائنس داں کے اس نظریے پر شدید غصے کا اظہار کیا اور اس کی ہڈیوں کو قبر سے نکلوا کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے سمندر میں پھینک دیا گیا کہ یہ جراثیم زدہ جسم اس پاک سرزمین کو آلودہ نہ کر سکے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ نظریہ ارتقا سامنے آیا تو کلیسا خوف زدہ ہو گیا Bishop of Worcester کی اہلیہ کو اس نظریے کا علم ہوا تو اس نے کہا:

> Descended from the apes! My dear, let us hope it is not true, but if it is, let us pray that it will not become generally known.[1]

کیا خواہشات اور آرزوؤں سے سائنس کے سفر کو روکا جا سکتا تھا؟ یقیناً نہیں۔

کلیسا کی اس سراسیمگی، خوف اور گھبراہٹ کا سبب یہ تھا کہ کلیسا نے ان امور، اقالیم، دائروں اور علوم میں خواہ مخواہ مداخلت کی جو مذہب کے منہاج سے غیر متعلق تھے۔ یہ مداخلت اگر ایک خاص علمی سطح پر رہتی اور تحمل وصبر کے ساتھ دینی وعلمی محاسبے کے طور پر ہوتی تب بھی کوئی حرج نہ تھا لیکن یہ ردعمل کے شدید جذبات سے مغلوب تھی۔ چونکہ کلیسا نے یونانی علوم وفنون کے زیر اثر ہر لحظہ تغیر پذیر عقلی وحسی معاملات میں اپنی آرا مذہبی معتقدات کے طور پر داخل کر دی تھیں لہٰذا جیسے جیسے علوم عقلیہ ان تغیر پذیر معاملات میں تغیر کے باعث نت نئی رائے دیتے کلیسا کا غصہ بڑھتا بلکہ بھڑکتا چلا جاتا۔ کلیسا یہ بات سمجھنے سے قاصر رہا کہ مذہب عیسوی میں منطق، فلسفہ، سائنس اور مذہب کی تطبیق اور تلفیق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سنگین مسائل کے حل کا طریقہ یہ ہے کہ اصول تطبیق وتلفیق کو ترک کر کے اصول تفریق پر عمل کیا جائے، لیکن دو ہزار سال تک اس اصول تطبیق سے کلیسا کو جو فوائد حاصل ہوئے تھے ان کی لذت سے کنارہ کشی مشکل تھی کیوں کہ علمی حلقوں میں لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو ہزار سال تک یہ مفروضات دینی مسلمات کے طور پر کیوں مذہب میں داخل رہے؟ ان حالات میں چرچ کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی لہٰذا اس کا اظہار آگ وخون کی خوف ناک کہانی سے ہوا، ہزاروں لوگوں کو پھانسی دی گئی Inquisition کے ذریعے ہزاروں لوگ مارے گئے ہزاروں عورتوں کو جادوگرنیاں قرار دے کر جلا دیا گیا۔

زمین کا محیط، طول وعرض اور کلیسائی دلیل:

[۲] زمین کو ساکن قرار دینے کے بعد زمین کے طول وارض اور محیط کے بارے میں کلیسا نے خواہ مخواہ مذہبی بنیادوں پر مداخلت کر کے عجیب وغریب آرا کا انبار مہیا کیا، کرۂ ارضی، اس کے قشر، اس کی

---

1. Ashley Montagu, *Man's Most Dangerous Myth: The Fallacy of Race*, California: Altamira Press, 1997, p.99.

سمتوں اور اس کی آبادیوں جیسے طبعی امور میں بھی کلیسا نے خواہ مخواہ مداخلت کی، اسی طرح کہ سینٹ آگسٹین کے تقلید میں کئی صدیوں تک یہ عقیدہ رکھا گیا کہ مخالف ارض سمت میں انسانی آبادی وجود ہی نہیں رکھتی، اور اگر [opposite side of earth] کوئی خطہ زمین وجود بھی رکھتا ہے تو وہاں انسان نہیں بستے۔ چھٹی صدی میں Procopius of Gza نے اس مسئلے پر ایک نئی رائے کا اظہار نئے مذہبی دلائل سے کیا کہ زمین کے مخالف سمت کوئی زمین ہو ہی نہیں سکتی کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف ہی نہیں لے گئے۔ علم ارضیات کے ساتھ ساتھ علم فلکیات میں بھی کلیا نے دراندزی کی اور اس کا یہی رویہ تھا۔

بیماریوں کا علاج: فطرت سے جنگ کے مرادف: کلیسا:

[۳] چیچک کی بیماری بلاشبہہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک سزا ہے اور ہر بیماری اور مصیبت و آفت انسانی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، جب انسان فطرت سے جنگ کر کے غیر فطری اور گناہ گار زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے نفس کو الٰہ بنالیتا ہے تو سزا کے طور پر مختلف گمراہیوں کے ساتھ ساتھ خطرناک بیماریوں میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے، مثلاً آتشک، سوزاک تمام جدید جنسی بیماریاں مغرب کی عیاشانہ ثقافت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں۔ ایڈز انسانی اعمال کی سزا ہے گناہ کا ثمر اور اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی، لیکن بہت سی بیماریاں وبائی اور متعدی بھی ہوتی ہیں۔ کلیسا کا خیال یہ تھا کہ ان بیماریوں کا علاج کرنا اور کرانا درست نہیں ہے اور جو بیماریوں کا علاج کر رہا ہے وہ خدا کی مشیت میں دخل اندازی کا مرتکب ہے۔ بیماریوں کے اصل اسباب کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ یعنی گناہ گار زندگی کا خاتمہ اور ان بیماریوں کا طبعی علاج کبھی کسی تہذیب اور مذہب میں ممنوع نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ بندوں کو بیماریوں میں مبتلا کر کے اپنے آپ سے قریب کرتا ہے، انسان مصیبت میں بے ساختہ اپنے رب کو دل کی گہرائیوں سے پکارتا ہے، یہ پکار اس عہد الست کا نتیجہ ہوتی ہے جو ہر انسان سے لیا جا چکا، جو اس کے باطن میں پیوستہ، اس کے قلب میں آراستہ اور اس کے جسم و جاں و روح سے وابستہ ہے۔ بیماری و تکلیف کے ذریعے اللہ بندے کو اپنی زندگی، اپنے شب و روز اور اپنے اعمال پر متوجہ ہونے کا موقع مہیا کرتا ہے۔ بیماری قربت رب کا ذریعہ بن سکتی ہے اگر عقل اور قلب کی آنکھ کھلی رہے، اس لیے تیمارداری اور بیماروں سے اپنے لیے دعا کرانا سنت نبویؐ سے ثابت ہے۔ لیکن کلیسا نے گناہوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماری چیچک کے علاج کو مشیت خداوندی میں دخل اندازی قرار دے کر اطبا کو سزائیں دیں، جن لوگوں نے کسی طبیب کو اپنے گھر میں پناہ دی اس کو بھی ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ غلوفی الدین اسی کا نام ہے اور عدل سے محرومی کے نتیجے میں یہی رویہ جنم لیتا ہے۔

[۴] ۱۷۰۷ء میں یورپ کے بعض شہروں میں پانی کی رنگت اچانک خون کی طرح سرخ ہوگئی، کلیسا نے اس صورت حال کو Wrath of God قرار دیا، سویڈن کے ایک سائنس داں Linnaeus نے پانی کے سرخ ہونے کی سائنسی توجیہہ اور تشریح پیش کی تو کلیسا نے اس پر شدید غصے

کا اظہار کیا ان نتائج کو Satanic Abyss سے تعبیر کیا گیا Comets کے بارے میں Astronomy اور ماہرین فلکیات کے بارے میں کلیسا نے مختلف منطقی توجیہات وتعبیرات پیش کر کے علوم فلکیات کے ایسے امور میں دخل اندازی کی کوشش کی جہاں اس بھونڈے اور غیر علمی دخل اندازی کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

[۵] علم ارضیات [Geology] کے بہت سے نظریات جو محض قیاس، مفروضات، گمان اور اندازے، اور کلیسا کے سائنسی عقائد سے مختلف تھے لہٰذا یہ علم بھی کلیسا کی نظر میں معیوب اور اس کے حامل مشرک بت پرست جاہل اور معتوب قرار پائے، کلیسا نے اس علم کو internal artillery not a subject of lawful inquiry اور Dark Art، اس علم کے فضلاء کو کلیسا نے impugners of the sacred record قرار دیا۔

[۶] طوفانی آندھی برق و باد سے متعلق امور میں بھی کلیسا نے مداخلت کی اسے صرف اور صرف شیطان کی کارستانیاں اور جادو سمجھا گیا۔ Pope Gregory XIII کے حکم پر طوفان کو ٹالنے روکنے اور اس کا زور توڑنے کے لیے کلیسا میں مختلف گھنٹیاں بجائی جاتیں، ۷ر دسمبر ۱۴۸۴ء کو Pope VIII نے ایک فرمان جاری کیا اور جرمنی کے اہل کلیسا کو حکم دیا کہ وہ اُن جادوگرنیوں کو تلاش کریں جن کے کرتوتوں سے موسمیاتی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور طوفان، آندھی، باغ اور فصلوں کو تباہ کر رہے ہیں لہٰذا ہزاروں عورتوں کو جادوگرنی قرار دے کر موجب سزا سمجھا گیا، سخت اذیتیں دے کر انھیں ہلاک کیا گیا، اس کار خیر میں ان کے عزیز و اقربا بھی شامل تھے جو واقعتاً اپنی عورتوں کو جادوگر سمجھتے تھے Thunder bolt کے بارے میں چرچ کا خیال تھا کہ یہ صرف اور صرف مختلف جرائم اور گناہوں کا نتیجہ ہے۔

[۷] ۱۷۵۵ء کے زلزلے کے بارے میں کلیسا کا خیال تھا کہ اس کا اصل سبب بوسٹن میں بہت بڑے پیمانے پر Franklin's Rodes کا استعمال تھا جو آسمانی بجلی سے عمارتوں کو محفوظ رکھتی تھی۔ کلیسا نے اس ایجاد کی بھی مخالفت کی، شروع میں تو اس کے وجود سے انکار کر دیا لیکن جب اس کی فروخت بڑھی اور ہر جگہ اس کا استعمال عام ہوا تو اسے زلزلے کا سبب بتایا گیا، سترہویں صدی کے اختتام تک کلیسا نے اس ایجاد کو حلال کر دیا اور اس کے استعمال کی اجازت دے دی۔

[۸] کانٹ نے Nebula کے وجود کا اظہار اپنی ایک تحریر میں کیا تو تمام اہل کلیسا میں کانٹ کی اس ''دہریت'' کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔ لیکن Spectroscope اور Spectrum analysis کی ایجادات کے بعد کانٹ کے خیال کی تائید و توثیق ہوگئی اور کلیسا کو اپنے موقف سے رجوع کرنا پڑا۔

[۹] نظریہ ارتقا کے ہاتھوں عیسائیوں کی شکست کے باوجود کلیسا نے ابھی تک ڈارون کے اس ارتقائی مفروضے کے خلاف جو سائنسی بنیادوں پر بہت کمزور ہو گیا ہے مسلسل امریکہ اور یورپ میں جنگ جاری رکھی کلیسا اپنی شکست نہیں بھولا ہے۔ آج امریکہ کی بہت سی ریاستوں میں نظریہ ارتقا کی تدریس پر

پابندی ہے اور جہاں اسے پڑھا جاتا ہے وہاں اس کے مخالف موقف کو بھی تدریس کا حصہ بنالیا گیا ہے، رونالڈ ریگن کے زمانے میں Creationism کے نام سے ایک تحریک چلی تھی جس نے علم الارض اور Astronomy کی حدود، حیثیت اور علمیت پر نہایت خطرناک حملے کیے، جارجیا کی عدالت اپیل کے جج Braswell Dean.Jr. نے اسی زمانے میں ایک مضمون لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"Monkey mythology of Darwin" is the cause of permissiveness, promiscuity pills, propphylactics, perversions, pregnancies, abortions, pornography, pollution, poisoning and proliferation of crimes of all types.[1]

کلیسا کی یونانی مذہبی عیسوی سائنس اور جدید سائنس کے مابین تصادم میں گیلی لیو جیسا سائنس دان بھی قتل کیا گیا۔ ۹ رمئی ۱۹۸۳ء کو ویٹی کن میں ایک خصوصی تقریب کے دوران Pope John Paul II نے پہلی مرتبہ اس المناک قتل پر کلیسا کی جانب سے سرکاری معذرت نامہ جاری کیا اس کے الفاظ پڑھیے:

The Church's experience, during the Galileo affair and after it, has led to a more mature attitude... The Church herself learns by experience and reflection and she now under stand better the meaning that must be given to freedom of research ...one of the most noble attributes of man... It is through research that man attains to Truth ... This is why The Church is convinced that there can be no real Contradiction between science and faith, ... [However]; it is only through humble and assiduous study that [the Church] learns to dissociate the essential of the faith from the Scientific system of a given age, especially when a culturally influenced reading of the Bible seemed to be linked to an obligatory Cosmogony.[2]

---

1. Jon P. Alston, *The Scientific Case Against Scientific Creationism*,Nebraska: iUniverse.inc, p.17.

2.Henry Nargenau, Roy Abraham, varghese, [eds.], *Cosmos, Bios, Theos: Scientific Reflect on Science, God and The Origins of The Univers, life and homo-sepiens*, Open cort Publishing, 1992,pp.96-7.

کلیسا کی یونانی نگر مذہبی عیسوی سائنس اور سترہویں صدی میں جدید فلسفے سے نکلنے والی جدید سائنس کے مفروضات میں اختلافات کے باعث یہ سائنسی اختلافات لامحالہ مذہب و سائنس کی جنگ میں تبدیل ہو گئے۔ اگر کلیسا مذہب اور سائنس کی خواہ مخواہ تطبیق کے مصنوعی ملاپ میں ملوث نہ ہوتا تو ہزیمت سے بچ سکتا تھا ـــــ الحمد للہ عالم اسلام اس قسم کی گمراہیوں اور افسوس ناک معذرت ناموں سے خالی رہا۔

Andrew Dickson کی تحقیقات کا اہم خلاصہ درج ذیل ہے:

The doctrine of the Spherical shape of the earth, andthere fore the existerice of the that of antipodes, was bitterly attacked by theologians who asked: "Is there any one so senseless as to believe that crops and tress grow downwards? .... that the rains and snow fall upwards?" The great authority of St. Augustine held the Church frmly against the idea of antipodes and for a thousand years it was believed that there could not be human beings on the opposite side of the earth - even if the earth had opposite sides. In the sixth century, Procopius of Gaza brought powerful theological guns to bear on the issue: there could not be an opposite side, he declared, because for that Christ would have had to go there and suffer a second time. Also, there would have had to exist a duplicate Eden, Adam, Serpent, and Deluge. But that being : clearly wrong, there could not be only antipodes. QED!

Ecclesiastics and theologians of the medieval Church vigorously promoted the view that comets are fireballs flung by an angry God against a wicked world. Churchmen illustrated the moral value of comets by comparing the Almighty sending down a comet to the judge laying down the sword of execution on the table between himself and the criminal in a court of justice. Others denounced people who heedlessly stare at such warnings of God and compared

them to "calves gaping at a barn door". Even up to the end of the 17th century, the oath taken by professors of astronomy prevented them from teaching that comets are heavenly bodies obedient of physical law. But ultimately, science could not be suppressed. Halley, using the theory of Newton and Kepler, observed the path of one particularly "dangerous" comet and predicated that it would return in precisely seventy-six year. He calculated to the minute when it would be seen again at a well-defined point in the sky. This was incredible. But seventy six years later, when Halley and Newton were both long dead, Halley's comet retuned exactly as predicted.

Christian ohrition orthodoxy held geology to be a highly subversive tool in the service of the devil. Not only did geological evidence refute Archbishop Usher's assertion of the earth's age, but it also showed that creation in six days was impossible. The orthodox declared geology "not a subject of lawful inquiry", denounced it as "a dark art", called it "infernal artillery", and pronounced its practitioners "infidels" and "impugners of the sacred record". Pope Pius IX was doubtless in sympathy with this feeling when he forbade the scientific congress of Italy to meet in Bologna in 1850.

During the Middle Ages, the doctrine of the diabolical origin of storms was generally accepted, receiving support from such unassailable authorities as St. Augustine. Storms, it was held, were the work of demons. Against this supernatural' power of the air various rites of exorcism,were used the most widely used being that of Pope Gregory XIII.

Whereas in earlier times the means of exorcism amounted simply to various chanting and ringing of church bells during storms, in the 15th century there evolved a tragic belief that certain women may secure infernal aid to produce whirlwinds, hail, frosts, floods, and like. One the 7th of December 1484, Pope Innocent VIII issued a papal bull, inspired by the scriptural command "Thou shalt not suffer a witch to live". He exhorted the clergy of Germany to detect sorcerers and witches who cause evil weather and so destroy vineyards, gardens, meadows, and growing crops. Thereupon thousands of women found themselves writhing on the torture racks, held in horror by their nearest and dearest ones, anxious only for death to relieve them of their suffering.

The thunderbolt, said Church dogma, was in consequence for five sins: impenitence, incredulity, neglect of repair of churches, fraud in payment of tithes to the clergy, and oppression of subordinates. Pope after pope expounded on this instrument of Divine retribution, calling it the "finger of God". And then in 1752 Benjamin Franklin flew his famous kite during aanelectrical an electrical storm, discovering in this dangerous experiment that lightning was but electricity. Immediately there followed the lightning rod, a sure protection from even the most furious storm. At first the Church refused to concede its existence. Then, as the efficacy became widely recognized and more and more were installed, the orthodox took up cudgels against them. The earthquake of 1755 in Massachusetts was ascribed by them

to the widespread use of Franklin's rods in Boston, and preachers fulminated against those who attempted to control the artillery of the heavens. The opposition would undoubtedly have lasted longer but for the fact that churches without lightning rods were frequently devastated by lightning. In Germany, in the period between 1750 and 1783 alone about 400 church towers had been damaged and 120 bell ringers killed by lightning. On the other hand, the town brothel , with its protruding I lightning rod, stood smug and safe even in the worst of storms. The few churches which had installed rods were never touched. And so, grudgingly to be sure, lightning rods received the Holy Sanction and were used to protect most churches by the end of the century.

When Immanuel Kant presented the theory that there exist nebula as well as stars, throughout the theological world there was an outcry against such "atheism". The rigidly orthodox saw no place for it in the Scriptures. Hence nebula should not exist. These opponents of nebular theory were overjoyed when improved telescopes showed that some patches of nebular matter could indeed be resolved into stars. But with time came the discovery of the spectroscope and spectrum analysis; the light from the nebula was clearly from gaseous matter. And so the orthodox were ultimately forced to retreat.[1]

1.www.alislam.org/egazette/articles/Andrew-Dickson-White-200907.pdf [29-03-2010]

مذہبی یونانی عیسوی سائنس اور جدید سائنس کے درمیان کلیسا کی سرپرستی میں لڑی جانے والی جنگ کی ہولناک داستان Andrew Dickson White کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب: History of the Warfare of Science & Theology in Christendom میں پڑھی جا سکتی ہے، یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں نے تحریر کی گئی تھی۔ اینڈریو ڈکسن کی کتاب کے چند اہم مضامین کی فہرست یہ ہے:

1- From Creation to Evolution. 2- Geography, 3-Astronomy, 4-From "signs and wonders" to law in the Heaven, 5- From Genesis to Geology; 6-The Antiquity of man, Egyptology and Assyriology.

اس کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے لازمی ہے جو اسلام اور سائنس میں تطبیق پیدا کرنے کے لیے شب و روز کوشاں ہیں[1]

عالم اسلام پر اللہ کا احسان تھا کہ امام غزالیؒ نے مذہب اور سائنس کی تطبیق کی معتزلی تحریک کو علمی بنیادوں پر شکست دے دی۔ ورنہ عالم اسلام کا بھی وہی انجام ہوتا جو عالم عیسائیت کا ہوا۔ چونکہ کلیسا خود مذہبی سائنسی نظریات کا حامل تھا لہٰذا اس کے مذہبی سائنسی نظریات جو اصلاً یونانی سائنسی نظریات تھے مسلسل جدید سائنس سے متصادم رہے اور آخر کار یونانی سائنس اور کلیسا ایک ساتھ منہدم ہو گئے۔

دو ہزار سال بعد کلیسا کی معذرت خواہی:

دو ہزار سال تک سائنس، فلسفے اور منطق سے عیسوی مذہب کی تطبیق اس کے وجود کے لیے سنگین خطرہ بن گئی تب پوپ جان پال دوم نے وہ معذرت جاری کی جو گزشتہ اوراق میں نقل کی گئی ہے جس میں اعتراف کیا کہ ہر زمانے اور عہد کا اپنا سائنسی نظام ہوتا ہے اس سائنسی نظام کے عقیدے سے کلیسا کو الگ رہنا چاہیے۔ اس طرح کلیسا نے ایک مرتبہ پھر دنیا کے امور سے الگ ہو کر دین و دنیا کی تفریق گوارا کر لی، صدیوں پہلے کلیسا نے City of God اور City of Man کے فلسفے کے تحت مادی دنیا اور روحانی دنیا کو دو الگ حصوں میں تقسیم کر کے دین کو دنیا سے الگ کیا، مادی، دنیاوی، تجربی اور حسی امور میں سلطنت رومۃ الکبریٰ کو تمام اختیارات سونپ دیے اور روحانی معاملات میں صرف کلیسا طاقت کا واحد اور آخری سرچشمہ قرار پایا۔ پھر طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر کلیسا نے دنیا کے امور میں مداخلت کی اور دنیا کی منطق، فلسفے اور سائنس کو عیسائیت میں شامل کر لیا اور جب دنیا نے انھیں شکست دے دی تو دوبارہ دنیا سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یعنی رہبانیت، جس کا حکم اللہ نے انھیں نہیں دیا تھا۔ گیلی لیو کی پھانسی سے متعلق کلیسا کا رویہ اپنے عہد کے سائنسی آرا و افکار سے متصادم تھا اگر کلیسا اس معاملے کا محض ایک عقلی، حسی اور تجزیاتی سرگرمی کے طور پر جائزہ لیتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا نہ کہ اس معاملے میں حتمی مذہبی

---

[1] یہ کتاب www.questia.com یا www.archive.org پر مطالعے کے لیے دستیاب ہے۔

فیصلے اور وہ بھی مسترد شدہ یونانی سائنسی بنیادوں پر مسلط کیے گئے۔ اپنے معذرت نامے میں پوپ نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ کلیسا کے افکار اور ردِ عمل غلط تھے، ایک مرتبہ پھر پوپ کے الفاظ پڑھیے:

"The Church learns to dissociate the essential of the faith from the scientific system of a given age".

یہ معذرت بھی تین سو پچاس سال کے بعد پیش کی گئی جب معذرت طلب کرنے والا کوئی نہیں تھا، اس غیر دانش مندانہ اور غیر دینی رویے کے باعث سائنس اور اس کی دنیا کے لیے مغرب میں کلیسا ایک غیر اہم ادارہ ہو گیا یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ اس دنیا کے امور سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں یہ ایک الگ دنیا ہے۔ کلیسا نے بھی اس موقف کو اپنی پے در پے شکستوں کے بعد طوعاً و کرہاً قبول کر لیا۔

کلیسا کی یونانی عقلیت سے مرعوبیت:

چرچ فادرز نے سقراط، بقراط، ارسطو کے یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر عقلیت کی بنیاد پر عالمگیر سچائیوں کو جاننے کے لیے فرد کو اس کی ذات سے ماوراء ہو کر سچ کی تلاش کا طریقہ بتانے کی کوشش کی، فلسفۂ یونان میں اپنی ذات زمان و مکان سے اوپر اٹھنا صرف عقل کے ذریعے ہی ممکن تھا کیونکہ عقلیت ہی معروضیت [Objectivity] اور آفاقیت کی طرف رہنمائی کرتی تھی لہٰذا انھوں نے نقلی دلائل کے بجائے عقلی دلائل کو فوقیت دی مگر اس سوال پر غور نہیں کیا کہ عقل کے ذریعے اگر علم حاصل کر لیا جائے تو اس کی غیر جانبداری اور صداقت جانچنے کا پیمانہ، منہاج اور معیار کیا ہوگا؟ ظاہر ہے اس کا منہاج عقل ہی ہوگا لہٰذا مذہبی امور میں بھی نہایت خاموشی کے ساتھ عقل نص قرار پائی یعنی نص [وحی] [Revealed Text] کی جگہ نفس [Self] نے لے لی اور عملاً وحی الٰہی پیغمبر باطن [عقل] سے کمتر قرار پائی، اگرچہ فکری و نظری اور اصولی سطح پر وحی کو فوقیت دی گئی لیکن عملی سطح پر وحی عیسائی معاشرت اور تہذیب سے بے دخل ہو گئی۔

عقل سے معروضی علم کے حصول کے امکان کا دعویٰ: یکسانیت

فلاسفہ یونان اور ان کے تتبع میں چرچ فادرز کا خیال تھا کہ عقل کے ذریعے بھی معروضی علم [objective knowledge] کا حصول ممکن ہے اس عقلی منہاج کے ذریعے ایک فرد اپنی تاریخ اپنے زمان و مکاں، تہذیب اور جذبات سے ماوراء اور غیر جانبدار [neutral] ہو کر سوچ سکتا ہے اور اس معروضیت سے حقیقت الحقائق کا ادراک کر سکتا ہے، عقل کے بارے میں اس نقطۂ نظر کے باوجود تمام روایتی فکر [traditional thought] گریکو رومن تھاٹ [Greeko Roman Thought] اور Scholistic Thought کسی بھی علم سے مابعد الطبیعیات کو منہا کر کے کسی قسم کے نتائج حاصل کرنے کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے، ان تہذیبوں میں موجود سائنس بھی مقصد [purpose] اور منزل [Tilos] کے تعین کے ساتھ تخلیق ہوتی تھی، جس کی بنیادیں مابعد الطبیعیات سے ہی نکلتی تھیں، ارسطو جب مشاہداتی تجزیے [Observational Analysis] کی بات کرتا ہے، تو اس سے مراد جزئیات کا علم نہیں ہوتا وہ plurality of causation کا قائل ہے اور آخری سبب Final

Cause کو سب سے اہم سمجھتا تھا یعنی مقصد purpose خیر، ہمیشہ مابعد الطبیعیات سے آتا ہے صرف ارسطو ہی نہیں تمام روایتی تہذیبوں میں مابعد الطبیعیات کے بغیر سائنس وٹکنالوجی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ وٹگنسٹائن کے الفاظ میں مقصد ہمیشہ باہر سے آتا ہے، ارسطو کے مشاہداتی تجزیات کے مطابق مابعد الطبیعیات کو منہا کر کے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا تمام قدیم تہذیبیں اپنے تمام امور، علوم، شعبہ ہائے زندگی طور طریقے مابعد الطبیعیات سے حاصل شدہ علیت کی روشنی میں انجام دیتے تھے۔

سائنسی تجربات مابعد الطبیعیات سے آزاد: جدید سائنس کا مہمل دعویٰ:

جدید سائنس کا دعویٰ تھا کہ وہ مابعد الطبیعیات سے ہٹ کر آزادانہ طور پر سائنسی تجربات سے مشاہدات اخذ کر کے نتائج حاصل کرتی ہے حالانکہ یہ ایک جھوٹا دعویٰ تھا جو آخر کار مغرب میں رد ہو گیا۔ یہ مفروضہ جو جدید سائنس اپنے معروضی علم ہونے کی طاقت ور ترین دلیل کے طور پر بیان کرتی تھی فی الحقیقت ایک جھوٹا دعویٰ تھا جدید سائنس کا پورا تانا بانا خاص فلسفے، تاریخ وتہذیب، مخصوص اہداف اور ما بعد الطبیعیات سے برآمد ہوا ہے جو آزادی [Freedom] اور ترقی [Development] بذریعہ سرمایہ [Capital] کی تثلیث سے ابھرتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ جدید سائنس کی مابعد الطبیعیات بہ ظاہر نظر نہیں آتی لیکن اس کے باطن میں پیوست ہے، اس کی مابعد الطبیعیات اندرون [Implicit] میں پوشیدہ ہے بیرون [Explicit] میں ظاہر نہیں ہے، ارسطو سمیت تمام روایتی تہذیبوں کی مابعد الطبیعیات دیکھی اور دکھائی جاسکتی ہے مگر جدید سائنس کی مابعد الطبیعیات اس کے باطن میں اس طرح مکین، مضمر، مخفی، محدود، محفوظ اور مقید ہے کہ اسے دیکھنا اور دکھانا ان لوگوں کے لیے مشکل ترین کام ہے۔ جو اس سائنس کے کرشموں سے مسحور ہو کر زماں ومکاں سے ماوراء ہونے کے قابل ہی نہیں رہے۔

مغرب: تاریخ کی جنونی تہذیب:

دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ نفسیاتی مریض، پاگل، بھیانک بیماریوں کے اعداد وشمار مغرب میں ملتے ہیں، یہ آزادی بے تحاشہ سائنسی ترقی بذریعہ سرمایہ داری اور اس مصنوعی فطرت دشمن، غیر حقیقی زندگی اور ترقی کا بدیہی نتیجہ ہے۔ اس جدید طرزِ زندگی ان جدید مصنوعی جعلی، جھوٹی، غیر فطری، غیر حقیقی اقدار کو ترک کرتے ہی پاگلوں اور جنونیوں کی تعداد لمحوں میں ختم ہو سکتی ہے۔ ان بیماریوں کے سب سے زیادہ ڈاکٹر یعنی ماہرین نفسیات کی سب سے بڑی تعداد مغرب میں ہے۔ [Thearapeutic Culture] کا مسکن مغرب ہے یہ نفسیات داں لوگوں کو آزادی کے آزار [Agony of Freedom] سے نجات دلانے کا کام مزید آزادی [More Freedom] یعنی آزادی کے مزید ذرائع [more resources for Freedom] مہیا کر کے وسیع کرتے ہیں۔

کیسا خدا کیسا نبی...... پیسہ خدا پیسہ نبی:

جدید مغربی تصور آزادی اور ترقی کا غیر مادی تصور ممکن ہی نہیں اس مادی تصور کے اظہار کی ایک ہی صورت ہے: مارکیٹ —— جہاں سرمایہ [Capital] کے بغیر آزادی اور ترقی کا اظہار نہیں

ہو سکتا لہٰذا سرمایہ [Capital] ہی اس دور کا سچ، حق اور خیر بن چکا ہے، سرمایہ اور آزادی براہ راست متناسب ہیں، سرمائے کے بغیر آزادی نہیں ملتی اور آزادی کے بغیر سرمایہ نہیں ملتا اور ایسی آزادی جس سے لطف اٹھانے کے لیے سرمایہ نہ ہو آزادی نہیں غلامی ہے، لہٰذا دنیا کے ہر فرد کی بنیادی ذمے داری کام کر کے سرمایہ جمع کرنا ہے تا کہ وہ آزادی، لطف اور لذت میں اضافہ کر سکے اور سائنس سرمایہ کے حصول کی سب سے بڑی محافظ ہے۔

تمام رشتے اور تعلقات، تمام محبتیں صرف اور صرف سرمایے کے منہاج پر پرکھی جا رہی ہیں، ہر تعلق پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہو رہا ہے، ہم مارکیٹ سوسائٹی میں رہ رہے ہیں، دفتر، اسکول اور گھر سے لے کر ہماری خواب گاہ تک چوبیس گھنٹے ہم مارکیٹ میں زندگی بسر کرتے اور ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدتے اور بیچتے رہتے یا خریدنے اور بیچنے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں، لیکن ہمیں اس کا نہ علم ہوتا ہے نہ اندازہ۔ اس جبر کی ایسی ایسی صورتیں ہیں کہ انسان غور کرے تو دنگ رہ جائے کہ اسے کس کس طرح اور کیسی کیسی سنہری و روپہلی زنجیروں میں جکڑا گیا ہے زنجیر سنہری ہو یا لوہے کی بہر حال وہ ہوتی زنجیر ہی ہے۔

عیسائیت کا المیہ اور اسلام کا امتیاز:

عیسائیت کا المیہ یہ تھا کہ Church Fathers کے ذریعے جو فلسفی بھی تھے، یونانی فلسفہ اور قدیم سائنس مذہبی پیرائے میں عیسوی دینی تعلیمات و اعتقادات میں داخل ہو چکی تھی۔ عیسائیت کی شکست و ریخت کا سبب یہ تھا کہ وہاں کوئی امام غزالیؒ پیدا نہ ہوا جو علما کو سائنس اور فلسفے کے رعب سے نکالتا۔ دین کی تشریح و توجیہہ سائنسی و فلسفیانہ مناہج میں کرنے سے روکتا اور اس کے مضر اور دور رس اثرات سے آگاہ کرتا، سائنس اور فلسفے کے تال میل سے عیسائیت کو جو عارضی اور فوری فوائد پہنچے اور ان اتفاقی فوائد کا دائرہ اٹھارہ صدیوں تک موثر رہا آخر کار شدید خسارے میں تبدیل ہو گیا۔ اصول کے بجائے فوری فائدے Pragmatism اور Utilitarianism کی بنیاد پر اچھے سے اچھے مقصد کا حصول بھی بالآخر خطرناک گمراہیوں پر ختم ہوتا ہے حتیٰ کہ مذہب خود سوال بن جاتا ہے۔ عیسائیت کے ساتھ یہی ہوا لہٰذا عیسائیت میں جنگ مذہب اور سائنس کے مابین نہیں اصلاً جنگ قدیم سائنس و جدید سائنس کی تھی جو علوم عقلیہ میں کلیسا کی غلط طریقے سے شمولیت، جلد بازی، عاقبت نا اندیشی اور عقلی علوم سے مرعوبیت کے باعث مذہب و سائنس کی جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا احسان یہ تھا کہ امام غزالیؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ نے اسلامی علمیت میں سائنس و فلسفہ کے قضایا کے داخل ہونے کا راستہ قیامت تک بند کر دیا۔

کاپرنیکس اور اس عہد کے غالب سائنسی نظریات کی کش مکش:

سترہویں صدی میں کاپرنیکس نے کہا زمین کو ساکن سمجھنا اسے مرکز کائنات قرار دینا درست علمی طریقہ نہیں ہے زمین محو گردش ہے جب کہ سورج ساکن ہے، اس کے خیال میں زمین کے ساکن

ہونے کے فلسفے کا ریاضیاتی تاثر ٹھیک نہیں بلکہ غلط تھا جب اس سے پوچھا گیا کہ مسئلے کا حل کیا ہے تو اس نے بتایا کہ زمین محور نہیں سورج محور و مرکز کائنات ہے، زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس نے یہ موقف ریاضی سے ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تصور علمیت اس دور کے عام آدمی، اس عہد کی غالب مذہبی علمیت، اس دور کے سائنسی تجربات، مشاہدات اور فلسفہ وسائنس کے نظریات کے خلاف تھا۔ ہر شخص اپنی آنکھ سے سورج اور چاند کو گردش کرتے ہوئے اور زمین کو ساکن محسوس کر رہا تھا۔ محسوسات، مشاہدات اور تجربات سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ فی الواقع زمین ساکن ہے لیکن کاپرنیکس نے Bold Conjecture کے ذریعے اس عہد کی غالب علمیت [Causious Conjecture] کو دعوت مبارزت دی۔ کاپرنیکس اس عہد کی غالب فلسفیانہ مذہبی اور سائنسی علمیت کے سامنے تنہا کھڑا تھا اس نے زمین کے ساکن ہونے کی تردید کی تو اس عہد کے سائنس دانوں نے جو کلیسا کے ساتھ تھے، کاپرنیکس کے ان علمی دعووں کو مختلف تجربی، علمی، عملی، اختباری، منطقی، عقلی سائنسی اور مذہبی دلائل سے رد کیا، مثلاً [Wheel Argument] پہیہ گھمایا گیا چیزیں گر گئیں، یہی چیزیں جب زمین پر رکھی گئیں تو نہیں گریں، کاپرنیکس سے پوچھا گیا کہ اگر زمین حرکت میں ہے تو چیزیں ساکن کیوں ہیں؟ مشاہدہ کاپرنیکس کے دعوے کی عملی نفی کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ صرف مشاہدے کی بنیاد پر حاصل علم بھی ظنی، قیاسی، غیر حقیقی اور غیر قطعی ہوتا ہے۔ کاپرنیکس صحیح بات کہہ رہا تھا لیکن اس کی پشت پر وہ سائنسی نظریات اور وہ پیچیدہ سائنسی ڈھانچے [complex structure] نہیں تھے جو ایک بہت بڑی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ کاپرنیکس نے کہا چونکہ زمین کا محیط بہت بڑا ہے اس لیے چیزیں نہیں گر رہیں، ورنہ فی الحقیقت زمین گردش کر رہی ہے۔ کاپرنیکس کے رد میں دوسری مضبوط ترین دلیل Tower & Foot Argument کے ذریعے دی گئی۔ ایک بہت اونچا مینار بنا کر اس کی چوٹی سے لوہے کا گولہ زمین پر پھینکا گیا، وہ مینار کے قدم [Foot] پر گرا، کاپرنیکس سے پوچھا گیا اگر زمین حرکت میں ہے تو گولے کو مینار کے قدم [Foot] پر نہیں گرنا چاہیے۔ پس ثابت ہوا کہ زمین نے بالکل حرکت نہیں کی۔ کاپرنیکس سے پوچھا گیا گولا مینار کے قدم [Foot] پر کیوں گرا کاپرنیکس خاموش ہو گیا۔ لہٰذا کاپرنیکس کو محض عقل، فلسفے، منطق، تجربے اور مشاہدے کی بنا پر نہیں بلکہ اس عہد کے غالب نظام علمیت سے اخذ شدہ تصورات، نظریات، افکار اور تجربات نے شکست دے دی۔ کاپرنیکس جس حقیقت [Fact] کو اپنے علم و یقین کی بنیاد پر بیان کر رہا تھا اسے تجربات کی سطح پر بیان کرنے سے قاصر رہا۔ اس کا تصور علم اس عہد کے غالب نظام علمیت سے ہم آہنگ نہ تھا۔ اس عہد کی غالب علمیت باطل تھی لیکن اپنے حق ہونے کے مضبوط علمی، عقلی، سائنسی اور منطقی فلسفیانہ اور مذہبی دلائل رکھتی تھی لیکن اس عہد کا سچ سچ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ثابت نہیں کر سکا۔ اس حق کو ثبوتِ حق کے لیے نیوٹن کا انتظار کرنا پڑا۔ سوال یہ ہے کہ دو ہزار سال تک حرکت کا ایک باطل نظریہ پوری دنیا پر حکومت کرتا رہا تو اس سے انسانوں پر اور تاریخ کی رفتار پر کیا فرق پڑا؟ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی چیز کو ثابت نہ کیا جا سکے، دکھایا نہ جا سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں

ہوتا کہ وہ شے وجود نہیں رکھتی یا وہ حقیقت، حقیقت نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ محض مشاہدات کی بنیاد پر حاصل کردہ علم قطعاً قابل اعتبار نہیں ہوتا، صرف کسی خاص حد تک اس کو اعتبار کے قابل سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً اگر پانی کے گلاس میں قلم ڈال دیا جائے تو قلم ٹیڑھا نظر آئے گا حالانکہ فی الحقیقت وہ سیدھا ہوتا ہے، یعنی صرف مشاہدہ و تجربہ سے حقیقت تک پہنچنے کا سائنسی خیال درست نہیں ہے کیونکہ انسان کا علم، عقل، تجربہ اور حواس نہایت محدود دائرے میں کام کرتے ہیں۔ یہاں اس معاملے کی مزید تفصیل فلسفۂ سائنس کے مؤرخ اور مفکر A.F. Chalmers کے الفاظ میں پڑھیے:

It was generally accepted in mediaeval Europe that the earth lies at the centre of a finite universe and that the sun, planets and stars orbit around it. The physics and cosmology that provided the framework in which this astronomy was set was basically that developed by Aristotle in the fourth century B.C. In the second century A.D., Ptolemy devised a detailed astronomical system that specified the orbits of the moon, the sun and all the planets.

In the early decades of the sixteenth century, Copernicus devised a new astronomy, an astronomy involving a moving earth, which challenged the Aristotelian and Ptolemaic system. According to the Copernican view, the earth is not stationary at the centre of the universe but orbits the sun along with the planets. By the time Copernicus's idea had been substantiated, the Aristotelian world view had been replaced by the Newtonian one. The details of the story of this major theory change, a change that took place over one and a half centuries.

When Copernicus first published the details of his new astronomy, in 1543, there were many arguments that could be, and were, levelled against it. Relative to the scientific knowledge of the time, these arguments were sound ones and Copernicus could not satisfactorily defend

his theory against them. In order to appreciate this situation, it is necessary to be familiar with some aspects of the Aristotelian world view on which the arguments against Copernicus were based. A very brief sketch of some of the relevant points follows:

The Aristotelian universe was divided into two distinct regions. The sub-lunar region was the inner region, extending from the central earth to just inside the moon's orbit. The super-lunar region was the remainder of the finite universe, extending from the moon's orbit to the sphere of the stars, which marked the outer boundary of the universe. Nothing existed beyond the outer sphere, not even space. Unfilled space is an impossibility in the Aristotelian system. All celestial objects in the super-lunar region were made of an incorruptible element called aether. Aether possessed a natural propensity to move around the centre of the universe in perfect circles. This basic idea became modified and extended in Ptolemy's astronomy. Since observations of planetary positions at various times could not be reconciled with circular, earth-centred orbits, Ptolemy introduced further circles, called epicycles, into the system. Planets moved in circles, or epicycles, the centres of which moved in circles around the earth. The orbits could be further refined by adding epicycles to epicycles etc. in such a way that the resulting system was compatible with observations of planetary positions and capable of predicting future planetary positions.

In contrast to the orderly, regular, incorruptible character of the super-lunar region, the sub-lunar region was

marked by change, growth and decay, generation and corruption. All substances in the sub-lunar region were mixtures of four elements air, earth, fire and water, and the relative proportions of elements in a mixture determined the properties of the substance so constituted. Each element had a natural place in the universe. The natural place for earth was at the centre of the universe; for water on the surface of the earth; for air, in the region immediately above the surface of the earth; and for fire, at the top of the atmosphere, close to the moon's orbit. Consequently, each earthly object would have a natural place in the sub-lunar region depending on the relative proportion of the four elements that it contained. Stones, being mostly earth, have a natural place near the centre of the earth, while flames, being mostly fire, have a natural place near to the moon's orbit, and so on. All objects have a propensity to move in straight lines, upwards or downwards, towards their natural place. Thus stones have a natural motion straight downwards, towards the centre of the earth, and flames have a natural motion straight upwards, away from the centre of the earth. All motions other than natural motions require a cause. For instance, arrows need to be propelled by a bow and chariots need to be drawn by horses.

These, then, are the bare bones of the Aristotelian mechanics and cosmology that were presupposed by contemporaries of Copernicus, and which were utilized in arguments against a moving earth. Let us look at some of the forceful arguments against the Copernican system.

Perhaps the argument that constituted the most

serious threat to Copernicus was the so-called tower argument. It runs as follows. If the earth spins on its axis, as Copernicus had it, then any point on the earth's surface will move a considerable distance in a second. If a stone is dropped from the top of a tower erected on the moving earth, it will execute its natural motion and fan towards the centre of the earth. While it is doing so the tower will be sharing the motion of the earth, due to its spinning. Consequently, by the time the stone reaches the surface of the earth the tower will have moved around from the position it occupied at the beginning of the stone's downward journey. The stone should therefore strike the ground some distance from the foot of the tower. But this does not happen in practice. The stones strikes the ground at the base of the tower. It follows that the earth cannot be spinning and that Copernicus's theory is false.

Another mechanical argument against Copernicus concerns loose objects such as stones, philosophers, etc. resting on the surface of the earth. If the earth spins, why are such objects not flung from the earth's surface, as stones would be flung from the rim of a rotating wheel? And if the earth, as well as spinning, moves bodily around the sun, why doesn't it leave the moon behind?

Some arguments against Copernicus based on astronomical considerations have been mentioned earlier in this book. They involved the absence of parallax in the observed positions of the stars and the fact that Mars and Venus, as viewed by the naked eye, do not change size appreciably during the course of the year.

Because of the arguments I have mentioned, and others like them, the supporters of the Copernican theory were faced with serious difficulties. Copernicus himself was very much immersed in Aristotelian metaphysics and had no adequate response to them.

In view of the strength of the case against Copernicus, it might well be asked just what there was to be said in favour of the Copernican theory in 1543. The answer is, "not very much", The main attraction of the Copernican theory lay in the neat way it explained a number of features of planetary motion, which could be explained in the rival Ptolemaic theory only in an unattractive, artificial way. The features are the retrograde motion of the planets and the fact that, unlike the other planets, Mercury and Venus always remain in the proximity of the sun. A planet at regular intervals regresses, that is, stops its westward motion among the stars (as viewed from earth) and for a short time retraces its path eastward before continuing its journey westward once again. In the Ptolemaic system, retrograde motion was explained by the somewhat ad hoc manoeuvre of adding epicycles especially designed for the purpose. In the Copernican system, no such artificial move is necessary. Retrograde motion is a natural consequence of the fact that the earth and the planets together orbit the sun against the background of the fixed stars. Similar remarks apply to the problem of the constant proximity of the sun, Mercury and Venus. This is a natural consequence of the Copernican system once it is established that the orbits of Mercury and Venus are inside that of the earth. In the Ptolemaic system,

the orbits of the sun, Mercury and Venus have to be artificially linked together to achieve the required result.

There were some mathematical features of the Copernican theory that were in its favour, then a part from these, the two rival systems were more or less on a par as far as simplicity and accord with observations of planetary positions are concerned. Circular sun-centred orbits cannot be reconciled with observation, so that Copernicus, like Ptolemy, needed to add epicycles and the total number of epicycles needed to produce orbits in accord with known observations was about the same for the two systems. In 1543, the arguments from mathematical simplicity that worked in favour of Copernicus could not be regarded as an adequate counter to the mechanical and astronomica; arguments that worked against him. Nevertheless, a number of mathematically capable natural philosophers were to be attracted to the Copernican system, and their efforts to defend it became increasingly successful over the next hundred years or so.

The person who contributed most significantly to the defence of the Copernican system was Galileo. He did so in two ways. Firstly, he used a telescope to observe the heavens, and in so doing he transformed the observational data that the Copernican theory was required 'to explain.' Secondly, he devised the beginnings of a new mechanics that was to replace Aristotelian mechanics and with reference to which the mechanical arguments against Copernicus were defused.

When, in 1609, Galileo constructed his first

telescopes and trained them on the heavens, he made dramatic discoveries. He saw that there were many stars invisible to the naked eye. He saw that Jupiter had moons and he saw that the surface of the earth's moon was covered with mountains and craters. He also observed that the apparent size of Mars and Venus, as viewed through the telescope, changed in the way predicted by the Copernican system. Later, Galileo was to confirm that Venus had phases like the moon, as Copernicus had predicted but which clashed with Ptolemy's system. The moons of Jupiter defused the Aristotelian argument against Copernicus based on the fact that the moon stays with an allegedly moving earth. For now Aristotelians were faced with the same problem with respect to Jupiter and its moons. The earthlike surface of the moon undermined the Aristotelian distinction between the perfect, incorruptible heavens and the changing, corruptible earth. The discovery of the phases of Venus marked a success for the Copernicans and a new problem for the Ptolemaics. It is undeniable that once the observations made by Galileo through his telescope are accepted, the difficulties facing the Copernican theory are diminished.

The foregoing remarks on Galileo and the telescope raise a serious epistemological problem. Why should observations through, a telescope be preferred to naked-eye observations? One answer to this question might utilize an optical theory of the telescope that explains its magnifying properties and that also gives an account of the various aberrations to which we can expect telescopic images to be subject. But Galileo himself did not utilize an optical theory

for that purpose. The first optical theory capable of giving support in this direction was devised by Galile's contemporary, Kepler, early in the sixteenth century, and this theory was improved and augmented in later decades. A second way of facing our question concerning the superiority of telescopic to naked-eye observations is to demonstrate the effectiveness of the telescope in a practical way, by focusing it on distant towers, ships, etc. and demonstrating how the instrument magnifies and renders objects more distinctly visible. However, there is a difficulty with this kind of justification of the use of the telescope in astronomy. When terrestrial objects are viewed through a telescope, it is possible to separate the viewed object from aberrations contributed by the telescope because of the observer's familiarity with what a tower, a ship, etc. looks like. This does not apply when an observer searches the heavens for he knows not what. It is significant in this respect that Galileo's drawing of the moon's surface as he saw it through a telescope contains some craters that do not in fact exist there. Presumably those "craters" were aberrations arising from the functioning of Galileo's far-from-perfect telescopes. Enough has been said in this paragraph to indicate that the justification of telescopic observations was no simple, straightfoward matter. Those adversaries of Galileo who queried his findings were not all stupid, stubborn reactionaries. Justifications were forthcoming, and became more and more adequate as better and better telescopes were constructed and as optical theories of their functioning were developed. But all this

took time.

Galileo's greatest contribution to science was his work in mechanics. He laid some of the foundations of the Newtonian mechanics that was to replace Aristotle's. He distinguished clearly between velocity and acceleration and asserted that freely falling objects move with a constant acceleration that is independent of their weight, dropping a distance proportional to the square of the time of fall. He denied the Aristotelian claim that all motion requires a cause and in its place proposed a circular law of inertia, according to which a moving object subject to no forces will move indefinitely in a circle around the earth at uniform speed. He analyzed projectile motion by resolving the motion of a projectile into a horizontal component moving with a constant velocity obeying his law of inertia, and a vertical component subject to a constant acceleration downwards. He showed that the resulting path of a projectile was a parabola. He developed the concept of relative motion and argued that the uniform motion of a system could not be detected by mechanical means without access to some reference point outside of the system.

These major developments were not achieved instantaneously by Galileo. They emerged gradually over a period of half a century, culminating in his book Two New Sciences which was first published in 1638, almost a century after the publication of Copernicus's major work. Galileo rendered his new conceptions meaningful and increasingly more precise by means of illustrations and thought experiments. Occasionally, Galileo described actual

experiments, for instance, experiment involving the rolling of spheres down inclined planes, although just how many of these Galileo actually performed is a matter of some dispute.

Galileo's new mechanics enabled the Copernican system to be defended against some of the objections to it mentioned above. An object held at the top of a tower and sharing with the tower a circular motion around the earth's centre will continue in that motion, along with the tower, after it is dropped and will consequently strike the ground at the foot of the tower, consistent with experience. Galileo took the argument further and claimed that the correctness of his law of inertia could be demonstrated by dropping a stone from the top of the mast of a uniformly moving ship and noting that it strikes the deck at the foot of the mast, although Galileo did not claim to have performed the experiment. Galileo was less successful in explaining why loose objects are not flung from the surface of a spinning earth, With hindsight, this can be attributed to the inadequacies of his principle of inertia and of his lack of a clear conception of gravity as a force.

Although the bulk of Galileo's scientific work was designed to strengthen the Copernican theory, Galileo did not himself devise a detailed astronomy, and seemed to follow the Aristotelians in their preference for circular orbits. It was Galileo's contemporary, Kepler who contributed a major breakthrough in that direction when he discovered that each planetary orbit could be represented by a single ellipse, with the sun at one focus. This eliminated the complex system of epicycles that both Copernicus and

Ptolemy had found necessary. No similar simplification is possible in the Ptolemaic, earth-centre system. Kepler had at his disposal Tycho Brahe's recordings of planetetry positions, which were more accurate than those available to Copernicus. After a painstaking analysis of the data, Kepler arrived at his three laws of planetary motion, that planets move in elliptical orbits around the sun, that a line joining a planet to the sun sweeps out equal areas in equal times, and that the square of the period of a planet is proportional to the cube of its mean distance from the sun.

Galileo and Kepler certainly strengthened the case in favour of the Copernican theory. However, more developments were necessary before that theory was securely based on a comprehensive physics. Newton was able to take advantage of the work of Galileo, Kepler and others to construct that comprehensive physics that he published in his Principia in 1687. He spelt out a clear conception of force as the cause of acceleration rather than motion, a conception that had been present in a somewhat confused way in the writings of Galileo and Kepler. Newton replaced Galileo's law of circular inertia with his own law of linear inertia, according to which bodies continue to move in straight lines at uniform speed unless acted on by a force. Another major contribution by Newton was of course his law of gravitation. This enabled Newton to explain the approximate correctness of Kepler's laws of planetary motion and Galileo's law of free fall. In the Newtonian system, the realms of the celestial bodies and of earthly

bodies were unified, each set of bodies moving under the influence of forces according to Newton's laws of motion. Once Newton sphysics had been constituted, it was possible to apply it in detail to astronomy. It was possible, for instance, to investigate the details of the moon's orbit, taking into account its finite size, the spin of the earth, the wobble of the earth upon its axis, and so on. It was also possible to investigate the departure of the planets from Kepler's laws due to the finite mass of the sun, interplanetary forces, etc. Developments such as these were to occupy some of Newton's Successors for the next couple of centuries.

The story I have sketched here should be sufficient to indicate that the Copernican Revolution did not take place at the drop of a hat or two from the Leaning Tower of Pisa. It is also clear that neither the inductivists nor the falsificationists give an account of science that is compatible with it. New concepts of force and inertia did not come about as a result of careful observation and experiment. Nor did they come about through the falsification of bold conjectures and the continual replacement of one bold conjecture by another. Early formulations of the new theory, involving imperfectly formulated novel conceptions, were presevered with and developed in spite of apparent falsifications. It was only after a new system of physics had been devised, a process that involved the intellectual labour of many scientists over several centuries, that the new theory could be successfully matched with the results of observation and experiment in a detailed way. No account of science can be regarded as

anywhere near adequate unless it can accommodate such factors.[1]

کاپرنیکس کے بیان کردہ مفروضے اور اس کے اٹھائے گئے سوال کا جواب قانون انجذاب دے سکتا تھا لیکن اس وقت تک نیوٹن پیدا نہیں ہوا تھا۔ کاپرنیکس نے اپنے علم، یقین اور ریاضیاتی مہارت کے بل پر جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس پر قائم رہا اس نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ پھانسی چڑھ گیا اور موت قبول کی لیکن اپنے دعوے سے پیچھے نہیں ہٹا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ذاکر نائیک صاحب ۲۸۰ ق م سے لے کر پندرھویں صدی کے درمیان کسی بھی زمانے میں پیدا ہو جاتے تو یقیناً وہ کاپرنیکس کی تردید فرماتے۔ وہ یہی کہتے کہ زمین ساکن ہے، یہ سائنسی حقیقت ہے، اسے فلسفہ بھی مانتا ہے، سائنس بھی، عیسائیت بھی، قرآن میں بھی ایسی کوئی آیت نہیں جو بہ ظاہر اس کے خلاف ہو یہ ایک ثابت شدہ ٹھوس سائنسی حقیقت ہے، اسے ماننا پڑے گا، ایسی حقیقت جو دو ہزار سال سے مسلسل ثابت شدہ ہے عقل، ریاضی، منطق کے ہر پیمانے پر پورا اترتی ہے یا وہ کہتے کہ نہیں ہم کسی ریاضی، سائنسی، منطقی حقیقت کو نہیں مانتے یا کہتے کہ قرآن کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حقیقت دس ہزار سال تک بھی رہے تب بھی یہ حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ سائنسی حقیقت کبھی بھی بدل جاتی ہے دو ہزار سال میں نہ بدلنے سے اس کا حق، حتمی اور منطقی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ حقیقت وہ ہے جو کبھی بدل نہیں سکتی اور اپنے ہونے کے لیے کسی دوسرے جواز کی محتاج نہیں ہوتی۔

سائنسی منہاج کی مکمل تردید وتصدیق ناممکن: ساختی مکتب:

آیے ایک اور سائنسی حقیقت کو دیکھتے ہیں، لے کاٹوش [Lakatos] اور کوہن [Kuhn] بتاتے ہیں، واضح رہے کہ دونوں مفکرین Structuralist ہیں، کہ سائنسی منہاج بڑے پیچیدہ اور گنجلک مناہج اور ڈھانچوں [Complex Paradiagms & Structures] پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان دونوں کا خیال ہے کہ پاپر کے فلسفہ تردیدیت [Falsification Method] کے تحت کسی ایک تجربے سے کسی پہلے تجربے کو رد کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی بنیاد پر کسی منہاج علم کو کامل مسترد کرنا ممکن نہیں، یہ دعویٰ کہ محض ایک تجربہ پورے نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے درست نہیں۔ اصلاً نظریۂ استخراج ونظریۂ تردیدیت کے باوجود علم کی دنیا میں کسی سائنسی نظریے کو نہ یقین سے قبول کیا جا سکتا ہے، نہ یقین سے مسترد کرنا ممکن ہے۔ کسی سائنسی نظریے کی توثیق اور تردید کے دعوے محض امکانی طور پر قابل توثیق یا قابل تردید [probably verify] اور [probably falsify] ہوتے

---

1. A. F. Chalmers, *What Is This Thing Called Science?: An Assessment of the Nature and Status of Science and its Methods*, U.S.A.:Open University Press, 1988, pp. 67 -75.

ہیں۔ان کی بنیاد پر نہ کسی سائنسی حقیقت کو سچ ثابت کیا جا سکتا ہے نہ غلط۔Kuhn اور Lakatos کے خیال میں کسی بھی حقیقت کی صداقت اور اس کے دعوے اسی خاص منہاج کے اندر جانچے، پرکھے جا سکتے ہیں اور اس کی سچائی structually determind یعنی اسی ڈھانچے کے اندر متعین، مشخص اور معین ہو سکتی ہے۔ اس متعین مخصوص ڈھانچے، منہاج اور دائرے سے باہر نکلتے ہی سائنسی سچائی سچائی نہیں رہ جاتی۔ یعنی سائنسی سچائی اپنے منہاج کے باہر سچائی نہیں ہوتی۔ بالفاظِ دیگر کسی نظریے کی مابعدالطبیعیات کو قبول کیے بغیر اسے سچ تسلیم نہیں کیا جا سکتا، ایمانیات پہلے ہے عقلیت بعد میں ہے۔ ہر تعقل اپنے منہاج میں درست نظر آتا ہے۔ منہاج بدل جائے تو عقلی استدلال غیر عقلی معلوم ہوتا ہے، جس طرح دو ہزار سال تک سورج متحرک اور زمین ساکن رہی لیکن دو ہزار سال کے بعد منہاج علم بدل گیا تو قدیم مذہبی علمی وعقلی دلائل مسترد ہو گئے۔

جب کہا جاتا ہے کہ زمین گردش کر رہی ہے اور یہ ایک مسلمہ سائنسی نظریہ ہے تو یہ ایک سادہ بیان ہے جو سائنس سے کامل ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہ نظریہ ایک نہیں کئی نظریوں [theories] کا مجموعہ ہے۔ کئی مناہج علم اس میں پیوست اور خلط ملط ہیں، ان کے آمیختے سے اس کا ظہور ہوا ہے۔ اسی طرح کائنات کا محور و مرکز سورج ہے، یہ نتیجہ صرف کسی سادہ نظریہ کا مرہون منت نہیں بلکہ کئی پیچیدہ ڈھانچوں [complex structure] کے ملاپ سے برآمد ہوا ہے، سورج کے مقام کا تعین صرف زمین کی گردش سے طے نہیں ہوگا۔ سورج اگر کائنات کا محور ہے تو اسے جاننے کے لیے کئی نظریوں کے آمیختے [combinations] سے گزرنا ہوگا۔ مثلاً:

Law of Inertia, Laws of Mechanics, Laws of Energy, Laws of Statistics, Laws of Gravity, Laws of Optics, Law of Gravitational Forces, Laws of Thermodynamics, Laws of Quantum Electrodynamics.

جب یہ تمام نظریات ملیں گے، تب سورج کے محور کائنات ہونے کے بارے میں کسی نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ نتیجہ بھی سائنسی منہاج علم کے تناظر میں محض اضافی نتیجہ [relative] ہے، مطلق، قطعی، حتمی اور ابدی نہیں کیونکہ مستقبل میں نئی دریافتیں، نئے اصول اور نئے مناہج کی تخلیق کے نتیجے میں ممکن ہے کہ یہ تصور ہی باقی نہ رہے اور سورج بھی کسی اور سیارے، اور قوت، کسی نئی اکائی، کسی نئے عنصر اور کسی نئے نظام پر منحصر ہو جائے جو فی الحال ہمارے محدود علم کی دسترس سے باہر ہے اور یہ سائنسی حقیقت ہی بدل جائے۔

سائنسی حقیقت کے بدلنے یا نہ بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا دو ہزار سال تک ارسطو اور قدیم یونانیوں کا حرکت کے بارے میں غلط نظریہ پوری دنیا میں تسلیم کیا گیا تو اس سے کیا فرق پڑ گیا؟ پھر نیوٹن سے آئن اسٹائن تک دو سو سال کے عرصے میں حرکت کے نظریات اور تصورات میں بنیادی تغیرات پیدا ہوئے تو اس کے نتیجے میں کائنات کی حقیقتوں پر کیا فرق پڑ گیا؟ سائنس اور فلسفہ کا اصول یہ ہے کہ وہ قدیم

افکار و نظریات و تجربات کو رد کر کے آگے بڑھتے رہتے ہیں اور آئندہ بھی آگے بڑھتے رہیں گے۔ ہر فلسفی کا علم اور فلسفہ دو ادوار میں منقسم ہوتا ہے early اور later، دوسرا دور کسی بھی مسئلے پر اس فلسفی کا آخری نقطۂ نظر اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ اس نظریے کے اظہار کے بعد فلسفی کو ارتقا، رجوع، تنقیح اور تنقید کا موقع نہیں مل سکا۔ موت کا پنجا اسے دبوچ لیتا ہے۔ حالانکہ اگر اسے زندگی ملتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اپنے آخری نقطۂ نظر سے بھی رجوع کر لیتا، اس کے آخری later نقطۂ نظر کو اصلاً موت نے آخری نقطۂ نظر بنا دیا فلسفی کے علم اور یقین نے نہیں۔ یہ فلسفی کا موت کے سامنے عجز ہے اس کے علم اور عجز کا کمال نہیں۔

آئن اسٹائن کے نظریات: سائنسی دنیا میں انقلاب:

آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت نے اس عہد کے زمان و مکان اور حرکت [Time, Space & Motion] سے متعلق مروجہ سائنسی نظریات سے یکسر مختلف نظریہ پیش کیا کچھ لوگوں کے خیال میں آئن اسٹائن کے نظریے نے نیوٹن کے افکار کو رد کر دیا جبکہ کچھ ماہرین کے خیال میں آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت نیوٹن کے نظریات کی توسیع ہے، اگر نیوٹن نہ ہوتا تو آئن اسٹائن بھی نہ ہوتا، لیکن کیا آئن اسٹائن نے نظریہ اضافیت نیوٹن کی تردید میں پیش کیا؟ اور کیا یہ نظریہ تجرباتی، عملی بنیادوں پر پیش کیا گیا؟ یا فی الحقیقت آئن اسٹائن کا یہ نظریہ وجدانی، خیالی، مابعد الطبیعیاتی فطری اور فلسفیانہ سطح پر سامنے لایا گیا؟ کیا نظریہ اضافیت بالکل اسی طرح کا نظریہ تھا جس طرح کاپرنیکس نے سورج کے ساکن اور زمین کے مرکز کائنات ہونے سے متعلق سترہویں صدی میں پیش کیا یعنی Bold Conjecture تاریخ کے مطابق؟ آئن اسٹائن نے ۱۹۰۵ء میں زیورچ یونیورسٹی سوئٹزرلینڈ سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی اسی سال اس نے جرمنی کے وقیع علمی رسالے میں اپنے چار مقالات شائع کرائے، یہ مقالات طبیعیات کے میدان میں حیران کن انکشافات سے معمور تھے، ان مقالات میں ایک مقالہ: *On the Electrodynamics of Moving Bodies* بھی شامل تھا جس میں آئن اسٹائن نے نظریہ اضافیت پر بحث کی تھی، تاریخ کے مطابق طبیعیات کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے والا یہ حیران کن مقالہ آئن اسٹائن نے محض سولہ سال کی عمر میں لکھا تھا، آئن اسٹائن نے General theory of Relalivity پر ایک خصوصی مقالہ ۱۹۱۳ء میں شائع کرایا جب اس کی عمر صرف چوبیس برس تھی۔ نظریہ اضافیت پر آئن اسٹائن کا کام ۱۹۱۶ء میں تکمیل پذیر ہوا' جب اس نے اپنا وقیع مقالہ: *The Foundation of the General Theory of Relativity* تحریر کیا تو اس وقت تک سائنس کی دنیا میں آئن اسٹائن کے انقلاب آفریں افکار اور تحقیقات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی، ۱۹۱۹ء کے اواخر میں آئن اسٹائن کا نظریہ سائنس دانوں کی توجہ کا مرکز اس وقت بنا، جب مئی ۱۹۱۹ میں مکمل سورج گرہن [total Solar Eclipse] نے سائنس دانوں کو متوجہ کیا، سائنس دانوں کے ایک منتخب گروہ نے سورج گرہن کا مشاہدہ آئن اسٹائن کے نظریات کی روشنی میں کیا اور نومبر ۱۹۱۹ء میں رائل سوسائٹی آف لندن نے آئن اسٹائن کے نظریے کی روشنی میں سائنس دانوں کے پیش کردہ نتائج کی توثیق کا رسمی اعلان کر دیا سائنس دانوں کے ان مشاہدات اور نتائج سے متعلق ایک مورخ لکھتا ہے:

These studies among other things showed Einstein's

prediction of cosmic significance, particularly the one relating to the bending of the ray of light when it passes near a massive star turned out to be true.

سائنس دانوں کا گروہ جس نے آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت کی تصدیق وتوثیق کے لیے مطلوبہ معلومات اور اعداد وشمار [requisit data] مہیا کیے اس کی سربراہی ممتاز ماہر فلکیات ریاضی داں اور طبعیات داں Sir. A. Stanley Eddington کررہے تھے۔ جنھوں نے پہلی مرتبہ نظریہ اضافیت کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا فریضہ انجام دیا، ایڈنگٹن نے ۱۹۱۸ء میں فزیکل سوسائٹی لندن کی درخواست پر آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت پر ایک کتاب لکھی ۱۹۲۳ء میں اس موضوع پر اس کی دوسری کتاب: *Mathametical Theory of Relativity* منظر عام پر آئی جس پر تبصرہ کرتے ہوئے آئن اسٹائن نے کہا تھا:

It is the finest presentation of the subject in any language.[1]

اس بحث کا مقصد یہ بات واضح کرنا ہے کہ بڑے بڑے سائنسی نظریے بھی پہلے صرف مفروضات کی سطح پر ہوتے ہیں تجربات، مشاہدات کے نتائج کی بنیاد پر اخذ نہیں کیے جاتے، جیسے کہ آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت جو ۱۹۱۳ء میں منظر عام پر آیا اور اس کی تصدیق وتائید ۱۹۱۹ء کے اواخر میں ہوسکی۔ نظریہ کسی اور نے پیش کیا اور اس کی تائید وتوثیق دوسرے سائنس دانوں نے کی۔ نیوٹن کے قوانین کے مقابلے میں آئن اسٹائن کا نظریہ bold conjecture تھا جس نے اپنے عہد کے تسلیم شدہ نظریات causious conjecture کو مسترد کردیا، لیکن جب آئن اسٹائن نے یہ نظریہ پیش کیا تو اس کے پاس اس کا کوئی عملی ثبوت نہیں تھا نہ وہ مطلوبہ معلومات [data] میسر تھیں جس کی بنا پر اس نظریے کی حقانیت کو جانچا جاسکتا تھا۔ نظریہ اس نے ۱۹۱۳ء میں پیش کیا اور چھ سال بعد سائنس دانوں کی ایک جماعت نے ایک مکمل سورج گرہن کے مطالعے ومشاہدے کے دوران اتفاقی طور پر آئن اسٹائن کے نظریات کو درست پایا۔ آئن اسٹائن کا وجدان، مکمل سورج گرہن کا مشاہدہ، سائنس دانوں کا اس مشاہدے کے نتائج کو ترتیب دیتے ہوئے آئن اسٹائن کے نظریات سے استفادہ، اس تجربے اور نظریے کے مابین کچھ تعلق یہ سب اتفاقات یکجا ہوئے تو طبعیات کی دنیا میں انقلاب آگیا۔ سائنس کا وجود اسی طریقے سے برآمد ہوتا ہے اور پھر اسی طریقے سے بدل جاتا ہے اور بدلتا رہتا ہے، لیکن سائنس کو مذہب پر قیاس کرنا اور اس کے نظریات سے قرآن یا مذہبیات کی تشکیل وتعمیر کا کام لینا محض جدیدیت [Modernism] ہے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا کہ سائنسی نظریے صرف مشاہدات اور تجربات کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سائنس کوئی نتیجہ دینے سے

---

1. M. saeed shaikh, "*Allama Iqbal's Interest in Science*", in Iqbal Review, vol.30,No. 1, April-June, 1989, p.34.

پہلے تمام تجربے کر گزرتی ہے ٹھیک نہیں ہے، مفروضات یا مابعد الطبیعیات کے بغیر کوئی سائنسی نظریہ وجود نہیں رکھتا۔ اگر کوئی سائنس دان ان امور کا انکار کردے تب بھی حقیقت میں مابعد الطبیعیات کے بغیر کسی نظریے کا کوئی وجود نہیں ہوتا، خود آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت جس کے بارے میں اس کا ذاتی خیال تھا کہ اس نظریے کی تشکیل و تعمیر میں مابعد الطبیعیات کا کوئی کردار نہیں، ۱۹۲۱ء میں آئن اسٹائن جب King's College لندن میں ایک خطبہ دینے آیا تو اس نے Lord Haldane سے واضح الفاظ میں کہا:

He did not believe that his theory had any metaphysical implication.[1]

Lord Haldane نے اپنی کتاب: *Reign of Relativity* میں آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت کے چند پہلوؤں کی ریاضیاتی تعبیر پیش کرنے کے بعد اسے بحیثیت مجموعی a compendium of Idealistic Metaphysics کے طور پر پیش کیا تھا Haldane نے اپنی کتاب کی تیسری اشاعت اگست ۱۹۲۱ء میں آئن اسٹائن اور اپنی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

Revised a few of the unphilosophical paragrahs in the book.[2]

سائنس: قطعی یا ظنیت کا شاہکار؟

نیوٹن اور آئن اسٹائن نے سائنس پر کیا اثر ڈالا، ان کی تحقیقات کے ضمنی و ذیلی اثرات کیا ہوئے؟ کیا دونوں کے نظریات نتائج حتمی، قطعی اور یقینی تھے؟ کیا آئن اسٹائن کے بعد طبیعیات میں مطلقیت اور قطعیت کا عنصر پیدا ہوسکا یا ابھی تک یہ علم قیاس، قیافہ، گمان، اندازوں اور اٹکل پچو طریقوں سے چل رہا ہے، کیا سائنس خاص ہے؟ کیا یہ الحق اور العلم ہے جو ناقابل تردید ہے؟ ایک ایسا علم جس کی نہ تردید ممکن ہے نہ تصدیق، کیا علم کہلا سکتا ہے؟ کیا سائنسی علم اور افریقہ کے جادوئی علم میں کوئی فرق نہیں ہے؟ سائنس کا کوئی عالمگیر تصور اور نظریہ وجود رکھتا ہے؟ سائنس کیا سرمایہ داری کے بغیر دوڑ سکتی ہے کیا سائنس کا مقصد صرف مادی دنیا کی تعمیر ہے یا کچھ اور؟ فلسفہ سائنس کے مفکر، چامر کا بیان پڑھیے جو بہت سے حقائق سے پردہ اٹھائے گا:

If Einstein's theory is applicable to the world, then under a wide variety of circumstances Newton's theory is approximately applicable to it. For example, it can be shown, within Einstein's theory, that if the velocity of a system with respect to a set of frames of reference is small, then the value

---

1. Ibid., p.35. 2. Ibid., p.36.

of the mass of the system will be approximately the same, whichever reference frame in the set it is evaluated with reference to. Consequently, within that set of reference frames we will not go far wrong if we treat mass as if it were a property rather than a relation. Similarly, under the same conditions it can be shown from within Einstein's theory that if we treat mass as a property then, within a particular reference frame from among the set, the sum of the product of mass and velocity for each part of the system will remain constant to a high degree of approximation. That is, from the point of view of Einstein's theory, we can show that the Newtonian law of conservation of momentum will be approximately valid provided velocities are not too great.

Again, we are forced to conclude that Newton's theory cannot be adequately characterized in instrumentalist terms. On the other hand, it cannot he construed in typical realist terms either, since, from the point of view of Einstein's theory, it does not correspond to the facts.

2. Unrepresentative realism

The physical world is such that Newtonian theory is approximately applicable to it under a wide variety of circumstances. The extent to which this is so can be understood in the light of Einstein's theory. The approximate validity of Newtonian theory is to be tested under experimental conditions, although, if the world is such that Newton's theory is applicable to it, it will continue to be so outside of experimental situations. Newton's theory cannot be construed as corresponding to the facts but its applicability to the world must be understood in a stronger

sense than is, captured by instrumentalism.

I suggest that all of these comments on the status of Newton's theory must be accepted by a realist who subscribes to the correspondence theory of truth. Given this, and given the difficulties associated with the correspondence theory of truth discussed in the previous section, the path to my own position is fairly straightforward. In involves treating all physical theories in the way that the above discussion had led us to treat Newton's theory.

From the point of view I wish to defend, the physical world is such that our current physical theories are applicable to it to some degree, and in general, to a degree that exceeds that of its predecessors in most respects. The aim of physics will; be to establish the limits of applicability of current theories and to develop theories that are applicable to the world to a greater degree of approximation under a wider variety of circumstances. I will call such a view as this *unrepresentative realism.*

Unrepresentative *realism* is realist in two senses. Firstly, it involves the assumption that the physical world is the way it is independently of our knowledge of it. The world is the way it is whatever individuals or groups of individuals may think about the matter. Secondly, it is realist because it involves the assumption that, to the extent that theories are applicable to the world, they are always so applicable, inside and outside of experimental situations. Physical theories do more than make claims about correlations between sets of observation statements. Unrepresentative realism is *unrepresentative* in so far as it

does not incorporate a correspondence theory of truth. The unrepresentative realist does not assume that our theories describe entities in the world, such as wave functions or fields, in the way that our common sense ideas understand our language to describe cats and tables. We can appraise our theories from the point of view of the extent to which they successfully come to grips with some aspect of the world, but we cannot go further to appraise them from the point of view of the extent to which they describe the world as it really is, simply because we do not have access to the world independently of our theories in a way that would enable us to assess the adequacy of those descriptions. This clashes with our common sense notions, according to which talks of cats and tables includes what is taken as descriptions of such things. However, I would remind those defenders of the applicability of the correspondence theory of truth to physics that they, too, are obliged to render Intelligible Newton's, to some extent successful, talk of-light particles, and of mass conceived of as a property, Maxwell's talk of the aether and Shrodinger's talk of wave-functions.

My characterization of unrepresentative realism in terms of the applicability of theories to the world, or their ability to come to grips with the world, might well be objected to on the grounds that it is too vague. Part of my response to that charge is to admit that my account is vague, but to insist that this is not a weakness but a strength of my position. The ways in which we are successfully able to theorize about the world are something we have to discover and not something that we-can establish in advance by

philosophical argument. Galileo discovered how it is possible to come to grips with some aspects of the physical world by way of a mathematical theory of motion, Newton's theories differed from Galileo's in important respects, whilst quantum mechanics comes to grips with the world in ways that are fundamentally different from classical physics and who knows what the future has in store? Certainly not philosophers of science. Any account of the relationship between theories within physics, and the world that those theories are intended to be about, should not be such as to rule out possible future development. Consequently, a degree of vagueness is essential.

My own account of the relationship between physical theories and the world draws on two general features of physics since Galileo. One is that physics involves experimentation, which provides me with a basis for rejecting instrumentalism. The other is the fact that physics has experienced revolutionary changes, a factor that constitutes part of the grounds for my criticism of the application of the correspondence theory of truth to physics. More details can certainly be added if we wish to characterize two hundred years of physics more precisely. We can say that physics involves universal generalizations formulated in mathematical terms, that systems of theories form something like Lakatosian research programmes, and that their development has taken place in conformity with the objectivist account of change presented in Chapter 11. In this kind of way we can fill out an answer to the question "what is this thing called physics?" However, we cannot be

sure that physics will not undergo some drastic changes in the future. It has already been noted that modern quantum mechanics differs from classical physics in fundamental respects, and it has also been suggested that the character of physics may be changing due to the social changes accompanying the growth of monopoly capitalism.

This talk of judgements about the status of areas of knowledge decreases in significance in the light of non-relativist aspects of my position. The, objectivist thrust of my own stance stresses that individuals in society are confronted by a social situation that has certain features, whether or not they like it or are aware of it, and they have at their disposal a range of means of changing the situation, whether they like it or not. Further, any action that is taken to change the situation will have consequences which depend on the objective character of the situation, and may differ markedly from the intentions of the actor. Similarly, in the domain of knowledge, individuals are confronted by an objective situation and a range of methods and theoretical raw materials at their disposal for contributing to a change in the situation. One theory may, as a matter of fact, meet certain aims better than a rival, and the judgements of individuals and groups may be wrong about the matter.

Looked at from this point of view, judgements made by individuals concerning the character and merits of theories are of less significant than is frequently assumed. My objectivist account of theory change was designed to show how the development of two hundred years of physics can be explained in a way that does not depend crucially on

the methodological judgements of individuals or groups. Aims need not be analyzed in terms of the aspirations of individuals or groups. Take, for example, the aim of increasing technological control over nature. That aim has greater significance in capitalist societies than in the feudal societies they replaced. Within a capitalist economy increased technological control is a necessity, in so far as capitalists who fail to achieve it will be forced out of the market by those who do and will consequently become bankrupt. The situation was not the same in feudal society. Communities centred around neighbouring manors were not obliged by the nature of the economic system to compete in this way. A feudal community which failed to match the technological advances of its neighbour would not go broke, but would simply experience a lower standard of living than its neighbour. Such talk of aims does not involve the judgements or values of the individuals involved.

In retrospect, I suggest the most important function of my investigation is to combat what might be called the ideology of science as it functions in our society. This ideology involves the use of the dubious concept of science and the equally dubious concept of truth that is often associated with it, usually in the: defence of conservative positions. For instance, we find the kind of behaviourist psychology that encourages the treatment of people as machines and the extensive use of the results of I.Q. studies in our educational system defended in the name of science. Bodies of knowledge such as these are defended by claiming or implying that they have been acquired by means of the

"scientific method" and, therefore, must have merit. It is not only the political right wing that uses the categories of science and scientific methods in this way. One frequently finds Marxists using them to defend the claim that historical materialism is a science. The general categories of science and scientific method are also used to rule out or suppress areas of study. For instance, Popper argues against Marxism and Adlerian psychology, on the grounds that they do not conform to his falsificationist methodology, whilst Lakatos appealed to his methodology of scientific research programmes to argue against Marxism, contemporary sociology, and other intellectual pollution!

As will by now be clear, my own view is that there is no timeless and universal conception of science or scientific method which can serve the purposes exemplified in the previous paragraph. We do not have the resources to arrive at and defend such notions. We cannot legitimately defend or reject items of knowledge because they do or do not conform to some ready-made criterion of scientificity. The going is tougher than that. If, for example, we wish to take an enlightened stand on some version of Marxism, then we will need to investigate what its aims are, the methods employed to 'achieve those aims, the extent to which those aims have been attained, and the forces or factors that determine its development. We would then be in a position to evaluate the version of Marxism in terms of the desirability of what it aims for, the extent to which its methods, enable the aims to be attained, and the interests that it serves.

Whilst one of the objectives of my book is to undermine illegitimate uses of conceptions of science and scientific method. I also hope that it will do something to counter the extreme individualist or relativist reactions against the ideology of science. It is not the case that any view is as good as any other. If a situation is to be changed in a controlled way, whether the situation involves the state of development of some branch of knowledge or the state of development of some aspect of society, this will best be achieved by way of a grasp of the situation and a mastery of the means available for changing it. This will typically involve co-operative action. The policy of "anything goes", interpreted in a more general sense than Feyerabend probably intended, is to be resisted because of its impotence. To quote John Krige again, anything goes. means that in practice, everything stays".[1]

Marxists are keen to insist that historical materialism is a science. In addition, Library Science, Administrative Science, Speech Science, Forest Science, Dairy Science, Meat and Animal Science and even Mortuary Science are all currently taught or were recently taught at American colleges or universities. Self-avowed "scientists" in such fields will often see themselves as following the empirical method of physics, which for them consists of the collection of "facts" by means of careful observation and experiment and the subsequent derivation of laws and theories from

1. A. F. Chalmers, *What is This Thing Called Science?* U.S.A: Open University Press , 1988, pp. 162-170.

those facts by some kind of logical procedure. I was recently informed by a colleague in the history department, who apparently had absorbed this brand of empiricism, that it is not at present possible to write Australian history because we do not as yet have a sufficient number of facts. An inscription on the facade of' the Social Science Research Building at the University of Chicago reads, "If you cannot measure, your knowledge is meagre and unsatisfactory". No doubt, many of its inhabitants, imprisoned in their modern laboratories, scrutinize the world through the iron bars of the integers, failing to realize that the method that they endeavour to follow is not only necessarily barren and unfruitful but also is not the method to which the success of physics is to be attributed.

The mistaken view of science referred to above will be discussed and demolished in the opening chapters of this book. Even though some scientists and many pseudo-scientists voice their allegiance to that method, no modern philosopher of science would be unaware of at least some of its shortcomings. Modern developments in the philosophy of science have pinpointed and stressed deep-seated difficulties associated with the idea that science rests on a sure foundation acquired through observation and experiment and with the idea that there is some kind of inference procedure that enables us to derive scientific theories from such a base in a reliable way. There is just no method that enables scientific theories to be proven true or even probably true. Later in the book, I will argue that attempts to give a simple and straightforward logical

reconstruction of the "scientific method" encounter further difficulties when it is realized that there is no method that enables scientific theories to be conclusively disproved either.

Some of the arguments to support the claim that scientific theories cannot be conclusively proved or disproved are largely based on philosophical and logical considerations. Others are based on a detailed analysis of the history of science and modern scientific theories. It has been a feature of modern developments in theories of scientific method that increasing attention has been paid to the history of science. One of the embarrassing results of this for many philosophers of science is that those episodes in the history of science that are commonly regarded as most characteristic of major advances, whether they be the innovations of Galileo, Newton, Darwin or Einstein, have not come about by anything like the methods typically described by philosophers.

One reaction to the realization that scientific theories cannot be conclusively proved or disproved and that the reconstructions of philosophers bear little resemblance to what actually goes on in science is to give up altogether the idea that science is a rational activity operating according to some special method or methods. It is a reaction somewhat like this that has recently led philosopher and entertainer Paul Feyerabend to write a book with the title *Against Method: Outline of an Anarchistic Theory of Knowledge* and a paper with the title "Philosophy of Science: A Subject with a Great Past"; According to the most extreme view that has

been read into Feyerabend's recent writings, science has no special features that render it intrinsically superior to other branches of knowledge such as ancient myths or Voodoo. A high regard for science is seen as the modern religion, playing a similar role to that played by Christianity in Europe in earlier eras. It is suggested that the choice between theories boils down to choices determined by the subjective values and wishes of individuals..

Francis Bacon was one of the first to attempt to articulate what the method of modern science is. In the early seventeenth century, he proposed that the aim of science is the improvement of man's lot on earth, and for him that aim was to be achieved by collecting facts through organized observation and deriving theories from them. Since then, Bacon's theory has been modified and improved by some and challenged in a fairly radical; way by others. An historical account and explanation of developments in the ·philosophy· of science would make a very interesting study. For instance, it would be very interesting to investigate and explain the rise of *logical positivism*, which began in Vienna in the early decades ot this century, became very popular and still has considerable influence today..[1]

مغربی سائنس اور فلسفے سے مرعوبیت: جدیدیت پسندوں کا المیہ:

مغرب، آئن اسٹائن اور برگساں سے ہمارے متجددین کی عقیدت کا عالم یہ ہے کہ وہ جنگ عظیم اول کے بعد یورپ کے ملبے سے اٹھنے والی نئی مغربی تہذیب کے دھوئیں میں نئے آدم، جدید دنیا اور ایک نئی زندگی کے طلوع کے آثار دیکھ رہے ہیں، ارسطو سے لے کر کانٹ تک انسان کے دماغ کی صرف چودہ کیٹیگریز [categories] تسلیم کی گئی ہیں، یعنی انسان ازل سے آج تک ایک ہی ہے، ہیگل

---

1. Ibid., pp.xvi-xviii.

کے خیال میں ذہن انسانی کی ۱۰۵ کیٹگریز ہیں، اور ہر نئے عہد کا انسان پچھلے عہد کے مقابلے میں زیادہ عقل مند اور زیرک ہوتا ہے، اس تصور کی پیروی کے باعث جدیدیت پسندوں کے ذہن میں یہ واہمہ پیدا ہوگیا کہ اس عظیم تہذیب کے نتیجے میں فلسفے اور سائنس کے ذریعے عہد حاضر میں ایک محیرالعقول نیا انسان کھڑا ہوگیا ہے، ہیگل کے جدلیاتی نظریۂ تاریخ نے عہد حاضر پر غیر معمولی اثر ڈالا ہے، یہ حضرات ہیگل کے اثر کی گرفت سے کبھی اوپر نہ اٹھ سکے لہٰذا جدید انسان کا تصور ان حضرات کے یہاں ہیگل کے Historicism کی خاک سے برآمد ہوتا ہے، تاریخ کے اس جدلیاتی تصور کے مطابق انسانی تاریخ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے ہر اگلا دور پچھلے دور سے بہتر ہے اور ہر نیا انسان گزشتہ دور کے انسان سے زیادہ بہتر، زیادہ عقل مند اور زیادہ زیرک ہے، Thesis اور Anti Thesis کے نتیجے میں Synthesis برآمد ہوتا ہے اس کے ذریعے تاریخ کا پہیہ رواں دواں رہتا ہے تاریخ کا قدیم تصور کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے یا تاریخ کا عیسوی مذہبی تصور درست نہیں ہے، تاریخ کے اس جدلیاتی عمل کے ذریعے انسان مسلسل رفعتوں کی تلاش میں ہے، اسے بلندی، عروج، اقبال اور ترقی عطا ہو رہی ہے اور وہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں، جیسے جیسے تاریخ آگے بڑھتی ہے ذہن، عقل، انسانی پختگی، بلندی، عظمت حاصل کرتی چلی جاتی ہے۔ Anti thesis کے نتیجے میں پتا چل جاتا ہے کہ گزشتہ زمانے کا سچ اب سچ نہیں رہا اس سچ کی خامیاں، کمزوریاں اور عیوب تاریخ کے اگلے دور میں واضح ہو جاتے ہیں تاریخ کے اس ارتقا کے نتیجے میں نہ صرف عقل اور ذہن، کا ارتقا ہوتا ہے بلکہ نئے نئے ادارے، نئے نئے طریقے نئی نئی ایجادات وجود میں آتی ہیں اور انسان مسلسل ارتقا کی جانب رواں دواں رہتا اور فتوحات کے پرچم اڑاتا چلا جاتا ہے Hegelian Evolution میں ہر اگلا دور پچھلے دور سے بہتر ہے، چنانچہ ہیگل تاریخ کے تمام سابقہ ادوار کو آج کے زمانے سے بدتر قرار دیتا ہے لہٰذا زمین پر انبیائے کرام کے تمام ادوار اور مسلمانوں کے یہاں خیر القرون کا تصور سب غلط اور ناکام قرار پاتے ہیں، عہد حاضر کا انسان چونکہ تمام سابقہ انسانوں سے بہتر، اعلیٰ، ارفع عظیم ہے لہٰذا تمام جدید انسان تمام انبیاء کرام سے بہتر زیادہ عقل مند زیادہ بالغ زیادہ سمجھ دار ہو جاتے ہیں [نعوذ باللہ]۔ لہٰذا عہد حاضر کا انسان تاریخ انسانی کا بہترین انسان ہے۔

جدید تہذیب تاریخ کی سفاک ترین تہذیب:

یہ وہ انسان ہے جس نے تین سو سال میں ایک ارب پچھتر کروڑ لوگوں کو قتل کیا ہے، اس نے تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ غلہ اور خوردنی تیل ۲۰۰۸ء میں پیدا کیا ہے لیکن تاریخ انسانی میں کبھی خوردنی تیل اور غلہ اتنا مہنگا فروخت نہیں کیا گیا، اس عظیم انسان کی حرص حسد و ہوس کے باعث اس بیسویں صدی کے اواخر میں ۷۰ لاکھ لوگ بھوک کے باعث تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو گئے، تاریخ انسانی کی سترہ تہذیبوں میں کبھی کوئی آدمی روٹی سے محروم نہیں رہا لیکن عہد حاضر کا انسان اس لیے روٹی سے محروم ہے کہ غلہ تو بہت ہے مگر خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اگر ہیں تو وہ بہت کم لہٰذا موت اس

کا مقدر ہے۔ عالمی فوڈ اینڈ ایگری کلچر آرگنائزیشن [FAO] کے سربراہ Jacques Diouf نے متنبہ کیا ہے کہ جدید معاشی بحران کے باعث سو بلین افراد اس سال بھوک و افلاس کا شکار رہیں گے۔ چھ میں سے ایک آدمی غذائی اجناس سے محروم رہے گا۔ قحط کی اس ہولناک صورت حال سے بچنے کے لیے New World Food Order کی ضرورت ہے۔ UN ورلڈ فوڈ پروگرام [WFP] کے سربراہ Joselte Sheevan نے یاد دلایا کہ کئی ترقی یافتہ ملکوں میں خوراک کی قلت کے باعث فسادات پھوٹ پڑے ہیں۔ ایک بھوکی دنیا نہایت خطرناک دنیا ہے۔ لہٰذا بھوک کا ازالہ کرنا سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ سو بلین بھوکے افراد کی تعداد منجمد نہیں ہے اس تعداد میں تیزی سے اضافہ کی رفتار دیکھی جا رہی ہے۔ ان سو بلین افراد میں سے ۶۴۲ ملین افراد براعظم ایشیا پیسفک میں پائے جاتے ہیں، ۲۶۵ ملین لوگ افریقہ کے Sub Saharan میں، ۵۳ ملین لاطینی امریکہ اور کیریبین میں اور ۵۲ ملین مشرق وسطیٰ اور مشرقی اور جنوبی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں ۱۵ ملین افراد بھوک کا شکار ہیں۔[1] غذائی اجناس سے محرومی کا سبب اجناس کی کمی نہیں بلکہ اجناس کی قیمتوں میں بلاوجہ صرف اور صرف زیادہ سے زیادہ منافع، جلد سے جلد کمانے کے لیے بے دریغ اضافہ اور لوگوں کی قوت خرید کا ختم ہو جانا ہے۔

خودکشی کی جتنی وارداتیں گزشتہ دس سال میں ہوئی ہیں پوری تاریخ ان وارداتوں سے خالی ہے اس جدید انسان نے فاسفورس بم ایجاد کیا ہے جس کی آگ پانی سے بھی نہیں بجھتی۔ اس انسان نے حیاتیاتی جرثوموں پر مبنی ہتھیاروں، جوہری بموں، اور بے شمار قسم کے اسلحہ کے ذخائر اتنی بڑی تعداد میں جمع کیے ہیں کہ ان ذخائر سے موجودہ دنیا کو سینکڑوں مرتبہ تباہ و برباد کیا جا سکتا ہے، یہ سولائزڈ نیا آدمی [Modern man] اتنا وحشی درندہ، اور خون خوار کیوں ہے؟ اسے کس قوت سے خوف اور خطرہ ہے کہ اس نے اس خطرے سے بچنے کے لیے اربوں ٹن اسلحہ کے ذخائر محفوظ کر لیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کسی سے خائف نہیں یہ اپنی خواہشات نفس کی تکمیل کے لیے تسخیر کائنات چاہتا ہے جو اسلحہ کے بغیر ممکن نہیں، دنیا بھر میں جنگیں اسی تسخیر کائنات کے اصل ہدف کا ہلکا پھلکا اظہار ہیں۔ اس انسان نے دنیا میں ایسی ہلاکت خیز چیزیں ایجاد کی ہیں کہ پوری کائنات ان ایجادات سے مسلسل خطرے میں ہے، عہد حاضر کا انسان تاریخ کا خبیث ترین انسان ہے جو بچے بیچ رہا ہے، بچے خرید رہا ہے، انسانی تعلقات، رشتے اور اشیا [comodities] میں بدل رہا ہے، صرف ایک قدر ہے سرمایہ Capital ہر شئے اس پر کسی جانچی اور پرکھی جا رہی ہے، باپ بیٹی بہو، ساس، سالی، پوتی سے جنسی تعلقات قائم کر رہا ہے، بھائی بہن کی آبرو لوٹ رہا ہے۔ ماں بیٹے اور نواسے سے منہ کالا کر رہی ہے۔ مغرب میں محرمات سے جبراً اور بالرضا جنسی تعلق ایک عام بات ہے۔ یہ آزادی کی قدر [Value] کا نتیجہ ہے جب مساوات کے فلسفے کے تحت سب برابر ہیں کوئی فرق نہیں تو اجنبی عورت سے تعلق قائم کرنے کی زحمت اٹھانے، خطرناک جنسی

---

[1] DAWN, AFP، ۱۹ جون ۲۰۰۹ء۔

بیماریاں سمیٹنے اور ناز برداری کے لیے پیسے خرچ کرنے کے بجائے گھر میں میسر انواع واقسام کی نسوانی نعمتوں سے کیوں استفادہ نہ کیا جائے؟ ہمارے جدیدیت پسند مفکرین کہتے ہیں کہ بنیادی حقوق کی شق آزادی اور مساوات اسلام میں بھی ہے۔عورت عورت سے شادی کررہی ہے، مرد مرد کے قانونی جوڑے بن رہے ہیں، عورت پر تیزاب پھینکا جارہا ہے، بچے پیدا کرکے سڑکوں پر پھینکے جارہے ہیں، دوسری شادی قانونی طور پر ممنوع ہے، لیکن ہزاروں عورتوں سے ناجائز تعلقات رضامندی سے رکھے جائیں تو یہ بالکل درست ہے، مغرب میں کسی شوہر یا بیوی کا ایک دوسرے سے حق زوجیت کی ادائیگی کے لیے جبر بہت بڑا ظلم اور ناقابل معافی جرم ہے، یہ جرم [Marital Rape] اور hidden hurt بھی کہلاتا ہے جس کی سزا بہت سخت ہے۔ بعض ممالک میں سات سال قید۔ Marital Rape، کو بعض لوگ Statutory Rape، Partner Rape اور Intimate Partner Sexual Assualt [ISPA] سے خلط ملط کردیتے ہیں، زنا کی یہ اقسام الگ الگ جرائم ہیں جس کی تفصیل اس موقع پر مناسب نہیں۔ نکاح شدہ زانی وزانیہ کے جرم زنا کی اصطلاح مغرب میں Spousal Rape کہلاتا ہے۔ یہ وہ مغرب ہے جہاں بغیر نکاح ناجائز تعلقات کو آزادی [freedom]، لذت [pleasure]، مزہ، چٹخارہ، بنیادی حق قرار دیا جاتا ہے۔ یہ آزادی کی انتہا ہے دوسری جانب شر پسندی کا یہ عالم کہ اگر کوئی شادی شدہ اپنی خواہش نفس جائز طریقے سے پوری کرنے کے لیے اپنے جیون ساتھی کی مرضی کا خیال نہ رکھے کچھ بے صبری، جبر، زور، عجلت اور غصے کا مظاہرہ کردے تو اسے Rape زنا کہا جاتا ہے۔ یہ فلسفۂ زنا آزادی [freedom] فلسفہ بنیادی مساوات [Equality] اور جسم میری ملکیت [body is my property] اور میں ہوں فاعل خودمختار [self autonomus being] اور میری زندگی کا مقصد Human being is a pleasure seeking animal کے آمیزے اور آمیختے سے کشید کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب میں نکاح کے بغیر زنا کاری آسان ترین مگر نکاح کے بعد جائز ازدواجی تعلق مشکل ترین اور نکاح کی موجودگی میں زندگی کے شریک سفر مذکر ومونث کو اس کی رضا کے بغیر طلب کرنا زنا کاری جیسا بدترین جرم ٹھہرا۔ تاریخ انسانی میں ایسی ذلیل ترین تہذیب کبھی پیدا نہیں ہوئی جس نے نکاح کے ادارے کو اس طرح برباد کیا ہو۔ اسی لیے رد عمل میں مغرب میں عورتوں مردوں نے شادی کرنا ترک کردیا کیونکہ شادی کا مطلب مصیبت، آفت اور قانون کی یلغار کے سوا کچھ نہیں لہٰذا مغرب میں خاندان کا ادارہ ہی تحلیل ہوگیا۔

Marital Rape کا یہ تمام قصہ آزادی اور میری مرضی کے تصور سے وابستہ ہے۔ یعنی ہر فرد آزاد ہے۔ لہٰذا کوئی کسی کی آزادی میں مداخلت نہیں کرسکتا نہ شوہر بیوی کی، نہ باپ بیٹی کی، نہ ماں بیٹے کی حتیٰ کہ آپ اپنے چھوٹے بچے کی مرضی اور ارادے کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتے۔ آپ کی آزادی صرف آپ کی ذاتی زندگی [private life] تک محدود ہے یہ ذاتی زندگی صرف آپ سے شروع ہو کر آپ پر ختم ہو جاتی ہے آپ کے سوا دوسرا جو بھی ہے وہ ایک الگ وجود [other being] ہے اس

کی اپنی ذاتی زندگی [own personal life] ہے جسے بنیادی حقوق کے فلسفے کے تحت آپ کی دستبرد، دسترس، رسائی، اثر اندازی اور جبر سے محفوظ کر دیا گیا ہے، کیونکہ دنیا کے تمام ماں باپ اور بزرگ بلاتفریق جابر ہوتے ہیں لہٰذا بچوں کو بھی اس جبر سے محفوظ کیا گیا ہے دوسرے لفظوں میں پرائیویٹ لائف کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ خود اپنی خلوت اور جلوت میں جو چاہیں کریں بشرطیکہ یہ آزادی دوسرے کی انفرادی آزادی میں حائل نہ ہو اور سرمایہ دارانہ نظام کے عقائد سے متصادم نہ ہو تو آپ ایسی محدود نجی پرائیوٹ زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ہیں لیکن private sphere یعنی آپ کی ذاتی زندگی میں آپ کی بیوی بچے گھر والے شامل نہیں، آپ کے سوا جو کوئی فرد ہے وہ Public یعنی other میں آجاتا ہے، اسی کا نام انفرادیت پرستی [Individualism] ہے مغرب میں آزادی صرف فرد کی ہوتی ہے کسی اجتماعیت، گروہ اور قبیلے کی نہیں ہوتی یہ آزادی کسی اجتماعیت کے خلاف بغاوت کے لیے مہیا کی جاتی ہے تاکہ ہر فرد تنہا، منفرد اور آزاد ہو جائے، اجتماعیتیں تحلیل ہو جائیں لہٰذا ریاست ہر تصور خیر، اجتماعیت گروہ کے خلاف فرد کی جانب سے کسی بھی قسم کی بغاوت کی آزادی کو مکمل تحفظ فراہم کرتی ہے جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ تمام اجتماعیتیں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ حتی کہ خاندان بھی نہیں بچتا، اگر آپ بچے، بیوی اور شوہر کی آزادی میں مداخلت کریں یعنی اس کی غیر اخلاقی سرگرمیوں پر روک ٹوک کریں، پابندیاں عائد کریں تو یہ مغرب میں قابل دست اندازی پولیس جرم [public sphere crime] ہے جس میں قید اور جرمانہ کی سزائیں شامل ہیں، لہٰذا باپ اپنی بیٹی سے نہیں پوچھ سکتا کہ تم رات بارہ بجے کہاں سے آرہی ہو، نہ چھ سال کے بیٹے سے پوچھ سکتا کہ تم رات کو کہاں جا رہے ہو؟ کیوں کہ فرد کی یہ نام نہاد ظاہری آزادی بھی ریاست کی جانب سے طے شدہ اصول و قواعد و ضوابط کے دائرے کے تحت نہایت محدود طور پر حاصل ہے۔ اس آزادی کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، بنیادی حقوق کے منشور میں مذہبی آزادی کا تحفظ دیا گیا ہے۔ لیکن اجتماعی نہیں صرف ہر فرد کی ذاتی مذہبی آزادی جو اسی طرح روبہ عمل آئے کہ دوسرے کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں جس طرح فرانس میں اسکارف، صلیب، کرپان، پگڑی پر اس لیے پابندی لگائی گئی کہ دوسروں کی آزادی متاثر ہو رہی تھی آزادی کے اسی فلسفے کی وسعت کے بعد مذہبی عبادت گاہوں کا طرز تعمیر بدل دیا جائے گا اذان کی اجازت نہ ہوگی اس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے، مصر میں فجر کی اذان مسجد کے اندر ہی جا سکتی ہے باہر اہل محلّہ کو سنائی نہیں جا سکتی، ڈیفنس سوسائٹی کے بعض علاقوں میں یہی صورت حال ہے، دوسرے لفظوں میں آپ کی وہ محدود ترین مذہبی آزادی آپ کو صرف اس حد تک حاصل ہوگی بشرطیکہ وہ بنیادی حقوق کے منشور کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً آپ مذہبی آزادی کے تحفظ سے اس خوش فہمی کا شکار نہ ہوں کہ آپ کو مغرب میں چار شادیوں کی اجازت ہوگی نہ آپ بچے کو سات سال کی عمر میں جبراً نماز پڑھوا سکتے ہیں، نہ آپ اپنی بیوی سے اس کی مرضی کے بغیر اظہار مواصلت و موانست کر سکتے ہیں، نہ آپ اپنے بچوں کی آوارگی پر کوئی قدغن لگا سکتے ہیں، نہ بچوں کو جبراً قرآن پڑھا سکتے ہیں، آزادی کا مطلب صرف آپ کی محدود ترین آزادی صرف آپ کے لیے ہے۔ اگر آپ نے اس ذاتی آزادی کو دوسرے

[other] یعنی اپنے سوا کسی پر بھی خاندان، قبیلہ، بچوں پر نافذ کرنے کی کوشش کی یعنی پبلک آرڈر میں مداخلت کی تو آپ کی آزادی سلب کر لی جائے گی۔

زنا کی ایسی رنگا رنگ اقسام سات ہزار سال کی انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ دنیا کے ایک سو چار ممالک میں جیون ساتھی کی رضا کے بغیر اس کے نفس کو طلب کرنے والا خواہ مذکر ہو یا مونث مجرم قرار دیا گیا ہے، صرف چار ممالک ایسے ہیں جہاں اس جرم کی سزا اس وقت دی جا سکتی ہے جب میاں بیوی قانونی طور پر علیحدگی اختیار کر لیں۔ ۳۲ ممالک میں نکاحی زنا ایک خاص قسم کا جرم ہے۔ بہتر [۷۲] ممالک میں یہ زنا کے عام قوانین کے تحت جرم زنا تصور کیا جاتا ہے۔ تاریخ انسانی میں ہمیشہ زنا کا مرتکب مرد ہوتا تھا، لیکن مغربی قوانین کے تحت زنا کا ارتکاب عورت بھی کر سکتی ہے۔ اس بے تکی منطق [abnormal logic] پر مغرب میں مسلسل احتجاج ہو رہا ہے لیکن کوئی اثر نہیں، مرد عورت زنا کے الزام میں ایک دوسرے کے خلاف مقدمات دائر کر سکتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ اس ذلیل معاشرت سے خالی ہے کہ عورت یا مرد اپنے جیون ساتھی کو صرف اس بات پر رشتہ نکاح سے علیحدہ کر دے یا قانون کے ذریعے جیل بھجوا دے کہ مجھے میری رضا، خواہش، طلب، آرزو، کے بغیر کیوں طلب کیا گیا اور بلا رغبت مجھ سے لذت کیوں حاصل کی گئی؟ اس جبلی، فطری حاجت، خواہش، ضرورت اور طلب کو اپنے گھر میں اپنی زندگی کے شریک سفر سے غصے یا جبر سے پورا کرنا جرم ٹھہرا۔ اس کا نام مغرب میں رواداری [tolerance] ہے اس کو درگزر، صبر، عفو کہا جاتا ہے۔ قوت برداشت اور صبر کی صفات سے عاری یہ تہذیب اور اس کے دانشور دنیا کو tolerance کا سبق دے رہے ہیں۔ فی الحقیقت اس اصطلاح tolerance کا یہی مطلب یعنی اپنے سوا کسی کو برداشت نہ کرنا اپنی خواہش کے لیے دوسروں کی خواہشات حتیٰ کہ شوہر اور بیوی کے مبارک ترین رشتوں کو بھی قربان کر دینا ہے جس پر مغرب میں عمل کیا جا رہا ہے، اس کے سوا اس اصطلاح کا کوئی دوسرا مطلب نہیں، آزادی کی راہ میں جو جذبہ، رویہ، طریقہ، قانون، شریعت، وحی یا روایت حائل ہوگی اس کو ختم کرنا فلسفۂ آزادی اور tolerance کے تحت ایک لازمی فریضہ ہے جب مغرب اس پر عمل کرتا ہے تو ہمارے اسلامی مفکرین کہتے ہیں کہ یہ اپنے اصول پر عمل نہیں کر رہا اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ یہ نقطہ نظر مغرب کے فلسفے سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ Russel, Diana E.H. کی کتاب [Macmillan 1990] *Rape in Marriage.* کے مطابق:

That rape in marriage was the most common yet most neglected area of sexual violence.

اسی سلسلے میں David Finkelhor اور Kersti yllo کی کتاب: *License to Rape,* [New York: Free Press, 1985] کی نادر اور ''شاہکار تحقیق'' کے مطابق:

10 to 14 percent of all married American women have been or will be raped by their husbands.

یہ عجیب تہذیب ہے کہ اگر مغرب کے کسی گھر میں کوئی نیک لڑکا یا نیک لڑکی صنف مخالف سے تعلق استوار نہیں کرے اور زنا کارزندگی سے پرہیز وگریز کرے تو ان کو ''ابنارمل'' قرار دے کر سائیکاٹرسٹ کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور اسی مغرب میں جب ایک شادی شدہ جوڑا ایک دوسرے سے اپنے فطری تقاضے پورے کرنے میں کچھ تجاوز کرے تو اس حلال تعلق کو مغرب زنا کاری کے قبیح ترین جرم کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ایسی بلندی اور ایسی پستی تاریخ انسانی کی کسی تہذیب کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کے باوجود مغرب کو ناز ہے کہ تاریخ کا سفر اس کی تہذیب پر اختتام پذیر ہو گیا ہے اور یہی تہذیب دنیا کی بالا، برتر اور اعلیٰ ترین تہذیب ہے جس مغرب کی سفاکی کا یہ عالم ہے اسی مغرب میں باہم رضامندی سے ہزاروں عورتوں کے ساتھ شب وروز زنا کاری عین حق اور خیر ہے، ماں باپ نرسنگ ہوم میں پھینکے جا رہے ہیں، مرد کے خراٹے لینے پر عورتیں طلاقیں لے رہی ہیں، بیوی بیٹے بیٹی کی شکایت پر باپ کو عدالت میں طلب کیا جا رہا ہے باپ کی شکایت پر ماں بیوی بیٹے کے خلاف پولیس مقدمات درج کر رہی ہے، ایک گھر میں آزادی مساوات Freedom & Equality کے خوبصورت نام پر ایک چھت کے نیچے متحارب فریق، دشمنوں کی نسل جمع ہے اس حالت میں گھر کا ادارہ کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ جب محبت، اعتماد، قربانی، درگزر اور عفو اور رحمت کی روایات باقی نہ رہیں، جب تعلق قانونی ہو جائے اور کسی بھی وقت کسی کو ایک فون کے ذریعے سزا اور قید کے شکنجے میں کسنا ممکن ہو تو خوف کے زیر اثر محبت، تعلق اور مودت پیدا نہیں ہو سکتی، وہاں رشتے ٹوٹ کر رہتے ہیں مغرب میں اس لیے خاندان تحلیل ہو گیا۔ مغرب کی عورت اپنے بچوں کو فرائی پین میں تل رہی ہیں، ڈیزی کٹر بم کے ذریعے بستیاں برباد کی جا رہی ہیں، کیمیائی جراثیم، کیمیائی ہتھیاروں سے لاکھوں آدمی ہلاک ہو رہے ہیں، جدید صنعتوں کی تیار کردہ مصنوعات کے زہر اس کے دھوئیں اس کی آلودگی سے اربوں مخلوقات برباد ہو رہی ہیں۔ ایسے انسان کو جدید، عالم، قابل اور بہترین شعور کا حامل قرار دینا جاہلیت جدیدہ ہے اس ذلیل انسان کا موازنہ خیر القرون یا سابقہ ادوار سے کرنا شرمناک جہالت ہے۔

فلاسفہ یونان اور دیگر بڑے فلاسفہ کا خیال تھا کہ عقلی اصول آفاقی ہوتے ہیں، لہٰذا ان عالمگیر عقلی اصولوں کی روشنی میں آفاقی قوانین اور عالمگیر اخلاقیات مرتب کی جا سکتی ہیں، لیکن ہیگل کے جدلیاتی تصور تاریخ کی مقبولیت، ڈارون کے نظریہ ارتقا کی قبولیت اور آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت کے نتیجے میں اضافیت [Relativity] کے فلسفے کی اثر پذیری کے بعد مغرب میں خیر کا تصور ایک باطل، لغو اور بے کار ناقابل قبول تصور قرار پایا کہ چیزیں ارتقا اور اضافیت کے ذریعے آگے بڑھتی ہیں، لہٰذا خیر و شر کچھ نہیں ارتقا کا سفر خیر و شر کے معنی و مفہوم بدلتا رہتا ہے جس شے اور علم میں ارتقا ممکن نہیں وہ علم جامد بے کار اور لایعنی ہے لہٰذا حرکت اور ارتقاء ہی خیر الحق قرار پائے۔ اضافیت کے فلسفے کے عروج کے باعث چیزوں کی اصل حقیقت کچھ نہیں رہی۔

ہیگل کا جدلیاتی نظریہ: اثرات و نتائج:

ہیگل کے فلسفے کے بعد عقلیت کی اساس پر آفاقی اصولوں کا دعویٰ بھی عقل کی بنیاد پر رد ہو گیا

کیونکہ عقل تو ارتقا کے ذریعے مسلسل تغیر پذیر ہے۔ اس اصول کے تحت ہیگل کا نظریۂ ارتقاء بھی رد ہونا چاہیے کہ یہ بھی ہیگل کے زمانے کا سچ تھا اب زمانہ آگے بڑھ گیا ہے، عقل کو منہاج، معیار، پیمانہ اور کسوٹی بنانے کے باوجود اس تغیر پذیر عقل سے کوئی حتمی، ابدی، قطعی اور مطلق اصول نہیں نکالا جا سکتا چونکہ ذہن انسانی اور عقل انسانی مسلسل بدل رہے ہیں لہٰذا ہر دور کا سچ صرف اس دور کے لیے سچ ہوگا انصاف، عدل، ایمان، نیکی، شرافت، سماجی انصاف خیر و شر سب اپنی تاریخ اور اس تاریخ میں تشکیل و تخلیق پانے والی عقل سے نکلیں گے، لہٰذا عالمگیر اصول اخلاقیات ماورائے تاریخ نہیں ہوں گے، تاریخ اور وقت بدلتے ہی یہ اصول بھی بدل جائیں گے ہر گزرے ہوئے دور کا سچ حق خیر اس دور کے گزرتے ہی ہمیشہ کے لیے گزر جائے گا، ہیگل کے اس تصور کا جدید اسلامی مفکرین پر بہت گہرا اثر پڑا ہے ان حضرات نے اپنی تالیفات میں جگہ جگہ ہیگل کے جدلیاتی تصور کی غلط سلط مذہبی تعبیریں پیش کی ہیں، یہ حضرات اس کام کے اہل نہیں ہیں، کیوں کہ ان کی اکثریت، اِلّا ماشاء اللہ، عربی زبان سے واقف ہے اور نہ ہی اُنھیں علوم اسلامیہ پر عبور حاصل ہے لیکن اس کم علمی کے باوجود ہیگل کے تصورات کو اختیار کرتے ہوئے انھوں نے ختم نبوت کے عقیدے کی عقلی، فکری، منطقی اور اسلامی توجیہہ یہ کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخر میں اس لیے تشریف لائے اور قرآن پر تمام صحف سماوی کا اختتام اس لیے ہوگیا کہ عقل انسانی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ اب انسان کو ''پیغمبر باطن'' کے بعد کسی ''پیغمبر ظاہر'' کی بیساکھی کی ضرورت نہیں رہی۔ عقل، فرد، تاریخ، زمانہ اور معاشرہ اپنے عروج کو پہنچ گئے۔ تاریخ کا سفر اختتام پذیر ہوگیا۔ انسان بلوغت کی منزل میں داخل ہوگیا۔ لہٰذا نبوت کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔ اس ادارے کی ضرورت ہی نہیں رہی لہٰذا نبوت ختم ہوگئی۔ دوسرے معنوں میں ہر فرد کو حاصل عقلی کمال کے باعث اب کسی کمال یافتہ شخص کی ضرورت زمانے کو باقی نہ رہی۔ اب ہر شخص صاحب کمال ہے عقل اس مقام پر آگئی کہ ہر فرد بشر اور انسان عقل کی روشنی میں خود کفیل ہوگیا، عقل کی یہ روشنی تاریخ کے کسی انسان کو اس طرح حاصل نہ ہوئی لہٰذا اب پیغمبر کی ضرورت ہی نہیں رہی جب تک انسان کی عقل بلوغت سے محروم تھی اس کے ''پیغمبر باطن'' [Prophet of innerself] کی اصلاح کے لیے ''پیغمبر ظاہر'' کی ضرورت پڑتی رہی لیکن اب روشنی رہنمائی، دستگیری کے لیے ہمارا پیغمبر باطن جو ہمہ وقت ہمارے ساتھ ہے، یعنی عقل، ہمارے لیے کافی ہے اسی تصور کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کے لیے بدلی ہوئی شریعت بدلی ہوئی مذہبیت درکار ہے کیونکہ عہد حاضر کا انسان رسالت مآبؐ کے دور سے بہتر اور زیادہ عقل مند ہے۔ بلکہ صاف لفظوں میں یہ انسان رسالت مآبؐ اور صحابہ کرامؓ سے بھی افضل، برتر فائق، قابل اور عاقل [نعوذ باللہ] ہے کیونکہ اس کے تجربات اور مطالعات کا دائرہ خیر القرون سے زیادہ وسیع ہے لہٰذا یہ علم ہی اصل سند ہے۔ اس علم، ارتقا، اور فضیلت کے باعث بعد میں آنے والا ہر انسان، زمانہ اور عقل پچھلوں کی خامیاں بہتر طور پر بتا سکے گا اور ان کے عیوب پہچاننے کی صلاحیت کا حامل ہوگا اس فلسفے سے یہ

بھی معلوم ہوا کہ پیچھے رہ جانے والا زمانہ لازماً غلط ہوگا غلطی کرے گا، آئندہ زمانوں میں آنے والا انسان ،انبیائے کرام اور صحابہ عظام کی خامیاں اور غلطیاں دریافت کرے گا کیونکہ عہد سابق کے لوگ اس دور جدید کے انسان سے کمتر تھے ان کا علم، تجربہ اوران کے ادارے سب کمتر تھے کیونکہ وہ تاریخ کے ابتدائی دور میں پیدا ہوگئے اور تجربات کے ذریعے عقلی ارتقا کی نعمت سے محروم رہے اس تصور تاریخ کے نتیجے میں خیر القرون کی طرف مراجعت ناممکن ہوجاتی اور ماضی کی طرف لوٹنے کے ہر عمل اور اقدام کی زبردست علمی اور عملی مزاحمت پیدا ہوتی اپنی سابقہ تاریخ سے شرم آتی اور اپنی روایات، تاریخی آثار اور تاریخی شخصیات سے گھن آنے لگتی ہے جس کے نتیجے میں ہیگل کے حرکیاتی نظریے کی تصدیق وتوثیق ممکن ہوتی ہے، عہد حاضر کے جدیدیت پسندوں کا المیہ یہی ہے، اس المیے کے نتیجے میں جو رویہ جنم لیتا ہے وہ یہ کہ مغربی تہذیب آفاقی، عالمی، قطعی اور ابدی سچائی ہے یہ عین حق بلکہ الحق ہے۔ لہٰذا اس کے بنائے ہوئے ادارے، اس کا مہیا کردہ علم، اس کی تخلیق کردہ تہذیب اقدار روایات خیر القرون سے لازماً بہتر ہیں لہٰذا اس جدید تاریخ کے مطابق قدیم شریعت کو ڈھال دیا جائے۔ ان ہی تصورات کا نام اسلامی جدیدیت، نوافلاطونیت، مغربیت، اسلامی مادیت، اور اسی الحاد کا نام عہد حاضر میں جدیدیت پسند اسلامی مفکرین نے اجتہاد رکھ دیا اقبال کے الفاظ میں یہ ''اجتہاد'' ع مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ۔

اس قسم کے خیالات متجددین کی سائنس اور فلسفے سے ادھوری واقفیت یا کم از کم بے پناہ مرعوبیت کو واضح کرتے ہیں۔ یہ حضرات مغرب میں کلیسا اور جدید سائنس کی کشمکش کی تاریخ اور اس کے حقیقی تناظر سے ناواقف ہیں، انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کیتھولک ازم کی مخالفت میں تحریک اصلاح کے فروغ کے نتیجے میں عیسائیت کی علمی حیثیت کو مختلف خطرات درپیش ہوگئے تھے، عیسائی یونانی سائنس اور جدید سائنس میں تصادم کے باعث مذہبی مقتدرہ کی حیثیت سوالیہ نشان بن گئی تھی، گیلی لیو کی دوربین نے زمین کو حرکت کرتے ہوئے دکھا دیا تھا عیسائیت کے عقائد اپنی بنیادوں کو ہلتا ہوا محسوس کر رہے تھے، عیسائیت جو کئی صدیوں تک چرچ فادرز کے عقلی دلائل سے فروغ پاتی رہی تھی اس کے عقلی دلائل اب اس کا دفاع کرنے سے قاصر تھے، کیونکہ عقلیت اپنی تاریخ تہذیب زماں و مکاں میں محصور ہوتی ہے اس سے اوپر نہیں اٹھ سکتی، لیکن وحی کی عقلیت زماں و مکاں سے ماورا ہوتی ہے وہ ہر دور کا سچ ہوتی ہے، جدید سائنس عیسائیت پر سایہ فگن قدیم سائنس کو شکست دے رہی تھی لہٰذا پروٹسٹنٹ ازم کے زیر اثر پوپ سے چھٹکارا پانے اور عیسائیت کی مذہبی مقتدرہ کی بنیادیں ہلانے کے لیے کتاب فطرت [Book of Nataure] کے ذریعے خالق فطرت [God] کو دریافت کرنے کا دعویٰ کیا گیا کہ کتاب فطرت کو پڑھنے کے لیے کتاب الٰہی [Book of God] کافی نہیں اس کے لیے سائنسی علم کی ضرورت ہے کیونکہ سائنسی علم معروضی [objective] ہے ہر کوئی ہر جگہ یکساں طریقے سے اسے حاصل کرسکتا ہے، یہ کسی مقصد اور ہدف کا تعین نہیں کرتا بلکہ صرف اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ اشیاء اس کائنات میں کس طرح وجود میں

آتی ہیں، کس طرح کام کرتی ہیں How things happen in the world یہ علم اس سے بحث نہیں کرتا کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں، یہ مقصدیت [purpose] سے ماورا ہے، یہ علم غیر جانبدار Value Neutral ہے یہ نقطۂ نظر Positivism کے نام سے علم کی دنیا میں معروف ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے آندھی طوفانِ برق و باد کی طرح اس عہد کے پورے علمی نظریات پر چھا گیا [یہ دعویٰ بھی محض مفروضہ تھا حقیقت کا اس دعوے سے دور کا تعلق بھی نہ تھا لیکن اٹھارہویں صدی میں اس پر ایمان قائم تھا اس دعوے کی حقیقت آگے کے صفحات میں آرہی ہے]۔ اٹھارہویں صدی تک تمام بڑے فلاسفہ کا خیال یہی تھا کہ سائنسی تجربات مشاہداتِ علم کے ذریعے تلاش حقیقت [Discovery of Truth] ممکن ہے۔ سائنٹفک میتھڈ کے باطن میں مستور Positivism کو آفاقی، غیر اقداری اور مؤثر تسلیم کر لیا گیا۔ Positivistic اور Naturalistic فکر کے زیر اثر سائنسی علم کی آفاقیت اور اہمیت علمی حلقوں میں ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر قبول کر لی گئی ڈیکارٹ، اسپنوزا، لائبنز، کانٹ، ہیگل، فختے اور مارکس تک سائنسی طریقۂ کار کو نہایت اہمیت دیتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے آتے آتے سائنس کا یہ گرد و غبار باقی نہ رہا ہزرل نے اس گرد و غبار کو صاف کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اس نے سائنسی طریقۂ کار [سائنٹفک میتھڈ] کی عالمگیریت کے غیر علمی اور غیر عقلی دعووں کو یوروپین سائنس کے ایک عظیم بحران کے طور پر دیکھا، اپنے فلسفہ مظہریات [Phenomnology] کے ذریعے اس نے سائنسی طلسم میں مضمر خطرات کی علمی نشاندہی اپنی کتاب: *The Crises of European Sciences and Transcendental Phenomenology: An Introduction to Phenomenological Philosophy*,[Evanstn: Northwestern University Press,1970.] میں کی، ہزرل کے اس تاریخی جملے کی گونج آج بھی علمی حلقوں میں سنائی دیتی ہے جو اس نے آج سے ایک صدی پہلے کہا تھا:

"نیچرل ازم اور پازیٹو ازم [یعنی سائنس، سائنسی علم، سائنٹفک میتھڈ کی عالمگیریت کے دعوے] نے صرف فلسفے کی گردن نہیں کاٹی بلکہ سائنس کی گردن بھی کاٹ دی"۔

ہزرل کی کتاب نے مغربی، یورپی سائنسی علم کی آفاقیت معروضیت اور مرعوبیت کو سوالیہ نشان بنا دیا اور اسے آفاقی علم کے بجائے ایک خاص تاریخ تمدن تہذیب ثقافت خاص زماں و مکاں سے ابھرنے والے علم کے طور پر دیکھا اس کے شاگرد ہائیڈیگر نے ۱۹۲۶ء میں *The Question Concerning Technology in Martin: Heidegger's Basic Writings*,[Ed.,David Farrell Krell,New York: Harper Collins Publications, 1970.] لکھ کر سائنس کے بارے میں بہت سے نئے سوالات پیدا کر دیے اور ان خطرات کی نشان دہی کر دی جو اگلے پچاس برسوں میں ایک حقیقت بن کر سامنے آئے، ہزرل اور

ہائیڈیگر کے ان مطالعات کے باعث سائنسی علم کی عظمت اور وقعت شدید طور پر متاثر ہوئی، انیسویں صدی سے لے کر آج تک مغرب کے کسی بڑے فلسفی نے سائنس کے ذریعے تلاش حقیقت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ مختصر لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے بعد مغرب کے تمام فلسفی سائنس کے ذریعے تلاش حقیقت کے دعوے سے دستبردار ہو گئے، بیسویں صدی کے تمام فلاسفہ scienticization کے زبردست مخالف ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ آزادی [freedom] کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

دوسرا باب

سائنس کیا ہے؟

جدیدیت پسند بتائیں گے یا سائنس دان؟

سائنس کیا ہے اور کیا نہیں؟ اس کو سمجھنے، جاننے اور جانچنے کے لیے ہمارے پاس پیمانہ، معیار، منہاج، اصول، قدر، کسوٹی، فرقان، برہان اور میزان جدیدیت پسندوں کے افکار و خیالات نہیں بلکہ مغرب کے وہ سائنس داں فلسفی اور فلاسفہ ہیں جو سائنسی علوم کی نظری، عملی اور مابعدالطبیعی اساسیات سے واقف ہیں، سائنس جن کے علم و تجربے، رویے اور تہذیب و تاریخ کا رواں دواں حصہ ہے۔ وہ فلسفی اور سائنس داں سائنس کے بارے میں کیا کہتے ہیں اصل چیز ان کا بیان ہے، افسوس کہ متجددین نے سائنس کی من پسند تشریحات قوم کے سامنے پیش کی ہیں کیوں کہ وہ جس سائنس سے مرعوب و مغلوب، مفتوح و مضروب اور مجروح و مقتول ہیں، اس سائنس کے خلاف مغرب میں اتنا کچھ لکھ دیا گیا ہے کہ اسے اس مختصر زندگی میں پڑھنا ممکن نہیں۔ سائنس کبھی قطعی، حتمی اور حقیقی علم مہیا نہیں کرتی وہ کسی جزو کا بھی جزوی علم دیتی ہے۔ اس صدی کا آئن اسٹائن اور نوبل پرائز یافتہ سائنس داں فائن مین [R. P. Feynman] میں لکھتا ہے:

Each piece, or part, of the whole of whole nature is always merely an *approximation* to the complete truth, or the complete truth so far as we know it. In fact, everything we know is only some kind of approximation, because *we know that we do not know all the laws* as yet. Therefore, things must be learned only to be unlearned again or, more likely, to be corrected. The principle of science, the definition, almost, is

the following:

The test of all knowledge is experiment. Experiment is the *sole judge* of scientific" truth." But what is the source of knowledge? Where do the laws that are to be tested come from? Experiment, itself, helps to produce these laws, in the sense that it gives us hints. But also needed is *imagination* to create from these hints the great generalizations___to guess at the wonderful, simple, but very strange patterns beneath them all, and then to experiment to check again whether we have made the right guess. This imagining process is so difficult that there is a division of labor in physics: there are *theoretical* physicists who imagine, deduce, and guess at new laws, but do not experiment; and then there are *experimental* physicists who experiment, imagine, deduce, and guess. For example, the mass of an object never seems to change: a spinning top has the same weight as a still one. So a "law" was invented: mass is constant, independent of speed. That "law" is now found to be incorrect. Mass is found to increase with velocity, but appreciable increases require velocities near that of light. A *true* law is: if an object moves with a speed of less than one hundred miles a second the mass is constant to within one part in a million. In some such approximate form this is a correct law. So in practice one might think that the new law makes no significant difference. Well, yes and no. For ordinary speeds we can certainly forget it and use the simple constant-mass law as a good approximation. But for high speeds we are wrong, and

the higher the speed, the more wrong we are.

Finally, and most interesting, *philosophically we are completely wrong* with the approximate law. Our entire picture of the world has to be altered even though the mass changes only by a little bit. This is a very peculiar thing about the philosophy, or the ideas, behind the laws. Even a very small effect sometimes requires profound changes in our ideas.[1]

سائنس جزوی علم دیتی ہے کلی نہیں:

سائنس دان کائنات کو ایک کلیت یا وحدت میں نہیں دیکھ سکتے وہ اس صلاحیت سے قاصر ہیں، وہ کائنات کو مختلف حصوں، خانوں، اجزا اور ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھتے ہیں، لہٰذا وہ کل [whole] کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، فائن مین یہی بات دوسرے انداز سے کہتا ہے:

If our small minds, for some convenience, divide this glass of wine, this universe, into parts—physics, biology, geology, astronomy, psychology, and so on—remember that nature does not know it! So let us put it all back together, not forgetting ultimately what it is for. Let it give us one more final pleasure: drink it and forget it all![2]

اس جزوی علم پر، جو کسی ایک جزو کے بھی نہایت جزوی جُز کا احاطہ کرتا ہے، اس کی بنیاد پر انسانی فطرت اور کائنات کو پہچاننے کا دعویٰ کرنا ایک لغو دعویٰ ہے، خود فائن مین اعتراف کرتا ہے:

In the cells of living systems there are many elaborate chemical reactions, in which one compound is changed into another and another. To give some impression of the enormous efforts that have gone into the study of

---

1. Richard P. Feynman, *Six Easy Pieces: Essentials of Physics Explained by Its Most Brilliant Teacher*, USA: Helix Books,1995,pp.2-3.

2. Ibid., p.67.

biochemistry, summarizes our knowledge to date on just one small part of the many series of reactions which occur in cells, perhaps a percent or so of it.[1]

سائنس کی حقیقت کے متعلق فائن مین کی متذکرہ کتاب کے دیباچہ نگار نے نہایت اہم بات لکھی ہے جو جدیدیت پسند مفکرین کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے:

There is a popular misconception that science is an impersonal, dispassionate, and thoroughly objective enterprise. Whereas most other human activities are dominated by fashions, fads, and personalities, science is supposed to be constrained by agreed rules of procedure and rigorous tests. It is the results that count, not the people who produce them.

This is, of course, manifest nonsense. Science is a people-driven activity like all human endeavor, and just as subject to fashion and whim.[2]

سائنس کا سفر مفروضات اور اندازوں پر منحصر ہے:

قیاس، گمان، مفروضات اور اندازوں کے ذریعے سائنس کا سفر آگے بڑھتا ہے۔ کوئی سائنس داں سائنسی نتائج کو حتمی اور قطعی تسلیم نہیں کرتا۔ Quantum Electro Dynamics جو سائنس کی دنیا میں علم کے سیل رواں کا نیا دروازہ ہے۔ جس کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ یہ نظریہ سائنس کے ہر مسئلے، ہر مشکل کو بیان کرنے اور اصول وقوانین وضع کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سے معاملات اور سائنسی امور میں یہ رہنمائی کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس قانون کی موجودگی کے باوجود بہت سے امور اندازے، قیاس اور گمان پر طے کیے جاتے ہیں۔ کسی سائنس داں کو یہ معلوم نہیں کہ جوہر [Atom] کے مرکز [Nucleus] میں کیا عمل اور ردِ عمل ہو رہا ہے اور اس کی حرکیات کیا ہیں؟

We have a new kind of particle to add to the electron, the proton, and the neutron. That new particle is

1. Ibid.,p.52. 2. Ibid.,p.ix.

called a photon. The new view of the interaction of electrons and protons that is electromagnetic theory, but with everything quantum-mechanically correct, is called Quantum Electrodynamics. This fundamental theory of the interaction of light and matter, or electric field and charges, is our greatest success so far in physics. In this one theory we have the basic rules for all ordinary phenomena except for gravitation and nuclear processes. For example, out of Quantum Electrodynamics come all known electrical, mechanical, and chemical laws: the laws for the collision of billiard balls, the motions of wires in magnetic fields, the specific heat of carbon monoxide, the color of neon signs, the density of salt, and the reactions of hydrogen and oxygen to make water are all consequences of this one law. All these details can be worked out if the situation is simple enough for us to make an approximation, which is almost never, but often we can understand more or less what is happening. At the present time no exceptions are found to the Quantum Electrodynamic laws outside the nucleus, and there we do not know whether there is an exception because we simply do not know what is going on in the nucleus.[1]

سائنس دان تمام سائنسی نظریات، تجربات کے بعد قائم نہیں کرتے، بہت سے سائنسی نظریات، قیاس، گمان، وجدان اور اندازے پر قائم کیے جاتے ہیں جیسا کہ Yukawa نے مختلف ذرات[particles] کے بارے میں پیش گوئی کی تھی جو پوری ہوگئی۔

سائنس تجربات ومشاہدات کے ذریعے آگے بڑھتی ہے لیکن آگے بڑھنے کے باوجود سائنس یہ کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتی:

1. Ibid., p.37.

Whether it is right or wrong but we do know that it is a little wrong or at least incomplete

یہ الفاظ راقم السطور کے نہیں، بلکہ اس صدی کے آئن اسٹائن کے ہیں، ان الفاظ کی تفصیل فائن مین کے الفاظ میں پڑھیے:

It would be impossible to predict exactly what would happen. We can only predict the odds! This would mean, if it were true, that physics has given up on the problem of trying to predict exactly what will happen in a definite circumstance. Yes! Physics has given up. We do not know how to predict what would happen in a given circumstance, and we believe now that it is impossible, that the only thing that can be predicted is the probability of different events. It must be recognized that this is a retrenchment in our earlier ideal of understanding nature. It may be a backward step, but no one has seen a way to avoid it.[1]

What are the nuclei made of, and how are they held together? It is found that the nuclei are held together by enormous forces. When these are released, the energy released is tremendous compared with chemical energy, in the same ratio as the atomic bomb explosion is to a TNT explosion, because, of course, the atomic bomb has to do with changes inside the nucleus, while the explosion of TNT has to do with the changes of the electrons on the outside of the atoms. The question is, what are the forces which hold the protons and neutrons together in the nucleus? Just as the electrical interaction can be connected to a particle, a photon, Yukawa suggested that the forces between

1. Ibid.,p.134.

neutrons and protons also have a field of some kind, andthat when this field jiggles it behaves like a particle. Thus there could be some other particles in the world besides protons and neutrons, and he was able to deduce the properties of these particles from the already known characteristics of nuclear forces. For example, he predicted they should have a mass of two or three hundred times that of an electron; and lo and behold, in cosmic rays there was discovered a particle of the right mass! But it later turned out to be the wrong particle. It was called A mmeson, or muon.[1]

However, a little while later, in 1947 or 1948, another particle was found, the p-mneson, or pion, which satisfied Yukawas criterion.. Besides the proton and the neutron, then, in order to get nuclear forces we must add the pion. Now, you say, "Oh great', with this theory we make quantum nucleodynamics using the pions just like Yukawa wanted to do, and see if it works, and everything will be explained." Bad luck! it turns out that the calculations that are involved in this theory are so difficult that no one has ever been able to figure out what the consequences of the theory are, or to check it against experiment, and this has been going on now for almost twenty years!

So we are stuck with a theory, and we do not know whether it is right or wrong, but we do know that it is a little wrong, or at least incomplete. While we have been dawdling around theoretically, trying to calculate the consequences of this theory, the experimentalists have been discovering

1. Ibid.,p.38.

some things. For example, they had already discovered this m-meson or muon, and we do not yet know where it fits. Also, in cosmic rays, a large number of other "extra" particles were found. It turns out that today we have approximately thirty particles, and it is very difficult to understand the relationships of all these particles, and what nature wants them for, or what the connections are from one to another. We do not today understand these various particles as different aspects of the same thing, and the fact that we have so many unconnected particles is a representation of the fact that we have so much unconnected information without a good theory. After the great successes of Quantum Electrodynamics, there is a certain amount of knowledge of nuclear physics which is rough knowledge, sort of half experience and half theory, assuming a type of force between protons and neutrons and seeing what will happen, but not really understanding where the force comes from. Aside from that, we have made very little progress.[1]

فائن مین کے یہ حوالے اس لیے دیے گئے ہیں کہ جدیدیت پسند حضرات ابتداء سے آج تک سب سائنس سے متاثر ہیں، لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اس میدان کے عبقری سائنس دان کے اعترافات سائنس کی پرستش میں مبتلا مریضوں کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں۔ فائن مین کون ہے؟ اور اس کا جدید سائنس میں کیا مقام ہے؟ اسے جاننے کے لیے درج ذیل تعارف پڑھیے کہ فائن مین کا اصل کارنامہ کیا ہے؟

Initially, Feynman made a name for himself from his work on the theory of subatomic particles, specifically the topic known as Quantum Electrodynamics or QED. In fact,

---

1. Ibid. p.39

the quantum theory began with this topic. In 1900, the German physicist Max Planck proposed that light and other electromagnetic radiation, which had hitherto been regarded as waves, paradoxically behaved like tiny packets of energy, or "quanta," when interacting with matter. These particular quanta became known as photons. By the early 1930s the architects of the new quantum mechanics had worked out a mathematical scheme to describe the emission and absorption of photons by electrically charged particles such as electrons. Although this early formulation of QED enjoyed some limited success, the theory was clearly flawed. In many cases calculations gave inconsistent and even infinite answers to well-posed physical questions. It was to the problem of constructing a consistent theory of QED that the young Feynman turned his attention in the late 1940s.

To place QED on a sound basis it was necessary to make the theory consistent not only with the principles of quantum mechanics but with those of the special theory of relativity too. These two theories come with their own distinctive mathematical machinery, complicated systems of equations that can indeed be combined and reconciled to yield a satisfactory description of QED. Doing this was a tough undertaking, requiring a high degree of mathematical skill, and was the approach followed by Feynman's contemporaries. Feynman himself, however, took a radically different route so radical, in fact, that he was more or less able to write down the answers straight away without using any mathematics.

To aid this extraordinary feat of intuition, Feynman

invented a simple system of eponymous diagrams. Feynman diagrams are a symbolic but powerfully heuristic way of picturing what is going on when electrons, photons, and other particles interact with each other. These days Feynman diagrams are a routine aid to calculation, but in the early 1950s they marked a startling departure from the traditional way of doing theoretical physics.

The particular problem of constructing a consistent theory of quantum electrodynamics, although it was a milestone in the development of physics, was just the start. It was to define a distinctive Feynman style, a style destined to produce a string of important results from a broad range of topics in physical science. The Feynman style can best be described as a mixture of reverence and disrespect for received wisdom.[1]

دو ہزار سال تک ارسطو اور یونانی سائنس کے تراشیدہ نظریے زمین و زماں اور مکان کی حرکت سے متعلق مستعمل و مسلط رہے، پوری دنیا کے علمی حلقوں بشمول مذہب، سائنس اور فلسفے کا اس پر اجماع رہا، لیکن کاپر نیکس، گیلی لیو اور نیوٹن کے آتے آتے حرکت اور زماں و مکاں سے متعلق یونانی سائنس و فلسفے کے تمام مفروضات غلط ہو گئے، نیوٹن کے قوانین حرکت نے دو ہزار سال کی تاریخ بدل دی، لیکن صرف دو سو سال بعد آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت نے نیوٹن کے قوانین کو غلط ثابت کیا اس موقف کی تشریح کے لیے فائن مین [Feynman] کا موقف پڑھیے:

Having described the idea of the electromagnetic field, and that this field can carry waves, we soon learn that these waves actually behave in a strange way which seems very unwavelike. At higher frequencies they behave much more like particles. It is quantum mechanics, discovered just after 1920, which explains this strange behavior. In the years

1. Ibid.,pp. x - xi.

before 1920, the picture of space as a threedimensional space, and of time as a separate thing, was changed by Einstein, first into a combination which we call space-time, and then still further into a curved space-time to represent gravitation. So the "stage" is changed into space-time, and gravitation is presumably a modification of space-time. Then it was also found that the rules for the motions of particles were incorrect. The mechanical rules of "inertia" and "forces" are wrong - Newton's laws are wrong - in the world of atoms. Instead, it was discovered that things on a small scale behave nothing like things on a large scale. That is what makes physics difficult and very interesting. It is hard because the way things behave on a small scale is so "unnatural"; we have no direct experience with it. Here things behave like nothing we know of, so that it is impossible to describe this behavior in any other than analytic ways. It is difficult, and takes a lot of imagination.[1]

Another most interesting change in the ideas and philosophy of science brought by quantum mechanics is this : it is not possible to predict exactly what will happen in any circumstance.[2]

سائنس کی معروضیت کا دعویٰ: ایک فسانہ:

سائنسی علم کے بارے میں ایک مفروضہ یہ بھی تھا کہ اس عظیم مشاہداتی علم کا ادراک جو تجربے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے انہی حالات، اسباب اور شرائط کے ساتھ کسی بھی سائنسی تجربے کو دنیا بھر میں ہر جگہ کوئی بھی شخص بلا لحاظ نسل، مذہب، زبان اور رنگ دہرا سکتا ہے اور اس سے وہی نتائج اخذ کرسکتا ہے جو کسی دوسرے سائنس داں نے اسی طریقے سے کسی اور براعظم میں اخذ کیے تھے، لیکن Feynman اس بارے میں بھی بتاتا ہے کہ:

---

1. Ibid.,p.33.　　2. Ibid.,pp.34-35.

For example, it is possible to arrange an atom which is ready to emit light, and we can measure when it has emitted light by picking up a photon particle, which we shall describe shortly. We cannot, however, predict when it is going to emit the light or, with several atoms, which one is going to. You may say that this is because there are some internal "wheels" which we have not looked at closely enough. No, there are no internal wheels; nature, as we understand it today, behaves in such a way that it is fundamentally impossible to make a precise prediction of exactly what will happen in a given experiment. This is a horrible thing; in fact, philosophers have said before that one of the fundamental requisites of science is that whenever you set up the same conditions, the same thing must happen. This is simply not true, it is not a fundamental condition of science. The fact is that the same thing does not happen, that we can find only an average, statistically, as to what happens. Nevertheless, science has not completely collapsed. Philosophers, incidentally, say a great deal about what is absolutely necessary for science, and it is always, so far as one can see, rather naive, and probably wrong. For example, some philosopher or other said it is fundamental to the scientific effort that if an experiment is performed in, say, Stockholm, and then the same experiment is done in, say, Quito, the same results must occur. That is quite false. It is not necessary that science do that; it may be a fact of experience, but it is not necessary. For example, if one of the experiments is to look out at the sky and see the aurora borealis in Stockholm, you do not see it in Quito; that is a

different phenomenon.[1]

عقل کی محدودیت اور نارسائی: کانٹ کا اعتراف:

کانٹ نے اپنی کتاب Critique of Pure Reason [New York: Dolphin Books, 1961] میں عقل اور طبیعیات کی حدود واضح کر دی تھیں کہ محدود عقل لامحدود کائنات اور ماورائے عقل امور کو نہیں پا سکتی۔ کسی شے کا ورائے عقل ہونا اور خلاف عقل ہونا دو مختلف اُمور ہیں۔ عقل کا دائرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے جہاں عقل کا دائرہ ختم ہو گیا اس دائرے سے باہر کے امور میں عقل عاجز درماندہ، پسماندہ اور ناکارہ ہے۔ یہاں اپنی محدودیت کا اعتراف کرنے کے بجائے اگر عقل اپنے دائرے سے باہر کے امور کو خلاف عقل قرار دے تو خود یہ غیر عقلی رویہ ہوگا۔ عقل طبیعی دنیا کے بھی تمام امور پر حاوی نہیں ہو سکتی تو مابعد الطبیعیاتی امور میں اس کی دخل اندازی ناممکن بلکہ محال ہے، محدود عقل کے تجربات اور محدود مشاہدات سے اخذ کردہ نتائج بھی محدود پیانے [partly correct] پر درست ہوتے ہیں۔ قطعی اور بالکل درست نہیں ہوتے، احتمالاً درست [probably true] ہو سکتے ہیں۔ سورج اور چاند کو صدیوں سے گردش کرتا ہوا دیکھ کر قدیم سائنس ہزارہا سال تک ہمیں مشاہدات کی بنا پر یہ بتاتی رہی کہ سورج اور چاند گردش کر رہے ہیں۔ زمین ساکن ہے اس نظریے کو کاپرنیکس نے معرض سوال بنا دیا۔ لیکن جدیدیت پسند مفکرین طبیعیات اور سائنس کے ذریعے مابعد الطبیعیاتی سوالات کو حل کرنے کے اس کام میں مصروف ہیں، جو ان سے پہلے یورپ میں مسترد ہو چکا تھا، وہ مسترد شدہ نظریات کے ملبے سے سائنس واسلام کا محل تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں، کیا نفس سائنس کا موضوع ہے؟ ان حضرات کی یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ سائنس نفس [Self] کو موضوع گفتگو بناتی ہے نفس سائنس کے دائرے سے باہر کی چیز ہے کیونکہ اسے تجربہ گاہ میں جانچا نہیں جا سکتا۔ سوشل سائنس میں سائیکالوجی نفس کے بارے میں بعض دعوے ضرور کرتی ہے مگر یہ تمام دعوے اور تجربات عقلی اور مادی منہاج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا روحانیت اور مابعد الطبیعیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ سائنس جو زندگی سے ایک آدھ ٹکڑا نوچ سکتی ہے کل کا علم نہیں رکھتی۔ حقیقت کے بھی کسی محدود جزو کا محض جزوی علم ہی رکھتی ہے۔ حقیقت کا جزو [part of reality] دراصل حقیقت نہیں [not reality] ہوتا وہ کچھ اور ہو جاتا ہے، مثلاً سوڈیم [Na] اور کلورین [Cl] آپس میں ملتے ہیں تو [NaCl] نمک [سوڈیم کلورائیڈ] بناتے ہیں لیکن اگر سوڈیم کو کلورین سے الگ کر دیا جائے تو کلورین ایک خطرناک عنصر ہے جو ہلاکت پھیلا سکتا ہے۔ لیکن سوڈیم کے ساتھ مل کر اس عنصر کی حقیقت و ماہیت، اصلیت و نوعیت اور کیفیت و طبیعت بدل جاتی ہے۔ جب ایک کل [whole] کو اجزا [parts] میں تقسیم کیا جاتا ہے تو وہ اپنی روح، طاقت، حقیقت اور

1. Ibid.,p.35.

جوہر [essence] کھو دیتا ہے وہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ روح کے بغیر مادے کی کوئی حیثیت و معنویت نہیں۔ معنویت کسی شے کی کلیت میں ہوتی ہے اور جب اسے اجزا میں توڑ کر دیکھا جائے تو اس کی معنویت سلب ہو جاتی ہے، عصر حاضر میں جدیدیت پسند علما کے روحانیت سے عاری فتاویٰ کا سبب بھی اسی غلط طریقہ کار کی پیروی ہے۔ کسی جزو کو اس کے کل تناظر اور کلیت سے الگ کر کے، اس کی حقیقت کو نظر انداز کر کے جب ایک جزو پر فتویٰ دیا جائے گا تو یہ عمل نہ صرف غیر علمی بلکہ روحانیت سے عاری بلکہ اس کے منافی ہوگا۔

سائنسی طریقۂ علم سے مذہب کی توثیق: ایک غیر علمی رویہ:

سائنسی طریقۂ علم سے مذہب کی تردید و توثیق کا کام لینا غیر علمی رویہ ہے، اگر کوئی علم سائنسی بنیادوں پر ثابت نہ ہو سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ علم نہیں ہے۔ جدیدیت پسند مسلم مفکرین صرف سائنس کو علم سمجھتے ہیں جب کہ سائنس عقلی علوم کی ایک جزوی، غیر قطعی، ظنی اور امکانی جہت کے سوا کچھ نہیں۔

فائن مین جس نے Theory of Subatomic Particles or QED Quantum Electro Dynamics میں محیر العقول کام کیا ہے جس پر اسے نوبل پرائز بھی دیا گیا اپنی کتاب *Six Easy Pieces* میں صرف سائنس کو علم سمجھنے والوں کو بتاتا ہے کہ:

If a thing is not a science it is not necessarily bad, for example love is not a science so if something is said not to be a science, it does not mean that there is something wrong with it, it just means that it is not a science.[1]

ایک غیر مسلم، اپنے عہد کا سب سے بڑا طبیعیات داں اور کوانٹم الیکٹروڈائمکس کا صف اول کا سائنس داں سائنس سے مرعوب نہیں ہے، وہ کسی چیز کے اہم، علمی، اور حقیقی ہونے کے لیے اس کا سائنسی ہونا ضروری نہیں سمجھتا۔ لیکن ہمارے جدیدیت پسند اسلامی مفکرین اسلام کے مقابلے میں سائنس سے اس درجے مغلوب و مرعوب ہیں کہ وہ سائنسی تشریح کے بغیر اسلام کی علمی تعبیر ممکن نہیں سمجھتے، اُن کا خیال ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نوجوان اسلام کو رد کر دیں گے۔ کیونکہ عہد جدید کے نوجوان کا ذہن حسی، افادی، تجربی، منطقی ہے، جس کے لیے اسلام کے قدیم علمی معیارات ناکافی اور لائق التفات نہیں ہیں۔ یہ بیان اس بات کا غماز ہے کہ ہمارے یہ دوست عہد حاضر کے ذہن سے بھی قطعاً ناواقف ہیں انھیں یہ تک معلوم نہیں کہ افادیت پسند ذہن اس قابل ہی نہیں رہتا کہ وہ جسم اور لذات کی سطح سے اوپر اُٹھ سکے، وہ اہم مسائل پر غور کرنے اور سوال اُٹھانے کی صلاحیت ہی کھو دیتا ہے۔

1. Ibid.,p.84.

سائنس کی زبان ریاضی، سائنس نہیں: فائن مین:

ریاضی کو سائنس داں نیچرل سائنس نہیں تسلیم کرتے کیونکہ اسے تجربے سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ Feynman کے الفاظ میں:

Mathematics is not a science from our point of view in the sense that it is not a natural science. The test of its validity is not experiment.[1]

ریاضی سائنس کی زبان ہے لیکن تجربے سے ماروا ہے، اگر ریاضی کو سائنس سے نکال دیا جائے تو سائنس بہری، گونگی، اندھی اور لنگڑی ہو جائے، سائنس کا انحصار مکمل طور پر غیر سائنس یعنی ریاضی پر ہے۔ جدیدیت پسندوں کو یہ دکھ ہے کہ عصر حاضر میں سائنس کے بغیر اسلام کیسے چل سکے گا؟ قابل غور بات یہ ہے کہ سائنس اپنے اظہار، ترجمانی اور تشریح کے لیے ایک ایسے علم پر منحصر ہے جو سائنس کی نظر میں غیر سائنسی ہے۔ لیکن کیا اس علم کی اہمیت سائنس سے کم تر ہے؟ کسی ایسے علم کو جو سائنس کے منہاج کے مطابق علم نہ ہو یا سائنس جس کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہو اسے غیر علمی اور غیر حقیقی سمجھنا خود غیر علمی رویہ ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ عصر حاضر کا ایک بڑا سائنس داں خود یہ کہتا ہے کہ محبت سائنس نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ خراب چیز، بری شے یا غلط ہے۔

سائنسی نتائج حتمیت وقطعیت سے خالی ہوتے ہیں:

سائنس مادی نتائج تک رسائی پاسکتی ہے لیکن یہ نتائج بھی قطعاً غیر قطعی وغیر حتمی اور صرف اندازے ہوتے ہیں۔ مادی نتائج انسان کی روح وجسم اور کائنات پر یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا ان کا جائزہ لینا، ان کی تنقیح کرنا مذہب کی ذمے داری ہے مذہب انسانوں کی عقلی سرگرمیوں اور اس کے حاصلات مادی ایجادات یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بجائے اس کا غلام بننے کی کوشش کرے تو یہ خطرناک صورتحال ہوگی۔ مثلاً منبر رسول سے جب کوئی عالم کاروں، جہازوں، اور جدید صنعتی ترقی، صنعتی مصنوعات ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنڈ وغیرہ کی زبردست تعریف کرتا ہے اور مغرب جیسی صنعتی ترقی کی دعائیں عالم اسلام کے لیے مانگتا ہے۔ اس کے فوری بعد اللہ تعالیٰ سے وہ یہ دعا بھی کرتا ہے کہ اے اللہ موسم کی شدت اور حدت سے جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے دن بہ دن بڑھ رہی ہے ہمیں محفوظ رکھ تو اصلاً وہ دو متضاد باتیں کرتا ہے، وہ یہ بھول جاتا ہے کہ موسم کی شدت کا اصل تعلق جدید طرز زندگی، کائنات کے استحصال، تسخیر کائنات کے فلسفے، عیش وعشرت کی ثقافت، اسراف پر مبنی معیشت، کاربن ڈائی آکسائیڈ $[CO_2]$ کی مسلسل پیداوار، گرین ہاؤس گیسز [Green House Gases]، اور میتھن [Methane] کا مسلسل اخراج جو دیگر گیسوں سے زیادہ خطرناک گیس ہے۔

---

1. Ibid., p.47.

آرکٹک اور انٹارٹیکا میں جمع ہونے والی یہ تمام خطرناک گیس اب وہاں برف پگھلنے کے باعث خارج ہو کر فضا میں شامل ہو رہی ہیں اور گلوبل وارمنگ میں زبردست اضافہ کر رہی ہیں۔ اس اضافے کا سبب بھی مغرب کی بے ہنگم، خدادشمن اور تسخیر فطرت کے نام پر تدفین فطرت کے عمل پر مبنی صنعتی ترقی ہے۔ اس کے نتیجے میں آرکٹک اور انٹارٹیکا میں صدیوں سے جمی ہوئی برف کی ہزاروں فٹ تہیں پگھل گئیں۔ پینگوئن کی ستر فی صد نسلیں ختم ہو گئیں اور ماحول اور موسم میں اچانک غیر معمولی، بے اندازہ، خطرناک تبدیلیاں جنم لے رہی ہیں۔ abrupt and irreversible climate shifts دنیا کو مزید تیزی سے تباہی کے دہانے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ UN سے وابستہ مختلف سائنس دانوں پر مشتمل مجلس IPCC | Intergovernmental Panal on Climate Change | کی رپورٹ کے مطابق:

PARIS, June 18: The world faces a growing risk of "abrupt and irreversible climatic shifts" as fallout from global warming hits faster than expected, according to research by scientists released on 20 June 2009. Global surface and ocean temperatures, sea levels, extreme climate events, and the retreat of Arctic sea ice had all significantly picked up more pace than experts predicted. Only a couple of years ago report said.

The stark warning comes less than six months before an international conference aiming to seal a treaty to save the planet from the worst ravages of global warming. A 36 page document summarised more than 1400 studies presented at a climate conference in March in Copenhagen, where a United Nations meeting will be held in December to hammer out a successor to the Kyoto Protocol that expires in 2012. The report said greenhouse gas emissions and other climate indicators are at or near the upper boundaries forecast by the UN Intergovernmental Panel on Climate Change (IPCC), whose 2007 report has been the scientific benchmark for the troubled UN talks.

There is also new evidence that the planet itself has begun to contribute to global warming through fallout from human activity. Huge stores of gases such as methane an even more powerful green house gas than carbon dioxide, trapped for millennia in the Arctic permafrost may be starting to leak into the atmosphere, speeding up the warming process.[1]

اس خوفناک تباہی کو روکنے اور دنیا کو اس سے بچانے کے بجائے ترقی یافتہ قومیں اور روس و امریکہ اس خطے میں مخفی وسائل پر قبضے کے منصوبے بنا رہے ہیں یہ سوچے بغیر کہ جب یہ دنیا ہی جہنم بن جائے گی تو ان وسائل کو حاصل کر کے یہ اقوام کیا کر سکیں گی؟

Reuters ایجنسی کے Alister Doyle کی ۲۲ جون ۲۰۰۹ء کی رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ Arctic Nations کے مابین اور روس امریکہ کے درمیان اس خطے کے وسائل، ذرائع اور ذخائر پر قبضے کے لیے سرد جنگ [Cold War] ہو چکی ہے Artic اور Antartica میں گیس تیل کے ذخائر کی دریافت اور نئے بحری راستوں کی تلاش میں خاموش سرد جنگ رفتہ رفتہ پھیل رہی ہے ۲۰۵۰ تک موجودہ گلوبل وارمنگ کے باعث یہ پورا خطہ برف سے خالی ہو جائے گا۔ Arctic میں 90 بلین ڈالر تیل محفوظ ہے جو دنیا کی تین سال کی ضروریات کے لیے کافی ہے اس رپورٹ کے انکشافات دنیا کو ایک نئے ماحولیاتی بحران سے آگاہ کرتے ہیں چند اہم حصے درج ذیل ہیں:

ARCTIC nations are promising to avoid new "Cold War" scrambles linked to climate change, but military activity is stirring in a polar region where a thaw may allow oil and gas exploration or new shipping routes.

The six nations around the Arctic Ocean are promising to cooperate on challenges such as overseeing possible new fishing grounds or shipping routes in an area that has been too remote, cold and dark to be of interest throughout recorded history. But global warming is spurring long irrelevant disputes, such as a Russian Danish stand off over

---

1. AFP DAWN 19, June 2009.

who owns the sea bed under the controls the Northwest passage that the United States calls an international water way. It will be a new ocean in a critical strategic area said Lee. Willett, head of the Marine studies Programme at the Royal United Services Institute for Defence and Security Studies in London.

Many leading climate experts now say the Arctic Ocean could be ice-free by 2050 in summer, perhaps even earlier, after ice shrank to a record low in September 2007 amid a warming blamed by the UN Climate Panel on human burning of fossil fuels.Previous forecasts had been that it would be ice-free in summers towards the end of the century. Among signs of military concern, a Kremlin document on security in mid May said Russia may face wars on its borders in the near future because of control over energy resources- from the Middle East to the Arctic. Russia, which is reasserting itself after the collapse of the Soviet Union, sent a nuclear submarine in 2008 across the Arctic under the ice to the Pacific. Canada runs a military exercise, Nanook, every year to reinforce sovereignty over its northern territories. Russia faces five NATO members- the United States, Canada, Norway, Iceland and Denmark via Greenland - in the Arctic. In February, candadian Prime Minister Stephen Harper criticised Russia's "increasingly aggressive" actions after a bomber flew close to Canada before a visit by US President Barack Obama. And last year Norway's government decided to buy 48 Lockheed Martin F-35 jets at a cost of 18 billion crowns ($2.81 billion), rating them better than rival Swedish Saab's Gripen at tasks such as surveillance of the vast Arctic north. The US Geological

Survey estimated last year that the Arctic holds 90 billion barrels of undiscovered oil- enough to supply current world demand for three years.And Artic shipping routes could be short-cuts Atlantic Oceans in summer even though uncertainties over factors such as ice bergs, insurance costs or a need for hardened hulls are likely to put off many companies. "The Arctic area would be of interest in 50 or 100 years- not now", said Lars Kullerud, President of the University of the Arctic. "It's hype to talk of a Cold War."[1]

اللہ تعالیٰ سے جدید صنعتی ترقی اور ایئر کنڈیشنڈ، کاروں، موبائل فون، کو اس ترقی کے فطری اور حقیقی مظاہر و لوازم اور ثمرات سمجھ کر طلب کرنے والا جو آج کل فریج کو ضروریات زندگی میں داخل سمجھتا ہے، دعا مانگتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ ریفریجریٹر اور ایئر کنڈیشنڈ کے ذریعے فضا میں CFC [Chloroflurocarbons] کی دو سو سال تک مسلسل پھیلنے والی آلودگی نے اوزون [Ozone] کی اس لہر کو توڑ دیا ہے جو پوری دنیا کو سورج کی خطرناک شدت وحدت سے بچاتی تھی۔ دو صدیوں تک چند فی صد امیر لوگوں نے ایئر کنڈیشنڈ سے مصنوعی ٹھنڈک کے مزے اٹھائے اور پوری دنیا کی اکثریت کو خطرناک گرم موسموں کے سپرد کر دیا۔ نہ صرف غریب لوگ بلکہ اب خود یہ امیر ابھی اس خطرناک گرمی سے پریشان ہیں۔ برف پگھل رہی ہے پانی کی سطح بلند ہو رہی ہے، اس صدی کے نصف تک ہزاروں شہر ڈوب جائیں گے، پانی کی قلت پیدا ہوگی اور تیسری عالمگیر جنگ پانی کے حصول کے لیے لڑی جائے گی۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ ماحول میں شدید گرمی کے اہم اسباب میں جدید صنعتوں، ان کے فاضل زہریلے مادوں، عالمگیر جنگوں، جنگوں میں مغرب کی جانب سے استعمال کیے جانے والے خطرناک ترین تابکار مادوں کا کتنا اثر شامل ہے۔ وہ مغرب کو تباہ کرنے کے لیے عالم اسلام کو جوہری صلاحیت حاصل کرنے کی دعائیں بھی کرتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ انسان فطرت دشمن اپنی عقلی سرگرمی سے Global Warming پیدا کرے اور خدا سے اس حدت گرمی اور موسم کی تبدیلی کی دعا کرے تو وہ ایک غیر عقلی، غیر علمی، غیر دینی سرگرمی میں نادانستہ طور پر مصروف عمل ہے۔ ہمارے اکثر جدیدیت پسند دعا کرتے ہوئے ان تمام حقائق سے سہو نظر کرتے ہیں کیونکہ وہ چیزوں کی اصل حقیقت سے ناواقف ہیں وہ سائنس کی ایجادات کے اس ظاہر اور اس کے عارضی فوائد پر نثار ہو چکے ہیں۔

اس عہد کا المیہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنی انفرادی لذت اور ذاتی جنت [personal paradise] کی تعمیر و تشکیل و تخلیق کے لیے اس دنیا کو اجتماعی جہنم [collective hell] میں

1. Reuters, 22 June 2009, Dawn 23 June 2009.

تبدیل کر رہا ہے۔ مگر سہولت، آرام، عیش وعشرت، مزوں، اور لذت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں، لیکن خدا سے چاہتا ہے کہ وہ اس کی غیر فطری سرگرمیوں کے مہلک اثرات سے خود اسے، انسانیت کو اور اس کائنات کو محفوظ کر دے۔ یہ دعا، یہ آرزو، یہ تمنا، یہ امید، یہ التجا اور یہ خواہش اسی قسم کی خواہش ہے جب ایک مجرم نے اپنے ماں باپ کو قتل دینے کے بعد عدالت سے اس بنا پر رحم کی اپیل کی کہ وہ یتیم ہے اور قانون میں یتیم کی سزا میں تخفیف کی شق موجود ہے۔ کیا عدالت ایسے شقی مجرم کو اس قانونی موشگافی کے تحت کوئی رعایت دے سکتی ہے؟ جس نے اس بنیاد کو اپنے ہاتھوں سے تہس نہس کر دیا جس کی اساس پر وہ رحم کی التجا کر رہا ہے۔ یہ نقطہ نظر اور طرز حیات دراصل اس اصول کی عکاسی کرتا ہے جس کے تحت اہل عالم زندگی فرعون کی چاہتے ہیں لیکن آخرت حضرت موسیٰ کی۔

ہر تعقل اپنے منہاج علم ہی میں معقول معلوم ہوتا ہے:

ہر علم کا اپنا منہاج، اپنی مابعد الطبیعیات، ایمانیات اور علمیت ہوتی ہے اور اسی دائرے میں وہ علم اپنا تعقل ثابت کر سکتا ہے۔ اس دائرے سے باہر وہ تعقل اپنا جواز کھو دیتا ہے۔ صرف انبیا کے پاس معروضی علم ہوتا ہے۔ ایسا علم جو آفاقی اور زماں ومکان سے ماورا ہوتا ہے۔ یہ ایسا علم ہے جس کی تصدیق ہر عہد کا انسان اپنے ذہن، عقل، قلب، تجربے، جذبات اور احساسات کے ساتھ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خواہشات نفس کی غلامی سے کچھ دیر کے لیے علیحدہ ہو جائے۔ جب آپ ارسطو، نیوٹن یا آئن اسٹائن کے منہاج میں کھڑے ہوں گے تو ہر منہاج کے اپنے دعاوی، اپنے مفروضات، اپنے مسائل، اپنی ایمانیات ہوں گی اور اس حصار کے اندر ہی یہ دعوے آپ کو تعقل سے بھرپور نظر آئیں گے۔ ان علوم سے پیدا ہونے والے مسائل، سوالات، مشکلات بھی انہی علوم سے متعلق دائروں کے اندر حل ہوں گے۔ اس لیے ایک منہاج علم کے اصول کو لے کر دوسرے منہاج علم کے مسئلے حل نہیں کیے جا سکتے نہ سوالات کے جوابات دیے جا سکتے اور نہ ہی غلطیاں درست کی جا سکتی ہیں اگر آپ یہ طریقہ کار اختیار کریں گے تو اس کے نتیجے میں خطرناک بحران پیدا ہوں گے خصوصاً مذہب اور سائنس میں تطبیق کی غیر سنجیدہ کوششوں کے نتیجے میں نقصان مذہب کو پہنچے گا جیسا کہ مسئلہ حرکت زمین کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سائنسی نظریے نے عیسائیت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور آج تک عیسائیت اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑی نہ ہو سکی، عیسائیت اور یونانی سائنس کی تطبیق نے عیسائیت کو لحد میں اتار دیا اور جدیدیت پسند بیسویں صدی میں دنیا کو سائنس اور مذہب کی تطبیق کا مسترد شدہ طریقہ بتا رہے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حضرات تاریخ مذہب اور تاریخ سائنس سے بہ خوبی واقف نہیں۔

مذہب اور سائنس دو مختلف منہاج علم:

مذہب اور سائنس دو مختلف علم اور دو مختلف دائرے ہیں ایک اقلیم اور ایک منہاج کے دلائل سے دوسری اقلیم دوسرے منہاج کے مسائل حل کرنے کا رویہ مذہب، فلسفہ اور سائنس کی دنیا میں غیر علمی رویہ ہے۔ نیوٹن کی طبیعیات کے مسئلے آئن اسٹائن کی طبیعیات سے حل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اسلامی منہاج علم میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات اسلامی علمیت اور اس کا تعقل دے گا۔ اگر اس تعقل

اور علمیت کے وارث اتنے کمزور ہیں کہ ان سوالات اعتراضات، شبہات اور اشکالات کا جواب نہیں دے سکتے تو اس منہاج علم کے [ماخذ علم] [hard core] سوالیہ نشان بن جائیں گے، جب اسلامی منہاج میں اٹھنے والے سوال، اعتراض، شبہ اور شکوک کا جواب آپ کے منہاج علم میں میسر نہیں وہ کسی دوسرے منہاج علم سے لایا جارہا ہے تو برتری، فوقیت اور عظمت آپ کی نہیں دوسرے منہاج علم کی ہوگی۔ اگر اسلام کو طاقت ور بنانے اور دعوتِ دین کے لیے انبیاء کے طریقے کو ترک کر کے سائنس کو استعمال کیا جائے تو اس میں یہ یقین محذوف ہوتا ہے کہ انبیا کا طریقہ کم از کم عصر حاضر میں غیر موثر ہے لہٰذا اس کے نتیجے میں فوقیت اور برتری سائنس کی ثابت ہوتی ہے دین کی نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ نقلی دلائل اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جب ان دلائل کے پیش کرنے والے کی اخلاقی فضیلت اور روحانیت کرشماتی ہو، ان کی زندگی کا رخ خدا مرکز ہو، وہ حیات دنیا کے طالب نہ ہوں بلکہ طالب آخرت ہوں، چونکہ دنیا میں ہر فرد دنیا چاہتا ہے اور دنیا کی طلب، آرزو، خواہش کسی نہ کسی سطح پر رکھتا ہے لیکن جب کسی ایسے شخص کو دیکھتا ہے جو ان دیکھی آخرت اور ان دیکھے خدا پر ایمان لا کر اُس دنیا کی طلب میں اس دنیا کو قابل ترجیح نہیں سمجھتا تو یہ عملی دلیل فکری نظری اور نقلی دلیل کے فہمِ عقلی کو ممکن بنا دیتی ہے۔ ایک شخص طالب آخرت ہو لیکن دنیا میں بھی اس طرح منہمک ہو جس طرح اہل دنیا تو یہ رویہ لوگوں کو نہ عقلی طور پر متاثر کرتا ہے نہ نقلی طور پر، جب اہل دنیا یہ دیکھتے ہیں کہ آخرت اور جنت کی طرف بلانے والے نفوس قدسیہ، ماشاءاللہ، خود ان سے زیادہ دنیا دار، طالب حیات دنیا، دنیا کی لذتوں میں منہمک ہیں تو ان کا ذہن، عقل، قلب اور طبیعت مذہبی دعووں کو قبول نہیں کرتی۔ علما انبیاء کے وارث ہیں لہٰذا ان کا کردار بھی انبیا کی طرح ہونا چاہیے اگر یہ کردار اس درجے کا نہیں ہوگا تو دینِ اسلام عقل، سائنس اور فلسفے کے ذریعے بھی ذہن انسان کے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہوگا۔ مذہب [religion] کا طریقہ علم، یقین، ایمان، عملِ صالح ہے۔ مذہبِ سائنس [Religion of Science] کا طریقہ مابعدالطبیعیات، اندازے، مفروضات، تجربات اور مشاہدات ہیں۔ جو ہر نئے تجربے اور نظریے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مذہبِ فلسفہ [Religion of Philosophy] کا طریقہ عقل کی برتری شک کی رفعت اور تشکیک سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہوتا ہے تینوں مذاہب کے اصول الگ الگ ہیں۔

سائنس: ایک منہاج سے دوسرے میں منتقلی ایک مذہب سے دوسرا مذہب قبول کرنے کی طرح ہے: کوہن

جس طرح ایک مذہب کی علمیت کے ذریعے دوسرے مذہب کے مسائل کا حل تلاش نہیں کیا جاسکتا بالکل اسی طرح سائنس کے ایک منہاج سے دوسرے منہاج میں آمد محض واقعہ، حادثہ، کھیل تماشہ نہیں ہے۔ کوہن [T.S Kuhn] کے الفاظ میں سائنس کے ایک منہاج سے دوسرے منہاج میں آنے کی کوئی عقلی دلیل نہیں دی جاسکتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ تبدیلی و تغیر بالکل اسی طرح ہے جس طرح کوئی شخص ایک مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کرے[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے:

Thomas Kuhn, *The Structure of Scientific Revolutions*, Chicago: Chicago University Press,1970,pp.154, 200.

کوہن Structuralist ہے مگر وہ Relativist بھی ہے، اس کے برعکس لے کاٹوش جواسٹرکچرلسٹ ہے لیکن اس کا شمار Objectivist میں ہوتا ہے، کوہن کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتا اس کے خیال میں ایک منہاج سے دوسرے منہاج میں منتقلی کی عقلی بنیادیں ہوتی ہے، وہ عقل کو معروضی علم کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے اس کے خیال میں جو سائنسی منہاج علم زیادہ مسئلے حل کرنے کے قابل ہوگا وہی منہاج علم کامیاب رہے گا۔ اور لوگ اسی بنیاد پر ایک منہاج کو ترک کرکے دوسرے میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے خیال میں سائنسی ڈھانچے [scientific structure] بنتے بگڑتے رہتے ہیں، جو ڈھانچے زندہ [generate] ہوتے ہیں وہ اکثر مسائل حل کردیتے ہیں جو ڈھانچے زندگی سے محروم [De generate] ہوتے ہیں ان کے مآخذ علم مناہج آخرکار متاثر ہوجاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سائنسی ڈھانچے مسائل کے حل میں غیر موثر ہوجاتے ہیں، سائنسی ڈھانچوں کے بننے بگڑنے کی حرکیات [Dynamics of Generation & Degeneration of Scienctific Structures] کے تحت لوگ سائنس کے ایک منہاج کو ترک کرکے دوسرا اختیار کرلیتے ہیں، لیکن سائنس دانوں کی بہت بڑی اکثریت جو سائنس اور عقل کو ایک معروضی و آفاقی علم نہیں سمجھتی لے کاٹوش کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتی۔ مغرب کے تمام بڑے فلاسفہ سائنس کی آفاقیت اور معروضیت [Objectivity & Universality of Science] کے قائل نہیں ہیں وہ اسے ایک خاص تاریخ تہذیب، ثقافت، عقلیت اور حالات کی پیداوار سمجھتے ہیں۔

سائنسی دعوے کا موازنہ غیر سائنسی دعوے سے کرنا ممکن نہیں: فیرابینڈ:

[P.K. Feyerabend] ایک اہم بات کرتا ہے جو ذاکر نائیک صاحب کی نظر سے یقیناً نہیں گزری، وہ کہتا ہے کہ کسی بھی سائنسی دعوے [scientific claim] کا موازنہ و مقابلہ کسی غیر سائنسی دعوے [non scientific claim] سے نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے عمل کو وہ Idea of Incommensurable کہتا ہے۔ یعنی ایک منہاج علم میں اٹھائے گئے مسائل کا حل دوسرے منہاج علم کے طریقوں میں تلاش نہیں کیا جاسکتا۔[1]

صرف سائنس کو علم سمجھنا دانش مندی نہیں: فیرابینڈ:

فیرابینڈ [Feyerabend] کو انارکسٹ مکتب فکر کا ترجمان سمجھا جاتا ہے، وہ پس جدیدیت فلسفے [Postmodern Philosophy] سے تعلق رکھتا ہے، وہ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ دو چیزوں کے مابین موازنے اور تقابل کے لیے ضروری ہے کہ ان اشیا کی بنیادوں میں مطابقت پائی

---

[1] فیرابینڈ کا یہ موقف درج ذیل مضمون اور کتاب کے متعلقہ صفحات پر تفصیل سے پڑھا جاسکتا ہے:

M. Ray [ed.], *Distinction Between Crank & Responsible Man Realism and Instrumentalism Comments on the Logic of Factual Support in the Critical Approach to Science and Philosophy*, NY: Free Press, 1964, p.305.

جائے ،اگر ان چیزوں کی بنیادیں مختلف ہوں تو ان کا تقابل نہیں ہوسکتا دوسرے لفظوں میں ان اشیا یا نظریات یا ڈھانچوں کے Meta Ethical Narrative یا Grand narvatives یکساں ہوں تو اشیا کے نظریات وغیرہ کا تقابل ممکن ہے ،مثلاً انسان کو اگر سائیکو کیمیکل آرگن کے طور پر تقابل کے لیے Physicilist اور Dualistic مکتب فکر میں جانچا جائے تو یہ ممکن نہیں کیوں کہ فزیکلسٹ سبب [Cause] اور اثر [Effect] کے مابین تعلق کو طبیعی [Physical] سمجھتے ہیں اور Dualistic انسان کو ذہن وجسم کا مجموعہ سمجھتے ہیں ،جو ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں لہٰذا ان دونوں مکاتب فکر کے Grand Narvatives الگ ہیں لہٰذا ان دو مختلف مناہج میں انسان کے تصورات کا تقابلی مطالعہ ممکن نہیں ۔اسی طرح مذہب اور جادو کا سائنس سے موازنہ وتقابل درست نہیں فیرابینڈ کے خیال میں آج کی دنیا میں سائنس ہر ریاست کا اہم ترین موضوع بن گیا ہے لہٰذا دنیا بھر میں سائنس کی بے پناہ اور روز افزوں ریاستی سرپرستی کے باعث اس کی شب وروز ترقی کو معروضیت کے دائرے میں علمیت کا پیمانہ سمجھ لیا گیا ہے ،جو چیز سائنٹفک طریقے سے اپنے علم اور دلیل کا اظہار نہ کرے اسے لوگ سرے سے علم ہی نہیں مانتے اور اگر علم مان لیتے ہیں تو اسے قابل قدر نہیں مانتے ،اس غیر علمی ،یک رخے اور غیر معقول رویے کے باعث دنیا خوفناک ترین علمی یکسانیت کی جانب بڑھ رہی ہے جس کے نتیجے میں وہ لمحہ آجائے گا جب دنیا میں حقیقت کو پہچاننے کا کوئی دوسرا متبادل طریقہ باقی نہ رہے گا صرف سائنسی ذریعۂ علم ہی حقیقت کی پہچان اور شناخت اور تصور کا واحد طریقہ بن جائے گا ،جبکہ حقیقت میں سائنسی علم حقیقت کو پہچاننے کا واحد طریقہ قطعاً نہیں ہے اس میں ہمہ وقت امکان کذب وتردید موجود ہے ۔فیرابنڈ کا خیال ہے کہ حقیقت کو جاننے کے جتنے بھی علمی طریقے ہیں ان سب کو زندہ رہنا چاہیے نہ کہ صرف سائنسی ذریعۂ علم کو ترجیح دے کر تمام ذرائع علم کو مسترد کیا جائے ،کیونکہ اس رویے کا صرف ایک ہی مطلب ہوگا کہ سائنس کو علم ماننے والے اس بات کا دعویٰ کردیں کہ وہ سچ [Truth] کو پہچان گئے ہیں جبکہ حقیقت [Reality] اور سچ [Truth] کو علمی طور پر نہ جانا جاسکتا نہ ثابت کیا جاسکتا ۔جب سچ اور حقیقت ثابت نہیں ہوسکتے تو ایک ہی قسم کے علم یا تصور یا سچ کے نظریے کو دنیا پر جبراً مسلط کرنا غیر علمی رویہ ہے ،اس رویے ،جبر اور تسلط کے نتیجے میں انسان کی آزادی اور خود مختاری متاثر ہوگی دنیا میں موجود بوقلمونی ،تنوع اور رنگارنگی [Diversity] کا خاتمہ ہوجائے گا۔

دو مختلف مناہج کو ملا کر نتائج اخذ کرنا غیر سائنسی رویہ ہے:

فیرابنڈ کے بتائے گئے سائنسی طریقے کے مطابق سائنسی تناظر کی روشنی میں قرآنی آیات کا سائنسی تحقیقات ونتائج سے تقابل یا سائنسی تحقیقات کا قرآنی آیات سے تقابل ،قرآن کا سائنس کی روشنی میں جائزہ یا سائنس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ خود سائنس کی نظر میں ایک غیر علمی ،غیر عقلی اور غیر منطقی رویہ ہے ۔کیونکہ دونوں اقالیم کی مابعد الطبیعیات ،ان کو سمجھنے کی علمیت ،نتائج اخذ کرنے کے طریقے اور مناہج بالکل مختلف ہیں ۔چونکہ ہر دعویٰ اپنی علمیت کی بنیاد پر صرف اور صرف اپنے منہاج علم ہی میں پرکھا جاسکتا ہے ۔نیوٹن اور آئن اسٹائن کی فزکس بہ ظاہر فزکس ہے لیکن دونوں کے اصول ،منہاج ،فلسفہ اور مابعد الطبیعیات مختلف ہیں نیوٹن کے اصولوں کی روشنی میں آئن اسٹائن کی فزکس کا مطالعہ باطل مطالعہ ہوگا

ہومیوپیتھی، ایلوپیتھی، یونانی طب کے اصول الگ ہیں ان کا فارما کوپیا اور مابعدالطبیعیات بھی الگ ہے، ان کا مطالعہ ان کے اپنے منہاج علم میں ہوسکتا ہے تینوں کو خلط ملط نہیں کیا جا سکتا یہ خالصتاً غیر سائنسی رویہ ہوگا۔ اسی لیے ایلوپیتھک طریقہ علاج سے کوئی مریض اپنی جراحی کرائے تو عمل جراحی سے پہلے اس کے دوران اور اختتام کے بعد وہ ہومیوپیتھی یا حکمت کی دوا استعمال نہیں کرسکتا اگر ایسا کیا جائے تو اس کی جان کے اتلاف کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ کوئی ایلوپیتھ سرجن آپ کو دوسرے فارما کوپیا کی ادویات استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ جب آپ ایلوپیتھی طریقہ علاج اختیار کرتے ہیں تو آپ کو اسی طریقے کی ادویات استعمال کرنا ہوں گی۔ پاکستان میں جراحت قلب [اوپن ہارٹ سرجری] کے دوران کئی اموات صرف اسی باعث واقع ہوئیں کہ مریض کا خون آپریشن کے بعد نہیں رک سکا بلکہ بہتا رہا۔ خون جمنے کی صلاحیت مریض کے جسم میں کیوں مفقود ہوئی؟ تحقیق پر معلوم ہوا کہ مریض خون پتلا کرنے کے لیے ہومیوپیتھک ادویات استعمال کرتے تھے اور اسی دوران آپریشن کرالیا گیا۔ لہٰذا نائیک صاحب مذہب اور سائنس کے مختلف اور متضاد منہاج سے ان کا تقابلی مطالعہ نہیں کر سکتے یہ غیر علمی رویہ ہے۔

حقیقت الحقائق اللہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے پیغمبر ہیں، دنیا میں ہزاروں پیغمبر آئے، پیغمبروں کے واقعات ان کی جدوجہد، ایمانیات، اعتقادات، اعمال، حشر ونشر، عذاب قبر، جنت ودوزخ، فرشتے محسوسات، جذبات سے متعلق قرآن کی ہزاروں آیات کی تشریح وتصدیق سائنسی منہاج میں ممکن ہی نہیں جو ایسا سمجھتا ہے وہ یا تو سائنس سے ناواقف ہے یا قرآن سے واقف نہیں۔ کوئی سائنس داں رسولؐ کے دعویٰ رسالت کو کبھی سائنسی منہاج تسلیم نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ سائنسی منہاج علم میں ثابت ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی رسالت مآبؐ نے جس ذریعے سے وحی کا علم حاصل کیا اسی ذریعے اور اسی طریقے سے کوئی دوسرا شخص وحی کا نہ تجربہ کرسکتا ہے اور نہ علم حاصل کرسکتا۔ یہ تجربہ ہر جگہ ہر شخص کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس تجربے اور علم میں کذب کا امکان بھی موجود نہیں ہے۔ اس کی تردید بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس کو سائنسی تجربہ گاہ میں آزمایا نہیں جا سکتا۔ یہ علم نقل سے حاصل ہوا ہے لہٰذا سائنس اس علم کو ہی تسلیم نہیں کرتی وہ اسے ایک موضوعی [Subjective] معاملہ قرار دے کر اسے سائنسی علم کی دنیا سے خارج کردیتی ہے۔

سائنس کی حقیقت: فائین مین کی زبانی:

سائنس کیا ہے؟ اور اس کی حقیقت وماہیت کیا ہے؟ ذیل میں اس سے متعلق اس صدی کے سب سے بڑے سائنس داں فائن مین Richard Feynman [1918-1988] کی کتاب *The Character of Physical Law [MIT Press]* میں شامل ایک اہم مضمون *"Seeking New Laws of Nature"* کے منتخب اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں، اس کی زبان نہایت آسان ہے اور شہادت اس صدی کے آئن اسٹائن کی ہے واضح رہے کہ عظیم سائنس داں اور مفکر فائن مین نے ۱۹۴۵ء میں امریکن آرمی میں شمولیت کی کوشش کی تو اسے دماغی طور پر نااہل

[Mentally deficient for service] کہہ کر باہر نکال دیا گیا تھا، فائن مین اپنے مضمون میں فطرت کے نئے قوانین کے بارے میں بتاتا ہے:

What I want to talk about in this lecture is not, strictly speaking, the character of physical law. One might imagine at least that one is talking about nature when one is talking about the character of physical law; but I do not want to talk about nature, but rather about how we stand relative to nature now. I want to tell you . . . what there is to guess, and how one goes about guessing. Someone suggested that it would be ideal if, as I went along, I would slowly explain how to guess a law, and then end by creating a new law for you. I do not know whether I shall be able to do that. . . .In general we look for a new law by the following process. First we guess it. Then we compute the consequences of the guess to see what would be implied if this law that we guessed is right. Then we compare the result of the computation to nature with experiment or experience, compare it directly with observation, to see if it works. If it disagrees with experiment it is wrong. In that simple statement is the key to science. It does not make any difference how beautiful your guess is. It does not make any difference how smart you are, who made the guess, or what his name is- if it disagrees with experiment it is wrong. That is all there is to it. It is true that one has to check a little to make sure that it is wrong, because whoever did the experiment may have reported incorrectly, or there may have been some feature in the experiment that was not noticed, some dirt or something; or the man who computed the consequences, even though it may have been the one who made the guesses, could have

made some mistake in the analysis. These are obvious remarks, so when I say if it disagrees with experiment it is wrong, I mean after the experiment has been checked, the calculations have been checked, and the thing has been rubbed back and forth a few times to make sure that the consequences are logical consequences from the guess, and that in fact it disagrees with a very carefully checked experiment.

You can see, of course, that with this method we can attempt to disprove any definite theory. If we have a definite theory, a real guess, from which we can conveniently compute - consequences which can be compared with experiment, then in principle we can get rid of any theory. There is always the possibility of proving any definite theory wrong; but notice that we can never prove it right. Suppose that you invent a good guess, calculate the consequences, and discover every time that the consequences you have calculated agree with experiment. The theory is then right? No, it is simply not proved wrong. In the future you could compute a wider range of consequences, there could be a wider range of experiments; and you might then discover that the thing is wrong. That is why laws like Newton's laws for the motion of planets last such a long time. He guessed the law of gravitation, calculated all kinds of consequences for the system and so on, compared them with experiment and it took: several hundred years before the slight error of the motion of Mercury was observed.

During all that time the theory had not been proved wrong. and could be taken temporarily to be right. But it

could never be proved right, because tomorrow's experiment might succeed in proving wrong what you thought was right. We never are definitely right. we can only be sure we are wrong.

Another thing I must point out is that you cannot prove a vague theory wrong. If the guess that you make is poorly expressed and rather vague, and the method that you use for figuring out the consequences is a little vague-you are not sure, and you say, "I think everything's right because its all due to so and so, and such and such do this and that more or less, and I can sort of explain how this works. . . ," then you see that this theory is good, because it cannot be proved wrong! Also if the process of computing the consequences is indefinite, then with a little skill any experimental results can be made to look like the expected consequences. You are probably familiar with that in other fields. "A" hates his mother. The reason is, of course, because she did not caress him or love him enough when he was a child. But if you investigate you find out that as a matter of fact she did love him very much, and everything was all right. Well then, it was because she was over-indulgent when he was a child! By having a vague theory it is possible to get either result. The cure for this one is the following. If it were possible to state exactly, ahead of time, how much love is not enough, and how much love is over-indulgent, then there would be a perfectly legitimate theory against which you could make tests. It is usually said when this is pointed out, "When you are dealing with psychological matters things can't be defined so precisely." Yes, but then you

cannot claim to know anything about it.

You will be horrified to hear that we have examples in physics of exactly the same kind. We have these approximate symmetries, which work something like this. You have an approximate symmetry, so you calculate a set of consequences supposing it to be perfect.

When compared with experiment, it does not agree. Of course-the symmetry you are supposed to expect is approximate, so if the agreement is pretty good you say, "Nice!," while if the agreement is very poor you say, "Well, this particular thing must be especially sensitive to the failure of the symmetry." Now you may laugh, but we have to make progress in that way. When a subject is first new, and these particles are new to us, this jockeying around, this "feeling" way of guessing at the results, is the beginning of any science. The same thing is true of the symmetry proposition in physics as is true of psychology, so do not laugh too hard. It is necessary in the beginning to be very careful. It is easy to fall into the deep end by this kind of vague theory. It is hard, to prove it wrong, and it takes a certain skill and experience not to walk off the plank in the game. . . .

What of the future of this adventure? What will happen ultimately? We are going along guessing the laws; how many laws are we going to have to guess? I do not know. Some of my colleagues say that this fundamental aspect of our science will go on; but I think there will certainly not be perpetual novelty, say for a thousand years. This thing cannot keep on going so that we are always going

to discover more and more new laws. If we do, it will become boring that there are so many levels one underneath the other. It seems to me that -what can happen in the future is either that all the laws become known-that is, if you had enough laws you could compute consequences and they would always agree with experiment, which would be the end of the line or it may happen that the experiments get harder and harder to make, more and more expensive, so you get 99.9 per cent of the phenomena, but there is always some phenomenon which has just been discovered, which is very hard to measure, and which disagrees; and as soon as you have the explanation of that one there is always another one, and it gets slower and slower and more and more uninteresting. That is another way it may end. But I think it has to end in one way or another.[1]

لے کاٹوش کا نظریہ: دفاع سائنس کا متکلمانہ حصار:

لے کاٹوش کا Refutable Protective Belt کا نظریہ سائنس کے دفاع کا اہم نظریہ ہے، اس طریقہ کار کو کسی بھی سائنسی نظریے سے پیدا ہونے والے مسائل کے دفاع کے لیے اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ سائنسی نظریے کی ایک ایسی علمی وعملی اور عقلی ونظری توضیح، توجیہہ وتشریح ممکن ہو جاتی ہے جو اس نظریے میں پیدا ہونے والی خامیوں اور در آنے والے تضادات کا ازالہ یا امالہ کر کے اصل نظریے کو محفوظ کر دیتی ہے اور اس نظریے کی خامیوں کو اسی نظریے کے منہاج علم میں رفع کر دیتی ہے ،یعنی نظریے پر اعتراضات یا اس میں موجود خامیوں کو دور کرنے کا نظام قوت وعمل اسی نظریے کے منہاج کے اندر مہیا کیا جاتا ہے۔ لے کاٹوش کے خیال میں پاپر کے نظریہ تردیدیت سے کسی نظریے کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا، کسی نظریے کو رد کرنے کے لیے اسے کئی سطحوں پر جانچنا اور پرکھنا ہوگا صرف ایک دو تجربوں سے رد کرنے کا طریقہ ٹھیک نہیں، لے کاٹوش مذہب سائنس [Religion of Science] کا زبردست دفاع کرتا ہے، سائنسی نظریات پر اٹھنے والے اعتراضات، شبہات اور سوالات کا وہ سائنس کے منہاج میں زبردست دفاع کرتا ہے، اس دفاع کے لیے وہ نہ صرف دلیلیں لاتا ہے بلکہ علم کلام سے

---

1. Richird Feynman, *The Character of Physical Law*. MIT Press

بھی کام لیتا ہے اور شکست پر شکست کھانے کے باوجود سائنسی نظریے پر ایمان، یقین اور اعتقاد سے دستبردار نہیں ہوتا، اس کے ایمان کا مشاہدہ کرنے کے لیے اس کے دلائل کا مطالعہ ضروری ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تجربات کی روشنی میں سائنسی نظریے کی تردید ہونے کے باوجود سائنس داں اپنے نظریے سے دستبردار نہیں ہوتے، سائنس دان اپنے مفروضات اور نظریات کو ایمانیات کا درجہ دیتے ہیں۔ اس ایمان کے تحفظ، یعنی اپنے نظریے کو درست ثابت کرنے، کے لیے ''کتاب الحیل'' سے کام لیتے ہیں اور اپنے نظریے کی ہر خامی کی کوئی ایسی علمی توجیہہ بیان کرتے ہیں جس کے ذریعے اس نظریے کی حقانیت ثابت ہوتی رہے۔ سائنس کے بارے میں عموماً مسلمانوں کے تمام جدیدیت پسند مفکرین کی متفق علیہ لیکن قطعی غلط، بے بنیاد اور غیر علمی رائے یہ ہے کہ سائنس کوئی غیر متنازعہ، نہایت واضح، نور کی طرح روشن دو اور دو چار کی طرح نظر آنے والا ثابت شدہ، تجرباتی سطح پر سو فی صد آزمودہ، ٹھوس، قطعی، حقیقی، سچا، غیر متبدل، حتمی، آخری، فنا سے عاری اور درست علم [absolute knowledge] ہے، وہ اسے آکسیجن اور ہائیڈروجن کے ملاپ کے نتیجے میں لازماً پانی بن جانے کی طرح کا ایک عمل سمجھتے ہیں، جب کہ پانی اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا انسان نے صرف یہ معلوم کیا کہ پانی کیسے بنتا ہے، سائنس کے مختلف بڑے نظریات اور اصول مختلف قیاسات، مفروضات، اندازوں، تیر تکوں، وجدان اور اتفاقی حادثات کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں، کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ نظریہ وجدانی سطح پر پیش کر دیا جاتا ہے جو بالکل درست ہوتا ہے لیکن اس کو تجرباتی سطح یا عملی طور پر ثابت کرنے میں دو سو اور تین سو سال لگ جاتے ہیں، مثلاً کاپرنیکس کا نظریہ کہ زمین متحرک ہے سورج چاند ساکن ہیں۔ پھر یہ خیال کہ سائنس اس قدر حسابی اور کتابی ہے کہ ایک ہندسے کے بدل جانے سے پورے نتائج بدل جاتے ہیں یہ بھی محض مفروضہ ہے، ایک سو برس تک Pluto کو نظام شمسی کا نواں سیارہ [Planet] قرار دیا گیا، تمام طلبا اور سائنس داں سو سال تک یہی پڑھتے رہے، علم فلکیات کے ماہرین فلکیات خلائے بسیط، فضائے محیط، عالم افلاک، نظام سیارگان اور کہکشاؤں کے سلسلے کے تمام حساب کتاب، مساواتیں، جمع ضرب تفریق تقسیم نو [9] کے ہندسے سے کرتے رہے لیکن سن دو ہزار سات میں دنیا بھر کے تمام سائنس دانوں نے اتفاق رائے سے کہہ دیا کہ Pluto نواں سیارہ نہیں ہے، لہٰذا سیارے صرف آٹھ رہ گئے۔ ۲۰۰۹ء میں کپلر دوربین کو خلاء میں بھیجا گیا تو اس نے پانچ نئے سیارے دریافت کر لیے جو بڑے بڑے سیاروں سے بھی بڑے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی میں جب فلکیات کا تمام حساب کتاب ۹ کے ہندسے کے تحت ہو رہا تھا۔ جب کہ یہ حساب غلط تھا اصلاً یہ حساب کتاب تیرہ کے ہندسے سے ہونا چاہیے تھا لیکن غلط ترین حسابات کے باوجود اس صدی میں محیر العقول ترقی ہوئی، سیٹلائٹ، وغیرہ اسی صدی میں بھیجے گئے، خلاء میں سائنسی تحقیقات کا انبار آیا خلائی شٹل، ہبل کی دوربین، چاند پر انسان کا اترنا، سب کچھ اسی صدی میں ہوا اور اسی صدی میں ماہر فلکیات تمام حسابات غلط کرتے رہے، لیکن ترقی کا پہیہ بھی رواں دواں رہا، اس سے معلوم ہوا کہ سائنس غلطی کے ساتھ بھی کام کرتی رہتی ہے یہ کام چلانے کا ایک طریقہ ہے، چونکہ کام چلتا رہتا ہے لہٰذا ہمیں یہ بہت اچھی لگتی

ہے، لیکن اس میں سچائی، حقیقت اور درستگی کا عنصر کتنا ہے یہ خود سائنس دانوں کو نہیں معلوم، وہ کہتے ہیں بس It works چونکہ تلاش حقیقت [discovery of reality] اٹھارہویں صدی کے بعد سائنس کا مسئلہ ہی نہیں رہا لہٰذا حقیقت کی تلاش جب ہدف ہی نہیں ہے تو طریقہ کار کی سو فی صد درستگی بھی مسئلہ نہیں ہے، چونکہ سائنس اٹکل پچو طریقے سے کام کرتی ہے لہٰذا سائنس داں اس کا دفاع بھی اسی اٹکل، پچو طریقے سے کر لیتے ہیں اس ضمن میں Imre Lakatos نے ایک عمدہ مثال بیان کی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''ایک سائنس داں کسی سیارے کے مدار کے بارے میں نیوٹن کے نظریۂ کشش ثقل کے تحت مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ فرض کریں کہ اس سیارے کے مشاہدہ کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریے کے بتائے ہوئے مدار پر سفر نہیں کر رہا۔ کیا وہ اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ نیوٹن کا نظریہ کشش ثقل غلط ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ یہ کہے گا اس سیارے کے نزدیک اب کوئی نامعلوم سیارہ موجود ہوگا جس کی کشش کی وجہ سے زیر مطالعہ سیارہ اپنے مدار سے ہٹ کر سفر کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ اس نامعلوم سیارے کے وزن، حجم اور مدار کے بارے میں حساب وتخمینہ لگاتا ہے اور پھر اپنے ساتھی سائنس دانوں کو اس نامعلوم سیارے کے مشاہدہ کا کام سپرد کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نامعلوم سیارہ اتنا چھوٹا ہو کہ اب تک کی طاقتور ترین دوربین کی مدد سے بھی نہ دیکھا جاسکتا ہو۔ لہٰذا وہ سائنس دان حکومت سے ریسرچ کی مد میں فنڈ مانگتے ہیں تاکہ ایک بڑی اور طاقتور دوربین تیار کی جاسکے۔ لگ بھگ تین برس کے عرصے میں ایک نئی دوربین تیار کر لی جاتی ہے۔ اگر تو اس دوربین کی مدد سے وہ نامعلوم سیارہ نظر آجائے تو سائنس دان خوشیاں منائیں گے کہ نیوٹن کے نظریے کی ایک بار پھر تصدیق ہوگئی۔ فرض کریں وہ نامعلوم سیارہ دوربین میں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا سائنس دان اسے نیوٹن کے نظریے کی شکست تسلیم کرلیں گے؟ نہیں بلکہ وہ کہیں گے کہ دراصل ایک فضائی بادل [Cloud of Cosmic Dust] نے اس نامعلوم سیارے کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ سیارہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ چنانچہ سائنس دان مزید ریسرچ فنڈ مانگتے ہیں تاکہ ایک خلائی شٹل بادل کے مشاہدے کے لیے بھیجی جاسکے۔ اگر خلائی شٹل کسی ایسے بادل کی نشاندہی کردے تو اسے نیوٹن کے نظریے کی زبردست کامیابی قرار دیا جائے گا۔ لیکن فرض کریں وہ بادل بھی نہ پایا جائے کیا اب سائنس دان نیوٹن کے نظریۂ کششِ ثقل بشمول اپنے خیالات کہ ایک نامعلوم سیارہ ہے یا یہ کہ ایک فضائی بادل ہے کی تردید کر دیں گے؟ نہیں بلکہ اب وہ کہیں گے کہ کائنات کے اس حصے میں کوئی مقناطیسی قوت [Magnetic Field] ہے جس نے سٹیلائٹ کے آلات کو صحیح کام نہیں کرنے دیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ بادل دریافت نہ ہوسکا۔ چنانچہ ایک نئی قسم کی خلائی شٹل تیار کر کے فضا میں بھیجی جاتی ہے۔ اگر وہ مقناطیسی قوت وہاں مل جائے تو نیوٹن کے مداح سائنس دانوں کی خوشی کی انتہا نہ ہوگی۔ لیکن فرض کریں ایسا نہ ہوسکے۔ کیا اب وہ نیوٹن کے نظریے کی شکست تسلیم کرلیں گے؟ نہیں بلکہ وہ ایک نیا اضافی مفروضہ تراشیں گے.........
یہاں تک کہ یہ سالوں پر محیط کہانی تحقیقی رسالوں کی اقساط میں دب کر گم ہوجاتی ہے اور پھر کبھی بیان نہیں

کی جاتی"۔[1]

فائن مین لے کاٹوش کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتا وہ لکھتا ہے:

It would have been in fact, the death of this wonderful theory if there were no other explanation. If a Law does not work even in one place where it ought to it is just wrong.[2]

طبیعیت کی دنیا میں انقلاب: کوانٹم فزکس اور کلاسیکل فزکس:

پلانکس کو انٹم تھیوری انیسویں صدی میں پیش کی گئی اس وقت کہا جاتا تھا کہ توانائی [Energy] اور مادّہ [Matter] میں فرق ہے، انرجی مسلسل اور شعاعوں کی شکل میں ہوتی ہے، جب کہ مادّہ ٹھوس ہوتا ہے، مادہ کی شکل میں ایک جوہر دوسرے سے جدا ہوتا ہے لہٰذا مادہ Discontinue ہوتا ہے یہ مادہ اور روشنی دونوں کا بنیادی فرق تھا، پلانکس نے کہا کہ روشنی پیکٹ کی صورت میں سفر کرتی ہے لہٰذا Wave Theory of Light روشنی کی شعاعوں کا نظریہ سوالیہ نشان بن گیا اس وقت تمام طبیعیات دان شعاعوں کی صورت میں روشنی کے سفر کے قائل تھے۔

سایہ بننے کا عمل، روشنی کے انعطاف [Difrection] کا طریقہ کار، پولرائزیشن کا طریقہ منشور سے گزر کر روشنی کا سات رنگوں میں ڈھلنا، یہ سب تجربات، مشاہدات، نتائج پلانکس کی تھیوری سے ثابت نہیں ہوتے تھے۔ پیکٹ تھیوری کو مذاق سمجھ کر تمام طبیعیاتی سائنس دانوں نے مشترکہ طور پر رد کر دیا تھا۔ لیکن روشنی کا شعاعی نظریہ اس بات کا جواب نہیں دے سکا کہ Lines spectrum کیوں بنتے ہیں؟ ظاہر ہے اس سوال کا تعلق جوہر کے ڈھانچے سے تھا۔ بوہر جب آیا تو اس نے پلانکس کے روشنی کے نظریے سے اس طریقہ کار کی تشریح اس طرح کی کہ یہ مسئلہ اس نے حل کر دیا پلانکس کا نظریہ روشنی کئی سال بعد درست ثابت ہو گیا۔ مسترد شدہ نظریہ زندہ ہو گیا۔ طبیعیات کی دنیا میں انقلاب آ گیا۔ اس کے نتیجے میں طبیعیات کلاسیکل فزکس اور کوانٹم فزکس کے دو دائروں میں تقسیم ہو گئی۔ یہ نظریہ کہ سائنس ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے اس نظریے سے غلط ثابت ہو گیا۔ یہ بات بھی علمی دنیا میں تسلیم کر لی گئی کہ کسی عمل، حقیقت اور نتیجے کی ایک ہی سائنسی تشریح تمام جزئیات کو بیان نہیں کر سکتی۔ اگر ذاکر نائیک صاحب اس وقت موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی پلانکس کی پیکٹ تھیوری [Packet Theory] کو

---

1. Imre Lakotos and A. Musgrave [ed.], *Falsification & Methodology of Scientific Research Programme*, in *Criticism and the Growth of Knowledge*, Cambridge: Cambridge University Press, 1974, pp.100-101.

2. P. Feynman, *Six Easy Pieces*. U.S.A.: Helix Books, 1995, p.99

حقیقت تسلیم نہیں کرتے اور ویوز تھیوری [Waves Theory]، کے حق میں قرآن وسنت، عقل و منطق، علم وفن اور دلائل کے انبار لگا دیتے۔ اسی لیے کسی بھی سائنسی حقیقت کو حتمی، قطعی اور آخری حقیقت مان کر اس کو ٹھوس نتیجہ سمجھنا، فلسفۂ سائنس کی دنیا میں فی زمانہ ایک غیر علمی رویہ ہے۔ کیا پلانکس کی کوانٹم تھیوری ٹھوس حتمی اور قطعی ہے؟ ظاہر ہے بالکل نہیں! فائن مین اس کے بارے میں لکھتا ہے:

Newton thought that light was made up of particles, but then it was discovered, as we have seen here, that it behaves like a wave. Later, however (in the beginning of the twentieth century) it was found that light did indeed sometimes behave like a particle. Historically, the electron, for example, was thought to behave like a particle, and then it was found that in many respects it behaved like a wave. So it really behaves like neither. Now we have given up. We say: "It is like neither." There is one lucky break, however-electrons behave just like light. The quantum behavior of atomic objects (electrons, protons, neutrons, photons, and so on) is the same for all; they are all "particle waves," or whatever you want to call them. So what we learn about the properties of electrons (which we shall use for our examples) will apply also to all "particles," including photons of light.

The gradual accumulation of information about atomic and small-scale behavior during the first quarter of this century, which gave some indications about how small things do behave, produced an increasing confusion which was finally resolved in 1926 and 1927 by Schrodinger, Heisenberg, and Born. They finally obtained a consistent description of the behavior of matter on a small scale.[1]

''زماں، مکاں، حرکت سے متعلق قدیم سائنسی نظریات نیوٹن کے قوانین حرکت نے یکسر ختم کر دیے لیکن نیوٹن کے قوانین حرکت تک علمی سفر ایک دو جستوں میں مکمل نہیں ہوا۔ کاپرنیکس، گیلی لیو کو سب

جانتے ہیں لیکن Tycho Brahe جیسے عظیم ماہر فلکیات کو کوئی نہیں جانتا جو اپنی رصدگاہ میں سالوں تک سیاروں اور ستاروں کی گردش کا مشاہدہ کر کے ان نتائج کو ہزاروں صفحات میں سموتا اور منتقل کرتا رہا، کوپن ہیگن کے جزیرہ Hven کی اس رصدگاہ کو لوگ بھول گئے ہیں۔ Tycho کے تحریری ضخیم مشاہدات سے استفادہ کرتے ہوئے ریاضی داں Kepler نے سیاروں کی حرکت کے سادہ مگر نہایت خوبصورت اور معرکہ آرا قوانین دریافت کیے، اس کے بعد نیوٹن نے اپنے قوانین پیش کیے، لیکن جس طرح کلاسیکل فزکس قطعی نہیں تھی اس طرح نیوٹونین فزکس اور آئن اسٹائن کی فزکس ٹھوس قطعی اور حتمی نہیں ہے فائن مین لکھتا ہے:

Finally let us compare gravitation with other theories. In recent years we have discovered that all mass is made of tiny particles and that there are several kinds of interactions, such as nuclear forces, etc. None of these nuclear or electrical forces has yet been found to explain gravitation. The quantum-mechanical aspects of nature have not yet been carried over to gravitation When the scale is so small that we need the quantum effects, the gravitational effects are so weak that the need for a quantum theory of gravitation has not yet developed. On the other hand, for consistency in our physical theories it would be important to see whether Newton's law modified to Einstein's law can be further modified to be consistent with the uncertainty principle. This last modification has not yet been completed.[2]

یہ خیال کہ سائنس تجربات سے وجود پذیر ہوتی ہے درست نہیں ہے، کوپرنیکس، پلانکس، یوکاوا [Yukawa] نیوٹن اور آئن اسٹائن نے اپنے نظریات، طبیعیاتی اور ریاضیاتی قوانین صرف تجربہ گاہوں میں جا کر اخذ نہیں کیے یہ نتائج رفتہ رفتہ علم اور تجربے سے تصدیق حاصل کرتے رہے یہ کام دوسرے سائنس دانوں نے کیا۔ فائن مین لکھتا ہے:

Because atomic behavior is so unlike ordinary experience, it is very difficult to get used to and it appears peculiar and mysterious to everyone, both to the novice and to the experienced physicist. Even the experts do not

1. Ibid.,p.116. 2. Ibid., p.113.

understand it the way they would like to, and it is perfectly reasonable that they should not, because all of direct, human experience and of human intuition applies to large objects. We know how large objects will act, but things on a small scale just do not act that way. So we have to learn about them in a sort of abstract or imaginative fashion and not by connection with our direct experience.[1]

But is this such a simple law? What about the machinery of it? All we have done is to describe how the earth moves around the sun, but we have not said what makes it go. Newton made no hypotheses about this; he was satisfied to find what it did without getting into the machinery of it. No one has since given any machinery. It is characteristic of the physical laws that they have this abstract character. The law of conservation of energy is a theorem concerning quantities that have to be calculated and added together, with no mention of the machinery, and likewise the great laws of mechanics are quantitative mathematical laws for which no machinery is available.

We use mathematics to describe nature without a mechanism behind it? No one knows. We have to keep going because we find out more that way.

Many mechanisms for gravitation have been suggested. It is interesting to consider one of these, which many people have thought of from time to time. At first, one is quite excited and happy when he "discovers" it, but he

1. Ibid., p. 117.

soon finds that it is not correct.[1]

کیا سائنس آئیڈیل علم ہے؟ اگر ہے تو کیا اس کے تجربات آئیڈیل ہوتے ہیں؟ کیا فطرت کو سائنس کے مثالی [Ideal] طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے کیا؟ اس طرح کے دعوے جدید سائنس کی دنیا میں درست دعوے ہیں؟ ایک مثالی تجربہ [Ideal Experiment] کیا ہوتا ہے؟ اس بارے میں فائن مین ہمیں بتاتا ہے کہ فطرت کو جاننے کا طریقہ اور تجربہ مثالی نہیں ہے، اسی نقطہ نظر کی تشریح کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے:

(1) The probability of an event in an ideal experiment is given by the square of the absolute value of a complex number 0 which is called the probability amplitude.

P = probability,

f = probability amplitude,

$P = |f|^2$.

(2) When an event can occur in several alternative ways, the probability amplitude for the event is the sum of the probability amplitudes for each way considered separately. There is interference.

$f = f_1 + f_2$,

$P = |f_1 + f_2|^2$.

(3) If an experiment is performed which is capable of determining whether one or another alternative is actually taken, the probability of the event is the sum of the probabilities for each alternative. The interference is lost.

$P = P_1 + P_2$.

One might still like to ask: "How does it work? What is the machinery behind the law?" No one has found any machinery behind the law. No one can "explain" any more than we have just explained." No one will give you any deeper representation of the situation. We have no ideas

1. Ibid., pp. 107-108.

about a more basic mechanism from which these results can be deduced. We would like to emphasize a very important difference between classical and quantum mechanics. We have been talking about the probability that an electron will arrive in a given circumstance. We have implied that in our experimental arrangement (or even in the best possible one) it would be impossible to predict exactly what would happen. We can only predict the odds! This would mean, if it were true, that physics has given up on the problem of trying to predict exactly what will happen in a definite circumstance. Yes! Physics has given up. We do not know how to predict what would happen in a given circumstance, and we believe now that it is impossible, that the only thing thnt can be predicted is the probability of different events. It must be recognized that this is a retrenchment in our earlier ideal of understanding nature. It may be a backward step, but no one has seen a way to avoid it.

We make now a few remarks on a suggestion that has sometimes been made to try to avoid the description we have given: "Perhaps the electron has some kind of internal works-some inner variables-that we do not yet know about. Perhaps that is why we cannot predict what will happen. If we could look more closely at the electron we could be able to tell where it would end up." So far as we know, that is impossible. We would still be in difficulty.[1]

حواس سے صرف احتمالی سچ تک ہی رسائی ممکن ہے:

فلسفہ سائنس کی کوئی بھی کتاب پڑھ لی جائے، ہر کتاب میں یہی تصور اور نظریہ اور اصول ملے

1. Ibid.، pp. 134-135.

گا کہ حواس خمسہ کی بنیاد پر حاصل کردہ علم اخذ کردہ نتائج، مشاہدات اور تجربات سے صرف امکانی سچ [Probable Truth] تک رسائی ممکن ہے نہ کہ ٹھوس، قطعی، حقیقی، اصلی، واقعی اور ابدی، سچائی تک۔ سائنسی علم اس علم کو کہتے ہیں جس میں کذب، تردید اور انکار کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ جس نظریے میں رد ہونے کے زیادہ امکانات ہوں گے وہ نظریہ زیادہ ترقی کرے گا، ارتقاء کی منازل کا سفر کامیابی سے طے کرے گا۔ سائنس کی سچائی سائنسی طریقے [سائنٹفک میتھڈ] سے آتی ہے۔ یعنی سائنسی علم محتاج ہے سائنسی طریقہ کار کا، جب کہ حقیقت سائنسی علم سے ماورا ہوتی ہے اور بے شمار سائنس داں اس کا انکار نہیں کرتے لیکن سائنس دانوں کا موقف یہ ہے کہ ہم علم کے دائرے میں صرف اس حقیقت کو زیر بحث لائیں گے جو ہمارے محدود تجربے کے دائرے میں آسکے۔ ہمارے تجربے اور علم کے دائرے سے حقیقت کے خارج ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقت نہیں ہے لیکن سائنسی علمیت اسے سائنسی حقیقت کے طور پر قبول نہیں کرتی۔ جو حقیقت سائنسی ذریعہ علم کے ذریعہ دائرہ فہم میں نہیں آسکتی وہ حقیقت کے زمرے سے خارج نہیں ہوتی۔ اس سے حقیقت کا انکار نہیں ہوتا بلکہ سائنسی ذریعہ علم کی تحدید کا اندازہ ہوتا ہے۔ سائنسی حقیقت [scientific fact of reality] صرف طے شدہ سائنسی علمیت [specific scientific method] سے ہی حاصل ہوسکتی ہے، اس مقام پر سائنسی علمیت اپنی محدودیت کا اعتراف کرنے کے بجائے تکنیکی طریقے سے حقیقت الحقائق کا انکار کرتی ہے۔ لہٰذا اصلاً وہ تمام حقیقتیں فی الواقع حقیقت ہوتی ہیں جو اپنے ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتی ہیں، وہ exists as its own right ہوتی ہیں وہ کسی خارجی ذریعہ تصدیق کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ حقیقتیں اپنے دائرے اور اپنے منہاج علم میں حقیقت تسلیم کی جاتی ہیں جو اس منہاج علم کو تسلیم نہیں کرتا وہ اس حقیقت کو حقیقت ہی نہیں مانتا کیوں کہ اس کا منہاج اُس کے ذریعے اور اخذ کردہ نتائج کی علمیت بھی بالکل مختلف ہے، اسی لیے انبیا لوگوں کے قلوب بدل کر انھیں علم صحیح عطا کر کے وہ منہاج دیتے ہیں جس میں حقیقت عین الیقین کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ، جیسے کہ روح اور جیسے کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم۔

حقیقت ناقابلِ تغیر و تبدل ہے:

حقیقت کسی طریقہ کار کے ذریعے عارضی طور پر حقیقت مان لی جائے اور یہ حقیقت قطعی اور حتمی نہ ہو بلکہ اس طریقہ کار کے تحت اس حقیقت کو بدلنے، رد کرنے کے سو فیصد امکانات ہر وقت موجود رہیں۔ تو حقیقت حقیقت اصلی نہیں ہے موضی، سائنسی یعنی وقتی حقیقت ہے جب کہ حقیقت بدلتی نہیں وہ ازل سے ابد تک ایک رہتی ہے، جو بدل جائے اور مسلسل بدلتی رہے وہ حقیقت نہیں بلکہ سائنسی علم ہے اور کسی نظریے کی محض سائنسی توجیہہ۔ سائنسی طریقہ کسی آفاقی سچ کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔ یہ سائنسی طریقے کا مسئلہ ہے ہمارا اعتراض اس طریقے پر ہے جسے جدیدیت پسند مسلم مفکرین سائنٹفک میتھڈ قرار دیتے ہیں۔ اور اس سے ماورائے سائنس حقائق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی ذہن کے استعمال کے نتیجے میں پیدا

ہونے والی کوششوں کو جاننے کا طریقہ سائنٹفک میتھڈ ہے۔ مذہب انسانی کوششوں کا نتیجہ نہیں یہ انعام ربی اور وحی الٰہی ہے۔ لہٰذا العلم یعنی وحی کا موازنہ یا تجزیہ یا اس کی تصدیق تائید و توثیق کے لیے انسانی، ظنی، قیاسی، حسی، تجربی، غیر قطعی، عقلی، عملی، اختباری، وجدانی اور قابل تغیر سائنسی طریقے سے مدد لینا غیر سائنسی اور غیر دینی رویہ ہے۔ سائنس کے منہاج علم میں بھی یہ طریقہ قابل قبول نہیں ہے اور مذہب کے منہاج میں بھی یہ غیر معتبر طریقہ کار ہے۔

یونانی دیومالا: علم کی اذیت کا فلسفہ:

دو سو اسی قبل مسیح میں ارسطو نے حرکت کا نظریہ پیش کر کے علم کونیات کو ایک نیا تصور دیا کہ کوئی چیز حرکت اس لیے کرتی ہے کہ چیزیں اپنے اصل کی طرف سفر کرتی ہیں آگ اوپر جاتی ہے، پتھر سمندر کے نیچے پاتال میں جاتا ہے کیونکہ وہاں زمین ہے آسمانی اجسام سورج تارے، چاند، آگ کے ہیں اس لیے اوپر رہتے ہیں اور اسی لیے آگ ہمیشہ اوپر کی طرف جاتی ہے۔ انسان عناصر اربعہ سے تخلیق ہوا ہے، ہوا، مٹی، پانی اور آگ، اس کی روح آگ سے تخلیق ہوئی ہے، اس لیے انسان کے انتقال کرتے ہی اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر جاتی ہے کیونکہ آگ بلندی کی طرف جاتی ہے اس لیے یونانی فکر میں انسان مرنے کے بعد اپنے اچھے اعمال کے باعث ستارہ بن کر آسمان پر چمکے گا اور بعض فلاسفہ کے یہاں برے اعمال کے باعث عورت بنا کر اس دنیا میں بھیج دیا جائے گا، عورت بننا سب سے بڑی سزا ہے۔ ہوا بھی اوپر جاتی ہے اس لیے وہ پانی سے نکل کر اوپر چلی جاتی ہے۔ یونانی دیومالا کے مطابق آگ آسمان سے آتی ہے لہٰذا اوپر ہی جائے گی۔ پرومیتھس [Prometheaus] ایک یونانی دیومالائی خدا تھا جو علم کو آگ سمجھتا تھا۔ زیوس [Zuses] نے کہا انسان کو سب ملے گا، صرف آگ نہیں ملے گی۔ پرومیتھس کہتا تھا کہ آگ علم ہے وہ آگ آسمان سے لے کر بھاگ آیا۔ اور زمین پر اس نے آگ انسانوں کے سپرد کر دی۔ زیوس نے پرومیتھس کو اس حرکت پر سخت ترین سزا دی اس کے سینے پر ایک گدھ مسلط کر دیا جو اس کا جگر نوچ نوچ کر کھاتا جاتا ہے۔ رات کو گدھ سوتا ہے تو جگر دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صبح گدھ دوبارہ جگر کھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس دیومالا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کے یہاں ہزاروں سال پہلے یہ علم موجود تھا کہ جگر خود بخود بنتا ہے۔ آج سائنس نے بتایا ہے کہ جگر خود پیدا [Re-generate] ہو جاتا ہے۔ یہ بات یونانیوں کو معلوم تھی۔ اس حکایت میں یہ بھی بتایا گیا کہ علم لذت اندوزی کا ذریعہ نہیں۔ یہ حکایت علم کی اذیت [agony of knowldge] بتاتی ہے کہ علم جب آتا ہے تو وہ آگہی روشنی لے کر آتا ہے جو اذیت رساں ہوتی ہے۔ یہ اذیت حاصل کرنے والا دنیا کو اس اذیت سے نجات دینے کے لیے کام کرتا رہتا ہے۔ قدیم یونانی فلسفۂ حقیقت کے چار اہم اجزا و عناصر تھے۔ یعنی آگ، ہوا، پانی، مٹی انھی چار عناصر سے حیات وجود میں آئی تھی:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا

ارسطو نے اپنے فلسفۂ حرکت کے ذریعے چار اجزا و عناصر کی ایک ایسی توجیہہ، تشریح و توضیح

پیش کی جس نے غالب علمیت سے ہم آہنگ علم کونیات کو جنم دیا جو دو ہزار سال تک دنیا بھر کے مفکرین کو متاثر کرتا رہا۔ اس وقت قوت تجاذب کا تصور نہیں تھا، ارسطو موشن کا تصور نیچرل آرڈر سے اخذ کرتا تھا:
Motion is a thing dependent on its natural order حرکت کا یہ یونانی تصور و فلسفہ ارسطو کی علمیت کے زیر اثر کئی صدیوں تک چلتا رہا سترہویں و اٹھارہویں صدی میں نیوٹن، گیلی اور کیپلر حرکت کے اس قدیم مستند لیکن غلط تصور پر سوالات اٹھا رہے تھے، نیوٹن نے Laws of Motion دریافت کر کے ارسطو کے تصور حرکت کو مسترد کر دیا۔ نائیک صاحب اس زمانے میں ہوتے تو یہی فرماتے کہ حرکت کا یونانی تصور ٹھوس سائنسی نتیجہ ہے جو دو ہزار سال سے مسترد نہیں ہو سکا اسے ٹھوس حقیقت مان لیا جائے اور قرآن کی آیات کو توڑ مروڑ کر اس نظریے کا اثبات قرآن سے ثابت بھی کر دیتے۔

کمیت [Mass] نیوٹن کی فزکس میں مطلق ہے لیکن وزن تبدیل ہو سکتا ہے، آئن اسٹائن کی فزکس میں کمیت اضافی [relative] شے ہے، آئن اسٹائن کی نئی تشریح کمیت سے نیوٹن کا تصور کمیت بدل گیا، نیا منہاج وجود میں آیا اور نئی سائنسی ترقی کا دریچہ کھل گیا۔ لیکن نیوٹن کی سائنس کا دریچہ بند نہیں ہوا وہ بھی موجود ہے۔

جناب ذاکر نائیک اس دور میں ہوتے تو اس سائنسی حقیقت کے بارے میں کیا مذہبی دلیل دیتے؟ وہی دلیلیں جو آج کل وہ عہد حاضر کی غیر قطعی سائنسی حقیقتوں کے بارے میں دے رہے ہیں۔ نائیک صاحب حقیقت، ادراکِ حقیقت، توجیہاتِ ادراکِ حقیقت الگ الگ اقالیم اور سطحیں ہیں وہ ان سطحوں کے باہمی فرق سے واقف نہیں ورنہ وہ خلط مبحث کا شکار نہ ہوتے یہ تین مختلف سطحیں ہیں اور اشیا کو دیکھنے کے ان تینوں طریقوں کے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔

حقیقت کی معرفت: اُصول اور ذرائع:

اصولی طور پر حقیقت اپنے ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتی ہے: Exists as its own right لیکن سوال یہ ہے کہ حقیقت تو ہے لیکن میں اسے جان سکتا ہوں یا نہیں؟ اور جو جان رہا ہوں اس میں معروضیت ہے یا نہیں؟ اور جو کچھ میں جان چکا فی الواقع وہ حقیقت ہے یا نہیں؟ اس کے لیے حقیقت [reality] اس کے حصول کی علمیت [Epistomology] اور اس علمیت کی معروضیت [objectivity of epistmology] کا جاننا ضروری ہے۔

سترہویں صدی میں سائنس دانوں اور بعض فلاسفہ نے دعویٰ کیا تھا کہ حقیقت تو ہے لیکن معروضیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے کا مفروضہ سائنٹفک میتھڈ کہلاتا ہے، یہ محض مفروضہ ہے حقیقت نہیں ہے کیونکہ حقیقت کیا ہے اس کا علم تو جدید سائنس اور فلسفے کو سرے سے نہیں ہے، اس لیے یہ کہنا کہ ہر حقیقت کو صرف معروضی عمل سے جانا جا سکتا ہے اور اس کا فہم معروضی عمل کے ذریعے ہی ممکن ہے ایک غلط بات ہے اس کے سوا بھی ہم حقیقت کو موضوعی اور جمالیاتی طور سے بھی جان سکتے ہیں۔ بعض حقیقتوں کو ہم نہایت شدت کے ساتھ صرف محسوس کرتے ہیں لیکن ان کے وجود کو تجربے، حسی عمل کے ذریعے دوسرے کو

نہیں بتا سکتے مثلاً احساس گناہ [Guilt]، احساس مسرت [Happiness]، احساس درد [Pain] احساس غم [Sadness] احساس محبت [Love] وغیرہ وغیرہ حقیقت کو جاننا علمیت کا دائرہ ہے حقیقت کو ایسے جاننا کہ اس میں معروضیت ہو یہ معروضیت اور مابعد الطبیعیات کا دائرہ ہے۔

سائنس ان حقیقتوں سے بحث کرے گی جو اس کے محدود حسی، تجربی، عملی، مادی اور اختباری دائرے میں آ سکیں، سائنسی دلائل حقیقت نہیں بلکہ توجیہات حقیقت [explanation of reality] ہیں، لیکن عموماً لوگ ان توجیہات [explanations] کو حقیقت [reality] سمجھ لیتے ہیں، جبکہ یہ توجیہات زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں، سائنس تو محض ایک میکانزم ہے جو توجیہات حقیقت کے ساتھ بدلتا ہے جہاں صرف حقیقت کو جانا نہیں جاتا بلکہ حقیقت کو تخلیق کیا جاتا ہے۔

دفاع مذہب کے لیے غیر معمولی ذہانت کی ضرورت:

میں خدا کا قائل ہوں مگر میری توجیہات احمقانہ ہوں تو اس سے خدا یا روحانیت کی تردید نہیں ہوتی، کسی دلیل کے رد ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقت نہیں ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت کے حق میں دی گئی دلیل کم زور ہے۔ کسی مضبوط سے مضبوط موقف کے حق میں بھی دلیل ہمیشہ مضبوط اور سوچ سمجھ کر دینی چاہیے ایک کمزور دلیل مضبوط موقف کو بھی کمزور کرنے کا باعث بن سکتی ہے لیکن اس کا ازالہ ایک طاقت ور دلیل سے کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے سائنس اور مذہب کے دفاع کا کام ذہین ترین لوگ کرتے ہیں لیکن عصر حاضر میں تمام ذہانت سائنس کے میدان میں منتقل ہوگئی ہے اور مذہب کے میدان سے ذہین لوگوں کا مسلسل انخلا ہو رہا ہے لہٰذا اس انخلا کو روکنے کی ضرورت ہے کہ ذہانت کا مقابلہ ذہانت سے بلکہ مد مقابل سے زیادہ ذہانت کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ انسان کی عمر بہت مختصر ہے وہ جس شے کو حقیقت سمجھ رہا ہے وہ اس کی زندگی تک حقیقت ہے، ممکن ہے، اس کے وصال کے بعد حقیقت وہ نہ رہے۔ جیسا کہ تاریخ میں اکثر ہوا ہے۔ دو ہزار سال تک تمام فلاسفہ مذہبی لوگ اور سائنس داں یقین کرتے رہے کہ زمین ساکن ہے یہی لکھتے، پڑھتے، لڑتے، جھگڑتے اور بحث و مباحثے کرتے کرتے مر گئے۔ حقیقت دو ہزار سال بعد تبدیل ہوگئی۔ پلوٹو [Pluto] کو ایک صدی تک نظام شمسی کا نواں سیارہ [Planet] سمجھا گیا، سو سال تک طلبا، اساتذہ سائنس داں یہی پڑھتے رہے، یہی پڑھتے پڑھتے مر گئے، اسی کو حقیقت سمجھتے رہے، لیکن ان کے مرتے ہی حقیقت تبدیل ہوگئی۔ لہٰذا سائنسی حقیقتوں کو اصل ٹھوس حقیقت سمجھنا فلسفۂ سائنس کی دنیا میں قابل قبول علمی رویہ نہیں۔

کئی سو سال تک یہ تصور سائنس راسخ رہا کہ انسان کا جینٹک کوڈ بدل جاتا ہے، حیاتیاتی علوم [biological science] میں نظریہ ارتقا [Evolution Theory] کے زیر اثر سالہا سال تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ adoption کے طریقے سے transformation ہو جاتا ہے جدید تحقیق سے معلوم ہوا کہ mutation کے ذریعے سے DNA تباہ ہوسکتا ہے دوبارہ تخلیق [reproduce] نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا کوڈ تبدیل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح پہلے نظریہ ارتقا کے تحت اگر

بیماری سے کسی کا جینیاتی کوڈ بدل گیا mutation ہوگیا جس کے نتیجے میں کسی انسان کے تین ہاتھ دوسر نکل آتے تو اسے نئی نوع سمجھا جاتا تھا لیکن یہ کیفیت اگلی نسل میں برقرار نہیں رہتی تھی لہٰذا mutation کو اب ارتقائی عمل نہیں سمجھا جاتا۔

قدیم ارتقا کے تصورات کے تحت ایک نوع دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی تھی اس کا کوڈ اس تبدیلی کے باعث بدل جاتا تھا لیکن اب ایک نوع دوسری نوع میں تبدیل ہی نہیں ہوسکتی یہ جدید تحقیق ہے، غرض سائنس کے ٹھوس نظریات صدیوں، سالوں اور طویل عرصے میں بدل جاتے ہیں ان سے مذہب یا قرآن کا اثبات کرنا غلط رویہ ہے، ہمارے یہاں مغربی سائنس کی جس طرح پرستش کی جاتی ہے خود مغرب سائنس کی اس طرح پرستش نہیں کرتا۔

سائنس، مفروضات سے ماورا: ایک مسترد نظریہ:

ڈیکارٹ سے ہزرل، ہیوم، برکلے، کانٹ، ہیگل، مارکس، اینجلز تک فلسفے کا مقصد Regress science بتایا جاتا تھا۔ مفروضات سے ماورا فلسفہ۔ سائنس کی پرستش اس بنیاد پر کی جاتی تھی کہ یہ مفروضات پر انحصار نہیں کرتی لیکن ہزرل نے اس طلسم کا پردہ فاش کر دیا اس کے فلسفہ، فنامنالوجی، اس کے بعد پوسٹ ماڈرن ازم، Existentialism اسٹرکچرل ازم، ڈی کنسٹرکشن ازم نے اس پورے تصور کو تہس نہس کر کے رکھ دیا کہ سائنس مفروضات سے ماورا کوئی شے ہے۔ ہزرل نے ثابت کیا کہ Positivism اور نیچرل ازم مفروضات سے ماورا [Pre-suppostion less] نہیں ہیں۔ بلکہ یہ نظریات اور فلسفے بے شمار مفروضات پر انحصار کرتے ہیں۔ ایک مفروضہ Realistic Dualism کا ہے، یعنی میں مان لوں کہ ایک subject اور ایک object ہے دونوں میں تعلق ہے لیکن دونوں ایک دوسرے پر منحصر نہیں۔

ہزرل معروضی علم کو ممکن سمجھتا تھا۔ اس نے نیچرل ازم اور پازیٹو ازم کو رد کیا لیکن اس خیال کو رد نہیں کیا کہ سائنٹفک میتھڈ کی بنیاد پر حاصل علم ماورائے تاریخ ہوسکتا ہے اس کے لیے ہزرل نے phenominological Reduction کا میتھڈ دیا لیکن فنامنالوجی سے زیادہ طاقت ور نظریہ Existensialism نکل کر آیا جس کا خالق ہزرل کا شاگرد رشید ہائیڈیگر تھا۔ ہزرل کے شاگرد ہائیڈیگر نے اشیا کی معروضیت کے اس تصور کو رد کر دیا جو فنامنالوجی سے اخذ کیا گیا تھا۔

ہائیڈیگر کے خیال میں ہزرل کا فلسفہ غیر جانبدار نہیں ہے۔ نہ ہی مفروضات سے ماورا ہے pure subject کبھی نہیں مل سکتا کیونکہ وجود ہمیشہ اس دنیا میں being in the world ہے لہٰذا نہ pure subject ہوگا نہ pure object۔

نیچرل ازم [Naturalism] اور پازیٹوازم [Positivism] کے اپنے اپنے مفروضات ہیں، ان مفروضات نے نہ صرف سائنس کو نقصان پہنچایا بلکہ فلسفے کا بھی گلا کاٹ دیا، ۱۹۳۶ء میں ہزرل کی کتاب Crisis of European Sciences لکھی گئی، اس کے بعد نیچرل ازم اور

پازیٹو ازم کی آفاقیت سوالیہ نشان بن گئی۔ ہزرل نے کہا کہ معروضی بنیادیں Naturalism اور Positivism سے اخذ نہیں کی جا سکتیں کیونکہ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر بذات خود مفروضوں پر قائم ہیں۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ جدید یورپی سائنس ایک خاص تہذیب، تاریخ، مابعد الطبیعیات، تناظر اور مفروضات کے افق سے طلوع ہوئی ہے۔ یہ آفاقی نہیں ہے۔ موضوعیت سے معروضیت کی طرف جانے کے لیے یعنی Subjectivity سے آزاد ہونے کے لیے ہزرل نے فنامناولوجیکل ریڈکشن [Phenominological Reduction] کا طریقہ دیا لیکن فلسفہ تاریخ بتاتا ہے کہ ہزرل کا یہ نظریہ خود مفروضات پر مبنی تھا اور غیر اقداری نہیں تھا۔

ہائیڈیگر نے کہا کہ اگر ہزرل کے فلسفے کو مان لیں تو زبان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، ہم معانی جس زبان سے اخذ کرتے ہیں کیا اخذِ معنی کا وہ درست طریقہ ہے؟ کیا ورائے زبان [Meta-language] زبان کے بغیر ہم مابعد الطبیعیاتی سوالات [Metaphysical question] کا علم اور ادراک حاصل کر سکتے ہیں؟ ماورائے تاریخ ہونے کے لیے کیا یہ زبان کافی ہے جو زمان و مکان میں محصور اور اسی کی پیداوار ہے؟ یا ادراک حقیقت کے لیے ورائے زبان کسی meta-language کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ مابعد الطبیعیاتی مسائل اور سوالات اور ان کے جوابات سمجھنے کے لیے کوئی زبان انسان تخلیق کر سکتا ہے؟ یا یہ وحی الٰہی کے ذریعے نازل ہوتی ہے یہ وہ سوالات ہیں جو ہائیڈیگر کے فکر پر اٹھائے جا سکتے ہیں، مگر ہائیڈیگر کے منہاج علم میں ان سوالات کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں یہ سوال بھی اہم ہے کہ اقدار [Values] کہاں سے آتی ہیں، وٹگنسٹائن جیسے فلسفی کے خیال میں اقدار باہر سے [external world] سے آتی ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا کوئی مابعد الطبیعیاتی زبان تخلیق کی جا سکتی ہے؟ جو ان مسائل کا فہم عطا کر سکے۔

کارل مارکس اپنے فلسفے کو سائنسی کہتا تھا اور خود کو سائنس داں سمجھتا تھا، لیکن اب تمام فلاسفہ کا اجماع ہے کہ سائنس مفروضات کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ Falsification اور Sophisticated Induction نے تسلیم کر لیا کہ سائنس نظریے سے شروع ہوتی ہے اس کا آغاز مشاہدے [Observation] سے نہیں ہوتا، سائنسی مشاہدات خاص نقطۂ نظر، مابعد الطبیعیات، مفروضات [Theory Laiden] کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ یہ نظریے میں گندھے ہوئے علمی تجزیے [Epistemological Analysis] وجودیاتی تجزیوں [Ontological Analysis] کے بغیر ممکن ہی نہیں دونوں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔

اٹھارویں صدی: فلسفے کا مقصد سچائی کی تلاش نہیں اس کی تخلیق:

سائنس کے ذریعے تلاش حقیقت کے مفروضے اور دعوے سے تو خود سائنس اٹھارہویں صدی میں دستبردار ہو گئی تھی۔ اٹھارہویں صدی تاریخ انسانی کے لیے ایک اور صدمے کے باعث یادگار رہے گی۔ کیونکہ اس صدی میں فلسفہ بھی تلاش حقیقت کے دعوے سے دستبردار ہو گیا۔ عہد یونان سے

کانٹ کے دور تک فلسفے کا مقصد حقیقت الحقائق کی تلاش اور جستجو رہی تھی لیکن کانٹ نے پہلی مرتبہ یہ اعلان کیا کہ فلسفہ کا مقصد سچائی کی تلاش نہیں ہے بلکہ انسانی مفادات کا تحفظ ہے۔ کانٹ نے مابعد الطبیعیات کی طرح فلسفے کو بھی انسان کا آلۂ کار بنا دیا۔ اس نقطۂ نظر کی کامل تفہیم کے لیے کانٹ کے نظریہ اخلاق اور اس کے فلسفہ سیاسی کو بغور پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کانٹ سے پہلے بہت سے فلاسفہ اخلاقیات، اخلاقی زندگی اور روحانیت کے لیے مذہب کے وجود کو اہم سمجھتے تھے اور ناگزیر خیال کرتے تھے۔ کانٹ وہ پہلا فلسفی ہے جس نے اس نقطۂ نظر کی مفصل علمی و عقلی تردید کر کے مذہب اور اخلاق کے درمیان آخری کڑی کو بھی توڑ کر رکھ دیا۔ کانٹ کے خیال میں اخلاقی اقدار کو عقل کے ذریعے سمجھا اور تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وحی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے نزدیک اخلاقیات کی بنیاد ارادہ انسانی ہے۔ ارادہ الٰہی یا قانون فطرت اخلاقیات کا منبع و ماخذ ہرگز نہیں ہے۔ اٹھارہویں صدی میں سائنس اور فلسفے کی جانب سے تلاش حقیقت کے دعوے سے دستبردار ہونے کے باوجود ہمارے جدیدیت پسند مفکرین ابھی تک سائنس کے ذریعے حقیقت الحقائق تک پہنچنے کی جستجو میں مصروف ہیں کیونکہ یہ نہ سائنس سے واقف ہیں نہ جدید فلسفے سے۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں سائنس کا مقصد کیا تھا:

The basic function of natural science was telological, it served to find the divine order of the universe whose main feature had been provided by revelation. In other words, science was principally a means of illustrating theological truths for emphasizing the need to go beyond material existence. The answers were known in advance it was the job of science to prove that faith was supported by reason and physical facts.[1]

ہمارے ذاکر نائیک صاحب ازمنہ وسطیٰ کے یورپ اور قدیم یونان کی تہذیب میں سائنس و ٹیکنالوجی کے مقاصد کو جدید سائنس پر منطبق کرنے کی غیر علمی اور لاحاصل مشق میں ابھی تک مصروف ہیں۔ سائنس جس کی اسلام کاری نائیک صاحب فرما رہے ہیں اس سائنسی علم کے بارے میں اگر مغرب کے صف اول کے فلاسفہ ہزرل، ہائیڈیگر، ڈلیوز، پاپر، مارکوزے، رچرڈ رارٹی، فوکالٹ، ہیبر ماس کی معرکہ آرا کتابیں پڑھ لی جائیں تو بہت سے توہمات ختم ہو سکتے ہیں، ان فلاسفہ اور سائنس دانوں کی کتابیں سائنس کی آفاقیت کے دعوے کو رد کرتی ہیں اور سائنس کے مفروضات سے ماوراء ہونے، اس

---

1. Pervez Hoodbhoy, *Muslims and Science: Religious Orthodoxy and the Struggle for Rationality*, Vanguard, 1991, p.80.

کے غیر اقداری عالمگیر ہونے کے تصورات کی تنقید کر کے اس اجمال کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔

مشہور ماہر معاشیات فریڈرک لسٹ جس نے بسمارک کے ساتھ مل کر کام کیا اور جرمنی کے جدید معاشیاتی ڈھانچے کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کیا۔ جدید انسان کے بارے میں وہ عجیب بات لکھتا ہے کہ "عقل مند آدمی وہ ہے جو جانتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے جو چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس زیادہ سے زیادہ کا حصول ایسے طریقے سے چاہتا ہے کہ کم سے کم خطرات کا سامنا کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کا جلد حصول جلد از جلد ممکن ہو جائے۔ جو شخص، فرد، معاشرہ ان تین سطحوں پر زندگی کے تانے بانے کو اس فلسفے کے تحت بننے کا قائل ہو وہی شخص، وہی تہذیب اور وہی فرد حقیقتاً عقلی [Rational] ہے، فریڈرک کا یہ تصور عقلیت معاشیات میں آج بھی مستعمل ہے اور مشہور سیاسی فلسفی John Rawls نے بھی اس تصور کو اپنے نظام فکر میں استعمال کیا ہے۔ جدید سائنس اس تیسری سطح کو زیادہ سے زیادہ مگر جلد سے جلد کو ممکن بنانے کا نام ہے۔ اس کا اسلام سے اور اسلام کی خدمت سے کوئی تعلق نہیں۔ جناب ذاکر نائیک صاحب کی تمام تحریروں کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے جدید فلسفہ اور جدید فلسفہ سائنس کی امہات کتب سے استفادہ نہیں کیا ورنہ وہ اس قسم کی بھیانک علمی اغلاط کا ارتکاب نہیں کرتے، محض ان کا اخلاص ان کی لاعلمی کا متبادل نہیں بن سکتا۔ سائنسی منہاج علم میں کسی نتیجے، تجربے، یا دریافت کو ٹھوس حقیقت کہنا ایک غیر سائنسی اور غیر علمی رویہ ہے۔

جدیدیت پسندوں کی سائیکالوجی سے مرعوبیت کی حقیقت:

عام طور پر جدیدیت پسند علم النفس سائیکالوجی کو عہد جدید کا عظیم علم سمجھتے ہیں ان کا ناقص خیال ہے کہ نفسیات علم روحانیات کے نئے دروا کر کے نئے دریچے کشادہ کرے گی جبکہ فی الحقیقت نفسیات کا روح سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور کسی بڑے نفسیات داں نے نفسیات کو روحانی مسائل کے لیے پیش ہی نہیں کیا، فائن مین نفسیات کے جعلی اور مصنوعی علم کے بارے میں عجیب وغریب اور اہم خیالات پیش کرتا ہے، سائیکالوجی کا دعویٰ ہے کہ وہ انسان کو جان سکتی ہے فائن مین کہتا ہے کہ انسان اپنے علم کی بنیاد پر ابھی تک کتے جیسے سادہ جانور کے مزاج، ذہن اور نفس بھی جاننے سے قاصر ہیں جو انسان کے مقابلے میں زیادہ سادہ حیوان ہے کیونکہ ہر انسان دوسرے انسان سے یکسر مختلف ہے لیکن نفسیات داں اس کو نہیں پہچان سکا:

Next, we consider the science of psychology. Incidentally, psychoanalysis is not a science: it is at best a medical process, and perphaps even more like witch-doctoring. It has a theory as to what causes disease - lots of different "spirits," etc. The witch doctor has a theory that a disease like malaria is caused by a spirit which comes into the air it is not cured by shaking a snake over it, but

quinine does help malaria. So, if you are sick, I would advise that you go to the witch doctor because he is the man in the tribe who knows the most about the disease; on the other hand, his knowledge is not science. Psychoanalysis has not been checked carefully by experiment, and there is no way to find a list of the number of cases in which it works, the number of cases in which it does not work, etc.[1]

The other branches of psychology, which involve things like the physiology of sensation-what happens in the eye, and what happens in the brain-are, if you wish, less interesting. But some small but real progress has been made in studying them. One of the most interesting technical problems may or may not be called psychology.

The central problem of the mind, if you will, or the nervous system, is this: when an animal learns something, it can do something different than it could before, and its brain cell must have changed too, if it is made out of atoms. In what way is it different? We do not know where to look, or what to look for, when something is memorized. We do not know what it means, or what change there is in the nervous system, when a fact is learned. This is a very important problem which has not been solved at all. Assuming, however, that there is some kind of memory thing, the brain is such an enormous mass of interconnecting wires and nerves that it probably cannot be analyzed in a straightforward manner. There is an analog of this to computing machines and computing elements, in that they also have a lot of lines, and they have some kind of element,

1. P. Feynman, *Six Easy Pieces,* U.S.A., Helix Books ,1995, p.63.

analogous, perhaps, to the synapse, or connection of one nerve to another. This is a very interesting subject which we have not the time to discuss further-the relationship between thinking and computing machines. It must be appreciated, of course, that this subject will tell us very little about the real complexities of ordinary human behavior. All human beings are so different. It will be a long time before we get there. We must start much further back. If we could even figure out how a dog works, we would have gone pretty far. Dogs are easier to understand, but nobody yet knows how dogs work.[1]

سائنس کو ایک فطری طریقۂ علم سمجھا جاتا ہے لیکن فائن مین ان طریقوں کو ہی فطری نہیں سمجھتا جن کے ذریعے سائنس یا فطرت کا علم حاصل کیا جارہا ہے، اس سوال پر نہایت گہرے غور و تدبر کی ضرورت ہے کہ جب حصولِ علمِ فطرت کے طریقے اور طریقۂ علم ہی غیر فطری ہوں تو ان سے فطری علم کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

It is very difficult to find an equation for which such a fantastic number is a natural root. Other possibilities have been thought of; one is to relate it to the age of the universe. Clearly, we have to find another large number somewhere. But do we mean the age of the universe in years? No, because years are not "natural"; they were devised by men.[2]

سائنس قیاس و گمان پر چلتی ہے:

سائنس اندازوں اور قیاس و گمان پر چلتی ہے یہ حتمی ذریعۂ علم نہیں، فائن مین کی شہادت پڑھیے:

The uncertainty principle "protects" quantum mechanics. Heisenberg recognized that if it were possible to measure the momentum and the position simultaneously with a greater accuracy, the quantum mechanics would collapse. So

---

1. Ibid., p. 64. 2. Ibid., p. 110.

he proposed that it must be impossible. Then people sat down and tried to figure out ways of doing it, and nobody could figure out a way to measure the position and the momentum of any thing-a screen, an electron, a billiard ball, anything-with any greater accuracy. Quantum mechanics maintains its perilous but accurate existence.[1]

Thus we are confronted with a large number of particles, which together seem to be the fundamental constituents of matter. Fortunately, these particles are not all different in their interactions with one another. In fact, there seem to be just four kinds of interaction between particles which, in the order of decreasing strength, are the nuclear force, electrical interactions, the beta-decay interaction, and gravity. The photon is coupled to all charged particles and the strength of the interaction is measured by some number, which is 1/137. The detailed law of this coupling is known, that is Quantum Electrodynamics. Gravity is coupled to all energy, but its coupling is extremely weak, much weaker than that of electricity. This law is also known. Then there are the so- called weak decays-beta decay, which causes the neutron to disintegrate into proton, electron, and neutrino, relatively slowly. This law is only partly known. The so-called strong interaction, the meson-baryon interaction, has a strength of 1 in this scale, and the law is completely unknown, although there are a number of known rules, such as that the number of baryons does not change in any reaction. This then, is the horrible condition of our physics

1. Ibid., p.38.

today. To summarize it, I would say this: outside the nucleus, we seem to know all; inside it, quantum mechanics is valid-the principles of quantum mechanics have not been found to fail. The stage on which we put all of our knowledge, we would say, is relativistic space-time; perhaps gravity is involved in space-time. We do not know how the universe got started, and we have never made experiments which check our ideas of space and time accurately, below some tiny distance, so we only know that our ideas work above that distance. We should also add that the rules of the game are the quantum mechanical principles, and those principles apply, so far as we can tell, to the new particles as well as to the old. The origin of the forces in nuclei leads us to new particles, but unfortunately they appear in great profusion and we lack a complete understanding of their interrelationship, although we already know that there are some very surprising relationships among them. We seem gradually to be groping toward an understanding of the world of sub-atomic particles, but we really do not know how far we have yet to go in this task.[1]

جدید سائنس: تلاشِ حقیقت نہیں تخلیق حقیقت کا سفر ہے:

کانٹ کے فلسفے کے بعد جدید سائنس کے ذریعے حقیقت کی تلاش کا سفر ختم ہوگیا۔ کانٹ نے بتا دیا کہ حقیقت مطلق تلاش نہیں کی جاسکتی بلکہ تخلیق کی جاسکتی ہے، انسان اپنے ذہن کے مطابق اس کائنات کو اپنی ذہنی ساخت سے ہم آہنگ کرسکتا ہے لہٰذا کانٹ کے بعد سائنس تلاش حقیقت کے بجائے تخلیق حقیقت کا طریقہ بن گئی، اب اگر اس علمی تناظر میں ہیگل کے فکر کو شامل کرلیا جائے جو کانٹ کے اس خیال سے متفق نہیں کہ ذہن انسانی کی ساخت بارہ categories میں محدود اور مشتمل ہے تو ذہن انسانی کی ساخت جیسے جیسے بدلتی جاتی ہے تخلیق حقیقت [Creation of reality] کا عمل بھی ویسے

1. Ibid., pp.43-45.

ویسے بدلتا جاتا ہے، یعنی حقیقت فی نفسہ کچھ نہیں ہوتی، نفس انسانی ہی، اصل نص ہے، وہی رب ہے، وہی معبود حقیقی ہے۔ لہٰذا نفس الٰہ بن گیا اور سائنس اس پرستش نفس کے اسباب وذرائع مہیا کرنے والا سرعت پذیر طریقہ قرار پایا، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حقیقت بذاتہ خود حقیقت ہوتی ہے۔ حقیقت کی شناخت ذہن انسانی پر انحصار نہیں کرتی، وہ اپنے ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتی ہے۔ مفروضے کی حقیقت میں تبدیلی کی کیا توجیہہ ہے؟ یعنی سائنسی علم میں پہلے مفروضہ بتایا جائے پھر اس مفروضے کو امکانی حقیقت [Probable / possible truth] میں تبدیل کرنے کے لیے تجربات، مشاہدات اور نتائج کی دنیا آباد کی جائے۔ حقیقت تو حقیقت رہے گی وہ مفروضہ کیوں بنی اور مفروضے سے ایک امکانی حقیقت میں کیوں تبدیل ہوئی؟ مفروضے سے امکانی حقیقت بننے کا عمل اصلاً سائنسی عمل ہے کیونکہ اس سائنسی طریقے میں حقیقت اہم نہیں بلکہ طریقہ [method] اہم ہے جس کو اختیار کرتے ہی مفروضہ [Hypothesis] امکانی حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے جسے ذاکر نائیک صاحب خواہ مخواہ ٹھوس اور قطعی حقیقت قرار دے رہے ہیں، سائنس کا اصل میدان ہدف نہ حقیقت ہے نہ کائنات بلکہ ذہن انسانی سے ابلنے والے تخلیقی لہو ولعب کو مادی پیکر میں کس طرح ڈھالا جائے اور ارادہ انسانی کو مسلط کرنے میں مادی طور پر کس کس طرح اطلاقات کے امکان بروئے کار لائے جائیں۔ یہ ذہن انسانی ہی وہ اصل شے ہے جو حقیقت کو مفروضہ اور مفروضے کو حقیقت میں ڈھال دیتا ہے۔ fact اور حقیقت [reality] اپنے ہونے کے لیے کسی کے محتاج نہیں۔ یہ ماورائے اقدار نہیں ہو سکتے، یہ غیر اقداری نہیں بلکہ اقداری [value loaded] ہوتے ہیں۔

حقیقت تک رسائی درست علیت کے ذریعے ممکن ہے:

حقیقت ایک چیز ہے اور حقیقت کا علم دوسرا معاملہ ہے، جب ہم علم کی بات کرتے ہیں تو ایک subject ہوگا اور ایک object ہوگا۔ object کو جاننے کا طریقہ جیسا کہ وہ ہے یا جیسا کہ میں جان پایا یہ فہم وادراک کی دو الگ الگ سطحیں ہیں۔ یہ دو فلسفے ہیں: [۱] ایک یہ کہ حقیقت فی نفسہٖ جانی جا سکتی ہے، [۲] دوسرے مکتب کا خیال ہے کہ حقیقت نہیں جانی جا سکتی سقراط، افلاطون، ڈیکارٹ، اسپنوزا اور لائبنز وغیرہ کہتے ہیں کہ حقیقت جانی جا سکتی ہے لیکن اس کے لیے صحیح علیت کو اختیار کرنا ہوگا علیت غلط ہوگی تو حقیقت کو نہیں جان سکتے۔ دوسرے مکتب فکر کا بانی کانٹ تھا۔ اس کا موقف ہے کہ آپ حقیقت کو ویسا نہیں جان سکتے جیسا کہ وہ ہے، بلکہ انسان حقیقت پر اپنے ذہنی سانچوں [structure of mind] کا اطلاق کرتا ہے اس کے نتیجے میں جو ادراک ہوگا وہ فرد کا انفرادی ادراک ہوگا لہٰذا حقیقت فی نفسہٖ جانی ہی نہیں جا سکتی اصلاً آدمی حقیقت تخلیق کرتا ہے۔ دونوں مکاتب فکر میں اختلاف حقیقت کے فہم وادراک یعنی جاننے پر ہے وجود حقیقت پر نہیں ہے۔ حقیقت کے وجود کے دونوں قائل ہیں۔

حقیقت فی نفسہٖ کو جاننا ممکن نہیں: کانٹ:

کانٹ کے خیال میں فرد زماں و مکاں کے چشموں سے حقیقت کو جانتا ہے اس کے

بغیر ہمارے لیے حقیقت کو جاننا ممکن ہی نہیں اگر ان چشموں کے بغیر حقیقت کو جانا جا سکتا تو ہم شاید حقیقت کو فی نفسہٖ جان سکتے لیکن اصلاً حقیقت کا تجربہ ان چشموں کے بغیر کر ہی نہیں سکتے ادراک حقیقت جب دو بیرونی عناصر پر منحصر رہ گیا تو حقیقت کی حقیقت کو پانا ممکن ہی نہیں رہتا۔ لہٰذا ہم حقیقت کو تخلیق کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا حقیقت کی تخلیق ہو سکتی ہے یا یہ عمل قرب حقیقت تک پہنچ سکتا ہے؟ کانٹ کے منہاج علم میں یہ سوالات نہیں اٹھائے جا سکتے کہ وہ ماورائے عقل معاملات کا انکار نہیں کرتا لیکن چونکہ انسانی عقل اور دائرہ علم ان کے وجود کا اثبات نہیں کرتے لہٰذا ان امور پر وہ کوئی کلام نہیں کرتا، دوسرے معنوں میں ان امور غیب ماورائے عقل وفہم وحواس معاملات اور قضایا پر کچھ نہیں کہا جا سکتا بہ ظاہر وہ ماورائے عقل امور کی نہ تردید کرتا ہے نہ تائید۔ لیکن عملاً مغرب میں کانٹ کے اس فلسفے نے انسان کے سوا ہر حقیقت کا انکار کر دیا اور اس طرح رفتہ رفتہ مابعد الطبیعیاتی سوالات کو دائرہ علم سے باہر نکال کر ان کو خیالی mythological قرار دے دیا گیا۔

وجودِ حقیقت، اعتراف حقیقت پر منحصر نہیں:

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ایک حقیقت ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ایک حقیقت ہے، یہ حقیقت ایک مسلمان کے لیے رسالت مآبؐ بحیثیت پیغمبر کی ہے لیکن ایک غیر مسلم، کافر اور مشرک کے لیے اس عالمگیر، غیر متغیر، ابدی اور قطعی حقیقت کی کوئی حقیقت نہیں لیکن اگر کوئی کافر رسالت مآب کو حقیقت نہیں مانتا تو اس سے حقیقت بدل نہیں جاتی، حقیقت کا اعتراف وجود حقیقت کے لیے ضروری نہیں مسئلہ صرف یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت مابعد الطبیعیاتی تناظر بدل جانے سے بدل جاتی ہے۔ غیر مسلم کے لیے حقیقت نہیں رہتی لیکن انکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اور حقیقت تبدیل نہیں ہو جاتی کیونکہ آپ کا رسول ہونا کسی کے ماننے یا مسترد کرنے پر منحصر نہیں ہے۔ آپ فی الواقع رسول ہیں خواہ ایک متنفس بھی آپ کو تسلیم نہ کرے، جس طرح اللہ تعالیٰ ایک حقیقت ہے خواہ دنیا کے تمام انسان اس حقیقت ازلی وابدی کا انکار کر دیں۔ جناب ذاکر نائیک صاحب اور دیگر جدیدیت پسند مخلص مسلم مفکرین کا المیہ یہ ہے کہ وہ سائنس کی حقیقت بتانے، اس کی خامیاں اور کمزوریاں واضح کرنے، اس کے تضادات تناقضات اور ناکامیاں نمایاں کرنے کے بجائے اس سائنس پر لوگوں کے ایمان کو مضبوط کرنے میں مصروف ہیں۔ اگر نائیک صاحب ودیگر مخلصین سائنس پر مغرب میں لکھے گئے نقد کا غائر مطالعہ کر لیتے تو وہ اس نقد کی بنیاد پر سائنس کو رد کر سکتے تھے۔ مغرب کو اس کے اپنے آئینے میں اس کا چہرہ دکھا سکتے تھے لیکن بجائے اس کے وہ مغرب کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہے ہیں اور اسلام کا چہرہ دکھا رہے ہیں۔ مغرب کو اپنے ایمان کی کسوٹی پر مسلمان کرنے کے بجائے مغرب کے مسترد کردہ سائنسی حقیقت کے فلسفے کی کسوٹی پر اس کو دائرہ ایمان میں داخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مغرب کا کوئی فلسفی سائنسی منہاج علم کو unquestionable نہیں سمجھتا لیکن ہمارے جدیدیت پسند مسلم مفکرین اس سوالیہ سائنس [Questionsable, Challengable] پر ایسا ایمان رکھتے

ہیں جو مغرب میں بھی ناپید اور مفقود ہے۔ سائنس کو رد کرنے کے بجائے اسے اسلام سے ہم آہنگ کر کے دکھانا سادہ لوحی کی انتہا اور مغرب کے فلسفہ سے کامل عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔

سائنس: امکانی تصدیق، احتمالی تردید:

جناب ذاکر نائیک صاحب کی تحریروں اور خطبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سائنس کے صغریٰ کبریٰ کو [Principle of Verifaility] کی بنیاد پر متعین فرما رہے ہیں۔ حالانکہ کوہن اور لے کاٹوش جیسے Structuralists نے ثابت کر دیا کہ سائنس نہ کسی چیز کی مکمل توثیق کر سکتی ہے نہ مکمل تردید، یعنی سائنس امکانی توثیق [probably verifiy] اور امکانی تردید [probably falsify] کرتی ہے لہٰذا اٹھارہویں صدی کے سائنسی مفروضوں کی بنیاد پر نائیک صاحب کا یہ سمجھنا کہ سائنس کسی شے کی تصدیق توثیق، تائید کا کوئی موثر ذریعہ ہے۔ ایک غیر علمی نقطہ نظر ہے۔ سائنسی حقیقت وہ حقیقت ہوگی جس کا مشاہدہ، تجربہ، حواس خمسہ کی بنیاد پر اسی طریقے سے دنیا کا کوئی بھی شخص کر سکے جس طرح یہ حقیقت کسی اور نے تلاش کی یا دیکھی ہے اس اصول کی بنیاد پر generalizaed truth بیان کیے جاتے ہیں۔ حقائق کو جاننے کا یہ طریقہ Inductivism سے نکلا ہے جسے فلسفے اور سائنس کے منہاج میں بڑے فلاسفہ نے علمی دلائل سے مسترد کر کے اس کی تمام خامیاں واضح کر دی ہیں۔ مادی دنیا کے حوالے سے کسی بھی دعوے کو حواس خمسہ کی بنیاد پر قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس عمل اور طریقے میں تجربہ ہر فرد کا انفرادی [personal] ہوتا ہے لیکن دعویٰ آفاقی [universal] ہوتا ہے لہٰذا کسی خاص تجربے [particular experience] کی بنیاد پر آفاقی دعوے [universal claim] نہیں کیے جا سکتے۔ یہ طرز عمل جزئیات سے کلیات اخذ کرنے کا عمل ہے جیسے چند شہروں، چند ملکوں میں کالے کوے دیکھ کر یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ تمام کوے کالے ہوتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کے تمام حصوں کے تمام کوؤں کا عملاً مشاہدہ ممکن ہی نہیں لہٰذا ایسے دعوے ہمیشہ صرف دعوے ہوتے ہیں، اس بنیاد پر حاصل ہونے والا سچ، نتیجہ، حقیقت محض امکانی سچ [probable truth] ہوتا ہے، مطلق سچ [absolute truth] نہیں ہوتا۔ اس کی تردید کسی لمحے بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے فلسفہ سائنس کی کتب میں Inductivism کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج کو قطعی سچ تسلیم نہیں کیا جاتا کیونکہ اس امکانی سچ کے رد ہونے کا انحصار صرف ایک ایسے تجربے پر منحصر ہے جو ان سابقہ تمام تجربات و نتائج کی نفی کر دے۔ جو اس نظریے کے حق میں دنیا بھر سے جمع کیے گئے تھے مثلاً کوئی سفید، مٹیالا، سرخی مائل سیاہ کوا دکھائی دے تو یہ آفاقی دعویٰ ایک لمحے میں رد ہو جائے گا کہ تمام کوے کالے ہوتے ہیں۔ اسی لیے فلسفہ سائنس میں کوئی سچ [truth] ایسا نہیں ہے جس کی تردید [falicify] نہ کی جا سکے سائنس کے منہاج میں حقیقت کے حقیقت ہونے یا سچ کے سچ ہونے کا انحصار سائنسی طریقہ کار [Scientific Method] پر ہوتا ہے یعنی اصل سچائی سائنسی طریقے میں پنہاں ہوتی ہے۔ یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ حقیقت اپنے حقیقت ہونے کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ فی نفسہٖ حقیقت ہوتی ہے خواہ کوئی تسلیم

کرے یا نہ کرے جو حقیقت کسی تجربے اور طریقے سے گزرنے کے بعد حقیقت کہلائی جائے تو اس وقت تک جب تک کہ دوسرا تجربہ اسے غیر حقیقت ثابت نہ کر دے وہ حقیقت نہیں ہے۔ لہٰذا حقیقت کچھ نہیں ہوتی صرف اگلے تجربے کے مختلف نتیجے سے رد ہو جاتی ہے۔

کارل پاپر سائنس کے بارے میں اپنی کتاب *Conjectures & refutations* میں لکھتا ہے:

These considerations led me in the winter of 1919-20 to conclusions which I may now reformulate as follows:

1. It is easy to obtain confirmations, or verifications, for nearly every theory - if we look for confirmations.
2. Confirmations should count only if they are the result of risky predictions; that is to say, if, unenlightened by the theory in question, we should have expected an event which was incompatible with the theory - an event which would have refuted the theory.
3. Every "good" scientific theory is a prohibition: it forbids certain things to happen. The more a theory forbids, the better it is.
4. A theory which is not refutable by any conceivable event is non-scientific. Irrefutability is not a virtue of a theory (as people often think) but a vice.
5. Every genuine test of a theory is an attempt to falsify it, or to refute it. Testability is falsifiability; but there are degrees of testability: some theories are more testable, more exposed to refutation, than others; they take, as it were, greater risks.
6. Confirming evidence should not count except when it is the result of a genuine test of the theory; and this means that it can be presented as a serious but

unsuccessful attempt to falsify the theory. (I now speak in such cases of "corroborating evidence.")

7. Some genuinely testable theories, when found to be false, are still upheld by their admirers - for example by introducing ad hoc some auxiliary assumption, or by reinterpreting the theory ad hoc in such a way that it escapes refutation. Such a procedure is always possible, but it rescues the theory from refutation only at the price of destroying, or at least lowering, its scientific status. (I later described such a rescuing operation as a "conventionalist twist" or a "conventionalist stratagem.")

One can sum up all this by saying that the criterion of the scientific status of a theory is its falsifiability, or refutability, or testability.

At the same time I realized that such myths may be developed, and become testable; that historically speaking all - or very nearly all - scientific theories originate from myths, and that a myth may contain important anticipations of scientific theories. Examples are Empedocles' theory of evolution by trial and error, or Parmenides' myth of the unchanging block universe in which nothing ever happens and which, if we add another dimension, becomes Einstein's block universe (in which, too, nothing ever happens, since everything is, four-dimensionally speaking, determined and laid down from the beginning). I thus felt that if a theory is found to be non-scientific, or "metaphysical" (as we might say), it is not thereby found to be unimportant, or insignificant, or "meaningless," or "nonsensical." But it

cannot claim to be backed by empirical evidence in the scientific sense - although it may easily be, in some genetic sense, the "result of observation." (There were a great many other theories of this pre-scientific or pseudo-scientific character, some of them, unfortunately, as influential as the Marxist interpretation of history; for example, the racialist interpretation of history - another of those impressive and all-explanatory theories which act upon weak minds like revelations.)

Thus the problem which I tried to solve by proposing the criterion of falsifiability was neither a problem of meaningfulness or significance, nor a problem of truth or acceptability. It was the problem of drawing a line (as well as this can be done) between the statements, or systems of statements, of the empirical sciences, and all other statements - whether they are of a religious or of a metaphysical character, or simply pseudo-scientific. Years later - it must have been in 1928 or 1929 - I called this first problem of mine the "problem of demarcation." The criterion of falsifiability is a solution to this problem of demarcation, for it says that statements or systems of statements, in order to be ranked as scientific, must be capable of conflicting with possible, or conceivable, observations.[1]

سائنس معروضی علم نہیں: فیرابینڈ:

"سائنٹفک میتھڈ" جسے جدیدیت پسند مفکرین اور نائیک صاحب علم کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس سے مرعوبیت کے باعث سائنٹفک میتھڈ کے ذریعے اسلام اور قرآن کی حقانیت ثابت کرتے ہیں اس صدی کے اہم مفکر Feyerabend سے واقف نہیں جسے سائنس اور فلسفۂ سائنس کی دنیا کے اہم ترین لوگوں میں

1. K. P. Popper, *Conjectaues and Refutation*. London: Routledge & Kegan Paul, 1963, pp. 36-39 .

شمار کیا جاتا ہے اور اس کی کتاب "Against Method" نے سائنٹفک میتھڈ پر نقد کے ذریعے علم کی دنیا میں زلزلہ برپا کر دیا تھا اپنی کتاب Science in a Free society میں فیرابینڈ نے سائنس پر زبردست نقد کیا ہے فیرابینڈ سائنس کو معروضی علم [objective knowledge] تسلیم نہیں کرتا وہ سائنس کو ایک معمہ، چیستان Myth سے مماثل قرار دیتا ہے اس کے خیال میں سائنس ان بے شمار طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جو ذہن انسانی نے حصول علم کے لیے دریافت کیے ہیں لیکن سائنس لازماً بہترین طریقہ نہیں ہے Not necessarily the best، اس کے خیال میں سائنس کو ایک طرز زندگی اور علم کے طور پر قبول کرنے والوں نے بغیر جانچ پڑتال کے قبول کرلیا ہے قبول کرنے والے اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ اس کی حدود کیا ہیں اور اس کے فوائد و ثمرات کیا ہیں کیونکہ ایسا کرنے والوں نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ سائنس لازماً تمام علوم سے بہتر بالاتر اور افضل ترین علم ہے وہ کہتا ہے کہ جس طرح چرچ کو ریاست سے علیحدہ کیا گیا بالکل اس طرح سائنس اور ریاست کا تعلق ختم ہونا چاہیے تاکہ ایک آزاد فری [Free] سوسائٹی جنم لے سکے جہاں تمام روایات، تمام روایتی علوم، تمام دانش ہائے سابق علم کے حصول کے تمام طریقوں کو یکساں طریقے اور ذرائع سے پھلنے پھولنے کے مواقع میسر ہوں نہ کہ تمام ریاستی ڈھانچہ صرف سائنس کی سرپرستی کے لیے وقف ہو اس کے خیال میں سائنس جمہوریت کے لیے بدترین خطرہ ہے لہذا سائنس کی ترقی اور رفتار کی نگرانی عوام کے سپرد کر دینی چاہیے تاکہ اسے جمہوری طریقے سے قابو کیا جا سکے۔

عموماً سائنس کو بحیثیت علم فائق اور برتر سمجھنے کی وجہ اس کی تجربیت، عقلیت، دلیل کی قوت و افادیت وغیرہ قرار دیے جاتے ہیں مگر فیرابینڈ کے خیال میں دلیل اور عقلیت کی تشریح کبھی واضح طور پر نہیں کی جاسکتی:

Reason and Rationality are ambiguous and never clearly explained.

اس سلسلے میں اس کے فلسفیانہ دلائل اور علمی اعتراضات اس کی کتاب *Farewell to Reason* میں تفصیل سے پڑھے جاسکتے ہیں۔

وہ سائنس کو نظام [System] تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے وہ اسے collage قرار دیتا ہے وہ سائنسی علم کی وحدت کا قائل نہیں ہے وہ Disunity of science کے نظریے کا علمبردار ہے اس کے خیال میں Science is not one thing, it is many. فیرابینڈ سائنس کو مغربی استعماریت کے تسلط اور فروغ کا ایک اہم ہتھیار سمجھتا ہے وہ کہتا ہے کہ معروضی طور پر سائنس، آسٹرالوجی Astrology اور voodoo میں کوئی فرق نہیں ہے۔

وہ سائنس کو حصول علم کا واحد عقلی پیمانہ، طریقہ، منہاج تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے وہ جمالیات، ذاتی خواہشات آرزوؤں اور سماجی عوامل کے کردار کو عقلیت اور تجربیت کے مقابلے میں سائنس کی ترقی کے لیے زیادہ اہم، موثر اور قابل ذکر سمجھتا ہے اس کے خیال میں سائنس کے میدان میں

صرف "anything goes" کا اصول موثر رہتا ہے اس نقد پر John Krige کا ردعمل یہ تھا کہ Any thing goes means that in practice every thing stays. اس کی تمام تحریروں میں مغربی دنیا میں سائنس کی پرستش اور حد سے زیادہ اثر پذیری پر سخت نقد ملتا ہے وہ سائنس کو علم کے حصول کا بہترین ذریعہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے:

We can't justify the science as the best way of acquiring knowledge.

اس کے خیال میں سائنسی نتائج وثمرات سائنس کی عظمت کی دلیل مہیا نہیں کرتے کیونکہ تمام سائنسی نتائج غیر سائنسی عناصر پر انحصار کرتے ہیں:

And the results of science don't prove its excellence, since these results have often depended on the presence of non scientific elements.

وہ غیر سائنسی مشاہدات کو نظریات کے مماثل تصور کرتا ہے کیونکہ کوئی مشاہدہ کسی نظریے، بعد الطبیعیات، تصورات اور وجودیات کے بغیر ممکن ہی نہیں:

Observations are just as theoretical (that hypothetical) as theories, "Logically speaking, all terms are "theoretical" [1]

وہ سائنس کو غیر اقداری value nutral نہیں بلکہ اقداری تصور کرتا ہے، جو ایک خاص تاریخ مابعد الطبیعیات اور وجودیات سے برآمد ہوتی ہے:

One of these is that "every positivistic observation language is based upon a metaphysical ontology"[2]

"the interpretation of a scientific theory depends upon nothing but the state of affairs it describes" [3]

اس دور میں کہ جب فلسفہ رہنمائی کرنے کے بجائے سائنس کے مقاصد کا ترجمان بن گیا ہے اور سائنسی اہداف کی تکمیل، تشکیل اور تعمیر کی علمی و عقلی بنیادیں مہیا کر رہا ہے اور ایک مغربی مفکر چامر کے الفاظ میں:

"philosophy is worthless unless it makes a positive and quantifiable contribution to the growth of knowledge

---

1. *Philosophical Papers*, Volume 1, p. 32 note.

2. *Philosophical Papers*, Volume 1, p. 21.

3. *Philosophical Papers*, Volume 1, p. 42.

(which, of course, means science)".

فیرابینڈ اس تصور حاضر کو درست تسلیم نہیں کرتا وہ فلسفے کو سائنس کے خادم کے طور پر برداشت نہیں کرتا اس سلسلے میں اس کا شدید نقد اس کی کتابوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔

اسٹین فورڈ انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی میں اس کے فکر و فلسفے کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے اور یہ جائزہ فلسفیانہ کم عام فہم زیادہ ہے، ملاحظہ کیجیے:

By the early 1970s Feyerabend had flown the falsificationist coop and was ready to expound his own perspective on scientific method. In 1970, he published a long article entitled "*Against Method*" in which he attacked several prominent accounts of scientific methodology. In their correspondence, he and Lakatos subsequently planned the construction of a debate volume, to be entitled For and Against Method, in which Lakatos would put forward the "rationalist" case that there was an identifiable set of rules of scientific method which make all good science science, and Feyerabend would attack it. Lakatos' unexpected death in February 1974, which seems to have shocked Feyerabend deeply, meant that the rationalist part of the joint work was never completed.

What's so great about knowledge? What's so great about science? What's so great about truth? We were not going to be disappointed after all! During the following weeks of that term, and for the rest of his year as a visiting lecturer, Feyerabend demolished virtually every traditional academic boundary. He held no idea and no person sacred. With unprecedented energy and enthusiasm he discussed anything from Aristotle to the Azande. How does science differ from witchcraft? Does it provide the only rational way of cognitively organizing our experience? What should we do if the pursuit of truth cripples our intellects and stunts

our individuality? Suddenly epistemology became an exhilarating area of investigation.[1]

Because his health was poor, Feyerabend started seeing a healer who had been recommended to him. The treatment was successful, and thenceforth Feyerabend used to refer to his own case as an example of both the failures of orthodox medicine and the largely unexplored possibilities of "alternative" or traditional remedies.

"Against Method" is not a book, it is a collage. It contains descriptions, analyses, arguments that I had published, in almost the same words, ten, fifteen, even twenty years earlier... I arranged them in a suitable order, added transitions, replaced moderate passages with more outrageous ones, and called the result "anarchism". I loved to shock people....[2]

He emphasised that older scientific theories, like Aristotle's Theory of Motion, had powerful empirical and argumentative support, and stressed, correlatively, that the heroes of the scientific revolution, such as Galileo, were not as scrupulous as they were sometimes represented to be. He portrayed Galileo as making full use of rhetoric, propaganda, and various epistemological tricks in order to support the heliocentric position. The Galileo case is crucial for Feyerabend, since the "scientific revolution" is his paradigm of scientific progress and of radical conceptual

---

1. John Krige, *Science, Revolution and Discontinuity,* Sussex: Harvester Press, 1980, pp. 106-107.

2. P.K Feyerabend, *Against Method: Outline of an Anarchistic Theory of Knowledge,* London: New Left Books, 1975,pp.139, 142.

change, and Galileo is his hero of the scientific revolution. He also sought further to downgrade the importance of empirical arguments by suggesting that aesthetic criteria, personal whims and social factors have a far more decisive role in the history of science than rationalist or empiricist historiography would indicate.

Against Method explicitly drew the "epistemological anarchist" conclusion that there are no useful and exceptionless methodological rules governing the progress of science or the growth of knowledge. The history of science is so complex that if we insist on a general methodology which will not inhibit progress, the only "rule" it will contain, will be the useless suggestion: "anything goes". In particular, logical empiricist methodologies and Popper's Critical Rationalism would inhibit scientific progress by enforcing restrictive conditions on new theories.

Feyerabend saw himself as having undermined the arguments for science's privileged position within culture, and much of his later work was a critique of the position of science within Western societies. Because there is no scientific method, we can't justify science as the best way of acquiring knowledge. And the results of science don't prove its excellence, since these results have often depended on the presence of non-scientific elements, science prevails only because "the show has been rigged in its favour" [1]

and other traditions, despite their achievements, have never been given a chance. The truth, he suggests, is that science is much closer to myth than a scientific philosophy is prepared

1. P.K Feyerabend, *Science in a Free Society, New Left Books,* 1978, p. 102.

to admit. It is one of the many forms of thought that have been developed by man, and not necessarily the best. It is conspicuous, noisy, and impudent, but it is inherently superior only for those who have already decided in favour of a certain ideology, or who have accepted it without ever having examined its advantages and its limits.[1]

The separation of church and state should therefore be supplemented by the separation of science and state, in order for us to achieve the humanity we are capable of. Setting up the ideal of a free society as "a society in which all traditions have equal rights and equal access to the centres of power"[2], Feyerabend argues that science is a threat to democracy. To defend society against science we should place science under democratic control and be intensely sceptical about scientific "experts", consulting them only if they are controlled democratically by juries of laypeople.

Many of the more important papers Feyerabend published during the mid-1980s were collected together in *Farewell to Reason*[London: Verso, 1987]. The major message of this book is that Relativism is the solution to the problems of conflicting beliefs and of conflicting ways of life. Feyerabend starts by suggesting that the contemporary intellectual scene in Western culture is by no means as fragmented and cacophonous as many intellectuals would have us believe. The surface diversity belies a deeper uniformity, a monotony generated and sustained by the

---

1. P.K. Feyerabend: *Against method*, London: Veso, 1975, p. 295.

2. Ibid., p.9.

cultural and ideological imperialism which the West uses to beat its opponents into submission. Such uniformity, however, can be shown to be harmful even when judged by the standards of those who impose it. Cultural diversity, which already exists in some societies, is a good thing not least because it affords the best defence against totalitarian domination.

Feyerabend complains that the ideas of reason and rationality are "ambiguous and never clearly explained" [1], they are defied hangovers from autocratic times which no longer have any content but whose "halo of excellence" [ibid.] clings to them and lends them spurious respectability:

[R]ationalism has no identifiable content and reason, no recognisable agenda over and above the principles of the party that happens to have appropriated its name. All it does now is to lend class to the general drive towards monotony. It is time to disengage Reason from this drive and, as it has been thoroughly compromised by the association, to bid it farewell.[2]

[R]elativism is the tool with which Feyerabend hopes to "undermine the very basis of Reason" [3]. But is it Reason with a capital "R", the philosophers' abstraction alone, that is to be renounced, or reason itself too? Feyerabend is on weak ground when he claims that "Reason" is a philosophers' notion which has no content, for it is precisely the philosopher who *is* willing to attach a specific content to the formal notion of rationality (unlike the layperson, whose

1. P. Feyerabend, *Farewell to Reasen,* London: Veso Newleft books 1987, p. 10.

2. Ibid.,p. 13. 3. Ibid.

notion of reason is closer to what Feyerabend calls the "material" conception, where to be rational is "to avoid certain views and to accept others".[1]

One of the projects which Feyerabend worked on for a long time, but never really brought to completion, went under the name "The Rise of Western Rationalism". Under this umbrella he hoped to show that Reason (with a capital "R") and Science had displaced the binding principles of previous world-views not as the result of having won an argument, but as the result of power-play. While the first philosophers (the pre-Socratic thinkers) had interesting views, their attempt to replace, streamline or rationalise the folk-wisdom which surrounded them was eminently resistible. Their introduction of the appearance/reality dichotomy made nonsense of many of the things people had previously known. Even nowadays, indigenous cultures and counter-cultural practices provide alternatives to Reason and that nasty Western science.

However, Feyerabend recognised that this is to present science as too much of a monolith. In most of his work after Against Method, he emphasises what has come to be known as the "disunity of science". Science, he insists, is a collage, not a system or a unified project. Not only does it include plenty of components derived from distinctly "non-scientific" disciplines, but these components are often vital parts of the "progress" science has made (using whatever criterion of progress you prefer). Science is a collection of theories, practices, research traditions and

1. Ibid., p. 10.

world-views whose range of application is not well-determined and whose merits vary to a great extent. All this can be summed up in his slogan: "Science is not one thing, it is many."

Likewise, the supposed ontological correlate of science, "the world", consists not only of one kind of thing but of countless kinds of things, things which cannot be "reduced" to one another. In fact, there is no good reason to suppose that the world has a single, determinate nature. Rather we inquirers construct the world in the course of our inquiries, and the plurality of our inquiries ensures that the world itself has a deeply plural quality: the Homeric gods and the microphysicist's subatomic particles are simply different ways in which "Being" responds to (different kinds of) inquiry. How the world is "in-itself" is for ever unknowable. In this respect, Feyerabend's last work can be thought of as aligned with "social constructivism".

Feyerabend came to be seen as a leading cultural relativist, not just because he stressed that some theories are incommensurable, but also because he defended relativism in politics as well as in epistemology. His denunciations of aggressive Western imperialism, his critique of science itself, his conclusion that "objectively" there may be nothing to choose between the claims of science and those of astrology, voodoo, and alternative medicine, as well as his concern for environmental issues ensured that he was a hero of the anti-technological counter-culture.[1]

1. http://plato.stanford.edu/entries/feyerabend/[08-08-2010]

What I want to talk about in this lecture is not, strictly speaking, the character of physical law. One might imagine at least that one is talking about nature when one is talking about the character of physical law; but I do not want to talk about nature, but rather about how we stand relative to nature now. I want to tell you . . . what there is to guess, and how one goes about guessing. Someone suggested that it would be ideal if, as I went along, I would slowly explain how to guess a law, and then end by creating a new law for you. I do not know whether I shall be able to do that. . . .In general we look for a new law by the following process. First we guess it. Then we compute the consequences of the guess to see what would be implied if this law that we guessed is right. Then we compare the result of the computation to nature with experiment or experience, compare it directly with observation, to see if it works. If it disagrees with experiment it is wrong. In that simple statement is the key to science. It does not make any difference how beautiful your guess is. It does not make any difference how smart you are, who made the guess, or what his name is- if it disagrees with experiment it is wrong. That is all there is to it. It is true that one has to check a little to make sure that it is wrong, because whoever did the experiment may have reported incorrectly, or there may have been some feature in the experiment that was not noticed, some dirt or something; or the man who computed the consequences, even though it may have been the one who made the guesses, could have made some mistake in the analysis. These are obvious remarks, so when I say if it disagrees with experiment it is

wrong, I mean after the experiment has been checked, the calculations have been checked, and the thing has been rubbed back and forth a few times to make sure that the consequences are logical consequences from the guess, and that in fact it disagrees with a very carefully checked experiment.

This will give you a some what wrong impression of science. It suggests that we keep on guessing possibilities and comparing them with experiment, and this is to put experiment into a rather weak position. In fact experimenters have a certain individual character. They like to do experiments even if nobody has guessed yet and they very often do their experiments in a region in which people know the theorist has not made any guesses. For instance, we may know a great many laws, but do not know whether they really work at high energy, because it is just a good guess that they work at high energy. Experimenters have tried experiments at higher energy, and in fact every once in a while experiment produces trouble; that is, it produces a discovery that one of the things we thought right is wrong. In this way experiment can produce unexpected results, and that starts us guessing again. One instance of an unexpected result is the M meson and its neutrino, which was not guessed by anybody at all before it was discovered, and even today nobody yet has any method of guessing by which this would be a natural result.

You can see, of course, that with this method we can attempt to disprove any definite theory. If we have a definite theory, a real guess, from which we can conveniently

compute - consequences which can be compared with experiment, then in principle we can get rid of any theory. There is always the possibility of proving any definite theory wrong; but notice that we can never prove it right. Suppose that you invent a good guess, calculate the consequences, and discover every time that the consequences you have calculated agree with experiment. The theory is then right? No, it is simply not proved wrong. In the future you could compute a wider range of consequences, there could be a wider range of experiments; and you might then discover that the thing is wrong. That is why laws like Newton's laws for the motion of planets last such a long time. He guessed the law of gravitation, calculated all kinds of consequences for the system and so on, compared them with experiment and it took: several hundred years before the slight error the motion of Mercury was observed.

During all that time the theory had not been proved wrong. and could be taken temporarily to be right. But it could never be proved right, because tomorrow's experiment might succeed in proving wrong what you thought was right. We never are definitely right. we can only be sure we are wrong.However. it is rather remarkable how we can have some ideas which will last so long. One of the ways of stopping science would be only to do experiments in the region where you know the law. But experimenters search most diligently, and with the greatest effort, in exactly those places where it seems most likely that we can prove our theories wrong. In other words we are trying to prove ourselves wrong as quickly as possible, because only in that

way can we find progress. For example, today among ordinary low energy phenomena we do not know where to look for trouble, we think everything is all right, and so there is no particular big programme looking for trouble in nuclear reactions, or in super-conductivity. In these lectures I am concentrating on discovering fundamental laws. The whole range of physics, which is interesting, includes also an understanding at another level of these phenomena like super-conductivity and nuclear reactions, in terms of the fundamental laws. But I am talking now about discovering trouble, something wrong with fundamental laws, and since among low energy phenomena nobody knows where to look, all the experiments today in this field of finding out a new law, are of high energy.

Another thing I must point out is that you cannot prove a vague theory wrong. If the guess that you make is poorly expressed and rather vague, and the method that you use for figuring out the consequences is a little vague-you are not sure, and you say, "I think everything's right because its all due to so and so, and such and such do this and that more or less, and I can sort of explain how this works. . . ," then you see that this theory is good, because it cannot be proved wrong! Also if the process of computing the consequences is indefinite, then with a little skill any experimental results can be made to look like the expected consequences. You are probably familiar with that in other fields. "A" hates his mother. The reason is, of course, because she did not caress him or love him enough when he was a child. But if you investigate you find out that as a matter of

fact she did love him very much, and everything was all right. Well then, it was because she was over-indulgent when he was a child! By having a vague theory it is possible to get either result. The cure for this one is the following. If it were possible to state exactly, ahead of time, how much love is not enough, and how much love is over-indulgent, then there would be a perfectly legitimate theory against which you could make tests. It is usually saidwhen this is pointed out, "When you are dealing with psychological matters things can't be defined so precisely." Yes, but then you cannot claim to know anything about it.

You will be horrified to hear that we have examples in physics of exactly the same kind. We have these approximate symmetries, which work something like this. You have an approximate symmetry, so you calculate a set of consequences supposing it to be perfect.

When compared with experiment, it does not agree. Of course-the symmetry you are supposed to expect is approximate, so if the agreement is pretty good you say, "Nice!," while if the agreement is very poor you say, "Well, this particular thing must be especially sensitive to the failure of the symmetry." Now you may laugh, but we have to make progress in that way. When a subject is first new, and these particles are new to us, this jockeying around, this "feeling" way of guessing at the results, is the beginning of any science. The same thing is true of the symmetry proposition in physics as is true of psychology, so do not laugh too hard. It is necessary in the beginning to be very careful. It is easy to fall into the deep end by this kind of

vague theory. It is hard, to prove it wrong, and it takes a certain skill and experience not to walk off the plank in the game. . . .

Because I am a theoretical physicist, and more delighted with this end of the problem, I want now to concentrate on how to make the guesses.

As I said before, it is not of any importance where the guess comes from; it is only important that it should agree with experiment, and that it should be as definite as possible. "Then," you say, "that is very simple. You set up a machine, a great computing machine, which has a random wheel in it that makes a succession of guesses, and each time it guesses a hypothesis about how nature should work it computes immediately the consequences, and makes a comparison with a list of experimental results it has at the other end." In other words, guessing is a dumb man's job. Actually it is quite the opposite, and I will try to explain why.

The first problem is how to start. You say, "Well I'd start off with all the known principles." But all the principles that are known are inconsistent with each other, so something has to be removed. We get a lot of letters from people insisting that we ought to make holes in our guesses. You see, you make a hole, to make room for a new guess. Somebody says, "You know, you people always say that space is continuous. How do you know when you get to a small enough dimension that there really are enough points in between, that it isn't just a lot of dots separated by little distances?" Or they say, "You know those quantum

mechanical amplitudes you told me about, they're so complicated and absurd, what makes you think those are right? May be they aren't right." Such remarks are obvious and are perfectly clear to anybody who is working on this problem. It does not do any good to point this out. The problem is not only what might be wrong but what, precisely, might be substituted in place of it. In the case of the continuous space, suppose the precise proposition is that space really consists of a series of dots, and that the space between them does not mean anything, and that the dots are in a cubic array. Then we can prove immediately that this is wrong. It does not work. The problem is not just to say something might be wrong, but to replace it by something and that is not so easy. As soon as any really definite idea is substituted it becomes almost immediately apparent that it does not work.

The second difficulty is that there is an infinite number of possibilities of these simple types. It is something like this. You are sitting working very hard, you have worked for a long time trying to open a safe. Then some Joe comes along who knows nothing about what you are doing, except

that you are trying to open the safe. He says "Why don't you try the combination 10:20:30?" Maybe you know already that the middle number is 32, not 20. Maybe you know as a matter of fact that it is a five-digit combination. . . . So please do not send me any letters trying to tell me how the thing is going to work. I read them-I always read them to make sure that I have not already thought of what is suggested-but it

takes too long to answer them, because they are usually in the class "try 10:20:30." As usual, nature's imagination far surpasses our own, as we have seen from the other theories which are subtle and deep. To get such a subtle and deep guess is not so easy. One must be really clever to guess, and it is not possible to do it blindly by machine.

I want to discuss now the art of guessing nature's laws. It is an art. How is it done? One way you might suggest is to look at history to see how the other guys did it. So we look at history.

We must start with Newton. He had a situation where he had incomplete knowledge, and he was able to guess the laws by putting together ideas which were all relatively close to experiment; there was not a great distance between the observations and the tests. That was the first way, but today it does not work so well.

The next guy who did something great was Maxwell, who obtained the laws of electricity and magnetism. What he did was this. He put together all the laws of electricity, due to Faraday and other people who came before him, and he looked at them and realized that they were mathematically inconsistent. In order to straighten it out he had to add one term to an equation. He did this by inventing for himself a model of idler wheels and gears and so on in space. He found what the new law was-but nobody paid much attention because they did not believe in the idler wheels. We do not believe in the idler wheels today, but the equations that he obtained were correct. So the logic may be wrong but the answer is right.

In the case of relativity the discovery was completely different. There was an accumulation of paradoxes; the known laws gave inconsistent results. This was a new kind of thinking, a thinking in terms of discussing the possible symmetries of laws. It was especially difficult, because for the first time it was realized how long something like Newton's laws could seem right, and still ultimately be wrong. Also it was difficult to accept that ordinary ideas of time and space, which seemed so instinctive, could be wrong.

Quantum mechanics was discovered in two independent ways-which is a lesson. There again, and even more so, an enormous number of paradoxes were discovered experimentally, things that absolutely could not be explained in any way by what was known. It was not that the knowledge was incomplete, but that the knowledge was too complete. Your prediction was that this should happen-it did not. The two different routes were one by Schrodinger, who guessed the equation, the other by Heisenberg, who argued that you must analyze what is measurable. These two different philosophical methods led to the same discovery in the end.

More recently, the discovery of the laws of the weak decay I spoke of, when a neutron disintegrates into a proton, an electron and an anti-neutrino-which are still only partly known-add up to a somewhat different situation. This time it was a case of incomplete knowledge, and only the equation was guessed. The special difficulty this time was that the experiments were all wrong. How can you guess the

right answer if, when you calculate the result, it disagrees with experiment? You need courage to say the experiments must be wrong. I will explain where that courage comes from later. Today we have no paradoxes-maybe. We have this infinity that comes in when we put all the laws together, but the people sweeping the dirt under the rug are so clever that one sometimes thinks this is not a serious paradox. Again, the fact that we have found all these particles does not tell us anything except that our knowledge is incomplete. I am sure that history does not repeat itself in physics, as you can tell from looking at the examples I have given. The reason is this. Any schemes-such as "think of symmetry laws," or "put the information in mathematical form," or "guess equations"-are known to everybody now, and they are all tried all the time. When you are struck, the answer cannot be one of these, because you will have tried these right away. There must be another way next time. Each time we get into this log-jam of too much trouble, too many problems, it is because the methods that we are using are just like the ones we have used before. The next scheme, the new discovery, is going to be made in a completely different way. So history does not help us much. . . .

It is not unscientific to make a guess, although many people who are not in science think it is. Some years ago I had a conversation with a layman about flying saucers because I am scientific I know all about flying saucers! I said "I don't think there are flying saucers." So my antagonist said, "Is it impossible that there are flying saucers? Can you prove that there are flying saucers? Can you prove that it's

impossible?" "No," I said, "I can't prove it's impossible. It's just very unlikely." At that he said, "You are very unscientific. If you can't prove it impossible then how can you say that it's unlikely?" But that is the way that is scientific. It is scientific only to say what is more likely and what is less likely, and not to be proving all the time the possible and impossible. To define what I mean, I might have said to him, "Listen, I mean that from my knowledge of the world that I see around me, I think, that it is much more likely that the reports of flying saucers are the results of the known irrational characteristics of terrestrial intelligence than of the unknown rational efforts of extraterrestrial intelligence." It is just more likely, that is all. It is a good guess. And we always try to guess the most likely explanation, keeping in the back of the mind the fact that if it does not work we must discuss the other possibilities. . . .

That reminds me of another point, that the philosophy or ideas around a theory may change enormously when there are very tiny changes in the theory. For instance, Newton's ideas about space and time agreed with experiment very well, but in order to get the correct motion of the orbit of Mercury, which was a tiny, tiny difference, the difference in the character of the theory needed was enormous. The reason is that Newton's laws were so simple and so perfect, and they produced definite results. In order to get something that would produce a slightly different result it had to be completely different. In stating a new law you cannot make imperfections on a perfect thing; you have to have another perfect thing. So the

difference in philosophical ideas between Newton's and Einstein's theories of gravitation are enormous.

What are these philosophies? They are really tricky ways to compute consequences quickly. A philosophy, which is sometimes called an understanding of the law, is simply a way that a person hold the laws in his mind in order to guess quickly at consequences. Some people have said, and it is true in cases "like Maxwell's equations, "Never mind the philosophy, never mind anything of this kind, just guess the equations. The problem is only to compute the answers so that they agree with experiment, and it is not necessary to have a philosophy, or argument, or words, about the equation." That is good in the sense that if you only guess the equation you are not prejudicing yourself, and you will guess better. On the other hand, maybe the philosophy helps you to guess. It is very hard to say.

For those people who insist that the only thing that is important is that the theory agrees with experiment, I would like to imagine a discussion between a Mayan astronomer and his student. The Mayans were able to calculate with great precision predictions, for example, for eclipses and for the position of the moon in the sky, the position of Venus, etc. It was all done by arithmetic. They counted a certain number and subtracted some numbers, and so on. There was no discussion of what the moon was. There was no discussion even of the idea that it went around. They just calculated the time when there would be an eclipse, or when the moon would rise at the full, and so on. Suppose that a young man went to the astronomer and said, "I have an idea.

May be those things are going around, and there are balls of something like rocks out there, and we could calculate how they move in a completely different way from just calculating what time they appear in the sky." "Yes," says the astronomer, "and how accurately can you predict eclipses?" He says, "I haven't developed the thing very far yet." Then says the astronomer, "Well, we can calculate eclipses more accurately than you can with your model, so you must not pay any attention to your idea because obviously the mathematical scheme is better." There is a very strong tendency, when someone comes up with an idea and says, "Let's suppose that the world is this way," for people to say to him, "What would you get for the answer to such and such a problem?" And he says, "I haven't developed it far enough." And they say, "Well, we have already developed it much further, and we can get the answers very accurately." So it is a problem whether or not to worry about philosophies behind ideas.

Another way of working, of course, is to guess new principles. In Einstein's theory of gravitation he guessed, on top of all the other principles, the principle that corresponded to the idea that the forces are always proportional to the masses. He guessed the principle that if you are in an accelerating car you cannot distinguish that from being in a gravitational field, and by adding that principle to all the other principles, he was able to deduce the correct laws of gravitation.

That outlines a number of possible ways of guessing.

I would now like to come to some other points about the final result. First of all, when we are all finished, and we have a mathematical theory by which we can compute consequences, what can we do? It really is an amazing thing. In order to figure out what an atom is going to do in a given situation we make up rules with marks on paper, carry them into a machine which has switches that open and close in some complicated way, and the result will tell us what the atom is going to do! If the way that these switches open and close were some kind of model of the atom, if we thought that the atom had switches in it, then I would say that I understood more or less what is going on. I find it quite amazing that it is possible to predict what will happen by mathematics, which is simply following rules which really have nothing to do with what is going on in the original thing. The closing and opening of switches in a computer is quite different from what is happening in nature.

One of the most important thing in this "guess-compute consequences-compare with experiment" business is to know when you are right. It is possible to know when you are right way ahead of checking all the consequences. You can recognize truth by its beauty. and simplicity. It is always easy when you have made a guess, and done two or three little calculations to make sure that it is not obviously wrong, to know that it is right-at least if you have any experience-because usually what happens is that more comes out than goes in. Your guess is, in fact, that something is very simple. If you cannot "see immediately that it is wrong, and it is simpler than it was before, then it is

right. The inexperienced, and crackpots, and people like that, make guesses that are simple, but you can immediately see that they are wrong, so that does not count. Others, the inexperienced students, make guesses that are very complicated, and it sort of looks as if it is all right, but I know it is not true because the truth always turns out to be simpler than you thought. What we need is imagination, but imagination in a terrible straitjacket. We have to find a new view of the world that has to agree with everything that is known, but disagree in its predictions somewhere, otherwise it is not interesting. And in that disagreement it must agree with nature. If you can find any other view of the world which agrees over the entire range where things have already been observed, but disagrees somewhere else, you have made a great discovery. It is very nearly impossible, but not quite to find any theory which agrees with experiments over the entire range in which all theories have been checked, and yet gives different consequences in some other range, even a theory whose different consequences do not turn out to agree with nature. A new idea is extremely difficult to think of. It takes a fantastic imagination.

What of the future of this adventure? What will happen ultimately? We are going along guessing the laws; how many laws are we going to have to guess? I do not know. Some of my colleagues say that this fundamental aspect of our science will go on; but I think there will certainly
certainly not be perpetual novelty, say for a thousand years. This thing cannot keep on going so that we are always going to discover more and more new laws. If we do, it will

become boring that there are so many levels one underneath the other. It seems to me that -what can happen in the future is either that all the laws become known-that is, if you had enough laws you could compute consequences and they would always agree with experiment, which would be the end of the line or it may happen that the experiments get harder and harder to make, more and more expensive, so you get 99.9 per cent of the phenomena, but there is always some phenomenon which has just been discovered, which is very hard to measure, and which disagrees; and as soon as you have the explanation of that one there is always another one, and it gets slower and slower and more and more uninteresting. That is another way it may end. But I think it has to end in one way or another.

We are very lucky to live in an age in which we are still making discoveries. It is like the discovery of America-you only discover it once. The age in which we live is the age in which we are discovering the fundamental laws of nature, and that day will never come again. It is very exciting, it is marvellous, but this excitement will have to go. Of course in the future there will be other interests. There will be the interest of the connection of one level of phenomena to another-phenomena in biology and so on, or, if you are talking about exploration, exploring other planets, but there will not still be the same things that we are doing now.

Another thing that will happen is that ultimately, if it turns out that all is known, or it gets very dull, the vigorous philosophy and the careful attention to all these things that I

have been talking about will gradually disappear. The philosophers who are always on the outside making stupid remarks will be able to close in, because we cannot push them away by saying, "If you were right we would be able to guess all the rest of the laws," because when the laws are all there they will have an explanation for them. For instance, there are always explanations about why the world is three-dimensional. Well, there is only one world, and it is hard to tell if that explanation is right or not, so that if everything were known there would be some explanation about why those were the right laws. But that explanation would be in a frame that we cannot criticize by arguing that type of reasoning will not permit us to go further. There will be a degeneration of ideas, just like the degeneration that great explorers feel is occurring when tourists begin moving in on a territory.

In this age people are experiencing a delight, the tremendous delight that you get when you guess how nature will work in a new situation never seen before. From experiments and information in a certain range you can guess what is going to happen in a region where no one has ever explored before. It is a little different from regular exploration in that there are enough clues on the land discovered to guess what the land that has not been discovered is going to look like. These guesses, incidentally, are often very different from what you have already seen-they take a lot of thought.

What is it about nature that lets this happen, that it is possible to guess from one part what the rest is going to do?

That is an unscientific question: I do not know how to answer it, and therefore I am going to give an unscientific answer. I think it is because nature has a simplicity and therefore a great beauty.[1]

1. Richard Feynman, *The Character of Physical Law*, MIT Press.

تیسرا باب

جناب ذاکر نائیک کا ڈاکٹر کیمپ بل سے مناظرہ: گمراہ کُن اغلاط

ٹھوس سائنسی حقائق: ایک مہمل تصور

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب فرماتے ہیں:

"میں اسے صرف ایسے سائنسی حقائق تک محدود رکھوں گا جو ثابت شدہ ہوں میں ان سائنسی نظریات کے بارے میں بات نہیں کروں گا جن کی حیثیت محض مفروضوں اور اندازو ں سے زیادہ نہیں جن کا کوئی ثبوت موجود نہیں کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس بعض اوقات پلٹا بھی کھا جاتی ہے"۔[1]

سائنس میں ٹھوس سائنسی حقائق جو ثابت شدہ ہوں کیا ہوتے ہیں؟ نائیک صاحب نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ سائنس میں کوئی حقیقت قطعی اور آخری حقیقت نہیں ہوتی، سائنس کی دنیا میں یہ تصور ہی غیر علمی ہے، نائیک صاحب اس صدی کے سات بڑے مفکرین فلاسفہ اور سائنس دان: K.R. Popper, Feynman, Carl-G Hempel، P.K Feyerabend، R.S. Kuhn، Pierre Duhem اور Imer Lakatos کی کتابیں پڑھ لیتے تو بلا دلیل یہ دعویٰ نہ فرماتے۔ انھیں سائنس کی اصل حقیقت، ماہیت اور حیثیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا۔ فلسفہ سائنس کی کسی بھی کتاب کا مطالعہ اس کے موقف کی تردید کے لیے کافی ہے۔ وہ عہد حاضر کے آئن اسٹائن فائن مین کی کتاب *Six Easy Peices* کے دلائل [جو صفحات گزشتہ میں نقل کیے گئے ہیں] بے بنیاد علمی ادعا سے دستبرداری کے لیے کافی ہیں کہ سائنس ٹھوس علم ہے۔ پاپر بلا شک وشبہ بیسویں صدی کا بڑا فلسفی ہے۔ اس نے Falsification یعنی سائنس کے نظریہ تردیدیت پر بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ سائنس کا علم تردید سے ارتقاء پاتا ہے جس نظریے کی جتنی زیادہ تردید ہو وہ اسی قدر بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ سائنس کی

---

[1] ذاکر نائیک، خطباتِ ذاکر نائیک، [مترجم: سید امتیاز احمد]لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۰۸ء صفحہ ۴۱۔

بے وقعتی کے بارے میں پاپر کا موقف Stanford Encyclopedia of Philosophy کے مقالہ نگار نے Popper پر اپنے مقالے میں نہایت اختصار کے ساتھ اصل مصادر کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ چند تمہیدی کلمات کے بعد اس کا حوالہ فلسفیانہ مباحث کی مشکلات سے نبٹنے کے لیے دیا جا رہا ہے تا کہ قارئین اس بحث کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ ہزرل سے لے کر پاپر تک کوئی سائنس کو حقیقت جاننے کا علم تسلیم نہیں کرتا سب کا مشترکہ خیال یہ ہے کہ سائنس کام چلاتی ہے Problem Solving کام چلانے والے علم سے حقیقت [reality] کی تلاش کا دعویٰ محض دعویٰ ہے، پاپر یہ بھی بتاتا ہے کہ مشاہدات پہلے سے موجود نظریات کے بغیر نہیں ہوتے۔ لہٰذا سائنس کو صرف مشاہدات کا علم سمجھ کر اسے معروضی [objective] علم سمجھنا درست نہیں یہ مشاہدات نظریات کی روشنی میں ہوتے ہیں، دوسرے معنوں میں سائنسی مشاہدات سے حاصل علم غیر اقداری [Value neutral] نہیں ہوتا یہ اقداری [value loaded] اور موضوعی [Subjective or theory laden] علم ہوتا ہے۔ Popper کے فلسفے کے مطابق جو فلسفۂ سائنس میں تسلیم شدہ امر ہے کہ سائنس کا اہم ترین وظیفہ مسائل کو حل کرنا ہے۔ [Problem Solvers] سائنٹفک میتھڈ کا اہم ترین حصہ Deductive testing of theories ہے، اس کے خیال میں مشاہدات کے لیے خاص حقائق دستیاب نہیں ہوتے۔ No pure facts available، لہٰذا تمام سائنسی مشاہداتی بیانات Theory laden ہوتے ہیں اور خالص موضوعی اثرات، مفادات، خواہشات اور توقعات کے بطن سے ظہور کرتے ہیں۔ Purely subjective factors interests, expectations, wishes etc. اکثر سائنسی نظریات قبل تجربی *a priori* ہوتے ہیں وہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ سائنسی علم قطعاً ٹھوس نہیں بلکہ عارضی، مفروضاتی، قیاسی، لمحاتی، غیر قطعی اور مابعد الطبیعیاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ All knowledge is provisional, conjectural, hypothetical پاپر کے خیال میں ہم سائنسی نظریات کی تصدیق [confirm] نہیں کر سکتے ہم صرف ان کی تردید [refute] کر سکتے ہیں۔ اور سائنس کا مقصد کسی خاص علم کی جستجو نہیں بلکہ صرف معلومہ حقائق کی تشریح یا مسائل کے حل کی کوششوں کا علم ہے:

Science is not a quest for certain knowledge but an evolutionary process in which hypothesis or conjectectures are imaginatively proposed and tested in order to explain facts or to solve problems.

پاپر کے افکار پر تنقید کرنے والوں نے پاپر سے اختلاف کرنے کے باوجود بھی بڑے بڑے سائنسی نظریات میں بڑی بڑی اغلاط کے امکان کو روا مانا ہے، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ بڑے بڑے سائنسی نظریے خامیوں، گمراہیوں اور ناکامیوں کے باوجود وجود رکھتے ہیں، زندہ رہتے ہیں، ان کی زندگی سے یہ

نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ ٹھوس ہوتے ہیں غیر علمی رویہ ہے۔ نائیک صاحب اِس عبارت کا بغور مطالعہ فرمائیں:

That all high level theories grow and live despite the existence of anomalies. The existence of such anomalies is not usualy taken by the working scientists as an indication that the theory in question is false on the contrary, he will usually and necessarily, assume that Auxiliary hypotheses which are associated with the theory can be modified to incorporate and explain existing anomalies.

پاپر پر اس تنقید سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کوئی سائنسی نظریہ ایسا نہیں ہے جو خامیوں [Anomalies] سے خالی ہو ان خامیوں، غلطیوں، کمیوں، کمزوریوں، عیوب اور تضادات کے باوجود سائنسی نظریے کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان خامیوں کی روشنی میں اسے ترمیم، تبدیلی اور نظر ثانی کے عمل سے گزارا جاسکتا ہے اور جیسے جیسے خامیاں نظر آتی جاتی ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پاپر اور اس کے ناقدین Grunbaum، Tichy، Miller، Lakatos کے تنقیدی افکار و خیالات کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ کوئی سائنسی نظریہ اغلاط سے مبرا نہیں ہے، لہٰذا وہ علم جو اغلاط پر مبنی ہو اور جس کا سکہ صرف اور صرف مسلسل اغلاط دور کر کے چلایا جاتا ہو وہ علم کیسے کہلا سکتا ہے؟ علم ہو اور اس میں اغلاط ہوں وہ علم کیسے ہوسکتا ہے؟ ایسے غلط سلط علم اور اغلاط کے دفتر سائنسی نظریات کے علم کو نائیک صاحب فرماتے ہیں کہ ''ٹھوس علم ہے''۔ علم موضوع اور معروض کے تعلق کا نام ہے، جب موضوع [Subject] مسلسل بدل رہا ہو تو وہ علم کیسے کہلا سکتا ہے۔ حقیقت اپنے ہونے اور اپنے جواز کے لیے کسی دوسرے پر منحصر نہیں ہوتی یہ کیسا علم اور کیسی حقیقت ہے جو تجربات پر منحصر ہے اور تجربہ کا نتیجہ بدلتے ہی بدل جاتی ہے؟ سائنس نہ علم [knowledge] ہے، نہ حقیقت [Reality] ہے، نہ حقیقت علم [Reality of Knowledge] ہے، اس لیے کہ یہ اپنے ہونے کا جواز اپنے اندر نہیں رکھتی لہٰذا اسے علم قرار دینا ممکن ہی نہیں۔ جب کہ قرآن حکیم علم ہے، اپنے ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتا ہے [Self Evident Evidence] اسے سائنس سے ثابت کرنا کسی عقلی منہاج میں قابل قبول نہیں، سائنس حقیقت کی تلاش وتشریح وتعبیر کا علم نہیں حقیقت کی تخلیق [creation of reality] کا علم ہے۔ حقیقت مادی دنیا میں تخلیق نہیں پاسکتی وہ خلق نہیں ہوتی ازلی ابدی وجود رکھتی ہے اور اپنے جواز وجود کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہوتی۔ سائنس کا علم خواہشات، مفادات اور امیدوں سے تخلیق ہوتا ہے، اس لیے Popper اس علم کو pure subjective factors پر مشتمل علم قرار دیتا ہے۔ اس موضوعی علم [Subjective Knowledge] سے معروضی علم قرآن کا اثبات کرنا اور یہ کہنا کہ معروض وموضوع میں کوئی تضاد نہیں ہوسکتا کمال سادگی کے سوا کیا ہے؟ علم وہ ہے جو مفروضات سے ماورا [pre -suppositionless]

ہو، سائنسی علم تمام تر مفروضات پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں نائیک صاحب اگر ہزرل کے یورپین سائنس پر اعتراضات اس کی کتاب The Crises of European Sciences میں پڑھ لیں تو ان کے بہت سے واہمے دور ہو جائیں گے۔ لہٰذا سائنس علم کے دائرے میں نہیں آتی جبکہ قرآن علم بھی ہے، علمِ حقیقت بھی اور اصل علم تو حقیقت کا علم ہی ہے، اسی علمِ حقیقی کو جو خالقِ حقیقی نے وحی کے ذریعے عطا کیا سائنسی، ظنی، قیاسی اور غیر قطعی علم سے اس کا موازنہ بہت بڑا ظلم ہے۔ پاپر کا موقف درج ذیل ہے، خط کشیدہ سطور کو نہایت توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے:

As Popper represents it, the central problem in the philosophy of science is that of demarcation, i.e., of distinguishing between science and what he terms 'non-science', under which heading he ranks, amongst others, logic, metaphysics, psycho-analysis, and Adler's individual psychology. Popper is unusual amongst contemporary philosophers in that he *accepts* the validity of the Humean critique of Induction, and indeed, goes beyond it in arguing that induction is never actually used by the scientist. However, he does not concede that this entails the scepticism which is associated with Hume, and argues that the Baconian/Newtonian insistence on the primacy of 'pure' observation, as the initial step in the formation of theories, is completely misguided: all observation is selective and theory-laden—there are no pure or theory-free observations. In this way he de-stabilises the traditional view that science can be distinguished from non-science on the basis of its inductive methodology; in contradistinction to this, Popper holds that there is no unique methodology specific to science. Science, like virtually every other human, and indeed organic, activity, Popper believes, consists largely of problem-solving.

Popper, then, repudiates induction, and rejects the view that it is the characteristic method of scientific investigation and inference, and substitutes *falsifiability* in its place. It is easy, he argues, to obtain evidence in favour of virtually any theory, and he consequently holds that such 'corroboration', as he terms it, should count scientifically only if it is the

positive result of a genuinely 'risky' prediction, which might conceivably have been false. For Popper, a theory is scientific only if it is refutable by a conceivable event. Every genuine test of a scientific theory, then, is logically an attempt to refute or to falsify it, and one genuine counter-instance falsifies the whole theory. In a critical sense, Popper's theory of demarcation is based upon his perception of the logical asymmetry which holds between verification and falsification: it is logically impossible to conclusively verify a universal proposition by reference to experience (as Hume saw clearly), but a single counter-instance conclusively falsifies the corresponding universal law. In a word, an exception, far from 'proving' a rule, conclusively refutes it.

Every genuine scientific theory then, in Popper's view, is *prohibitive*, in the sense that it forbids, by implication, particular events or occurrences. As such it can be tested and falsified, but never logically verified. Thus Popper stresses that it should not be inferred from the fact that a theory has withstood the most rigorous testing, for however long a period of time, that it has been verified; rather we should recognise that such a theory has received a high measure of corroboration and may be provisionally retained as the best available theory until it is finally falsified (if indeed it is ever falsified), and/or is superseded by a better theory.

Popper has always drawn a clear distinction between the *logic* of falsifiability and its *applied methodology*. The logic of his theory is utterly simple: if a single ferrous metal is unaffected by a magnetic field it cannot be the case that all ferrous metals are affected by magnetic fields. Logically speaking, a scientific law is conclusively falsifiable although it is not conclusively verifiable. Methodologically, however, the situation is much more complex: no observation is free

from the possibility of error—consequently we may question whether our experimental result was what it appeared to be.

Thus, while advocating falsifiability as the criterion of demarcation for science, Popper explicitly allows for the fact that in practice a single conflicting or counter-instance is never sufficient methodologically to falsify a theory, and that scientific theories are often retained even though much of the available evidence conflicts with them, or is anomalous with respect to them. Scientific theories may, and do, arise genetically in many different ways, and the manner in which a particular scientist comes to formulate a particular theory may be of biographical interest, but it is of no consequence as far as the philosophy of science is concerned. Popper stresses in particular that there is no unique way, no single method such as induction, which functions as the route to scientific theory, a view which Einstein personally endorsed with his affirmation that 'There is no logical path leading to [the highly universal laws of science]. They can only be reached by intuition, based upon something like an intellectual love of the objects of experience'. Science, in Popper's view, starts with problems rather than with observations—it is, indeed, precisely in the context of grappling with a problem that the scientist makes observations in the first instance: his observations are selectively designed to test the extent to which a given theory functions as a satisfactory solution to a given problem.

On this criterion of demarcation physics, chemistry, and (non-introspective) psychology, amongst others, are sciences, psycho-analysis is a pre-science (i.e., it undoubtedly contains useful and informative truths, but until such time as psycho-analytical theories can be formulated in such a manner as to be falsifiable, they will

not attain the status of scientific theories), and astrology and phrenology are pseudo-sciences. Formally, then, Popper's theory of demarcation may be articulated as follows: where a 'basic statement' is to be understood as a particular observation-report, then we may say that a theory is scientific if and only if it divides the class of basic statements into the following two non-empty sub-classes: (a) the class of all those basic statements with which it is inconsistent, or which it prohibits—this is the class of its potential falsifiers (i.e., those statements which, if true, falsify the whole theory), and (b) the class of those basic statements with which it is consistent, or which it permits (i.e., those statements which, if true, corroborate it, or bear it out).

For Popper accordingly, the growth of human knowledge proceeds from our problems and from our attempts to solve them. These attempts involve the formulation of theories which, if they are to explain anomalies which exist with respect to earlier theories, must go beyond existing knowledge and therefore require a leap of the imagination. For this reason, Popper places special emphasis on the role played by the independent creative imagination in the formulation of theory. The centrality and priority of *problems* in Popper's account of science is paramount, and it is this which leads him to characterise scientists as 'problem-solvers'. Further, since the scientist begins with problems rather than with observations or 'bare facts', Popper argues that the only logical technique which is an integral part of scientific method is that of the deductive testing of theories which are not themselves the product of any logical operation. In this deductive procedure conclusions are inferred from a tentative hypothesis. These conclusions are then compared with one another and with other relevant statements to determine whether they falsify

or corroborate the hypothesis. Such conclusions are not directly compared with the facts, Popper stresses, simply because there are no 'pure' facts available; all observation-statements are theory-laden, and are as much a function of purely subjective factors (interests, expectations, wishes, etc.) as they are a function of what is objectively real. How then does the deductive procedure work? Popper specifies four steps:

(a) The first is *formal*, a testing of the internal consistency of the theoretical system to see if it involves any contradictions.

(b) The second step is *semi-formal*, the axiomatising of the theory to distinguish between its empirical and its logical elements. In performing this step the scientist makes the logical form of the theory explicit. Failure to do this can lead to category-mistakes____ the scientist ends up asking the wrong questions, and searches for empirical data where none are available. Most scientific theories contain analytic (i.e., a priori) and synthetic elements, and it is necessary to axiomatise them in order to distinguish the two clearly.

(c) The third step is the comparing of the new theory with existing ones to determine whether it constitutes an advance upon them. If it does not constitute such an advance, it will not be adopted. If, on the other hand, its explanatory success matches that of the existing theories, and additionally, it explains some hitherto anomalous phenomenon, or solves some hitherto unsolvable problems, it will be deemed to constitute an advance upon the existing theories, and will be adopted. Thus science involves theoretical progress. However, Popper stresses that we ascertain whether one theory is better than another by deductively testing both theories, rather than by induction. For this reason, he argues that a theory is deemed to be better than another if (while unfalsified) it has greater empirical content, and therefore

greater predictive power than its rival. The classic illustration of this in physics was the replacement of Newton's theory of universal gravitation by Einstein's theory of relativity. This elucidates the nature of science as Popper sees it: at any given time there will be a number of conflicting theories or conjectures, some of which will explain more than others. The latter will consequently be provisionally adopted. In short, for Popper any theory X is better than a 'rival' theory Y if X *has greater empirical content, and hence greater predictive power, than* Y.

(d) The fourth and final step is the testing of a theory by the empirical application of the conclusions derived from it. If such conclusions are shown to be true, the theory is corroborated (but never verified). If the conclusion is shown to be false, then this is taken as a signal that the theory cannot be completely correct (logically the theory is falsified), and the scientist begins his quest for a better theory. He does not, however, *abandon* the present theory until such time as he has a better one to substitute for it. More precisely, the method of theory-testing is as follows: certain singular propositions are deduced from the new theory-these are predictions, and of special interest are those predictions which are 'risky' [in the sense of being intuitively implausible or of being startlingly novel] and experimentally testable. From amongst the latter the scientist next selects those which are not derivable from the current or existing theory-of particular importance are those which contradict the current or existing theory. He then seeks a decision as regards these and other derived statements by comparing them with the results of practical applications and experimentation. If the new predictions are borne out, then the new theory is *corroborated* [and the old one falsified], and is adopted as a working hypothesis. If the predictions are not

borne out, then they falsify the theory from which they are derived. Thus Popper retains an element of empiricism: for him scientific method does involve making an appeal to experience. But unlike traditional empiricists, Popper holds that experience cannot *determine* theory, it rather *delimits* it: it shows which theories are false, not which theories are true. Moreover, Popper also rejects the empiricist doctrine that empirical observations are, or can be, infallible, in view of the fact that they are themselves theory-laden.

The general picture of Popper's philosophy of science, then is this: Hume's philosophy demonstrates that there is a contradiction implicit in traditional empiricism, which holds both that all knowledge is derived from experience and that universal propositions (including scientific laws) are verifiable by reference to experience. The contradiction, which Hume himself saw clearly, derives from the attempt to show that, notwithstanding the open-ended nature of experience, scientific laws may be construed as empirical generalisations which are in some way finally confirmable by a 'positive' experience. Popper eliminates the contradiction by rejecting the first of these principles and removing the demand for empirical verification in favour of empirical falsification in the second. Scientific theories, for him, are not inductively inferred from experience, nor is scientific experimentation carried out with a view to verifying or finally establishing the truth of theories; rather, all knowledge is provisional, conjectural, hypothetical-we can never finally prove our scientific theories, we can merely (provisionally) confirm or (conclusively) refute them; hence at any given time we have to choose between the potentially infinite number of theories which will explain the set of phenomena under investigation. Faced with this choice, we can only eliminate

those theories which are demonstrably false, and rationally choose between the remaining, unfalsified theories. Hence Popper's emphasis on the importance of the critical spirit to science ___ for him critical thinking is the very essence of rationality. For it is only by critical thought that we can eliminate false theories, and determine which of the remaining theories is the best available one, in the sense of possessing the highest level of explanatory force and predictive power. It is precisely this kind of critical thinking which is conspicuous by its absence in contemporary Marxism and in psychoanalysis.

How then can one be certain that one is questioning the right thing? The Popperian answer is that we cannot have absolute certainty here, but repeated tests usually show where the trouble lies. Even observation statements, Popper maintains, are fallible, and science in his view is not a quest for certain knowledge, but an evolutionary process in which hypotheses or conjectures are imaginatively proposed and tested in order to explain facts or to solve problems. Popper emphasises both the importance of questioning the background knowledge when the need arises, and the significance of the fact that observation-statements are theory-laden, and hence fallible. For while falsifiability is simple as a logical principle, in practice it is exceedingly complicated-no single observation can ever be taken to falsify a theory, for there is always the possibility (a) that the observation itself is mistaken, or (b) that the assumed background knowledge is faulty or defective.

Popper was initially uneasy with the concept of truth, and in his earliest writings he avoided asserting that a theory which is corroborated is true-for clearly if every theory is an open-ended hypothesis, as he maintains, *then ipso facto* it has to be at least potentially false. For this reason

Popper restricted himself to the contention that a theory which is falsified is false and is known to be such, and that a theory which replaces a falsified theory (because it has a higher empirical content than the latter, and explains what has falsified it) is a 'better theory' than its predecessor. However, he came to accept Tarski's reformulation of the correspondence theory of truth, and in Conjectures and Refutations (1963) he integrated the concepts of truth and content to frame the metalogical concept of 'truthlikeness' or 'verisimilitude'. A 'good' scientific theory, Popper thus argued, has a higher level of verisimilitude than its rivals, and he explicated this concept by reference to the logical consequences of theories. A theory's content is the totality of its logical consequences, which can be divided into two classes: there is the *'truth-content'* of a theory, which is the class of true propositions which may be derived from it, on the one hand, and the *'falsity-content'* of a theory, on the other hand, which is the class of the theory's false consequences (this latter class may of course be empty, and in the case of a theory which is true is necessarily empty).

The utilisation of either method of computing verisimilitude shows, Popper held, that even if a theory t2 with a higher content than a rival theory t1 is subsequently falsified, it can still legitimately be regarded as a better theory than t1, and 'better' is here now understood to mean t2 is closer to the truth than t1. Thus scientific progress involves, on this view, the abandonment of partially true, but falsified, theories, for theories with a higher level of verisimilitude [not absolute علم مطلق نہیں اغلب، قرین قیاس، بہ ظاہر صحیح] [مرتب، i.e., which approach more closely to the truth]. In this way, verisimilitude allowed Popper to mitigate what many saw as the pessimism of an anti-inductivist philosophy of

science which held that most, if not all scientific theories are false, and that a true theory, even if discovered, could not be known to be such. With the introduction of the new concept, Popper was able to represent this as an essentially optimistic position in terms of which we can legitimately be said to have reason to believe that science makes progress towards the truth through the falsification and corroboration of theories. Scientific progress, in other words, could now be represented as progress towards the truth, and experimental corroboration could be seen an indicator of verisimilitude. [1]

قرآن کی جدید سائنس کے ذریعے تصدیق یا تغلیط: گمراہ کن تصور:

نائیک صاحب کہتے ہیں: "کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہو گا جو قرآن کے کسی ایک بیان کو بھی جدید سائنس کی روشنی میں غلط ثابت کر سکے۔" [۲]

خدا موجود ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسول ہیں، قرآن اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے، جنت وجہنم وجود رکھتے ہیں، انسان جو کچھ انفاق کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جمع ہوتا ہے، اللہ انسان کی ایک ایک حرکت کا علم رکھتا ہے، ارحام میں کیا پرورش پا رہا ہے، خدا سب جانتا ہے، وہ دلوں کے راز تک جان لیتا ہے، ان قرآنی بیانات کو نائیک صاحب جدید سائنس کی روشنی میں ثابت کر کے دکھا دیں۔ قرآن مجید کے بے شمار احکامات و بیانات مافوق الحسی، مابعد الطبیعی اور روحانی احوال و کیفیات سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا سائنسی دائرۂ کار سے کوئی تعلق نہیں، جس دائرۂ کار کی دلالت ہی طبیعی ہو، وہاں ما بعد الطبیعی دلالت کی تلاش بے معنی بات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کے پاس عقل محض [Pure reason] ہے جو حسی اور طبیعی دنیا سے اوپر اٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ سائنس صرف تعقل پر انحصار کرتی ہے جو علم کو کل [Whole] میں دیکھنے سے قاصر ہے لہٰذا عقل کے ذریعے جزئی علم کا بھی ایک کم تر جزو ہی حاصل ہوتا ہے۔ برگساں نے اس سلسلے میں وجدان کے بغیر عقل حواس، تجربات اور مشاہدات سے حاصل علم کو غیر حقیقی اور ناممکن قرار دینے کے لیے جو مثالیں دی ہیں اگر نائیک صاحب انھیں پڑھ لیں تو حیران رہ جائیں، برگساں اس صدی کے بڑے مابعد الطبیعی فلاسفہ [Great Metaphysicions] میں

---

1. From Stanford Encyclopedia Archives of Philosophy: Karl Popper. at plato. stanford.edu/entries/Popper on 30-8-09

۲۔ خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۱۴۔

شامل ہے، وہ سائنس پر عبور رکھتا تھا اور فلسفی بھی تھا اس نے مغربی تہذیب میں سائنس کے بڑھتے ہوئے رسوخ کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا اور اپنے دلائل سے عقلی علوم کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ محدود عقل ان مابعد الطبیعی امور تک نہیں پہنچ سکتی، لیکن وہ عقل جو قلب سے واصل ہو اور ایک دوسرے منہاج علم اور مابعد الطبیعیات سے نکلتی ہے وہ ان امور کو اپنی گرفت میں لا سکتی ہے۔ محبت ایک جذبہ ہے، جس کے وجود سے ہر شخص آگاہ ہے لیکن سائنسی منہاج علم میں محبت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، محبت کے جذبے کا ریاضیاتی جائزہ نہیں لیا جا سکتا کہ کتنی محبت، کس سے محبت، کیسی محبت، کب تک محبت، سائنس محبت کے کیف و کم اور دورانیے کو محسوس کرنے کی سکت ہی نہیں رکھتی، مگر اس جذبے سے انکار بھی ممکن نہیں، سائنس یہ کہتی ہے کہ ہم اسے اپنی زبان میں بیان نہیں کر سکتے لہٰذا محبت سائنسی دائرۂ علم سے خارج قرار پاتی ہے۔ فی زمانہ سائنس کو ہی ذریعۂ علم مانا جاتا ہے لہٰذا صرف وہی امور علم تسلیم کیے جاتے ہیں جو حسی اور تجربی طریقے سے ثابت کیے جا سکیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ذکر تقریباً ۹۸۰ آیات میں ہے، السماء اور سموات کا ذکر ۱۲۰ اور ۱۹۰ آیات میں ہے، صلوٰۃ کا ذکر ۶۷ مقامات پر، رسول، پیغمبر اور انبیاء کا ذکر ۵۰۰ سے زائد مقامات پر، جنت ۷۰ مرتبہ، جہنم ۶۴ مرتبہ، جنات ۷۰ مرتبہ، آخرت ۱۰۰ مرتبہ، قیامت ۶۶ مرتبہ، الکتاب ۲۱۸ مرتبہ اور دیگر بے شمار ایسی اصطلاحات کا تذکرہ ہے جو سائنسی منہاج علم کے دائرے سے باہر ہیں۔ تو کیا سائنس ان اصطلاحات کو تسلیم کرتی ہے؟ ظاہر ہے سائنس ان کا انکار کرتی ہے، قرآن کو اور اس کے بیان کردہ واقعات کو علم اور دائرہ علم سے باہر سمجھ کر انھیں غیر سائنسی بیانات قرار دیتی ہے کیونکہ سائنسی علم کے مبادیات ایسے دعووں کو تسلیم نہیں کرتے جن کا تجربہ [experience] نہ کیا جا سکے. جن کی تردید [Falsify / Refute] نہ کی جا سکے، جن میں شک [doubt] نہ کیا جا سکے، جن کو تجربہ گاہ میں پرکھا [Laboratory experement] نہ جا سکے اور ریاضی کی زبان [Mathematical Language] میں بیان نہ کیا جا سکے لہٰذا یہ تمام آیات غیر سائنسی ہیں۔

قرآن مجید کے کسی بیان کا جدید سائنس کی روشنی میں اثبات یا استرداد کا دعویٰ، ایک لغو اور مہمل بات ہے۔ اس موقف کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مثلاً قرآن مجید کے بارے میں آتا ہے کہ اسے جبرئیل امین لے کر قلب محمدیؐ پر نازل ہوئے جدید سائنس نزول قرآن کے اس طریقے کو نہیں مان سکتی، اسی طرح جنت و جہنم کا وجود وہاں کی نعمتوں اور کلفتوں کا تذکرہ درج ذیل مقامات پر قرآن نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے: ۲:۸۲، ۲:۲۶۶، ۳:۱۸۵، ۳:۱۴۲، ۲۹:۸۵، ۳۶:۲۶، ۳۹:۷۳، ۴۷:۶، ۶۹:۲۲، ۸۸:۱۰، اسی طرح دو جنتوں کا ذکر: ولمن خاف مقام ربہ جنتان ۵۵:۴۶، ۵۵:۶۲، ۳۴:۱۵، اسی طرح مومنین کے نفسوں کو جنت کے بدلے خرید لینے کا قرآنی دعویٰ: ان اللّٰہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ [۹:۱۱۱]، جدید سائنس ایسے کسی دعوے کو تسلیم نہیں کرتی۔ اسی طرح خشیت الٰہی، اس کی طلب، رغبت، اہمیت کی جو تفصیل قرآن کے درج ذیل مقامات میں بیان ہوئی ہے: ۲۴:۵۲، ۲:۷۴، ۲۰:۲، ۲۰:۳، ۲۰:۴۴، ۲۸:۳۵، ۷۹:۲۶، ۸۰:۹_۸، ۴:۷۷، ۱۷:۱۰۹، ۵۹:۲۱،

۲۳:۲، ۳۵:۱۸، ۳۹:۲۳، ۴۳:۶۸، ۴۴:۷۰، ۳۹:۴۱، ۹:۷۹، ۲:۸۸، ۸:۹۸، جدید سائنس خشیت کی کسی ایسی کیفیت کو تسلیم نہیں کرتی، اسی طرح سود کے بارے میں قرآن کا یہ دعویٰ کہ سود سے مال اللہ کی نظر میں نہیں بڑھتا: وما اتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عنداللّٰہ جدید سائنس کے نزدیک یہ دعویٰ مہمل ہے۔ اسی طرح ذکر الٰہی میں دلوں کا سکون اور اطمینان ہے [۱۳:۲۸]، مومنین کے قلوب پر نزولِ سکینہ [۹:۲۶]، [۹:۴۰]، [۴۸:۲۶]، اسی طرح دلوں میں زنگ لگنا، قفل لگنا، غلاف چڑھنا، دلوں کو ہدایت ملنا، اس پر ٹھپہ لگنا، دلوں کا مُزیّن ہونا ملاحظہ کیجیے: ۲:۲۸۳، ۴۰:۳۵، ۶۴:۱۱، ۳۵:۸، اسی طرح قرآن وحی کو ''علم'' کہتا ہے ۲:۷۸، ۲:۲۵۱، ۳:۷، ۴:۱۶۲، ۲:۱۷۹، ۲:۱۹۸، ۱۲:۱۱۱، ۱۳:۱۹، ۱۴:۵۲، ۴۰:۵۴، ۶۵:۱۰، جبکہ جدید سائنس وحی کو کسی درجے میں بھی ذریعۂ علم قرار نہیں دیتی۔

اسی طرح ناقۂ صالح کی خصوصیات، قمیص یوسف کے اوصاف، معجزاتِ موسیٰ میں عصا کا سانپ بن جانا، جادوگروں سے مقابلہ کرنا، ید بیضا، پانی پھٹ جانا، حضرت یونس کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنا، فی الفور سایہ دار درخت کا اُگنا غرض بے شمار مابعدالطبیعی حقائق جو محض مادی حسی، طبعی، عقل وشعور کے لیے ناقابلِ تسلیم مباحث ہیں قرآن میں کثرت سے بیان کیے گئے ہیں جن کی تردید یا تغلیط سائنس کا دائرہ ہی نہیں لیکن سائنسی دائرے میں اسے علم تسلیم نہیں کیا جاتا۔ نائیک صاحب کا یہ دعویٰ کہ قرآن میں سائنسی غلطیوں کا امکان نہیں ایک مہمل اور بے معنی دعویٰ ہے۔

قرآن میں آتا ہے: اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ [۷۷:۳۰] ''چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے''، جدید سائنس ایسے کسی سائے کو نہیں مانتی۔ قرآن میں جگہ جگہ آسمان اور سات آسمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ سائنس کسی آسمان کو نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ اوپر صرف خلائے بسیط محیط ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ قرآن میں تقریباً تین سو اٹھارہ آیات میں آسمان دنیا کا ذکر کیا گیا۔ سائنس ان تین سو اٹھارہ آیتوں کا انکار کرتی ہے۔ نائیک صاحب کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ قرآن میں سورج کا ذکر بار بار آیا ہے لیکن عموماً اسی سورج کا ذکر ہے جو لوگوں کو نظر آتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں بس ایک ہی سورج ہے لیکن حقیقت میں ہر سیارے میں کئی سورج گردش کر رہے ہیں، اس کی تفصیل جاننے کے لیے Black holes سے متعلق سائنسی مباحث کا مطالعہ کیا جائے۔ قرآن میں صرف ایک چاند کا ذکر ہے جبکہ تمام سیاروں کے اپنے اپنے کئی چاند ہیں تو خدانخواستہ قرآن میں صرف ایک چاند اور سورج کے ذکر کا یہ مطلب ہے کہ، نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ اپنی کائنات سے خود ناواقف ہے؟ دوسرے لفظوں میں قرآن کی یہ تمام آیات بھی جدید سائنس کے مطابق نہیں ہیں۔ کیونکہ قرآن آسمان دنیا کے صرف ایک سورج کا ذکر کر رہا ہے سورج کا ذکر قرآن میں تقریباً تینتیس مرتبہ آیا ہے۔ لہٰذا نائیک صاحب کے اصول کے تحت یہ ۳۳ آیات بھی ادھورے سائنسی علم کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یہ بات تو قرآن کے بغیر بھی دنیا کا ہر آدمی اپنے مشاہدے سے بیان کر سکتا ہے کہ آسمان پر صرف اور صرف ایک سورج موجود ہے، لیکن ایک سورج یعنی آسمان دنیا پر چمکنے والے شمس کا قرآن میں ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ ہر ایک

کونظر آ رہا ہے۔ یہ ازل سے ابد تک کے تمام انسانوں کا اجتماعی، آفاقی اور معروضی مشاہدہ ہے۔ اس ایک سورج کے ہونے کے لیے قرآن کی پینتیس آیات کی کوئی ضرورت نہ تھی نہ سائنس کی سند کی ضرورت۔

ظاہر ہے یہاں سورج کے ذکر کا مقصد نظام شمسی اور علم فلکیات کا بیان نہیں بلکہ لوگوں کو ایک آفاقی و معروضی تجربے کے ذریعے خالق کائنات کی خلاقیت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے نہ کہ سورجوں کی تعداد کے علم کی طرف، اگر قرآن علم سائنس کی رہنما کتاب تھی جیسا کہ نائیک صاحب کا خیال ہے تو اس میں دیگر سورجوں اور چاندوں کا ضمناً یا تفصیل سے ذکر ضروری تھا، یا کم از کم ان کی تعداد کے بارے میں کوئی اشارہ یا کنایہ ہوتا۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے فرشتے سے فرمایا کہ وہ بوڑھے اور ان کی اہلیہ بانجھ ہیں پھر بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا: یٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ [۳:۴۳] لیکن اللہ نے انھیں بیٹا عطا کر دیا۔ حضرت ابراہیم کو بھی اسی طرح آخر عمر میں اولاد عطا کی گئی۔ جدید سائنس قرآن کی ان دونوں آیتوں کو تسلیم نہیں کرتی کیونکہ وہ صرف اور صرف علت و معلول کے مفروضے پر یقین رکھتی ہے۔ بانجھ عورت کا علاج کے بغیر بچہ پیدا کرنا یا مطلق بوڑھی بانجھ کا علاج کے بعد بھی بچہ پیدا کرنا جدید سائنس کی نظر میں ممکن نہیں تو کیا قرآن کی یہ آیات غلط ہیں؟ قرآن میں آیات متشابہات کے بارے میں کہا گیا: هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؑ☆ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ [۳:۷] کہ ان کا مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور اہل علم یہی کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے۔ ایسی آیات کی تعداد اچھی خاصی ہے جن آیات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا کہ ان کا حقیقی مفہوم کوئی نہیں جانتا تو سائنس کے دائرے سے یہ آیتیں بھی باہر رہ گئیں اگر جدید سائنس آیات متشابہات کا مفہوم بتا سکتی ہے [نعوذ باللہ] تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا بیان خود اپنے بارے میں درست نہیں ہے۔ ان آیتوں کے بارے میں نائیک صاحب کوئی عقلی و علمی، اور منطقی دلیل لوگوں کو سمجھانے کے لیے دے سکتے ہیں؟ ان آیتوں پر تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ایمان لانا ہوگا یہاں سائنسی، کلامی اور عقلی دلیلیں ناکام ہو جائیں گی، اسی طرح: اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [۲:۲۵۹] قرآن کے مطابق ایک آدمی سو برس تک بغیر کھائے پیے مردہ پڑا رہا، اس کا کھانا سو برس تک ٹھیک رہا خراب نہ ہوا، جب اللہ نے اسے سو برس کے بعد زندہ کیا تو اس کا گدھا مردہ اور پنجر تھا پھر اس کے سامنے

گدھے کو بھی زندہ کر دیا اور اس آدمی کو بتایا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ مردے کو زندہ کرے گا، کیا جدید سائنس اس آیت کو تسلیم کرے گی؟ کوئی سائنس دان سائنسی منہاج میں ان آیات کو تسلیم نہیں کرے گا، اسی طرح: وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَ لٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ [۲:۲۶۰] قرآن بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار پرندے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پہاڑ پر رکھ دیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ زندہ ہو گئے۔ جدید سائنس ایسے کسی بیان کو تسلیم نہیں کرتی۔ کیا نائیک صاحب جدید سائنس سے اس آیت کو ثابت کر سکتے ہیں؟ کیا مباہلے کے ذریعے کسی انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے؟ سائنس اسے تسلیم نہیں کرتی، مگر قرآن اس کو دین حق کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے: فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ [۳:۶۱] تو کیا موت Cause اور Effect کے بجائے صرف دعا کے ذریعے آسکتی ہے؟ جدید سائنس اس آیت کو نہیں مانتی۔ حضرت مریم علیہا السلام کے یہاں پیدائش بغیر مرد کے لمس کے ہوئی جدید سائنس اسے تسلیم نہیں کرتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی ہوئی آگ میں پھینکا گیا مگر اللہ کے حکم سے وہ آگ گلزار خلیل میں تبدیل ہو گئی۔ جدید سائنس اس آیت کو نہیں مانتی آگ کا کام جلانا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ آگ ٹھنڈی ہو جائے اور گلزار میں تبدیل ہو جائے؟

سورج کا محو سفر ہونا، سائنسی تحقیق کے خلاف ہے:

سورۂ یاسین کی آیت ہے: وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ [۳۶:۳۸] "اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے یہ [اللہ] غالب اور دانا کا [مقرر کیا ہوا] اندازہ ہے"۔ سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے یعنی سورج محو سفر ہے، گردش میں ہے، جدید سائنس اس آیت کو نہیں مانتی اس کا کہنا ہے کہ زمین گردش کرتی ہے اور سورج ساکن ہے، قرآن کہتا ہے کہ سورج غروب ہو جاتا ہے سائنس غروب آفتاب کو تسلیم نہیں کرتی، سورج مشرق سے نکلتا اور مغرب میں غروب ہوتا ہے یہ ہر شخص کا مشاہدہ ہے لیکن سائنس اسے تسلیم نہیں کرتی۔ ہر شخص آنکھ سے آسمان دیکھ رہا ہے سائنس آسمان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی، مسئلہ یہ ہے کہ قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ وہ لوگوں کے عام مشاہدات کی بنیاد پر ان سے ہم کلام ہوتی ہے۔ انسانی آنکھ، حواس اور مشاہدات جن آثار کائنات کو جس طرح گرفت میں لے سکتے ہیں وہ ان کی بنیاد پر ان سے کلام کرتی ہے، ہر شخص سورج کو گھومتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن زمین کی گردش محسوس نہیں کرتا۔ سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھتا ہے جبکہ سورج غروب نہیں ہوتا چکر کاٹ کر کہیں اور منتقل ہو جاتا ہے، اسے آنکھ سے آسمان دکھائی دیتا ہے خواہ سائنس اسے مانے یا نہ مانے، قرآن انسانی آنکھ کے مشاہدات کی بنیاد پر لوگوں سے کلام کر رہا ہے آپ یہاں سائنس کو لے آتے ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو آسمان کے لفظ کو سمونے سے انکار کر دے اور کوئی

انسان ایسا نہیں جو یہ کہہ دے کہ سورج اس وقت موجود ہے غروب نہیں ہوا۔ کیونکہ اگر سورج موجود ہے تو چاند ظہور نہیں کرسکتا چاند اسی وقت نمودار ہوگا جب سورج غروب ہوجائے گا یہ عالمی، آفاقی اور معروضی تجربہ ہے۔ قرآن کو سائنسی کتاب ثابت کرنے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

تشریح قرآنی کا حق اولین مخاطبین کو نہیں: ذاکر نائیک:

قرآنی آیات کے معنیٰ کے بارے میں ذاکر نائیک کی دلیل یہ ہے کہ:

''کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے الفاظ کے وہی معنیٰ سامنے رکھنے چاہئیں جو اس وقت مراد لیے جاتے تھے جب کتاب تحریر ہوئی تھی یا وہی معنیٰ قبول کرنے چاہیں جو معنی اولین مخاطبین کے نزدیک درست تھے۔ لیکن یہ بیان صرف بائبل کے بارے میں درست ہے کیونکہ اس کے مخاطبین صرف اسی دور کے لوگ تھے، قرآن کا معاملہ مختلف ہے قرآن صرف اُس دور کے عربوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا قرآن کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے بھی نہیں ہے یہ تو پوری انسانیت کے لیے ہدایت ہے[1]....آپ قرآنی الفاظ کے معنی کو قطعاً اس دور تک محدود نہیں کرسکتے جس دور میں یہ نازل ہوا تھا''.[2]

نائیک صاحب کے اس طرز استدلال کی تفہیم یہ ہے کہ ''قرآن کے اولین مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تھے انھوں نے قرآن کے جو معنی بیان کیے وہ عہد حاضر کے لیے حتمی، قطعی، لازمی اور حجت نہیں۔ عہد حاضر میں تفسیر ماثور غیر معتبر اور قطعاً ناقابل قبول ہے، کیونکہ رسالت مآب ﷺ اور صحابہ کرام سترہویں صدی کے بعد ہونے والی جدید سائنسی ترقی کے نتائج سے ناواقف تھے وہ قرآن کی کئی سو آیات کے مطالب کا مفہوم زمان و مکان کی قید کے باعث سمجھنے سے عاجز و قاصر تھے۔ نائیک صاحب کے خیال میں قرآن کی تین ہزار آیات سائنس سے متعلق ہیں چونکہ عہد رسالت میں جدید سائنس نہیں تھی اور اس کا وجود سترہویں صدی میں ظہور پذیر ہوا لہٰذا ان تین ہزار آیات کے درست معنیٰ تو قرن اول میں سمجھنا ممکن ہی نہیں تھا اور جو کچھ معانی قرن اول میں سمجھے گئے وہ اس دور کے لحاظ سے تو شاید صحیح ہوسکتے ہیں مگر زمان و مکان [Time & Place] بدل جانے سے وہ معانی آج کے دور کے لیے بالکل لایعنی اور ناقابلِ قبول ہیں کیونکہ عہد حاضر کے انسان کا ذہن ارتقاء کے ذریعے، معاذ اللہ، عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن سے وسیع بہتر اور عمدہ ہے لہٰذا اس دور میں جو معنیٰ صحابہ کرامؓ نے رسولؐ اللہ کے فیضِ صحبت اور اذن ربی سے کسب اور اخذ کیے وہ آج کے دور کے لیے قطعاً ناقابل قبول ہیں۔ دوسرے معنوں میں قرآن حکیم کی آیات کے معانی زمانے کے بدلنے اور سائنس کے ارتقاء پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے کیونکہ اس کے معانی حتمی نہیں ہیں اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے

---

[1] ایضاً، صفحہ ۵۳۔ [2] ایضاً، صفحہ ۵۴۔

الفاظ کے کچھ معنی سرے سے ہیں ہی نہیں یہ معانی ہر عہد کا بڑھتا، پھیلتا اور پھولتا سائنسی علم مہیا کرے گا یعنی قرآن کے فہم کا تمام تر انحصار ہر عہد کی جدید سائنسی ترقی کے اثرات، حاصلات اور ثمرات پر ہے۔ قرآن کے الفاظ کے معنی غیر متعین ہیں۔ ہر عہد کا علمی منظر نامہ ان الفاظ کی تعیین، تدوین، تبئین، تعبیر اور تشکیل کا فریضہ انجام دے گا۔ نائیک صاحب کا یہ نقطہ نظر قرآن کی کئی آیات کی تردید اور انکار پر مبنی ہے، مثلاً رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ ٥ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ ٥ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ٥ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ٥ [۷۵:۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹] فَتَعٰلَی اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا [۲۰:۱۱۴] ''اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے''۔ لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت، آپ اس قرآن کو غور سے سنتے رہیے پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمے ہے۔ اگر نائیک صاحب کے فلسفے کو مان لیا جائے کہ قرآن کے وہ معنی جو اولین مخاطبین کے نزدیک درست تھے قیامت تک کے لیے آنے والے تمام انسانوں کے لیے درست نہیں ہیں تو یہ موقف سورہ قیامہ کی ان آیات کی تردید کرتا ہے، اگر اللہ کا پیغمبر جسے آیات کے معانی اللہ تعالیٰ نے بتائے وہ معانی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بتائے لیکن اللہ اور پیغمبر اور صحابہ کے بتائے ہوئے معنی قیامت تک کے انسانوں کے لیے حجت نہیں ہیں تو پھر رسالت مآب تمام جہانوں کے لیے رحمت کیسے بن سکتے ہیں؟ وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ [۲۱:۱۰۷] اگر آپ رحمت العالمین ہیں تو آپ کا بیان کردہ علم بھی قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے حجت ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ رسالت مآبؐ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت نازل فرمائی لہٰذا آپ کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں: کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَکِّیْکُمْ وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ یُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ [۲:۱۵۱] ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ [۶۲:۲]، وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ وَ رَحْمَتُہٗ لَھَمَّتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ اَنْ یُّضِلُّوْکَ وَ مَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَ مَا یَضُرُّوْنَکَ مِنْ شَیْءٍ وَ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ عَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَ کَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا [۴:۱۱۳]، لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ اِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ [۳:۱۶۴] کیا یہ کتاب اور حکمت قیامت تک کے انسانوں کے لیے حجت نہیں ہے اور کیا حکمت کا مطلب ہر عہد میں بدلتا رہے گا؟ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مالک الملک، زندہ و موجود اور حکیم و بصیر ہے، رسالت مآب کو قرآن کے ایسے معنی بتائے جو کل عالم کے لیے حجت نہیں تھے بلکہ صرف ان کے زماں و مکان تک محدود تھے۔ یہ اللہ کی صفات کا انکار ہے کہ وہ ایسا علم رسالت

مآبؐ کو عطا نہ کر سکا جو زماں و مکاں کی قید سے ماورا ہو سکتا اور صرف اپنے عصر کے لیے کافی نہ ہوتا بلکہ آنے والے تمام زمانوں کے لیے بھی کافی و شافی ہوتا۔ رسالت مآبؐ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے جو بھی معانی بتائے جو بھی علوم عطا فرمائے حکمت کے ذریعے جو موتی آپ کو پیش فرمائے آپ نے یہ تمام علوم، معانی، حکمت کے چشمے اور موتی اس امت تک من و عن پہنچا دیے کیوں کہ آپ امانت دار تھے لہٰذا آپ نے اللہ کی یہ امانت امت تک منتقل کر دی: وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ [۳:۱۶۱] آپ کا یہ عمل اس لیے بھی مبارک ہے کہ آپ غیب کی باتیں بتانے میں جزرس نہیں تھے: وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ [۸۱:۲۴] سورۂ مائدہ میں آپ کو حکم دیا گیا کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا: يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ [۵:۶۷] لہٰذا رسالت مآبؐ نے نہ صرف قرآن کی ایک ایک آیت امت تک پہنچا دی بلکہ ان آیات کا حقیقی مفہوم جو قیامت تک حجت ہے شرح صدر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں امت تک منتقل کر دیا تاکہ فہم قرآن کے لیے امت، ربانی اور نبوی ذرائع کے سوا قیامت تک کسی خارجی، بیرونی، انسانی ذریعے کی محتاج نہ رہے دوسرے معنوں میں رسالت مآبؐ نے قرآن کا جو بھی مطلب صحابہ کو بتایا وہ اذن الٰہی اور علم الٰہی کی روشنی میں امت تک منتقل فرمایا کیوں کہ آپ کی زبان سے نکلنے والا کوئی حرف بھی اللہ تعالیٰ کی تصدیق و تائید کے بغیر نہیں نکلتا تھا اور کبھی ایسا اتفاق ہوتا تو وحی الٰہی کے ذریعے آپ کے عمل و قول کی تصحیح فرما دی جاتی۔ سورہ تحریم اور سورہ عبس اس کی دو اہم ترین مثالیں ہیں۔ اس لیے رسالت مآبؐ کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ اللہ کی منشا کے عین مطابق ہوتا۔ تمام پیغمبر بشمول رسالت مآبؐ اللہ تعالیٰ کے ذکر کو کھول کھول کر بیان کرتے تاکہ نازل کردہ تعلیم لوگوں پر واضح ہو جائے اور کوئی ابہام نہ رہے: بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ [۱۶:۴۴] آپ اپنے جی سے نہیں بولتے تھے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى [۵۳:۳] قرآن بتاتا ہے کہ آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِىْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [۵:۳] لیکن نائیک صاحب کے نقطۂ نظر کے مطابق قرآن کے یہ تمام بیانات صحیح نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت تمام کر دی۔ رسالت مآبؐ نے غیب سے ملنے والا تمام علم امت تک منتقل کر دیا، اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے اس دین کو کامل کر کے پسند کر لیا تو یہ کیسا دین ہے جس کے پیغمبر کی بتائی ہوئی تشریحات اور قرآن کی آیات کے مفاہیم قیامت تک سائنس کے ذریعے رفتہ رفتہ ظاہر ہوں گے؟ یعنی پیغام آسمانی ہوگا اور تشریح انسانی اور سائنسی ہوگی آیات کے معنی آہستہ آہستہ واضح ہوں

گے جو قرآن تدریجاً ہونے والی سائنسی ترقی کے ذریعے اپنے مفاہیم اہل عالم پر واضح کرے گا وہ تام، حجت، سلطان کیسے ہوا؟! اگر تام نہیں ہے قرآن کہتا ہے کہ: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ [۲۱:۱۰۷] کہ ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا'' لیکن یہ عجیب رحمت ہے [نعوذ باللہ] کہ رحمت العالمین نے قرآن جیسی رحمت کے جو معانی صحابہ کو بتائے وہ صرف قرن اول کے لیے حجت اور معتبر ہیں اور قیامت تک قرآن کی آیات کے وہ معانی درست نہیں ہیں جو رسالت مآبؐ نے بیان فرمائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسالت مآبؐ نے اپنے بعد آنے والی امتوں کو قرآن کی رحمت کے معانی سمجھنے سے محروم رکھا اور ان کے فہم قرآن کے لیے اپنے عہد کے علم، منہاج اور سائنس کے سپرد کر دیا کہ وہاں سے جا کر معانی قرآن اخذ کر لو، ان معانی کی تصدیق کون کرے گا؟ ظاہر ہے سائنس داں ہی کریں گے جو بہر حال مسلم نہیں لہٰذا کلام الٰہی یعنی آسمانی اور ربانی پیغام کا متن محتاج ہو گا انسانی اور سائنسی علم کا جو خود محتاج تصدیق ہے، اور کوئی سائنس داں اور فلسفی سائنس سے حاصل کردہ کسی علم اور کسی نظریے و نتیجے کو حتمی ٹھوس قطعی تسلیم نہیں کرتا یقین نہ آئے تو پاپر [Popper]، فیرابینڈ [Fereyabend]، لے کاٹوش [Lakatos] کوہن [Kuhn]، فائن مین [Feynmen] کو پڑھ لیجیے۔ قرآن کہتا ہے کہ رسالت مآبؐ کو روشن چراغ بنا کر بھیجا گیا ہے: وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا [۳۳:۴۶] لیکن یہ عجیب روشن چراغ ہے جس کی روشنی صرف قرن اول کے لیے کافی ہے بعد کے زمانوں کے لیے اس کی روشنی قطعاً کافی نہیں بلکہ سائنس کی روشنی ضروری ہی نہیں لازمی بھی ہے اس کے بغیر آیات قرآنی کی وضاحت ممکن نہیں۔ اور روشنی بھی مغربی سائنس کی۔ کینیڈا کے سائنس داں پروفیسر کیتھ مور سے حاصل کردہ روشنی۔ اور یہ بھی مغرب کا اور پروفیسر مور کا احسان ہے کہ انھوں نے ہمیں اپنی روشنی عطا کر کے قرآن کے مطالب کا فہم حاصل کرنے میں اعانت فرمائی اگر وہ انکار کر دیتے یا مسلمان ان کے علم سے محروم رہتے تو یہ امت قیامت تک قرآن کے درست، حقیقی اور جدید فہم کو حاصل ہی نہ کر سکتی اور صرف قرآن کے قدیم مفہوم کو پوجتی رہتی ۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کلام سارے جہاں والوں کے لیے نصیحت ہے: وَمَا ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ [۶۸:۵۲] نائیک صاحب فرماتے ہیں کہ صرف قرآن کے الفاظ قیامت تک سارے جہاں کے لیے نصیحت ہیں مگر ان آیات کے وہ مفاہیم جو رسالت مآبؐ اور صحابہ اور تفسیر ماثور نے بتائے وہ نہ حجت ہیں، نہ نصیحت اور نہ ضرورت دین بلکہ مفاہیم و مطالب قرآن قیامت تک سائنس کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتے ہیں لہٰذا قرآن قیامت تک کے تمام اہل عالم کے لیے کامل نصیحت اور مکمل حجت نہیں جب تک کہ اس کے مفہومات جدید سائنس کی روشنی میں اخذ نہ کیے جائیں۔ متعین اور معلوم نہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ رسول اللہ کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات لوگوں تک پہنچا دیں: اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِسٰلٰتِہٖ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا [۷۲:۲۳] لیکن نائیک صاحب کہتے ہیں کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات جو رسالت مآبؐ نے خیر القرون میں صحابہ تک پہنچائے اس کے مطالب اسی زمانے کے لیے حجت تھے۔ اب

آئندہ آنے والے زمانوں کے لیے ان پیغامات کا مطلب جدید سائنس کے بغیر نہ واضح ہوسکتا ہے نہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ حالانکہ قرآن کا جو بھی مطلب صاحب قرآن کے فرامین اور اصحاب رسالت مآبؐ کے علم کے بغیر بیان کیا جائے گا قطعاً معتبر نہیں قرآن کا ایسا فہم اسی قسم کا فہم ہوگا جو امیوں کو حاصل تھا: وَ مِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ [۲:۷۸] قرآن کہتا ہے کہ یہ حکمت سے بھری کتاب ہے: تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ [۳۱:۲] وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ [۳۶:۲] لیکن یہ عجیب کتاب ہے کہ اس کے مطالب و مفاہیم عہد جدید کی لیبارٹریوں کے سائنس دان بتائیں گے قرآن اپنے بارے میں خود کہتا ہے کہ یہ فرقان ہے۔ [۳:۴] حق و باطل میں فرق کھینچنے والا، قرآن خود کو واضح روشن کتاب مبین و قرآن مبین کہتا ہے: ۱:۱۲، ۱:۱۵، ۱:۲۷، ۱:۲۶، ۲:۲۶، ۱:۲۸، ۲:۲۸ وہ کہتا ہے کہ یہ اہل تقویٰ اور عقل کے لیے کتاب نصیحت ہے: ۱۳۸:۳، ۱۵:۶، ۳۲:۱۴، ۲۹:۳۸، ۵۰:۳۷ قرآن اپنے بارے میں خود کہتا ہے کہ یہ قول فیصل ہے، دوٹوک کلام حق کو باطل سے جدا کرنے والا: اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ [۸۶:۱۳،۱۴] یہ تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لانے والی کتاب ہے: یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ [۵:۱۶] یہ کل عالم کے لیے نصیحت ہے: ۱۰۴:۱۲، ۱:۲۵، ۳۸:۸۷، ۶۸:۵۲، ۷۴:۱۹، ۸۱:۲۷ قرآن کہتا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے: ۵۲:۷، ۶۴:۱۶، ۷۷:۲۷، ۵۱:۲۹، ۴۵:۲۰ یہ احسن تفسیر ہے: وَ لَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا [۲۵:۳۳] یہ برہان ہے: ۱۷۴:۴ یہ شفا ہے: ۵۷:۱۰، ۸۲:۱۷ یہ موعظت ہے: ۵۷:۱۰، ۱۳۸:۳ یہ قرآن ذکر للعالمین ہے، رحمت للمومنین ہے، رحمت للمحسنین ہے، ام الکتاب ہے، کلام اللہ ہے، یہ حکمت بالغہ ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓىِٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ [۶:۳۸] ہم نے کتاب میں کسی چیز کے ذکر کو نہیں چھوڑا۔ اب نائیک صاحب سے کوئی پلٹ کر پوچھے کہ یہ عجیب تبیان، الکتاب، قول فیصل، فرقان، برہان، موعظت، شفاء مبین، حکمت اور احسن تفسیر ہے جو اپنی تفسیر کے لیے جدید سائنس اور سائنس دانوں کی محتاج ہے، جو کتاب دوسروں پر انحصار کرتی ہو اس کتاب پر آخرت کی درستگی کے لیے کیسے اعتماد کیا جائے؟ افسوس کہ نائیک صاحب نے ان سوالات پر غور نہیں فرمایا۔

نائیک صاحب کے بیان کردہ نقطۂ نظر کی روشنی میں وہ حدیث باطل قرار پاتی ہے جس میں ''خیر القرون'' کا بیان ہے کیونکہ سب سے بہترین عہد رسالت مآبؐ کا زمانہ نہیں جدید سائنسی عہد ہے جس میں قرآن کے حقیقی مفاہیم، اصل معانی، درست مطالب سمجھ لیے گئے، ان معنوں میں ''خیر القرون'' رسالت مآبؐ کا دور نہیں آج کا جدید سائنسی عہد ہی قرار پاتا ہے۔ جس کے بانی ڈیکارٹ، نیوٹن، گیلی لیو، کیپلر، راجر بیکن اور سترہویں صدی کے فلاسفہ مغرب ہیں تاریخ انسانی کی سترہ تہذیبیں جدید سائنس سے خالی تھیں۔ دیکھیے کہ ایک کم زور عقلی دلیل جس کا مقصد مناظرے میں کامیابی حاصل کر کے

خطابت کے ذریعے مدمقابل کو شکست دینا تھا، اپنی تاریخ، تہذیب، عقائد اور مآخذ علوم دینیہ کے لیے کتنے مہلک خطرات پیدا کر دیتی ہے۔

انفس و آفاق کی نشانیاں: سائنسی حقائق؟

نائیک صاحب کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ قرآن کی آیت: ''ہم عنقریب اپنی نشانیاں ان کے انفس و آفاق میں دکھائیں گے۔ سے یہ ہے کہ قیامت تک اللہ اپنی آیات نشانیاں کے معنی سائنس کے ذریعے بیان کرتا رہے گا''۔

اس لیے قرآن کے کسی لفظ کے جو معنی رسول اور اصحاب رسول نے بتائے وہ قیامت تک کے لیے حجت نہیں، ہر عہد ان کے نئے معانی و مفاہیم متعین کرے گا اور یہ طریقہ قرآن کی آیت سے یعنی نص سے ثابت ہے اور معانی قرآن کو صرف رسالت مآبؐ و اصحاب رسولؐ سے مختص کرنا غلط ہے۔ دوسرے معنوں میں عہد حاضر کے انسان کا فہم، رسالت مآبؐ اور صحابہ کرام کے فہم سے اعلیٰ، بالا، بہتر اور عمدہ ہے کیونکہ وہ بعد میں پیدا ہوا اور جو جتنے بعد میں پیدا ہوگا سائنس کی نئی ایجادات کی روشنی میں آیات قرآنی کا اتنا زیادہ بہتر مفہوم بتا سکے گا، نعوذ باللہ، یہ خیالات ہیگل کے نظریہ ارتقاء سے اخذ کردہ ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن بتاتا ہے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے، اور خود تمھارے اپنے وجود میں ہیں۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں: وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ [۵۱:۲۰] اس آیت کا اصل مطلب کیا یہ ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی جیسے جیسے اس کائنات کے اسرار فاش کریں گے اور انسانی حیات کے سربستہ راز کھولیں گے تو ان آیات کا مطلب عہد حاضر کا انسان سمجھ لے گا جن کے مطالب، نعوذ باللہ، رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ مغربی سائنس سے محرومی کے باعث سمجھنے سے قاصر رہے؟ یہ بنیادی سوال ہے جس کا مطالعہ اگر قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں کیا جائے تو نائیک صاحب کی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ سورہ یونس میں آتا ہے اللہ نے [سورج چاند وغیرہ] سب کچھ برحق پیدا کیا ہے وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین و آسمان میں پیدا کی ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو [غلط روی و غلط بینی] سے بچنا چاہتے ہیں: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ...... اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ [۱۰:۵،۶] یہی بات سورہ آل عمران میں کہی گئی ہے۔ [۳:۱۹۰،۱۹۱] یہ تمام نشانیاں ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گی مگر ان تک رسائی کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان جاہلانہ تعصب سے پاک ہو کر علم کے ان ذرائع سے کام لے جو اسے قدرت نے عطا کیے ہیں نہ کہ ان آیات کو سمجھنے کے لیے پہلے آکسفورڈ اور کیمبرج جا کر سائنسی علم حاصل کریں اور کینیڈا میں کیتھ مور سے قرآن کی آیات کے تفسیری نکات معلوم کریں۔ اگر کوئی ان نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لا رہا تب بھی ہمیں اپنے نفس کو زیغ میں مبتلا

کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نائیک صاحب نے قرآن کی یہ آیت ضرور پڑھی ہوگی: وَ اِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ [۶:۳۵] یہ ارشاد رسالت مآبؐ سے ہے لہٰذا کفار کو راہ راست پر لانے کے لیے دین میں تنسیخ تحریف وترمیم کرنے کے بجائے صبر و تحمل سے کام لیا جائے۔ لہٰذا اہل مغرب کے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں قرآن سے سائنس کے ذریعے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لانا کوئی علاقانہ رویہ نہیں ہے۔ کفار مطالبہ کرتے تھے رسول اللہؐ سے کہ ثبوت حق کے لیے کوئی نشانی لاؤ جواب دیا گیا: وَ اِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ [۶:۳۷] اس انکار کی وجہ منکرین کا مشترکہ تاریخی رویہ ہے: وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا کَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ [۶:۴] قرآن بتاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اس کائنات پر غور و فکر ہی نہیں کرتے: وَ جَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ [۲۱:۳۱] غور و فکر کی اس دعوت کا تعلق کسی خاص زمانے سے نہیں کیونکہ یہ دعوت عام ہے ہر طرح کے عہد اور ہر قسم کے زمانے کے لیے اور قرآنی آیات یا اللہ کی نشانیوں کو سمجھنے، جاننے اور پہچاننے کے لیے سترہویں صدی اور جدید سائنس کے انتظار کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ نائیک صاحب سورہ نمل کی آخری آیات کو بھول گئے: اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَ لَهٗ کُلُّ شَیْءٍ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ..... وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ..... وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ [۲۷:۹۱، ۹۲، ۹۳] اس میں رسالت مآب اپنی امت سے کہتے ہیں کہ میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں ان سے کہو تعریف اللہ ہی کے لیے ہے وہ عنقریب تمھیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انھیں پہچان لو گے اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو، کیا یہاں نشانیوں کا مطلب سائنس کے کمالات ہیں؟ یہ مکی سورت ہے۔ کفار نے رسول اللہ سے نشانیوں کا مطالبہ کیا تو جواب آیا نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ [نشانی] کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے: وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ..... اَوَ لَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَةً وَّ ذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ [۲۹:۵۰، ۵۱] اللہ تعالیٰ نے آسمان سے قرآن کو روشن اور ناقابل شک نشانی کے طور پر پیش کرنے کا سبب اس سے پہلی والی آیت میں بیان کیا: وَ مَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ کِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِکَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ..... بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ [۲۹:۴۸، ۴۹] اللہ تعالیٰ نے کفار کے مطالبوں کے جواب

میں آسمان سے نشانیاں نازل کرنے کے بجائے زمین و آسمان میں اس وسیع، بسیط محیط کائنات میں چلتی پھرتی نشانیوں پر توجہ دینے کا حکم دیا جو شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتی ہیں، اس کے لیے کسی یونیورسٹی، کسی فلسفے اور کسی اضافی علم کی ضرورت نہیں۔ شب و روز کی نشانیوں کی طرف توجہ دیتے ہوئے قرآن بتاتا ہے تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟ [۸۸:۱۷ تا ۲۰] یہاں آفاق میں موجود نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب قرآن انفس کی طرف آتا ہے فرد کا اپنا وجود یہ خود کتنی نشانیوں کا مخزن ہے، قرآن پوچھتا ہے: ''کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا: اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ [۳۰:۸] ''ہم عنقریب اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھائیں گے'' [۴۱:۵۳] کائنات اور ارض و سماء کے درمیان بکھری ہوئی نشانیوں کا نہایت تفصیل سے ذکر سورۃ روم میں کیا گیا۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی یہ بتائی گئی کہ اس نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، اب وہ بشر ہو کر پھیلتے جا رہے ہیں، اس کی نشانی یہ ہے کہ تمھاری جنس سے ازواج بنائیں جن سے سکون حاصل کرتے ہو اس کی نشانیوں میں آسمانوں اور زمین کی پیدائش زمانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ اس کی نشانیوں میں رات اور دن کو تمھارا سونا اور اللہ کا فضل تلاش کرنا ہے۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے، آسمان سے پانی برساتا ہے اس کی نشانیوں میں سے آسمان و زمین کا قیام ہے: وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ...... وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [۳۰:۲۰ تا ۲۱] اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے اس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں [۳۰:۲۸] لیکن ان کا حال یہ ہے کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے: وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ [۲۱:۳۲] کیا انھوں نے کبھی اس زمین و آسمان کو نہیں دیکھا جو انھیں آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے ہم چاہیں تو انھیں زمین میں دھنسا دیں یا آسمان کے کچھ ٹکڑے ان پر گرا دیں، درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہے: اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ [۳۴:۹]۔ اللہ تعالیٰ کی یہ نشانیاں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ جانوروں کے اندر بھی، قرآن نے بار بار جانوروں کا حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ جو کچھ کھاتے ہیں اللہ کی قدرت انھیں تین اجزا میں تقسیم کر دیتی ہے خون، گوبر اور دودھ: وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ [۱۶:۶۶] یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ ان جانوروں میں سے خون اور گوبر کے درمیان سے دودھ جیسی نفیس

شیریں اور عمدہ خوراک انسانوں کے لیے تخلیق کرتا ہے، یہ اس کا کمال ہے اب دودھ کا ذکر سن کر ڈیری فارم انڈسٹری پر توجہ فرمانا کمال جدیدیت ہے۔ قرآن میں آتا ہے پہاڑوں میں بھی سفید سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اس طرح انسانوں اور جانوروں کے مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ [فاطر: ۳۵: ۲۷، ۲۸] تو کیا ان آیات سے رنگوں کی صنعت کا سرا تلاش کیا جائے؟ اور دنیا کو بتایا جائے کہ رنگوں کے فن کی صنعت [paint industry] کا اشارہ قرآن میں دیا گیا ہے؟ قرآن میں آتا ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے اور تمھاری اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو اللہ [زمین میں] پھیلا رہا ہے بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں: وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ [۴۵: ۴] کیا ان آیات سے مویشیوں کی افزائش کے علم [کیٹل فارمنگ انڈسٹری] کا جواز نکالا جائے گا؟ یا معرفت رب کے حصول پر توجہ دی جائے گی؟ قرآن مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ انسان یعنی انفس و آفاق کی نشانیوں کے ذریعے انسان کو خالق ارض و سماء کی طرف متوجہ کر کے اسے عبودیت کا سبق دینا چاہتا ہے اسی لیے سورہ یونس میں ارشاد ہوتا ہے: ''ان سے کہو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو اور جو لوگ ایمان ہی نہیں لانا چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ [۱۰: ۱۰۱] قرآن کہتا ہے یہ ہماری آیات سے غافل ہیں: اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ [۱۰: ۷] ان کی غفلت کا عالم یہ ہے کہ ''ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو: وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَ لَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ [۳۰: ۵۸] میری آیات تیرے پاس آ چکی تھیں پھر تو نے انھیں جھٹلایا تکبر کیا [۳۹: ۵۹] جو لوگ آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کیوں؟ ان سے کہو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو اور جو لوگ ایمان ہی نہیں لانا چاہتے ان کے لیے نشانیاں مفید نہیں ہو سکتیں [۱۰: ۱۰۱] ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین و آسمان میں پیدا کی ہے نشانیاں ہیں: اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ [۱۰: ۶] زمین اور آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ گزرتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا [۲۵: ۷۳] کیا یہ غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ [۲۱:۳۰]ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے اس کی طرف التفات نہیں کرتے: وَمَا تَاْتِیْھِمْ مِّنْ اٰیَۃٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّھِمْ اِلَّا کَانُوْا عَنْھَا مُعْرِضِیْنَ [۳۶:۴۶] دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو اللہ کی کائنات میں پھیلی آیات، نشانیوں، مظاہر اور مناظر سے معرفت رب حاصل کر لیتے ہیں ''ابراہیم کو ہم اس طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے: وَ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَ لِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ [۶:۵۵]؟ زمین وآسمان کے اس نظام کا مشاہدہ کرنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو علم فلکیات سیکھنے کی ضرورت نہ پڑی نہ کسی درس گاہ میں جا کر فلسفہ اور علم افلاک کے اسباق حاصل کرنے پڑے، قرآن نے آثار کائنات سے اسباق لینے کا طریقہ اس تمثیل کے ذریعے بیان کیا ہے: فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْہِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ..... فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَھْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَکُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ..... فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَۃً قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَآ اَکْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ..... اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ [۶:۷۶ تا ۷۹] نائیک صاحب یہ آیت غور سے پڑھ لیتے تو اس تگ ودو سے دستبردار ہو جاتے جو کسی علمی بنیاد کے بغیر اسلام کی نہیں بلکہ سائنس کی عظمت بیان کر رہی ہے۔ تخلیق انسانی کی آیات میں مراحل تخلیق بار بار بیان کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب ہمیں سورہ مومن کی میں دیا گیا ہے: ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّکُمْ ثُمَّ لِتَکُوْنُوْا شُیُوْخًا وَ مِنْکُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّلَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ O ھُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ [۴۰:۶۷،۶۸] لعلکم تعقلون تاکہ تم حقیقت کو سمجھو اور حقیقت کیا ہے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ وہی ہے زندگی دینے والا اور وہی ہے موت دینے والا، وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے بس ایک حکم دیتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔

اگر کفار ایمان نہیں لا رہے تو اس میں تشویش اور اضطراب کی کوئی بات نہیں کیونکہ اگر اللہ کی سنت یہی ہوتی کہ سب اہل زمین ایمان لے آئیں تو وہ ضرور لے آتے لہٰذا ہم لوگوں کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ قرآن کہتا ہے: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ [۱۰:۹۹] رسالت مآب کفار کے ایمان نہ لانے پر بہت گرانی محسوس فرمارہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ [۱۰:۹۹] ایک اور جگہ آپ کی تشویش پر ارشاد کیا: وَ لَقَدْ کُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ فَصَبَرُوْا عَلٰی مَا کُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰٓی اَتٰھُمْ نَصْرُنَا وَ لَا مُبَدِّلَ

لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَO وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ [۶:۳۴،۳۵] قرآن بتاتا ہے کہ اللہ رب العزت نے فرعون کو آیات کبریٰ دکھائی: فَاَرٰهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى [۷۹:۲۰] مگر آیت کبریٰ دیکھنے کے باوجود اس نے جھٹلایا اور اللہ کو خالق تسلیم نہیں کیا حضرت یونسؑ کی قوم کے سوا کسی قوم نے آیات کبریٰ دیکھ لینے کے باوجود بندگی رب کو اختیار نہیں کیا تو اگر مغرب والے آیات صغریٰ کو دیکھ کر ایمان نہیں لا رہے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں دعوت دین اسی طرح سے دی جائے گی جس طرح تمام پیغمبروں نے دی، اس کے سوا دعوت کا ہر جدید طریقہ گمراہی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور قرآن کے نصوص سے متصادم ہے، دعوت انھی دلوں پر اثر کرتی ہے جو نرم ہوں، جو نرم زمین کی طرح پانی جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں ایسی زمین جو پانی پڑتے ہی پھول جاتی ہے اور پانی کو سمیٹ لیتی ہے۔ ہماری بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم دین پر یکسوئی کے ساتھ قائم رہیں: وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [۱۰:۱۰۵] دوسروں کو مسلمان کرنے کی آرزو میں اپنے مآخذ علم کو سوالیہ نشان نہ بنا دیں، کسی کے مسلمان ہونے نہ ہونے کی فکر میں وہ کام نہ کریں جس کے نتیجے میں ہمارا ایمان، عمل اور نتیجہ مشتبہ ہو جائے۔ دین کی جدوجہد، تبلیغ، تدریس اور تعلیم کی راہ میں صبر اور انتظار ہی کی روش مصلحت و حکمت الٰہی ہے، نیک سے نیک ارادے کے ساتھ کی جانے والی عجلت بہتوں کے لیے تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے اور خود جدوجہد کرنے والے کے لیے خسران عظیم۔ ہمارا کام صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم آخری سانس تک حق کو بالکل اسی طریقے سے بیان کرتے رہیں جس طرح انبیاء کرام نے بیان فرمایا ہے اور رسالت مآبؐ کے ذریعے حق کو بیان کرنے کا وہ طریقہ اس امت تک صحابہ کرام اور اجماع امت سے تواتر کے ساتھ منتقل ہوتا رہا ہے اور اس امت کے لیے اجنبی طریقہ نہیں قرآن کے لفظوں میں ”مجھے حکم دیا گیا ہے [خواہ کوئی مانے یا نہ مانے] میں خود مسلم بن کر رہوں: وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ [۱۰:۷۲] اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنی فکر کرو کسی دوسرے کی گمراہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ [۵:۱۰۵]

قرآن بتاتا ہے کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے یقیناً یہ [اعادہ] تو اللہ کے لیے آسان تر ہے ان سے کہو کہ زمین میں چلو، پھر و اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی پھر اللہ بار دگر بھی زندگی بخشے گا یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ [۲۹:۱۹،۲۰] اللہ ہی خلق کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا پھر اس کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے: اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ [۳۰:۱۱]

نائیک صاحب رحم مادر میں تخلیق انسانی سے متعلق آیات سے علم ایمبریالوجی ثابت

کرتے ہیں، یہ درست طریقہ نہیں کیونکہ آیاتِ تخلیق کفار کے اس اعتراض کے جواب میں بار بار دہرائی گئی ہیں کہ حیات بعد موت کیسے ممکن ہے؟ سورہ عنکبوت میں آتا ہے: اَوَ لَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ...... قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ [۲۰،۱۹:۲۹] ان آیات میں تخلیق انسانی اور حیات بعد موت سے متعلق سوالات کا جواب دیتے ہوئے سیر و فی الارض کا حکم دیا گیا اس حکم کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اللہ کی کائنات کی سیر کرتے ہوئے گھومتے پھرتے اچانک کینیڈا کے ڈاکٹر کیتھ مور کی لیبارٹری میں جا کر اس سے جنین کی آیت کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس کا مطلب سمجھنے کے لیے انسان اپنے نفس کو دیکھے، اپنے وجود پر نظر ڈالے مذکر و مونث کے ملاپ سے ایک نئے وجود کے ظہور پر غور کرے۔ قرآن درختوں پر پھل آنے پھر ان کے پکنے کی کیفیات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لیے: وَ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ کُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَۃٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ [۹۹:۶] اس مشاہدے، مطالعے، تجربے، علم، ادراک اور فہم کے لیے بیسویں صدی تک سائنس دانوں کے کمالات کے انتظار کی ضرورت نہیں تھی۔

جدید طرز زندگی: مشاہدہ کائنات میں سب سے بڑی رکاوٹ:

ویسے بھی اس صدی میں آثار کائنات کے مشاہدات سے اللہ تعالیٰ کو پہچاننے والی تمام قرآنی آیات کا مشاہدہ جدید شہری زندگی میں ممکن ہی نہیں ہے۔ شہروں میں نہ درخت ہوتے ہیں نہ پھل، نہ فصل بہار، نہ آسمان نظر آتا ہے نہ چاند ستارے، تتلیاں تک مر رہی ہیں جگنو شہروں سے بہت پہلے رخصت ہو گئے۔ کوئل کی کوک، کبوتروں کی غٹرغوں، پرندوں کی ڈاریں، طور کی قطاریں، قوس وقزح کے رنگ، دھنک کا منظر، جھٹ پٹے کی صورت، صبح صادق اور صبح کاذب کے مناظر، یعنی وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ [۸۱:۱۷] رات کے رخصت ہونے اور صبح کی سانسیں لینے کا منظر اب شہروں میں مفقود ہے۔ قوس وقزح اب کسی شہر کے آسمان پر نظر ہی نہیں آتی حتی کہ شہروں میں برسات کے بعد جب زمین بھپک اٹھتی ہے بیر بہوٹیوں کے لشکر بھی نظر نہیں آتے، جدید شہری زندگی فطرت، مناظر فطرت اور حسن فطرت کی قاتل ہے۔ فلیٹوں میں رہنے والے بند کمروں میں عمر بسر کرتے ہیں وہ بے چارے زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کی آیات کہاں دیکھ سکتے ہیں؟ کیونکہ فلیٹ والا زمین و آسمان کے مابین معلق ہے نہ زمین اس کی نہ آسمان اس کا۔ وہ در و دیوار کا اسیر قیدی ہے جو دن میں بھی اجالا کرنے کے لیے مصنوعی روشنی کا محتاج اور سورج کی شعاؤں سے محروم ہے۔ وہ شخص جو سورج کی حدت اور چاند کی ٹھنڈی روشنی اپنے کمرے میں محسوس کرنے سے قاصر ہے آثار کائنات کے مشاہدے کے قابل ہی نہیں ہے، لیکن پھر بھی خود کو تاریخ کا عقل مند ترین

سائنسی انسان سمجھ رہا ہے۔ دنیا کے پچاس شہروں میں آلودگی کے باعث چاند تارے دکھائی ہی نہیں دیتے اس صورت میں مشاہدہ کائنات کی آیات پر عمل کیسے ہو؟ شہروں میں فصل، باغ، کھیت، پھلوں کے درخت جانوروں کی افزائش و پرورش کے مناظر مفقود ہو جاتے ہیں لہٰذا شہری زندگی کا مسلسل فروغ اور دیہاتوں سے شہروں کی طرف منتقلی جسے ہم آج کل ترقی سمجھتے ہیں فطرت کائنات اور مشاہدہ کائنات کو ناممکن بنا دیتا ہے اور شہری زندگی کے نتیجے میں کم از کم عصر حاضر کا انسان خدا کو مشاہدہ کائنات اور آثار فطرت کے ذریعے ہرگز پہچاننے کے قابل نہیں رہتا، لیکن بعض جدیدیت پسند علماء فقہاء اس جدید زندگی کو، جو قرآن کی سینکڑوں آیت کی تفہیم میں سدراہ بن گئی ہیں، عین فطری حق اور جائز و درست بلکہ اسلام کا اصل مدعا منشاء قرار دے رہے ہیں، ہمارے مرحوم متجد دین آج زندہ ہوتے اور انھیں پتا چلتا کہ لاہور میں تتلیاں اور بھنورے، بیر بہوٹی اور جگنو نایاب ہو گئے ہیں اس دور کے تمام باغات صنعتی اداروں میں تبدیل ہو گئے ہیں تو وہ اپنی کتب و مقالات میں سے مشاہدات فطرت کی آیات خارج کر دیتے کیوں کہ جدید صنعتی شہری زندگی کے باعث انسان فطرت سے دور ہو گیا ہے جدید سائنس جو کشف فطرت کے دعوے کے ساتھ اٹھی تھی، تدفین و تکفین فطرت کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ جدید شہری زندگی آیات کائنات اور آیات الٰہی کی قاتل ہے اس نظم زندگی اور طرز زندگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور قربت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا، لہٰذا جدید طرزِ زندگی کے انہدام اور قدیم فطری طرزِ زندگی کے قیام، احیاء اور استحکام کے بغیر آیات کائنات کے مشاہدات کا سوال ہی بے معنی ہے۔

قرآن میں آتا ہے کہ اللہ نے ہر قسم کی نباتات اگائیں، کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے، کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے پیدا کیے، انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے، یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آتے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو: وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ [۶:۹۹] جدید شہری زندگی میں غور و فکر کے لیے یہ تمام مناظر، نظارے اور مشاہدات شہروں میں دستیاب نہیں جدید سائنس کی آلودگی اور جدید صنعتی شہری زندگی نے جہاں عالم فطرت و سبزے کو برباد کر کے کنکریٹ کے جنگل اگا دیے ہیں وہاں یہ مشاہدہ ناممکن بن گیا ہے، ٹیکنالوجی نے شہر برباد کر دیے ہیں اس کے باوجود مشاہدہ کائنات کی یہ دعوت اہل عالم کے لیے قیامت تک عام ہے ہر شخص اپنے جدید صنعتی آلودہ گرد و غبار سے اٹے ہوئے شہروں سے نکل کر کائنات میں گھوم پھر کر اللہ تعالیٰ کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ چشم قلب کھلی ہوئی ہو۔

وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ [۶:۴] سورۃ انعام کی اس آیت کا کیا مطلب لیا جائے؟ لوگ ہر آیت سے کیوں منہ موڑ لیتے ہیں کیا اس لیے کہ اس زمانے کی

سائنس یا عقل ان آیات کی تفہیم اور ادراک سے قاصر رہتی ہے، یا اصل میں یہ دیکھتے ہی نہیں کہ اندھے ہیں اور سمجھتے ہی نہیں کہ مردہ ہیں۔ یہ آیات زندوں کے لیے غور وفکر کا سامان مہیا کرتی ہیں، لیکن جو لوگ جانوروں سے بدتر اور مردوں کی طرح بے حس ہیں وہ ان آیات سے کچھ اخذ نہیں کر سکتے۔ تخلیق کی آیات میں خطاب عام لوگوں سے ہے۔ ہر شخص کا ذاتی، انفرادی اور اہل عالم کا اجتماعی حقیقی تجربہ ہے کہ وہ مذکر و مؤنث کے اختلاط اور ماں باپ کے ملاپ سے وجود میں آتا ہے۔ ایک قطرہ جو آغوش رحم مادر میں جاتا ہے، اللہ کی رحمت سے مراحل تخلیق طے کر کے ایک جیتا جاگتا ناقابل یقین وجود بن جاتا ہے۔ یہ ہر شخص کا ذاتی، آفاقی اور معروضی [Objective] تجربہ ہے جس کی کوئی تردید نہیں کر سکتا اسی لیے کہا گیا کہ: کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا۔ اب ہم پر وہ مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے: اولم یر الانسان انا خلقنہ من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین وضرب لنا مثلا ونسی خلقہ قال من یحی العظام وھی رمیم [۳۶: ۷۷، ۷۸] آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا: قال کذلک قال ربک ھو علی ھین و قد خلقتک من قبل و لم تک شیئا [۱۹:۹] ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا: ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا [۷۶:۱] اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو پھر کیوں سبق نہیں لیتے: ولقد علمتم النشاۃ الاولی فلولا تذکرون [۵۶: ۶۲] کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ میں غور وفکر نہیں کیا او لم یتفکروا فی انفسھم [۳۰: ۸] ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے تم [اللہ کی قدرت کے کرشموں پر] حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں: فاستفتھم اھم اشد خلقا ام من خلقنا انا خلقنھم من طین لازب بل عجبت ویسخرون [۳۷: ۱۱، ۱۲]۔ انسان کہتا ہے کہ کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو زندہ کر کے نکال لیا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے یقیناً وہ [خالق] اسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے: فلینظر الانسان مم خلق [۸۶: ۵] شاید اس آیت سے سینے اور ہڈیوں کے طبی علوم کی تاریخ بھی دریافت کی جا سکتی ہے جو نائیک صاحب اور جدیدیت پسند مفکرین کا دل پسند مشغلہ ہے شکر ہے یہ آیت ایسی مشق ستم سے محفوظ رہیں۔

جس طرح مذکر کے چند قطرے انسان کو وجود بخشتے ہیں جب وہ رحم مادر کی سرزمین پر گرتے ہیں بالکل اسی طرح سوکھی ہوئی زمین پر جب بارش کے قطرے برستے ہیں مردہ زمین میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی عطا کرتے ہیں: یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی و یحی الارض بعد موتھا و کذلک تخرجون [۳۰:۱۹] اللہ کی رحمت یہ ہے کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کس طرح لہلہا اٹھتی ہے: فانظر الی اثر رحمت اللہ کیف

يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [۳۰:۵۰] بالکل اسی طریقے سے اللہ مرنے کے بعد دوبارہ انسانوں کو زندہ فرما دیں گے۔ قرآن بتاتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ ابر کے خول سے بارش کے قطرے ٹپکے چلے آتے ہیں تو مردہ زمین کھل اٹھتی ہے، بنجر ارض لہلہانے لگتی ہے، کل تک جو زمین چٹیل اور ریگ زار لگتی تھی بارش کے قطروں کے ساتھ ہی چمن زار، گلزار اور سبزہ زار میں بدل جاتی ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ [۳۰:۴۸] اسی طرح کا مضمون سورۃ نور میں بھی بیان ہوا ہے اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول سے بارش کے قطرے ٹپکے چلے آتے ہیں: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ [۲۴:۴۳]۔ یہی مضمون سورۃ فرقان اور سورۃ حج میں ایک اور انداز سے بیان ہوا ہے: وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ...... لِّنُحْيِ َۦ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ...... وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا [۲۵:۴۸،۴۹،۵۰]۔ بارش برستے ہی مردہ زمین یکا یک بھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش نظر نباتات اگلنی شروع کر دی: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ [۲۲:۵] سورۃ السجدہ میں اسی مضمون کو دوسرے انداز سے بیان کیا گیا ہے اور کیا ان لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہا لاتے ہیں اور پھر اس زمین سے وہ فصل اگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارہ ملتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ [۳۲:۲۷] سورۃ الاعراف میں اس کی ایک اور مثال دی گئی ہے اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوش خبری لیے ہوئے بھیجتا ہے پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انھیں کسی مردہ شدہ زمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر [اس مری ہوئی زمین سے] طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے، دیکھو اس طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو: وَ هُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ

رَحْمَتِهٖ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ [۷:۵۷] وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے پھر پاک پانی نازل کرتا ہے تا کہ ایک مردہ علاقے کو اس کے ذریعے زندگی بخشے: لِنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا [۲۵:۴۹] اگر تم ان سے پوچھو کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے: وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ [۲۹:۶۳] پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح زندہ کر دیتا ہے، یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے: فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [۳۰:۵۰] کیا ان لوگوں نے یہ منظر کبھی نہ دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہالاتے ہیں اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اگاتے ہیں: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ [۳۲:۲۷] پھر ہم اسے ایک اُجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ اس زمین کو زندگی عطا کرتے ہیں جو مردہ ہو چکی تھی: وَ اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ [۳۵:۹] ان لوگوں کے لیے بے جان زمین ایک نشانی ہے ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا: وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ [۳۶:۳۳] جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی عطا کی: وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ [۴۳:۱۱] پھر تم دیکھتے ہو کہ زمین سونی پڑی ہے پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا یکا یک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [۴۱:۳۹] اور اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے: وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ [۴۵:۵] یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخشتے ہیں: رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ [۵۰:۱۱] خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے: اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [۵۷:۱۷] ان تمام آیات میں حیات بعد موت پر متوجہ کیا گیا ہے اور عام انسانی مشاہدات کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پانی سے لدے ہوئے

بادل مردہ زمین کو کسی طرح زندہ کرتے ہیں اس کی مثال دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ حیات بعد موت کو واضح فرماتے ہیں: وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ [۷:۵۷]۔ کشت انسان اور کشت ویران کے تقابلی مطالعے سے حیات بعد موت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دوسری زندگی بالکل اسی طرح وقوع پذیر ہوگی۔ حیات آخرت میں احیاء انسانی پر متحیر اذہان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا، اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی، پھر اس کا توازن قائم کیا اور اس کی رات ڈھانکی: ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا ...... رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ... وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ...... وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا [۷۹:۲۷تا۳۰] جب اتنے مشکل کام ہو سکتے ہیں تو تخلیق بعد موت اور احیائے ثانی میں کیا امر مانع ہو سکتا ہے؟

سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ نے دو لوگوں کی مثال پیش کی ہے جن کو انگور کے دو باغ دیے گئے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی ان باغوں کے اندر ایک نہر اللہ تعالیٰ نے جاری کی اور اس سے خوب پیداوار اور خوب نفع حاصل ہوا۔ یہ کچھ پا کر ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے باتیں کرتے ہوئے بولا میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت وحمیت رکھتا ہوں، پھر اپنی جنت یعنی باغ میں داخل ہوا اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی تاہم اگر کبھی مجھے اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا اس کے جواب میں اس کے ہمسائے نے گفتگو کرتے ہوئے اس کا فر نعمت سے آغاز کلام میں کہا: قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا [۱۸:۳۷] ''کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کیا''۔ اپنی تخلیق اور پیدائش کا تجربہ ایسا معروضی تجربہ ہے کہ کوئی انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ آدمی اس تجربے کو بالکل اسی طرح پہچانتا ہے اور جانتا ہے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے، کفار مکہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل اسی طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو۔ اس طرح انسان اپنی پیدائش کی حقیقت سے بغیر کسی علم، سائنس اور فلسفے کے بخوبی آگاہ ہے یہ ایسی دلیل ہے جو زمان ومکان سے ماوراء ہے جب تک انسان روئے زمین پر پیدا ہوتے رہیں گے اسی طریقے سے پیدا ہوں گے یہ دلیل کبھی غیر روشن اور مردہ نہیں ہوگی، بالکل اسی طرح موت کی دلیل بھی تخلیق انسانی کی دلیل کی طرح قیامت تک کے لیے روشن ہے اس لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین وکفار مکہ کے سامنے مالک الملک کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ [۱۰:۱۰۴]

سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اسی خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمھاری موت ہے۔ ظاہر ہے موت کا انکار کافر بھی نہیں کر سکتا لہٰذا وہ ہستی جو تم کو موت کے شکنجے میں کس لیتی ہے اس کا نام اللہ واحد ہے اگر تمھارے معبود فی الحقیقت موجود ہیں تو وہ تمھیں موت سے کیوں بچا نہیں لیتے۔ انسان اس حقیقت کو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس فرض کو بھول جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لیے اس کے رب نے اسے پیدا کیا تھا یعنی بندگی: كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ [۲۳:۸۰]

قرآن: مراحل تخلیق کا تذکرہ اور اس سے مقصود:

دلائل کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے قرآن نے کہا: ہرگز نہیں ہم نے جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اسے یہ خود جانتے ہیں: كَلَّا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ [۳۹:۷۰] ہر آدمی جانتا ہے کہ اس کی تخلیق اس کے باپ کے نطفے سے ہوئی ہے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ اسے نطفے سے، ماء مہین سے، ماء دافق سے، نطفہ امشاج سے، نر اور مادہ سے، اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا: ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ [۸:۳۲]، اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ [۲۰:۷۷]، خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ...... يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ [۷،۶:۸۶]، اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا [۲:۷۶]، وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى [۴۵:۵۳]، [۹۳:۷۵]۔ قرآن بتاتا ہے کہ تم کو اپنی پہلی پیدائش کا تو معلوم ہی ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ [۶۲:۵۶]، انسان دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے: فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ [۵:۸۶]۔ لیکن اب انسان کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہو گیا کہ ایک قطرے سے یہ انسان کیسے وجود میں آ گیا جواب خود ایک طوفان ہے؟ اسی لیے قرآن میں آتا ہے لعنت ہو انسان پر کیسا سخت منکر حق ہے کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے نطفہ کی ایک بوند سے: قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ...... مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ...... مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ [۸۰:۱۷، ۱۸، ۱۹]۔ ان آیات کا مقصد ہر فرد پر یہ بات واضح کرنا ہے کہ انسان اپنی حقیقت، اپنے ارد گرد، شب و روز دنیا میں آنے والے بچوں کی تخلیق و افزائش کے عمل سے تلاش کر سکتا ہے۔ تخلیق کی آیات کا مقصد انسان کو عہد الست یاد دلانا اور یہ جتلانا ہے کہ جب تم ان تمام حقائق کے عینی شاہد ہو تو ہمیں کیوں بھول جاتے ہو؟ ہم نے تمھیں پیدا کیا ہے پھر تم کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ [۵۷:۵۶] قرآن کے الفاظ میں ''اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمھاری پیدائش کی ابتداء کی پھر اس ضعف کے بعد تمھیں قوت بخشی پھر اس قوت کے بعد تمھیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ هُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ [۵۴:۳۰] ضعف سے طاقت اور طاقت سے پھر ضعف کا یہ مضمون سورۃ الانشقاق میں ایک اور طرح سے

بیان ہوا ہے، پس قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب کہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے: فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ...... وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ...... وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ......لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ [۸۴:۱۶ تا ۱۹]۔ ان آیات کو سمجھنے کے لیے جدید علم ایمبریالوجی کا پندرہ سو برس تک انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ہر شخص تخلیق انسانی کی کیفیات و تجربات کا عینی شاہد ہے۔

وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ [۱۰:۵] تخلیق انسانی کی تمام آیات کے سیاق و سباق پر غور کیجیے ہر آیت کے آغاز یا اختتام پر حیات بعد موت کے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ سورۃ صافات میں آتا ہے ''اب ان سے پوچھو ان کی پیدائش زیادہ مشکل کام ہے یا ان چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں تو ان سے پوچھو کہ ان کا بنانا مشکل ہے یا جتنی خلقت ہم نے بنائی ہے؟ انھیں ہم نے چپکتے گارے سے بنایا ہے۔ ہاں تو تم تعجب کرتے ہو اور یہ تمسخر کرتے ہیں۔ اور جب ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو نصیحت قبول نہیں کرتے۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا پھر اٹھائے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی [جو] پہلے [ہو گزرے ہیں؟'': فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ...... بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ...... وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ...... وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ...... وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ...... ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ...... اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ [۳۷:۱۱ تا ۱۷] قرآن نے اس سلسلے میں لوگوں کی تشویش اور اضطراب کا ذکر کیا ہے اور پھر دلیل میں تخلیق کا عمل پیش کیا ہے اور اختتام آیت پر لوگوں کو وحدانیت، ربوبیت اور توحید کی دعوت دی ہے۔ نائیک صاحب اس تناظر کو نظر انداز کر کے درمیان کی بعض آیات سے سائنس ثابت کر دیتے ہیں، چلیے مان لیا کہ یہ طریقہ درست ہے تو کیا سائنس ان آیات کے اصل مقاصد، مدعا اور منشا، یعنی حیات بعد الموت حشر اور خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرتی ہے؟ قرآن کی آیت سے سائنس نکال لی جائے مگر اس سائنس کے پھلنے پھولنے فروغ پانے کے نتیجے میں خدا کا سوال ہی ختم ہو جائے اور آخرت غیر اہم ہو جائے کیونکہ سائنس کے منہاج میں خدا، حشر نشر، آخرت اور توحید وغیرہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو ایسی سائنس کا کیا فائدہ جو خدا سے منکر ہے؟

استقرار حمل سے لے کر پیدائش تک کا مرحلہ وار ذکر: قرآن:

قرآن میں تخلیق انسان یا جنین کے مراحل کا بیان جگہ جگہ آیا ہے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بتاؤ کیا متنوع مخلوق کی تخلیق اور آسمان و زمین کا بنانا انسان کی تخلیق سے زیادہ مشکل کام ہے؟ ظاہر ہے نہیں تو انسان اپنی تخلیق پر اتنا حیران کیوں ہے: فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ

خَلَقْنَا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ [۱۱:۳۷] لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ [۵۷:۴۰] ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا [۲۷:۷۹] اس کے بعد مراحل تخلیق بتاتے ہوئے کہا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ [۲۶:۱۵] وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ [۲۸:۱۵] وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ [۱۲:۲۳] اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ [۷:۳۲] ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ [۸:۳۲] خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ [۱۴:۵۵] وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ [۱۱:۷] قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ [۱۲:۷] وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ [۲۶:۱۵] وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ [۲۸:۱۵] قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ [۳۳:۱۵] وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا [۶۱:۱۷] قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا [۳۷:۱۸] يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ [۵:۲۲] وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ [۱۱:۳۵] فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ [۱۱:۳۷] اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ [۷۱:۳۸] قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ [۷۶:۳۸] هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [۶۷:۴۰] خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ [۲:۹۶]، [۹۳:۷۵] پھر ارشاد ہوا کہ ہم نے تخلیق انسان کے لیے نر اور مادہ کے جوڑے بنائے: وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى [۴۵:۵۳] [۹۳:۷۵] پھر بتایا کہ پانی سے تخلیق کی گئی: وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ [۳۲:۸] اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ [۲۰:۷۷] خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ [۶:۸۶] يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ

الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ [۸۶:۷] پھر بتایا کہ مخلوط نطفے سے انسان کو وجود بخشا گیا: اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا [۷۶:۲] نطفہ قرار مکین میں رکھا گیا منی رحم مادر میں قطرے کی صورت میں ڈالی گئی: ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ [۲۳:۱۳] مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى [۵۳:۴۶] اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى [۷۵:۳۷] ایک وقت مقررہ تک اسے محفوظ جگہ رکھا: فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ [۷۷:۲۱] اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ [۷۷:۲۲] فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ [۷۷:۲۳] لہو کا لوتھڑا بنایا، اعضاء درست کیے، جوڑے بنائے مرد و عورت: ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى [۷۵:۳۸] فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى [۷۵:۳۹] خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ [۹۶:۲] ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا: فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ [۲۳:۱۴] پھر کان آنکھ عطا کیے: وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ [۱۶:۷۸] پھر اسے درست کیا پھر اس میں اپنی روح پھونکی: ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ [۳۲:۹] اسے ماں کے پیٹ میں تین اندھیروں میں رکھا: خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ [۳۹:۶] مدراج تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے بتایا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ [۲۲:۵] هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [۴۰:۶۷] مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ [۸۰:۱۸] مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ [۸۰:۱۹] قرار حمل سے لے کر پیدائش تک انسان کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے اس کا علم بھی صرف خالق کے پاس ہوتا ہے جیسی صورت چاہتا ہے بناتا ہے: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ [۷:۱۸۹] اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ [۱۳:۸] اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ [۳۱:۳۴] هُوَ

الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ [۳:۶] پھر اللہ جسے چاہتا ہے بیٹی دیتا ہے جسے چاہتا ہے بیٹا عطا کرتا ہے: لِلّٰـهِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ [۴۲:۴۹] اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَانًا وَّاِنَاثًا وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ [۴۲:۵۰] اس کی عمر کا تعین بھی خالق حقیقی کرتا ہے: وَ اللّٰهُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَ مَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ [۳۵:۱۱] مدت حمل اور مدت رضاعت بھی وہی بتاتا ہے: وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسٰنًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ کُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ کُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ [۴۶:۱۵] وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَ عَلَی الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ کِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُکَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَ عَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِکَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَکُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ [۲:۲۳۳] پھر وہی بچپن جوانی ضعف کی حالت طاری کرتا ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ [۳۰:۵۴] وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَکِّسْهُ فِی الْخَلْقِ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ [۳۶:۶۸] اور اس انسان کو جو ابتدائی حالت ضعف میں پیدائش کے بعد کچھ نہ جانتا تھا اس کے بعد سن شعور اور بلوغت اور بڑھاپے سے پہلے تک وہ بہت کچھ جانتا تھا اسی انسان کو اللہ رب العزت حالت ضعف میں دوبارہ بالکل لاعلم بنا دیتا ہے: وَ اللّٰهُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ وَ مِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ [۱۶:۷۰] ان تمام مراحل کے بیان کے بعد اللہ اپنے بندے سے پوچھتا ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی فَلَوْلَا تَذَکَّرُوْنَ [۵۶:۶۲] پھر تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟ مراحل تخلیق کے بیان کے بعد اللہ کی ربوبیت سے آگہی کے لیے غور و فکر کی دعوت کا سائنس سے کیا تعلق؟ یہ دعوت تو خالصتاً قربت، رب معرفت رب کے حصول کے لیے دی جارہی ہے نہ کہ حصول سائنس کے لیے۔

نائیک صاحب قرآن اور علم ایمبریالوجی کی ہم آہنگی ثابت کرنے کے لیے سورۃ مومنون اور سورۃ الحج کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن کا تعلق تخلیق انسانی کے مختلف مراحل سے ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَکُمْ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی

ثُمَّ نُخرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ [۲۲:۵] ''لوگو! اگر تمھیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہو تو ہم نے تمھیں [پہلی بار بھی تو] پیدا کیا تھا [یعنی ابتداء میں] مٹی سے پھر اُس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی تاکہ تم پر [اپنی خالقیت] ظاہر کر دیں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک میعاد مقرر تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں پھر تم جوانی کو پہنچتے ہو اور بعض [قبل از پیری] مرجاتے ہیں اور بعض [بوڑھے ہو جاتے اور بڑھاپے کی] نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ بہت کچھ جاننے کے بعد بالکل بے علم ہو جاتے ہیں، اور [اے دیکھنے والے] تو دیکھتا ہے [کہ ایک وقت میں] زمین خشک [پڑی ہوتی ہے] پھر جب ہم اس پر مینہ برساتے ہیں تو وہ شاداب ہو جاتی اور ابھرنے لگتی ہے اور طرح طرح کی بارونق چیزیں اگاتی ہے''۔

مٹی سے انسان کی تخلیق اور جدید سائنس:

اس آیت کے شروع میں حیات آخرت پر شک کی تردید کے لیے تخلیق انسانی کے مراحل کا نقشہ پیش کیا گیا لیکن حیات آخرت کے ذکر کے فوراً بعد انسان کی تخلیق کے مرحلۂ اول یعنی مٹی سے انسان کی تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے، تراب کے بعد قرآن نے نطفے، علقه، مضغه، رحم کا ذکر کیا ہے، ایمبریالوجی اور جدید سائنس نطفے سے لے کر رحم کے مراحل کو تو تسلیم کرتی ہے لیکن جدید سائنس کا کوئی سائنس دان انسان کی مٹی سے تخلیق کے نظریے کو تسلیم نہیں کرتا ان کا موقف یہ ہے کہ انسان مادے سے ظہور کرتا ہے اور یہ مادہ Protein cell سے تخلیق پاتا ہے۔ سائنس جب اس آیت کے پہلے دو بیانات کو ہی درست تسلیم نہیں کرتی یعنی نہ آخرت کو مانتی ہے نہ مٹی سے تخلیق کو تو بقیہ مراحل کو سائنس سے ثابت یا ہم آہنگ کرنے کی کوشش محض سادگی ہے۔ قرآن میں طین کا ذکر گیارہ مرتبہ اور تراب کا ذکر ۸ مرتبہ کیا گیا اس کے علاوہ دیگر مراحل تخلیق کا ذکر حسب ذیل ہے: صلصال ۴، [۱۵:۲۶، ۱۵:۲۰، ۱۵:۳۳، ۵۵:۱۴]، الطین ۱۱، [۳:۴۹، ۵:۱۱۰، ۶:۲، ۷:۱۲، ۲۳:۱۲، ۲۸:۳۸، ۳۲:۷، ۳۷:۱۱، ۳۸:۷۱، ۳۸:۷۶، ۵۱:۳۳، ۷۱:۶۱] تراب: ۸ مرتبہ، [۳:۵۹، ۱۸:۳۷، ۲۲:۵، ۳۰:۲۰، ۳۵:۱۱، ۴۰:۶۷]، ترابا ۹، [۲۳:۳۵، ۲۳:۸۲، ۲۷:۶۷، ۳۷:۱۶، ۳۷:۵۳]، نطفه ۱۲ [۱۶:۴، ۱۸:۳۷، ۲۲:۵، ۲۳:۱۳، ۲۳:۱۴، ۳۵:۱۱، ۳۶:۷۷، ۴۰:۶۷، ۵۳:۴۶، ۷۵:۳۷، ۷۶:۲، ۸۰:۱۹]، قرار مكين ۲ [۲۳:۱۳، ۷۷:۲۱]، علقه ۵ [۲۲:۵، ۲۳:۱۴، ۲۳:۱۴، ۴۰:۶۷]، مضغة ۳، [۲۲:۵، ۲۳:۱۴، ۲۳:۱۴]، لحماً [۲۳:۱۴]، خلق: ۶۴ مرتبہ: خلقنا ۲۴، خلقكم اور خلقناكم: ۹ مرتبہ آیا ہے اس کے علاوہ قرآن میں ماءِ مهين، ماء دافق، مني، طين لازب کی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں۔ تخلیق انسانی مٹی سے ہوئی۔ یہ قرآن کا بیان ہے اور تکرار کے ساتھ ہے جگہ جگہ قرآن میں بتایا گیا کہ ہم نے انسان کو ارض

سے، طین سے، تراب سے پیدا کیا ہے لیکن کوئی جدید فلسفی یا سائنس دان انسان کی مٹی سے تخلیق کا قائل نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے قبل بعض یونانی فلاسفہ [Atomist] انسان کی مٹی سے تخلیق کے قائل تھے لہٰذا قرآن کے تمام بیانات جدید سائنس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے [نعوذ باللہ] سورۃ مومنون میں بھی تخلیق کے مراحل درج ہیں: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۔۔۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۔۔۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۔۔۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۔۔۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ [۲۳:۱۲تا۱۶] یہاں بھی پہلا بیان یہ ہے کہ انسان کو مٹی کے ست سے بنایا: سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ پھر نطفہ قرار مکین میں ٹپکایا گیا پھر نطفہ علقہ بنا پھر مضغہ میں تبدیل ہوا پھر یہ عظماً بنایا گیا پھر اس پر لحم چڑھایا گیا پھر اسے ایک دوسری مخلوق بنا کر اٹھا دیا گیا، ان آیات کے فوراً بعد کہا گیا کہ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے، جدید سائنس دان اور فلسفی مراحل تخلیق کی ان آیات کی پہلی آیت یعنی مٹی کے ست سے تخلیق اور آخری آیت روز قیامت اور احیاء کو تسلیم نہیں کرتے لہٰذا درمیان کی صرف تین آیات کو سائنس سے ہم آہنگ ثابت کرنا محض نادانی ہے۔ سائنسی علم میں ایسی باطل تاویلات کی کوئی حیثیت نہیں کوئی سائنس داں نائیک صاحب کے بیانات کو تسلیم نہیں کرتا خواہ وہ سائنس کی حمایت میں کتنا ہی زور خطابت صرف فرما دیں۔ سورۃ سجدہ میں تخلیق کے مراحل کا تذکرہ کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی شان اور کائنات کی تخلیق کی کیفیات بیان کی گئی ہیں: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۔۔۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۔۔۔ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ [۳۲:۴تا۶]۔ جدید سائنس ان دونوں آیات میں بیان کردہ کسی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی، اس کے بعد کہا گیا کہ اللہ ظاہر و باطن سے واقف ہے سائنس اس کو بھی نہیں مانتی پھر تخلیق کے مراحل بتائے گئے: الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۔۔۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۔۔۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ [۳۲:۷تا۹] پھر مقصد تخلیق بتایا گیا کہ شکر گزار بنو، اس پر آدمی کا رویہ کیا ہے وہ بتایا گیا کہ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو پھر آخرت اور احیاء بعد موت کا ذکر کیا گیا: وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۔۔۔ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ [۳۲:۱۰تا۱۱] سائنس ان میں سے کسی بیان کو تسلیم نہیں کرتی۔

سورۃ مرسلات میں تخلیق کے دو مراحل کے بیان سے پہلے آخرت کا ذکر ہے: اَلَمْ

نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ...... ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ...... كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ...... وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ [۷۷: ۱۶ تا ۱۹] پھر کہا گیا کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمھیں پیدا نہیں کیا؟ ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھہرائے رکھا تو دیکھو ہم اس پر قادر تھے پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں: اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ...... فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ...... اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ...... فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ [۷۷: ۲۰ تا ۲۳] اس کے فوراً بعد کہا گیا کہ تباہی اس روز جھٹلانے والوں کے لیے: وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ [۷۷: ۲۴] سائنس ان دو آیات کے سوا کسی آیت کو نہیں مانتی تو ایسی سائنس سے قرآن کو ثابت کرنے کی مہم جوئی سادہ لوحی، سادہ دلی، نادانی اور کم فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

قرآن کو سمجھنے کے لیے کسی سائنسی تجربے، سائنسی ایجاد، سائنسی بیان، تحقیق اور جدید سائنس کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب کو تفصیل سے نازل کرتا ہے تاکہ ہدایت کے حصول کے لیے کسی اور ذریعے کی طرف دیکھنا نہ پڑے۔ اگر ہدایت کے لیے کسی اور ذریعے سے رجوع کرنا ضروری ہے یا ہدایت کی تشریح کوئی خارجی ذریعہ کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہدایت تام اور کامل نہیں۔

خدا کا کلام محتاج ہے اپنی تصدیق، توثیق اور تائید کے لیے اپنی مخلوق کا، اس مخلوق کا جو مغرب میں رہتی ہے اور خالق کو خالق بھی تسلیم نہیں کرتی اس کی ایجاد کردہ سائنس کا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ قرآن، نعوذ باللہ، مکمل نہیں ہے کیونکہ حقیقت اپنے ثبوت کے لیے، اپنے ہونے کے لیے اور اپنے جواز کے لیے کسی دوسرے پر انحصار نہیں کرتی۔ وہ اپنے ہونے کا مکمل جواز اپنے اندر رکھتی ہے فلسفہ پڑھنے والے اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں فلسفہ میں حقیقت [Reality] کسی پر منحصر نہیں ہوتی۔ اگر نائیک صاحب کے یہاں موجود غلط تصور حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے نتیجے میں قرآن نہ تو حقیقت ہے، نہ حقیقت ازلی و ابدی۔ نہ خالق حقیقی کا کلام جو اپنی تشریح توضیح تفسیر اور تکمیل کے لیے اپنی مخلوق کا محتاج ہو۔ ظاہر ہے وہ کلام الٰہی کیسے ہو سکتا ہے۔

نعوذ باللہ، کیا اس قرآن میں کوئی خلاء، کمی، کجی، باقی رہ گئی ہے؟ اور خارجی ذرائع کے بغیر اس تعلیم ہدایت کی تشریح تعبیر، تفسیر، تصریح، توجیہہ اور تکمیل ممکن نہیں تمام آسمانی صحائف اپنی تشریح و توجیہہ کے لیے کفریہ علوم کے محتاج نہیں تھے۔ وہ مفصل نازل ہوئے تورات بھی اسی تفصیل سے نازل کی گئی تھی اس کو بھی سمجھنے کے لیے اس زمانے یا بعد کے زمانے کی سائنس کا علم ضروری نہیں تھا: ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ [۶: ۱۵۴]، وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ [۷: ۱۴۵]، مگر لوگ پھر بھی توجہ نہیں کرتے قرآن صاف، واضح اور صریح کتاب ہے اور ہم اس کائنات میں موجود نشانیاں اور تاریخ عالم کے واقعات صاف اور صریح طور پر تفصیل سے بیان کر رہا ہے مگر پھر بھی بہت سے انسان ہماری

نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں: فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ [۱۰:۹۲] اسی طرح قرآن میں تمام اہم، ضروری عقائد، معاملات، مسائل کی تفصیلات بیان کر دی گئی ہیں تا کہ انسان کو کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہ ہو، وہ روشنی اور علم اور تشریح و تفسیر کے لیے کفار کا محتاج نہ ہو، کفر کے علماء ان کے علوم اور ان کی جامعات پر انحصار نہ کرے یہ تفصیلات ایک طالب ہدایت کی رہبری کے لیے کافی ہیں۔ جو طالب ہدایت ہی نہیں اس کے سامنے رسول آ جائیں اور آسمان سے اللہ کی نشانیاں بھی پے در پے نازل ہو جائیں تب بھی وہ ایمان نہیں لاتا۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ تمام اقوام کے سامنے بین کبریٰ نشانیاں پیش کیں مگر کوئی قوم ایمان نہیں لائی سوائے حضرت یونسؑ کی قوم کے اور وہ بھی اس لیے بچ گئے کہ حضرت یونس اضطراب میں وقت سے پہلے ہجرت فرما گئے تھے، ورنہ عذاب وقت پر نازل ہو جاتا۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ واضح مفصل اور صاف صاف نازل کیا گیا ہے، یہ وہ دعویٰ ہے جو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ دعویٰ اس لیے کیا گیا کہ قرآن کی آیات واضح المعانی ہیں: كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ [۴۱:۳] یہ آیتیں بین ہیں: وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ ۢ بَيِّنٰتٍ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ [۲۲:۱۶] قرآن کی نازل کردہ آیات بینات ہیں [۵۷:۹] ہم نے اس کتاب میں کچھ نہیں چھوڑا: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ [۶:۳۸] یقین لانے والوں کے لیے تو نشانیاں ہم صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں: قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ [۲:۱۱۸] ہم نے تمھیں صاف صاف آیات دے دی ہیں [۳:۱۸] ہم نے نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی ہیں: قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [۵۷:۱۷] اور ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں: وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ [۶:۱۰۵]۔ اللہ اپنی آیات لوگوں کے لیے صراحت سے بیان کرتا ہے: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ [۲:۱۸۷] اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اپنی آیتیں صاف صاف بیان کرتا ہے [۲:۲۱۹]۔ اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے: وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ [۲:۲۲۱] اس طرح اللہ اپنی آیات تمھیں صاف صاف بتاتا ہے [۲:۲۴۲] اس طرح اللہ اپنی آیات صاف صاف بیان کر رہا ہے: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ

اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ [۲۶۶:۲] اس طرح اللہ اپنی آیات تمھارے سامنے روشن کرتا ہے: وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ [۱۰۳:۳] اللہ تمھارے لیے احکامات کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا [۱۷۴:۴] اس طرح اللہ اپنی آیات تمھارے لیے واضح کرتا ہے: لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَ احْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ [۸۹:۵] اللہ کی آیات بالکل واضح ہیں: وَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ [۱۸:۲۴] اس طرح اللہ اپنی آیات کی توضیح کرتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ [۵۸:۲۴] اس طرح اللہ اپنی آیات تمھارے سامنے کھولتا ہے: وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ [۵۹:۲۴] اس طرح اللہ تمھارے سامنے آیات بیان کرتا ہے: لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [۶۱:۲۴] عنقریب ان کو اپنی آیات آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی حق ہے [۵۳:۴۱] ہم نے تمھاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں: وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ [۹۹:۲] قرآن سراسر ہدایت ہے ایسی بینات پر مشتمل جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَ مَنْ

كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ [۱۸۵:۲] جو بینات تمھارے پاس آ چکی ہیں اگر ان کو پالینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی تو جان رکھو: فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ [۲۰۹:۲] اللہ کے گھر میں آیات بینات کھلی ہوئی نشانیاں ہیں: فِيهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيمَ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ [۹۷:۳] ہم نے آیات بینات کے ساتھ قرآن کو نازل کیا ہے اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے: وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ م بَيِّنٰتٍ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يُّرِيدُ [۱۶:۲۲] اللہ اپنے بندے پر آیات بینات نازل کر رہا ہے تاکہ تمھیں ظلمت سے نور میں لے آئے: هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّورِ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ [۹:۵۷] اور ہم نے صاف صاف آیات نازل کی ہیں: اِنَّ الَّذِينَ يُحَآدُّونَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهٗ كُبِتُوا كَمَا كُبِتَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَ لِلْكٰفِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ [۵:۵۸] رسول ان کے پاس کھلی کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے مگر انھوں نے کہا کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے: ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ [۶:۶۴] ہم نے صاف صاف ہدایات دینے والی آیات تمھارے پاس بھیج دی ہیں: وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ [۳۴:۲۴] ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات نازل کر دیں: لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَ اللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ [۴۶:۲۴]۔ اور وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں اُن سے رستے معلوم کرو۔ ''عقل والوں کے لیے ہم نے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں: وَ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ [۹۷:۶]، اور وہی تو ہے جس نے تمھیں ایک شخص سے پیدا کیا پھر [تمھارے لیے] ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی۔ سمجھنے والوں کے لیے ہم نے [اپنی] آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں: وَ هُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ [۹۸:۶]۔'' [کہو] کیا میں اللہ کے سوا اور منصف تلاش کروں حالانکہ اُس نے تمھاری طرف واضح المطالب کتاب بھیجی ہے اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب [تورات] دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ تمھارے رب کی طرف سے برحق نازل ہوئی ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔'' اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِي حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا وَ الَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ [۱۱۴:۶]'' اور یہی تمھارے رب کا سیدھا رستہ ہے جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کے لیے ہم نے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں: وَ هٰذَا

صِرَاطُ رَبِّکَ مُسْتَقِیْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ [۶:۱۲۶]، ''اور ہم نے ان کے پاس کتاب پہنچا دی ہے جس کو علم و دانش کیساتھ کھول کھول کر بیان کر دیا ہے [اور] وہ مومن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔'' وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ [۷:۵۲]، ''اور اسی طرح ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں [تاکہ تم لوگ ان پر عمل کرو] اور اس لیے کہ گنہگاروں کا رستہ ظاہر ہو جائے'' وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ [۶:۵۵]، ''پوچھو تو کہ جو زینت [و آرائش] اور کھانے [پینے] کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اُن کو حرام کس نے کیا ہے؟ کہہ دو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں سمجھنے والوں کے لیے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ [۷:۳۲]، ''اور اسی طرح ہم [اپنی] آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ یہ رجوع کریں: وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ [۷:۱۷۴]، ''اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں اور سمجھنے والے لوگوں کے لیے ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں: فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ [۹:۱۱]، ''دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے کہ ہم نے اُس کو آسمان سے برسایا پھر اُس کیساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں ملا کر نکلا یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوش نما اور آراستہ ہوگئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم [عذاب] آ پہنچا تو ہم نے اُس کو کاٹ [کر ایسا کر] ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں اُن کے لیے ہم [اپنی قدرت کی] نشانیاں اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں: اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [۱۰:۲۴]، ''وہ تمھارے لیے تمھارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ بھلا جن لونڈی [غلاموں] کے تم مالک ہو وہ اس [مال] میں جو ہم نے تمھارے عطا فرمایا ہے تمھارے شریک ہیں؟ اور [کیا] تم اس میں [ان کو اپنے] برابر [مالک سمجھتے] ہو [اور کیا] تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنوں سے ڈرتے ہو؟ اسی طرح ہم عقل والوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں: ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ [۳۰:۲۸]، ''وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور چاند کی

منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور [کاموں کا] حساب معلوم کرو یہ [سب کچھ] اللہ نے تدبیر سے پیدا کیا ہے سمجھنے والوں کے لیے وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ [۱۰:۵] ، ''الر۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور اللہ حکیم وخبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کردی گئی ہیں: الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ خَبِیْرٍ [۱۱:۱] ، ''اللہ وہی تو ہے جس نے ستونوں کے بغیر آسمان جیسا کہ تم دیکھتے ہو [اتنے] اونچے بنائے پھر عرش پر جا ٹھہرا اور سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا، ہر ایک، ایک میعاد تک گردش کر رہا ہے، وہی [دنیا کے] کاموں کا انتظام کرتا ہے [اس طرح] وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم اپنے رب کے رُو برو جانے کا یقین کرو: اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ [۱۳:۲] ''۔ [ایسی] کتاب جس کی آیتیں واضح [المعانی] ہیں [یعنی] قرآن عربی ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں' كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ [۴۱:۳] ، ''اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے ہاں [یہ اللہ کا کلام ہے] جو [کتابیں] اس سے پہلے [کی] ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے اور انہی کتابوں کی [اس میں] تفصیل ہے اس میں کچھ شک نہیں [کہ] یہ رب العالمین کی طرف سے [نازل ہوا] ہے'' وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ [۱۰:۳۷] ، ''ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ [قرآن] ایسی بات نہیں ہے جو [اپنے دل سے] بنالی گئی ہو بلکہ جو [کتابیں] اس سے پہلے [نازل ہوئی] ہیں اُن کی تصدیق [کرنے والا] ہے اور ہر چیز کی تفصیل [کرنے والا] اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے: لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ [۱۲:۱۱۱] ، قرآن کی آیات پر اعتراض کرنے والوں کے اعتراض ختم ہی نہیں ہوتے لہٰذا اس کا جواب نہایت بلیغ طریقے سے دیا گیا: وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْ لَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ ءَ اَعْجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ وَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَیْهِمْ عَمًى اُولٰٓىِٕكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ [۴۱:۴۴]

قرآن میں آتا ہے اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا مگر یہ ہیں کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں: وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّ هُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ [۲۱:۳۲] یہاں توجہ کرنے سے مراد کیا علم فلکیات کے اصول اخذ کرنا ہے یا اللہ کی ربوبیت،

صفت تخلیقیت، صناعی پر ایمان لاتا ہے؟ عہد حاضر کی سائنس کہہ رہی ہے کہ کائنات بڑھ رہی ہے، پھیل رہی ہے اور قرآن کہہ رہا ہے کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آ رہے ہیں: بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ [۲۱:۴۴] تو کیا قرآن کا یہ بیان سائنس کے خلاف ہے؟ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ زمینوں کی اقسام کا ذکر کرتے ہیں۔ طیب اور خبیث زمین: وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَ الَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ [۷:۵۸] اسی طرح قرآن نے پھٹ جانے والی زمین کا ذکر کیا: وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ [۸۶:۱۲] تو کیا اس آیت سے [Soil Testing or Soil Engineering] زمین سے متعلق علوم سائنس کا بیان ہے یا زرخیز اور بنجر قلب کا ذکر ہے جہاں یاد الٰہی کا شجر پروان نہیں چڑھ سکتا۔ قرآن میں آتا ہے: وَاَحْصٰى كُلَّ شَىْءٍ عَدَدًا [۷۲:۲۸] کہ اللہ نے ایک ایک چیز کو گن رکھا ہے تو کیا اس آیت سے علم الاحصاء اور علم الاعداد کا وجوب ثابت کرنا مقصود ہے۔ کیا آیت ۱۸:۴۹ میں احصھا سے مراد یہی حسابی علم ہے؟ کیا آیت ۱۹:۹۴ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا علم شماریات وحساب سے متعلق ہے؟ کیا آیت ۷۸:۲۹ وَكُلَّ شَىْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا میں یہی علم مقصود ہے کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ دی ہے؟ کیا آیت ۷۳:۲۰ میں تُحْصُوْهُ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے سے مراد علم الحساب ریاضی یا الجبرا ہے؟ سورۃ طلاق میں وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار رکھو۔ [۶۵:۱] کیا اس سے مراد علم الحساب ہے کیا آیت ۱۸:۱۱ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا شمار قیام مدت سے مراد علم حساب ہے کیا آیت ۱۴:۳۴ اور ۱۶:۱۸ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ میں گنتی سے مراد یہی حساب کتاب کا علم ہے جو یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے؟ قرآن میں آتا ہے لوگو ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمھارا ہی ذکر ہے: لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [۲۱:۱۰] وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ [۲۳:۷۱] بلکہ ہم ان کا اپنا ہی ذکر ان کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں۔ تو کیا اس سے مراد علم تاریخ، علم الانسان، علم تشریح، اعضاء یا علم بشریات [Anthropology] کا حصول مقصود ہے؟ کیا آیت ۲۶:۷،۸ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ...... اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کا مطلب علم نباتات کی تحقیق ہے؟ اور نباتیات [Botany] کا علم یہاں سے اخذ کیا جائے؟ یا ترکی کے مفکر ڈاکٹر ہلوک نور باقی کی طرح قرآن کی آیت ۸۷:۴،۵ وَالَّذِىْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ...... فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا سے پیٹرولیم کا وجود ثابت کرنا مقصود ہے؟ اسی طریقے سے علامہ سعید نورسی نے ریلوے، بجلی، اور نہ جانے کیا کچھ قرآن کی آیات سے نکال دیا یہ جدیدیت مغربیت اور جدید سائنس سے انتہا درجے کی مرعوبیت

ہے۔ یہ امت کے فہم اجتماعی، اجماع اور تفسیر ماثور سے کامل انحراف ہے۔ یہ ان الذین یلحدون فی ایتنا سے مماثل عمل ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

قرآن مجید کی آیات سے اس قسم کے استنباط کے باعث پرویز صاحب اور اُن جیسے دیگر مفکرین نے یہ اجتہادات فرمائے کہ مساجد کے متولی امام اور موذن صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو صاحب نصاب ہوں کیوں کہ قرآن نے کہا ہے کہ: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ [۹: ۱۸] جب تک کسی شخص کے پاس دو کمرے نہ ہوں اس کو شادی کی اجازت نہیں ہے اور ہر طالب نکاح کی ذمہ داری ہے کہ وہ کم از کم دو کمرے کا گھر بنائے اس کی دلیل نص ہے:

سورۃ جاثیہ میں آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے اور تمھاری اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو اللہ [زمین میں] پھیلا رہا ہے بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں: اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ...... وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ [۴۵: ۳-۴] کیا ان نشانیوں کے لیے کسی یونیورسٹی جانے یا کسی سائنس دان سے ملاقات کی ضرورت ہے؟ کیا اس کے بغیر آیات الٰہی کو جاننا ممکن نہیں ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان براہ راست آیات الٰہی پر غور کر کے اللہ کو نہیں پہچان سکتا جب تک وسیلہ نہ ہو اور وسیلہ بھی مادی، طبعی، دنیاوی، سائنسی، حسی اور تجرباتی نہ ہو کیا اس نقطۂ نظر کے نتیجے میں اس رویے اور طریقے سے دین کے پھیلنے کا امکان ہے یا سمٹنے کا؟

قرآن اور سائنس: دونوں غلطیوں سے پاک؟

ڈاکٹر نائیک صاحب فرماتے ہیں:

''کلام خداوندی میں غلطی نہیں ہوسکتی اس میں سائنسی غلطیوں کا امکان ھی نہیں''[1]

یہ کہنا کہ قرآن میں سائنسی غلطیوں کا امکان نہیں ہے یا یہ کہنا کہ قرآن میں سائنسی غلطیوں کا امکان موجود ہے نہایت نامناسب بات ہے، سائنس کیا ہے کیا نہیں ہے، سائنسی غلطی کسے کہتے ہیں؟ صحیح سائنس کیا ہوتی ہے؟ سائنس کبھی صحیح اور وہی سائنس کبھی غلط کیوں ہو جاتی ہے؟ عہد حاضر کے اہم ترین فلسفی کارل پاپر کے مطابق سائنس غلط ہوتی رہتی ہے، اس علم میں تردیدیت کی صلاحیت Falsification ہی اس کی اصل قوت ہے، سائنس اصول تردید کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے اور سائنسی علم وہی علم ہے جس کی تردید کسی بھی لمحے کسی بھی موقع پر کی جا سکے، لہٰذا جو علم خود تردید کے عمل سے

[1] ذاکر نائیک خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۶۲۔

اپنی عظمت قائم کرتا ہے اس کو جانے بغیر یہ کہنا کہ قرآن میں سائنسی غلطیوں کا امکان نہیں غلط دعویٰ ہے، اس دعوے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کوئی سائنسی بیان سرے سے نہیں ہے ورنہ تمام سائنسی بیانات غلط ہو سکتے ہیں ان کا غلط ہونا ہی ان کے سائنس ہونے کا ثبوت ہے، اگر وہ غلط ہونے کی صلاحیت کھودیں گے تو وہ مذہبی بیانات بن جائیں گے۔ مثلاً دو ہزار سال تک زمین ساکن تھی پھر اچانک دو ہزار سال کے بعد متحرک ہوگئی تو یہ کیا معاملہ ہے سائنس ایک ابہام ایک مغالطہ، مفروضات کا گورکھ دھندہ اور ظنی وقیاسی علم ہے اس علم کے بارے میں یہ کہنا کہ قرآن میں سائنسی غلطیوں کا امکان نہیں عجیب بات ہے۔ جب سائنس غلطیوں کی اصلاح کے سہارے آگے بڑھ رہی ہے اور اس کا کوئی نظریہ اور اصول، حتمی و قطعی نہیں ہے تو یہ کہنا کہ سائنسی غلطیوں کا امکان قرآن میں نہیں نادرست بیان ہے، اگر قرآن سائنس کے کسی نظریے، اصول، مساوات، تجربے اور تجربے کی تصدیق کرتا ہے تو اس کا سو فیصد امکان موجود ہے کہ یہ نظریہ مستقبل میں غلط ہو جائے لہٰذا قرآن کو سائنسی منہاج پر پرکھنے کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ قرآن میں سائنسی غلطیوں کا امکان پیدا ہوتا رہے گا۔

غالباً ذاکر نائیک صاحب سائنس سے واقف نہیں وہ Feyerabend اور Popper کا سرسری مطالعہ فرما لیں تو ان کو سائنس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ سائنس خود اغلاط کا دفتر اور ٹھوکروں کا پلندہ ہے، وہ ان اغلاط کو درست کر کے ارتقاء کا سفر طے کرتی رہتی ہے لیکن اس کی عاجزی یہ ہے کہ وہ کبھی خود کو قطعی، حتمی اور آخری نہیں قرار دیتی لہٰذا سائنس کو جانے بغیر یہ دعویٰ کرنا کہ اس میں سائنسی غلطی کا امکان نہیں غیر علمی دعویٰ ہے، کارل پاپر لکھتا ہے کہ: یہ Problem Solving علم ہے، ہمارے مسائل حل کر دیتا ہے بس کام چلا دیتا ہے کلام چلاتا رہتا ہے۔ کیا وحی الٰہی، الکتاب، الفرقان صرف Problem solving activity کے لیے نازل ہوتے ہیں ظاہر ہے؟ یہ باطل دعویٰ ہے۔ سائنس جب خود اپنے منہاج، طریقہ کار، اصولوں، تجربات اور نتائج میں غلطیوں کے سو فی صد امکان کو تسلیم کرتی ہے تو اس کو غلطیوں سے مبرا قرار دینا اور اس کی بنیاد پر قرآن کو پرکھنے کا دعویٰ ایک غلط دعویٰ ہے۔ قرآن کو پرکھنے کی شے سائنس نہیں ہے سائنس کو اتنے بلند مرتبے پر فائز کر دینا سائنس سے عدم واقفیت ہے۔

لے کاٹوش نے سائنس کے ٹھوس ہونے کی حقیقت کو درج ذیل مثال سے غلط ثابت کیا ہے اور سائنس دانوں کے کلامی دلائل کا احاطہ کیا ہے، یہ عجیب وغریب مثال پڑھیے:

The story is about an imaginary case of planetary misbehaviour. A. physicist of the pre Einstenian era takes Newton's mechanics and his law of gravitation, N, the accepted initial conditions, I, and calculates, with their help, the path of a newly discovered small planet, p, But the

planet deviates from the calculated path. Does our Newtonian physicist consider that the deviation was forbidden by Newton's theory and therefore that, once established, it refutes the theory N? No. He suggests that there must be a hitherto unknown planet p', which perturbs the path of p. He calculates the mass, orbit, etc. of this hypothetical planet and then asks an experimental astronomer to test his hypothesis. The planet p' is so small that even the biggest available telescopes cannot possibly observe it; the experimental astronomer applies for a research grant to build yet a bigger one. In three years time, the new telescope is ready. Were the unknown planet p' to be discovered, it would be hailed as a new victory of Newtonian science. But it is not. Does our scientist abandon Newton's theory and his idea of the perturbing planet? No. He suggests that a cloud of cosmic dust hides the planet from us. He calculates the location and properties of this cloud and asks for a research grant to send up a satellite to test his calculations. Were the satellite's instruments (possibly new ones, based on a little-tested theory) to record the existence of the conjectural cloud, the result would be hailed as an outstanding, victory for Newtonian science. But the cloud is not found. Does our scientist abandon Newton's theory, together with the idea of the perturbing planet and the idea of the cloud which hides it'? No. He suggests that there is some magnetic field in that region of the universe which disturbed the instruments of the satellite. A new satellite is sent up. Were the magnetic field to be found, Newtonians would celebrate a sensational victory. But it is

not. Is this regarded as a refutation of Newtonian science? No. Either yet another ingenious auxiliary hypothesis is proposed or the whole story is buried in the dusty volumes of periodicals and the story never mentioned again. Falsification & methodology of scientific research"[1]

''ایک سائنس داں کسی سیارے کے مدار کے بارے میں نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کے تحت مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ فرض کریں کہ اس سیارے کے مشاہدہ کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریے کے بتائے ہوئے مدار پر سفر نہیں کر رہا۔ کیا وہ اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ نیوٹن کا نظریہ کشش ثقل غلط ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ یہ کہے گا اس سیارے کے نزدیک اب کوئی نامعلوم سیارہ موجود ہوگا جس کی کشش کی وجہ سے زیر مطالعہ سیارہ اپنے مدار سے ہٹ کر سفر کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ اس نامعلوم سیارے کے وزن، حجم اور مدار کے بارے میں حساب وتخمینہ لگاتا ہے اور پھر اپنے ساتھی سائنس دانوں کو اس نامعلوم سیارے کے مشاہدہ کا کام سپرد کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نامعلوم سیارہ اتنا چھوٹا ہو کہ اب تک کی طاقتور ترین دوربین کی مدد سے بھی نہ دیکھا جا سکتا ہو۔ لہٰذا وہ سائنس دان حکومت سے ریسرچ کی مد میں فنڈ مانگتے ہیں تاکہ ایک بڑی اور طاقتور دوربین تیار کی جاسکے۔ لگ بھگ تین برس کے عرصے میں ایک نئی دوربین تیار کر لی جاتی ہے۔ اگر تو اس دوربین کی مدد سے وہ نامعلوم سیارہ نظر آجائے تو سائنس دان خوشیاں منائیں گے کہ نیوٹن کے نظریے کی ایک بار پھر تصدیق ہوگئی۔ فرض کریں وہ نامعلوم سیارہ دوربین میں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا سائنس دان اسے نیوٹن کے نظریے کی شکست تسلیم کرلیں گے؟ نہیں بلکہ وہ کہیں گے کہ دراصل ایک فضائی بادل [cloud of cosmic dust] نے اس نامعلوم سیارے کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ سیارہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ چنانچہ سائنس دان مزید ریسرچ فنڈ مانگتے ہیں تاکہ ایک خلائی شٹل بادل کے مشاہدے کے لیے بھیجی جاسکے۔ اگر خلائی شٹل کسی ایسے بادل کی نشاندہی کر دے تو اسے نیوٹن کے نظریے کی زبردست کامیابی قرار دیا جائے گا۔ لیکن فرض کریں وہ بادل بھی نہ پایا جائے کیا اب سائنس دان نیوٹن کے نظریۂ کششِ ثقل بشمول اپنے خیالات کہ ایک نامعلوم سیارہ ہے یا یہ کہ ایک فضائی بادل ہے کی تردید کر دیں گے؟ نہیں بلکہ اب وہ کہیں گے کہ کائنات کے اس حصے میں کوئی مقناطیسی قوت [Magnetic Field] ہے جس نے سٹیلائٹ کے آلات کو صحیح کام نہیں کرنے دیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ بادل دریافت نہ ہوسکا۔ چنانچہ ایک نئی قسم کی خلائی شٹل تیار کر کے فضا میں بھیجی جاتی ہے۔ اگر وہ مقناطیسی قوت وہاں مل

1. Imre Lakatos & A Musgrave[ed.], *Falsification & the Methodology of Scientific Research Programmes in Criticism and the Growth of Knowledge*, Cambridge: Cambridge University Press, 1974, p.100-101.

جائے تو نیوٹن کے مداح سائنس دانوں کی خوشی کی انتہا نہ ہوگی۔ لیکن فرض کریں ایسا نہ ہو سکے۔ کیا اب وہ نیوٹن کے نظریے کی شکست تسلیم کرلیں گے؟ نہیں بلکہ وہ ایک نیا اضافی مفروضہ تراشیں گے.......... یہاں تک کہ یہ سالوں پر محیط کہانی تحقیقی رسالوں کی اقساط میں دب کر گم ہو جاتی ہے اور پھر کبھی بیان نہیں کی جاتی''۔ اس مثال کے بیان سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تجربات کی روشنی میں کسی سائنسی نظریے کی حتمی تردید کا دعویٰ ایک غلط دعویٰ ہے۔

نائیک صاحب لے کاٹوش کو مختصراً پڑھ لیں تو ان کے بہت سے علمی توہمات جو صرف سائنس پر غیر معمولی ایمانیات و اعتقاد کا ثمر ہیں خود رفع ہو جائیں گے۔ خطابت اور اخلاص علم کا متبادل نہیں ہوسکتا۔ آپ کا اخلاص بلاشبہ سر آنکھوں پر لیکن اخلاص کی تلوار سے علم اور عقیدے کی دیوار گرانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

یعنی قرآن اس لیے برحق اور اغلاط سے مبرا ہے کہ اس میں سائنسی نتائج کی بنیاد پر سائنس سے متصادم کوئی نظریہ یا بات بیان نہیں کی گئی۔ کسی چیز کے حق پر ہونے کی دلیل اس کا سائنس سے متضاد نہ ہونا اور سائنس و قرآن کا ہم آہنگ ہونا لازمی ہے، یہ تصور دین میں ایک نئے فریضے کا اضافہ اور بدعت و ضلالت ہے۔ اور سائنس بھی وہ جس کا حال عہد حاضر کے ایک اہم ترین فلسفی اور سائنس داں نے کتنی خوبصورتی سے کھول کر رکھ دیا ہے اس کے باوجود اگر نائیک صاحب سائنس کو ٹھوس کہتے ہیں تو یہ ان کی سادہ لوحی کی انتہا ہے۔

چھ دنوں میں تشکیل کائنات کی سائنسی توجیہہ: ایک چیستان:

ڈاکٹر ذاکر نائیک فرماتے ہیں:

''سائنس داں ہمیں بتاتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے والے چھ دنوں میں کائنات کی تشکیل ممکن ہی نہیں، قرآن بھی اس حوالے سے چھ ایام کا ذکر کرتا ہے.... لفظ یوم کا مطلب چوبیس گھنٹے کا ایک دن بھی ہوتا ہے اور اس سے مراد طویل عرصہ بھی ہوسکتا ہے یعنی ایک زمانہ اور یہ بات تسلیم کرنے میں کسی سائنس داں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ دنیا چھ طویل وقفوں یا زمانوں میں تخلیق ہوئی''۔[1]

یوم کی تشریح کی ضرورت جناب نائیک صاحب کو اس لیے محسوس ہوئی کہ سائنس دانوں نے اعتراض کیا، گویا اگر یہ اعتراض دور کر دیا جاتا تو سائنس دان اسلام لے آتے۔ کیا متکلمین اور علماء کا کام سائنس دانوں کے اعتراضات کی روشنی میں عصر حاضر کے علوم انسانی کے قرآن کے ایسے مفاہیم متعین کرنا ہے جو ان علوم سے ہم آہنگ ہوں؟ وہ سائنس جو اٹکل پچو طریقے سے چلتی ہے جس کی کوئی سند نہیں، جو

---

[1] ذاکر نائیک، خطباتِ ذاکر نائیک، صفحہ ۶۳۔

نہایت متغیر اور متنوع جنس ہے، جو ہر لمحے تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے جس کا پورا کارخانہ قیاس، گمان، تخمینوں، اندازوں بلکہ سادہ لفظوں میں غلط بیانی پر منحصر ہے، اس کی مطابقت قرآن سے کیوں ثابت کی جائے؟ اگر ڈاکٹر نائیک صاحب قرآن کا بہ غور مطالعہ کرتے تو انھیں اللہ کے ایک یوم کی تشریح اسی قرآن میں خود مل جاتی کہ اللہ کا ایک دن ایک ہزار برس کا ہوتا ہے اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ کا ایک دن پچاس ہزار برس کے برابر ہوتا ہے: تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ [۷۰:۴]، وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ [۲۲:۴۷]۔ جب قرآن نے خود ہی تشریح کر دی کہ اللہ تعالیٰ کے ایک دن کو انسان اپنی دنیا کے ایک یوم پر قیاس نہ کرے تو نائیک صاحب کی تشریح خود بخود بے معنی ہو جاتی ہے۔ سورۂ سجدہ میں آتا ہے وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ایک ہزار سال ہے: يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ [۳۲:۵] سائنس دان صرف ایسے دن کو مانتے ہیں جو چوبیس گھنٹے کا ہے، ان کی تفہیم کے لیے نائیک صاحب یوم کی تشریحات ''دور'' سے فرما رہے تھے تو کیا یہ آیت ان کی نظر سے نہیں گزری، اللہ تو خود ہی تشریح فرما چکا ہے کہ اس کا ایک یوم انسانوں کے قیاس کردہ یوم کے برابر نہیں ہوتا۔ اس دنیا کے اصول اور حساب و کتاب اس محدود و مختصر دنیا کے اصولوں سے مماثل نہیں ہوتے یہ طبعی اور مادی دنیا ہے وہ غیر طبعی اور روحانی دنیا ہے جس کا ذکر انسانوں کی محدود زبان میں کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ لامحدود ہستی کے افعال و اعمال کا ادراک ہماری محدود زبان نہیں کر سکتی اور نہ ہی اسے سائنس کے ذریعے گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ جہنم میں انسان کتنا عرصہ رہے گا قرآن نے بتایا کہ وہ مدتوں پڑا رہے گا۔ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا [۷۸:۲۳] احقاب کے معنی ہیں پے درپے آنے والے طویل زمانے، ایسے مسلسل ادوار کہ ایک دور ختم ہوتے ہی دوسرا دور شروع ہو جائے، اگر نائیک صاحب لفظ احقاب سے مدد لیتے تو سائنس داں شاید اس لفظ کے ذریعے نفس مطمئنہ کی نعمت سے فیض یاب ہو سکتے تھے اور نائیک صاحب یوم کی تشریح سے بھی بچ سکتے تھے۔ نائیک صاحب یہ بھی بتائیں کہ اس آیت میں کیا احقاب کے ادوار سے مراد یہ لی جائے گی کہ آخر کار جہنم کے شعلے بجھا دیے جائیں گے اور وہ فنا ہو جائے گی جیسا کہ بعض گمراہ فرقوں کا خیال ہے کہ جنت و جہنم کو دوام حاصل نہیں ہے۔ جبکہ قرآن بتاتا ہے کہ جہنم ابدی ہے: اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ [۱۳:۵]

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کا دن کتنا طویل ہوتا ہے اور اس بیان کردہ عرصے میں تخلیق کائنات ممکن ہے یا نہیں؟ مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے کائنات بنادی تو آپ تسلیم کر لیں۔ اس بیان کی عقلی دلیل اہم نہیں ہے۔ ایمان اہم ہے اعتراض کرنے والا سائنس داں تو چھ یوم کے دورانیے پر بھی اعتراض کر سکتا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ پس ثابت ہوا کہ تمھارا رب بھی بعض امور میں مجبور ہے مالک کل

نہیں ہے۔ اسے دنیا تخلیق کرنے کے لیے اتنی طویل ریاضت اور اس قدر طویل زمانوں کی ضرورت کیوں پڑی؟ جو نائیک صاحب نے ثابت فرمادیے وہ پوچھ سکتا ہے کہ کیا تمہارا اللہ مجبور محض ہے کیا وہ کُن فیکون کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ اس قدر بڑی کائنات کو ایک لمحے میں بنا سکے؟ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت کہ وہ پلک جھپکنے کے وقفے میں اپنے حکم پر عمل درآمد کرا سکتا ہے؟ نائیک صاحب کی یوم کی تشریح کے نتیجے میں اللہ کی صفت تخلیق کلمح البصر کے کمال کا بھی انکار کر دیا گیا کہ سائنس داں اسے کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ تو کیا ہم سائنس دانوں کی خوشنودی کے لیے کلام اللہ کے الفاظ کے نئے مطالب گھڑتے چلے جائیں؟ اللہ فرماتا ہے: فعال لمایرید اور جو چاہے کر ڈالنے والا ہے۔ وہ کہتا ہے: نخلق ما یشاء جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [۵:۱۷] فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ [۸۵:۱۶]۔ یعنی اللہ چاہے تو ایک لمحے میں، پلک جھپکنے میں، ایک ہزار یوم میں، پچاس ہزار ایام میں کائنات بنا دے اور اگر صرف یہ کہہ دے کہ کن اور فیکون ہو جائے یہ آیات اللہ کی قدرت پر دلالت کر رہی ہیں نہ کہ ان آیات سے ایام کی بحث، چوبیس گھنٹے کے دن کا حساب کتاب سائنس کی بارگاہ میں پیش کرنا ہے۔ اعتراض کرنے والا تو یہ بھی اعتراض کر سکتا ہے کہ اگر اللہ کلمح البصر کی مدت میں کوئی کام کر بھی دے تو کیا کمال ہے یہ صفت تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق حضرت سلیمانؑ کے اس امتی کو بھی حاصل تھی جو پلک جھپکتے میں تخت بلقیس لے آیا تھا:

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ [۲۷:۴۰] اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ اگر مختصر زمانے میں تخلیق کائنات کی تکمیل ممکن بھی ہو تو اس میں خالق کا کیا کمال یہ تو اس کی مخلوق کو بھی حاصل ہے؟ چلیے اگر اس کمال الٰہی کو مان لیا جائے کہ وہ پلک جھپکنے کے لمحے میں سب کچھ کر سکتا ہے تو اعتراض کرنے والا اس دلیل کو اس بنیاد پر رد کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسے ہی کائنات کو بنانے کا ارادہ یا خیال کیا، یہ خیال اسی لمحے تخلیق کے مرحلے سے کیوں نہیں گزر گیا؟ کیا خدا بھی انسانوں کی طرح محتاج زماں و مکاں ہے کہ اس نے کائنات قسطوں میں تخلیق کی؟ وہ پوچھ سکتا ہے کہ یہ کائنات کیا طویل زمانوں میں ہی بن سکتی تھی؟ کیا قلیل زمانوں میں اس کائنات کی تعمیر، تشکیل، تخلیق ممکن نہیں تھی؟ کوئی ذاکر نائیک صاحب سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت برپا کرنے میں کچھ دیر نہ لگائے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے بلکہ اس سے بھی کم: اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ [۱۶:۷۷] تو کائنات کی تشکیل میں اسے چھ دن کیوں لگ گئے؟ جب دنیا لمحے بھر میں تباہ ہو سکتی ہے، کھربوں انسان قبروں سے اٹھا کر زندہ کھڑے کیے جا سکتے ہیں، زمین کو ہموار کر کے میدان حشر لمحوں میں قائم کیا جا سکتا ہے، کھربوں انسانوں کے ہاتھوں

میں نامہ اعمال تھما کر حساب کتاب شروع ہوسکتا ہے، کھولتی ہوئی جہنم تیار کی جاسکتی ہے، نعمتوں سے بھرپور جنت بنائی جاسکتی ہے، تو اسی مماثل مدت میں تخلیق کائنات کیوں نہیں ہوسکی؟۔ چونکہ سائنس کا یہ دعویٰ تھا کہ کائنات چھ دن میں نہیں بن سکتی لہٰذا ذاکر نائیک صاحب نے فوراً یہ عقلی اعتراض تسلیم کرلیا۔ اور اسے رفع کرنے کے لیے عقلی دلائل دینے لگے یہ سوچے بغیر کہ ان کمزور عقلی دلائل کی زد کہاں کہاں پڑ سکتی ہے۔ امام رازیؒ سے لے کر آج تک تمام متکلمین اور مفسرین اس آیت تخلیق کائنات چھ دن میں کیوں؟ [ستته الایام] کی کوئی عقلی توجیہہ نہیں کرسکے اور آخر کار انھیں یہی کہنا پڑے کہ اللہ مالک الملک ہے وہ جو چاہے کرے، عقلی اور منطقی اعتراض کبھی ختم نہیں ہوتے کیونکہ ان اعتراضات کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی بلکہ یہ محض ذہنی مشق اور ذہنی عیاشی کا معاملہ ہوتا ہے جس کی بنیاد ریب انکار، اور تردید پر رکھی جاتی ہے، اس لیے کُن فیکون اور کلمح البصر پر بھی اسلام دشمنوں کی جانب سے یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کو یہ کہنے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے کہ ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ادھر اللہ ارادہ کرنا شروع کردے ادھر تخلیق کا عمل خودبخود شروع ہوجائے؟ اس کے کسی ارادے کو روبہ عمل لانے والے فرشتوں کو پلک جھپکنے میں لگنے والے وقت کے مساوی وقت کی کیوں ضرورت ہوتی ہے؟ بلکہ ارادے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ بس وہ جو چاہے ایسا نظام ہو کہ اس کی چاہت لمحوں میں حقیقت کا روپ دھار لے اللہ کو سوچنے ارادہ کرنے، کہنے کی بھی ضرورت کیوں ہو؟

ہر عقلی دلیل پر معترض اس سے زیادہ مضبوط عقلی دلیل کے ذریعے حملہ آور ہوسکتا ہے۔ اس لیے انبیاء معرکہ حق باطل عقل کی تماشہ گاہ میں نہیں ایمان کی سجدہ گاہ میں برپا کرتے ہیں۔ وہ قلب پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس معبد کو فتح کرتے اور قلب کے دریچے کھول کر چشم باطن روشن کر کے امت کو سجدے کی توفیق عطا کرتے ہیں۔ یوم، احقاب، دور، وغیرہ وغیرہ اس طرح کے تمام الفاظ، اصطلاحات اور تمام بیانات، امثال وتشبیہات کا مقصد انسانی ذہن، زبان اور فہم کی محدودیت کے پیش نظر اس زبان کے اسلوب ومحاورے اور زبان وبیان میں مالک الملک کی صفات وکمالات کا اظہار وابلاغ مقصود ہے، مثلاً قرآن کی یہ آیت کہ ''ہم نے آسمان بغیر ستون کے بنایا'' اس آیت کی تشریح میں مفسرین اور متکلمین نے دو ہی دلائل دیے: ایک یہ کہ آسمان بغیر ستون کے بنایا گیا جو کمال خداوندی ہے، دوسری تشریح یہ کی گئی کہ آسمان کے ستون تو ہیں لیکن نظر نہیں آتے دونوں تشریحات کا مقصد ذہن انسانی کو یہ بتانا ہے کہ تم ایک چھوٹے سے حجرے کی چھت ستونوں کے بغیر تعمیر کرنے سے عاجز ہو یہ مالک الملک ہے جو اتنا بڑا آسمان بغیر ستون کے تعمیر کرتا ہے، کیا کسی میں یہ جرأت ہے کہ ایسی بے مثال شے تخلیق کر سکے؟ انسان کو ایسی تخلیق سے عاجز وقاصر بتا کر اللہ تعالیٰ کی شانِ صناعی وخلاقی پر استدلال کیا گیا۔ لیکن ذاکر نائیک جیسے سادہ لوح مگر مخلص مسلم مفکر اس آیت کی روح میں اترنے کے بجائے اس کے ظاہر میں الجھ جائیں گے اور مسلم سائنس دانوں کو ہدایت کریں گے کہ وہ ان ستونوں کو تلاش کریں جو نظر نہیں آرہے تاکہ ہم ستونوں کو مخفی رکھنے کی سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے اثبات خداوندی کرسکیں۔ آیات ربانی سائنسی تحقیق کے لیے

نہیں ایمان ایقان اور یقین میں اضافے کے لیے ہوتی ہیں طبیعی علوم [Physical Science] علوم انسانی میں اضافے کے لیے نہیں ہوتیں۔ ذاکر نائیک صاحب کا چھ یوم کو عام ایام کے بجائے ''طویل زمانہ'' صرف اس لیے تسلیم کرنا کہ قرآن کی سائنس سے اور سائنس دانوں کے ان بیانات سے جن کی قطعیت کے وہ خود قائل ہیں مطابقت پیدا کر دی جائے محض معذرت خواہی ہے اور اعلیٰ درجے کی سادگی۔ کل سائنس داں یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ یہ دنیا ان طویل ادوار میں بھی نہیں بن سکتی کیونکہ یہ دنیا اس قدر وسیع و عریض، اتنی متنوع، ایسی رنگا رنگ اور ہر مخلوق کی تخلیق، ارتقاء، تشکیل کا عمل اس قدر پیچیدہ ہے کہ اسے سمجھنے اور جاننے میں صدیاں لگ رہی ہیں تو ایسی پیچیدہ کائنات چند ادوار میں تخلیق ہی نہیں ہو سکتی۔ عقلی اعتراضات کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے عقلی جوابات سے ہر ایک مطمئن ہو سکتا ہے۔ اصل مطلوب اطمینان قلبی ہے سائنس داں اگر قرآن پر اعتراضات کرنے لگیں تو ایک سے ایک اعتراض اٹھا سکتے ہیں مثلاً قرآن میں آتا ہے: ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا ...... رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ...... وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ...... وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ...... اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ...... وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ...... مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ [۷۹: ۲۷ تا ۳۳] کہ اللہ نے پہلے آسمان بنایا، چھت کا توازن قائم کیا، رات ڈھانکی، دن نکالا، اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا، اس کے اندر سے پانی نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑے۔ معترض پوچھ سکتا ہے کہ یہ کام تدریج کے ساتھ کیوں ہوئے؟ کیا اللہ یہ تمام کام ایک ساتھ انجام نہیں دے سکتا تھا؟ وہ احسن الخالقین ہے تو اس نے اپنی مخلوق انسانوں کی طرح درجہ بدرجہ کام کیوں کیے؟ یہی اعتراضات البقرۃ کی آیت ۲۹: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ پر بھی کیے جا سکتے ہیں کہ اللہ نے تمام کام ایک ساتھ کیوں نہ کیے؟ سورۃ اعراف کی: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ [۷: ۵۴] پر بھی اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ اللہ نے آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں کیوں تخلیق کیا، پانچ دن میں کیوں تخلیق نہیں کیا؟ چھ بڑے ادوار میں ہی کیوں کیا، چار ادوار میں کیوں نہ کر سکا؟ تخلیق کے بعد وہ اپنے تخت سلطنت پر کیوں جلوہ افروز ہوا؟ پہلے کیوں نہ ہوا؟ سورۃ مومنون میں آتا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِیْنَ [۲۳: ۱۷] اور تمھارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے سائنس داں سات راستوں کو نہیں مانتے لیکن وہ پوچھ سکتے ہیں کہ صرف سات کیوں آٹھ کیوں نہیں؟ بعض عقلی مفسروں نے ''دلیل دی کہ مراد سات سیاروں کی گردش کے راستے ہیں چونکہ اس زمانے کا انسان سبع سیارہ ہی سے واقف تھا اس لیے سات راستوں کا ذکر کیا گیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سیارے [Planates] صرف سات ہی ہوں گے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں مگر یہ سیارے بعد میں آٹھ ہو گئے بیسویں صدی میں ایک سیارے [Plauto] کے اضافے کے بعد یہ نو ہو گئے اور اب

۲۰۰۷ء میں دوبارہ سیارے کم ہو کر آٹھ رہ گئے ہیں۔ سو سال تک اسکول، کالج، یونیورسٹی میں یہی پڑھایا جاتا رہا کہ دنیا میں نو سیارے ہیں مگر جو لوگ اس ایمان پر مر گئے کہ سیارے نو ہیں وہ اپنے ایمان کا کیا کریں؟ معترض سورۃ حم السجدۃ کی آیت: وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ..... ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ..... فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ [۴۱: ۱۰ تا ۱۲] پر بھی اعتراض اٹھا سکتا ہے کہ اللہ نے یہ کام چار دن میں کیوں کیے تین دن میں کیوں نہ کیے؟ یہ کام کر کے وہ پانچویں دن آسمان کی طرف کیوں متوجہ ہوا؟ زمین کی طرف پہلے کیوں متوجہ ہو گیا آسمان اس وقت محض دھواں کیوں تھا؟ کیا زمین سے خاک اڑ رہی تھی؟ اس کو آسمان اور زمین سے یہ کہنے کی ضرورت کیوں ہوئی کہ وجود میں آ جاؤ وہ صرف اشارہ کرتا تو یہ وجود میں آ جاتے؟

وہ سورۃ طلاق کی آیت: اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا [۶۵: ۱۲] پر اعتراض وارد کر سکتا ہے کہ اللہ نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ اس کا کیا مطلب؟ آسمان تو سرے سے موجود ہی نہیں تو سات آسمان کا کیا سوال؟ مگر یہ سات زمین کیا ہیں؟ زمین تو ایک ہی ہے سات کیسے ہو گئیں؟ سورۃ نوح: اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا [۷۱: ۱۵] اور سورۃ ملک اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ [۶۷: ۳] پر بھی اعتراض کر سکتا ہے کہ اللہ نے تہہ بہ تہہ سات آسمان کیوں بنائے آٹھ کیوں نہ بنائے؟۔ اور آسمان تو وجود ہی نہیں رکھتا یہ تو محض نظر کا دھوکہ ہے اگر آسمان ہوتا تو انسان چاند پر کیسے پہنچ جاتا؟ اعتراض کرنے والے سورۃ ھود کی آیات: وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ [۱۱: ۷] پر بھی اعتراض کر سکتے ہیں کہ اللہ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں کیوں پیدا کیا آدھے دن میں کیوں نہ کیا؟ پہلے کہا تھا کہ دو دن میں پیدا کیا اب چھ دن میں کیوں؟ زمین و آسمان سے پہلے اس کا عرش پانی پر کیوں تھا مٹی پر کیوں نہ تھا؟ اور اگر عرش تھا تو اس کا فرش وہ کہاں تھا؟ وہ فرش آسمان پر لے جاتا تو ہم مانتے۔

نائیک صاحب اگر عقل کے گھوڑے کے ذریعے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کریں گے تو کبھی کسی نتیجے پر نہ پہنچیں گے سوال کا سلسلہ جاری رہے گا اور جواب سے اطمینان قلبی حاصل نہ ہو گا اسی لیے نقل کی اہمیت مسلم ہے عقل نقل کے تابع ہو، اس کے حصار میں اس کی مطیع اس کی آغوش رحمت میں ہوتی ہے تو وہ صرف عقل نہیں رہتی وہ تعقل قلبی کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے ایک نورانی اور روحانی وجود

بن جاتی ہے۔ عقلِ محض [pure reason] اسی قسم کے جاہلانہ سوالات اٹھاتی رہتی ہے اور وادیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

ولیم کیمپ بل سے مناظرہ: خطرناک نتائج:

جناب ذاکر نائیک نے ولیم کیمپ بل کے خلاف تیئیس [۲۳] دلائل پیش کیے ہیں اور ان کی بنیاد سائنس کی عہد حاضر کی تحقیقات کو بنایا ہے جو غیر قطعی و غیر حتمی ہیں، ان دلائل کی روشنی میں اگر انجیل رد بھی ہو جائے تب بھی عظمت قرآن کی نہیں سائنس کی ثابت ہوتی ہے۔ اور اس سائنسی، افادی، حسی، تجربی، اختیاری، عملی مگر غیر قطعی عظمت کو اصل عظمت سمجھنا ذاکر نائیک صاحب کی مجبوری بن جاتا ہے لہٰذا وہ قرآن کی تصدیق و تائید بھی سائنس سے پیش کرتے ہیں۔ ایسی تصدیق کی علمی حیثیت جاننے کے لیے علامہ طنطاوی کی تفسیر کا مطالعہ کافی ہے جو چھبیس جلدوں پر مشتمل ہے اور جس کے تمام سائنسی بیانات دس سال کے عرصے میں مسترد ہو چکے تھے۔ اگر قرآن سے سائنس کی وکالت کرنا جہالت ہے تو بلا شک وشبہ سائنس سے قرآن کی عظمت کو جانچنا اور اس کے بیانات کی توثیق کرنا بدعت اور ضلالت ہے۔ نائیک صاحب کے خیال میں قرآن اور بائبل کو جانچنے، پرکھنے، موازنہ اور مقابلہ کرنے کا منہاج اور پیمانہ کوئی اور نہیں صرف سائنس ہے گویا کسی علم کی صحت کو جانچنے کا واحد پیمانہ سائنس ہے جو ہر لمحہ تبدیل ہو رہا ہے۔ ایسے متغیر اور متنوع پیمانے پر قرآن کے حتمی، قطعی اور ناقابل تغیر متن کو جانچنا حد درجہ سادہ لوحی ہے۔

ڈاکٹر کیمپ بل کا اعتراض: نائیک صاحب نقل کی آغوش میں:

ڈاکٹر کیمپ بل نے سورۃ سباء کی آیت ۱۴ میں حضرت سلیمانؑ کا ایک عصا کے سہارے کھڑے رہنے اور اسی حالت میں فوت ہو جانے پر عقلی و سائنسی اعتراضات کیے مثلاً ''ڈاکٹر کیمپ بل نے کہا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص چھڑی کے سہارے کھڑا ہو وہ فوت ہوجائے اور کسی کو پتا ہی نہ چلا ہو''۔[1] ظاہر ہے ان اعتراضات کا عقلی، سائنسی اور منطقی جواب ذاکر نائیک صاحب کے پاس نہیں تھا۔ ذاکر نائیک کا کلام، علم، دلیل خطابت، لفاظی اور سائنسی منطق پر مبنی علم کلام ان کے کسی کام نہ آیا انھیں آخر کار ایمان، یقین، اور نقل، کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔ اس پناہ کے سوا کوئی پناہ گاہ معتبر نہیں لہٰذا انھوں نے فوراً عقلی و منطقی دلیل ترک کر کے نقلی دلیل کا سہارا لیا اور انجیل کے نقلی بیانات یعنی آیات کی بنیاد پر اپنے موقف کو موکد کیا وہ کہتے ہیں: ''سورۃ سباء کی آیت کریمہ کی وضاحت بھی متعدد طریقوں سے ممکن ہے، پہلی بات تو یہی ہے کہ سلیمانؑ اللہ کے پیغمبر تھے اور یہ ان کا ایک معجزہ ہو سکتا ہے، جب بائبل یہ کہتی ہے کہ عیسیٰؑ مردہ کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور یہ کہ وہ بغیر باپ

---

[1] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۹۷۔

کے پیدا ہوئے تھے تو یہ بات حضرت سلیمانؑ کے واقعے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ناقابل یقین ہوتی ہے [معاف کیجیے یہ بات صرف بائبل نہیں کہتی قرآن بھی یہی کہتا ہے] آپ خود بتائیے کسی مردے کا زندہ کردینا اور بغیر باپ کے پیدا ہونا زیادہ حیرت انگیز ہے یا کسی مردہ شخص کا چھڑی کے سہارے کھڑے ہونا ؟اللہ عیسیٰؑ کے ذریعے معجزات ظاہر فرماسکتا ہے تو حضرت سلیمانؑ کے ذریعے کیوں نہیں فرماسکتا، موسیٰؑ کے لیے سمندر میں راستہ بن سکتا ہے، ان کا عصا اژدھے میں تبدیل ہوسکتا ہے بائبل یہ بتاتی ہے قرآن بھی. سو اگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن ہے تو حضرت سلیمانؑ والا واقعہ کیوں ممکن نہیں؟[1] متعدد دیگر تاویلات بھی ممکن ہیں کیوں کہ قرآن یہ تو کہہ ہی نہیں رہا کہ حضرت سلیمانؑ بہت طویل عرصے تک چھڑی کے سہارے کھڑے رہے تھے.[2] کچھ دیر پہلے ذاکر نائیک صاحب نے کہا تھا کہ قرآن کی کوئی آیت جدید سائنسی تحقیق اور تجربات سے متصادم نہیں ہوسکتی۔ لیکن جیسے ہی حضرت سلیمانؑ کا واقعہ کیمپ بل نے پیش کیا نائیک صاحب کی عقلی سائنسی دلیلیں ایک لمحے میں عاجز، قاصر اور ناکام ہوگئیں وہ فوراً نقل کے حصار میں تشریف لے آئے۔ سوال یہ ہے کہ طویل عرصے تک حضرت سلیمانؑ وصال مبارک کے باوجود عصا کے سہارے کھڑے رہے، ایک انسان موت کے بعد صحیح وسالم حالت میں کیسے کھڑا رہ سکتا ہے؟ اس کا توازن کیوں نہیں تبدیل ہوا اس کا جسم انحطاط پذیر کیوں نہ ہوا؟ اجزائے جسمانی کی کیمیائی تحلیل تعلیل کیوں نہ ہوئی؟ [قطع نظر اس کے کہ محفوظیت اجساد نبیا احادیث، یعنی نقل، سے ثابت ہے] یہ تمام سوالات علت ومعلول [Cause and Effect] اور سائنس کی اقلیم ومنہاج میں پیدا ہوتے ہیں نائیک صاحب کا دعویٰ تھا کہ قرآن کی کوئی آیت کسی سائنسی حقیقت سے نہیں ٹکراتی مگر یہاں تو قرآن میڈیکل سائنس کے مسلمات اور سائنس کے مفروضات کے برعکس نظر آرہا ہے، خالص عقل [Pure Reason] پر جب بھی دلیل کی بنیاد رکھی جائے وہ عمارت منہدم ہوکر رہے گی، لیکن دلیل قلبی [Reason by Heart] کے ذریعے گفتگو کی جائے گی تو احمقانہ سوالات مخالف کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوسکتے۔ جدید سائنس سے بغیر باپ اور بغیر مرد کے جرثومے کے بچے کی پیدائش ممکن نہیں، ٹیسٹ ٹیوب بے بی بھی مخلوط نطفوں کے ذریعے وجود میں آتی ہے نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی مردہ زندہ ہوجائے، سات ہزار سال کی معلومہ تاریخ میں کوئی طب کوئی حکیم کوئی دوا مردے کو زندہ نہ کرسکی یہ سارے غیر سائنسی بیانات قرآن میں موجود ہیں لہٰذا، نعوذ باللہ، یہ تمام بیانات غلط ہیں؟ کیونکہ اصل کسوٹی، منہاج، میزان، فرقان، کلام اللہ نہیں سائنس دان کا کلام ہے جو ان آیات کو سائنس تسلیم نہیں کرتا۔

---

[1] ایضاً، صفحہ ۹۷۔ [2] ایضاً، صفحہ ۹۸۔

قرآن اور مصدقہ سائنسی حقائق:

ذاکر نائیک صاحب فرماتے ہیں: ''**قرآن کی کوئی آیت مصدقہ سائنسی حقائق کے خلاف نہیں ہو گی**'' [1] ''مصدقہ سائنسی حقائق'' نام کی کوئی شے سائنس کی دنیا میں وجود نہیں رکھتی۔ نائیک صاحب کو یقین نہ آئے تو اس صدی کے آئن اسٹائن Richard R. P. Feynman کی دو کتابیں *"The Character of Physical Law* اور *Six Easy Pieces* کا مطالعہ فرمالیں، یہ کتابیں نہایت سادہ، سہل، آسان، رواں دواں اور شگفتہ انگریزی میں لکھی گئی ہیں، فلسفیانہ زبان اور سائنسی اصطلاحات میں حتی المقدور گفتگو نہیں کی گئی ہے، لہٰذا ہر شخص جو سادہ انگریزی جانتا ہے ان کتابوں سے براہ راست استفادہ کر سکتا ہے۔ سائنس کے تمام نظریے، نتائج ظنی، قیاسی، تخمینی، عارضی، غیر قطعی اور غیر حقیقی ہوتے ہیں اور عموماً علت و معلول کے فلسفے سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ بہت سے سائنسی نظریات، تجربے اور علت و معلول کے بغیر صرف اندازے اور قیاس و گمان سے اخذ کیے گئے ہیں۔ تاریخ سائنس میں صرف وجدان نے بغیر ریاضی، تجربہ گاہ، تجربے اور مشاہدے کے بڑے بڑے سائنس دانوں کو علت و معلول کے بغیر حیران کن درست نتائج تک پہنچا دیا جن کی تصدیق بعد میں تجربات سے ہو گئی۔ فائن مین نے اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ مصدقہ سائنسی حقائق کیا ہوتے ہیں کیا یہ مطلق [Absolute] ہوتے ہیں یا اضافی [Relative] کیا یہ دائمی [Permanent] ہوتے ہیں یا ان کی تردید و تکذیب [Falsification] بھی ہو سکتی ہے؟ سائنس کبھی تردید، انکار، تکذیب، استرداد، ترمیم، تنسیخ اور تصحیح کے امکان کو رد نہیں کرتی، وہ علم سائنسی علم نہیں کہلا سکتا جس کی تردید نہ کی جا سکے اور جسے سوالیہ نشان نہ بنایا جا سکے، سائنس ایمان، یقین، ایقان، وحی، عقیدہ نہیں تجربہ ہے جو نتائج اور حالات بدلنے پر بدل سکتا ہے سائنس اس امکان کو ہر لحہ تسلیم کرتی ہے۔ اسی لیے اس کا ارتقاء جاری رہتا ہے، مذہب وحی کے بارے میں اس امکان کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ مذہبی احکام آیات وحی الٰہی کے ذریعے منتقل ہوئے، دنیا کی سب سے عظیم ہستی کے نازل کردہ حروف جو خود کامل ہے حد کمال پر پہنچے ہوئے ہیں ان میں کسی تبدیلی تغیر، ترمیم اور تنسیخ کی کوئی گنجائش نہیں خواہ بدلتی ہوئی، ہر لمحے سمت تبدیل کرتی تغیر سے دوچار سائنس کچھ بھی کہتی رہے، آیات قرآنی کو ان سائنسی مفروضات نتائج سے کوئی سروکار نہیں جو خود سائنس دانوں کی نظر میں حتمی، قطعی، یقینی اور آخری نہیں ہیں۔

ماں باپ کے جرثوموں اور نطفوں کے ملاپ کے بغیر پیدائش کا تصور جدید سائنس کے منہاج میں فی الحال کسی کے لیے قابل قبول نہیں، اس صورت حال میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کی پیدائش سے متعلق واقعات سائنس کی روشنی میں علت و معلول کے فلسفے کے تناظر میں باطل قرار پائیں

[1] ایضاً صفحہ ۹۸

گے۔ نائیک صاحب کے خلاف دلیل خود قرآن سے سائنس داں پیش کر سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا ہے: وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا [۷۲:۳] اور اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ کوئی اس کی شریک زندگی ہی نہیں ہے: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ [۶:۱۰۱] اسی لیے تو حضرت مریم نے فرشتے سے کہا تھا کہ: قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا [۱۹:۲۰] میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جب کہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔

"علم جنین کا سراغ صرف قرآن میں نہیں ملتا بلکہ ۴۶۰ ق۔م کے مفکر Hypocrites نے اپنی تحقیقات میں مراحل علم الجنین بتائے ہیں۔ ارسطو نے ساڑھے تین سو ق۔م میں اپنی کتاب میں ارتقائے جنین کا ذکر کیا ہے۔ ۱۲۳ عیسوی میں Sharaka اور Shushruta نے جنین کے بارے میں بتلایا، گالن ۱۳۱ عیسوی میں پیدا ہوا وہ بھی مخلوط نطفے سے پیدائش کا ذکر کرتا ہے اور جنین کے ارتقائی مراحل سے آگاہ کرتا ہے"۔ ان دلائل کی روشنی میں کیمپ بل نے ثابت کرنا چاہا کہ قرآن کا علم اس عہد کی سائنسی سطح سے اخذ کیا گیا تھا جو قدیم مفکرین کے علمی و سائنسی شہ پاروں میں پہلے سے موجود تھا اس کے جواب میں ذاکر نائیک صاحب قرآن کی آیات کے سیاق و سباق پر غور فرماتے اور ان اعتراضات کا سائنسی جواب دینے کے بجائے نقل کے منہاج میں کھڑے ہو جاتے تو یہ ایک معقول جواب ہوتا، وہ بتا سکتے تھے کہ قرآن کو گالن اور ارسطو کے بیان کردہ حقائق کی تردید و تصدیق کے لیے نازل نہیں کیا گیا تخلیق انسانی کی قرآنی آیات کا مقصد اپنے عہد یا اس جدید عہد کے سائنسی انکشافات کی توثیق نہیں ہے، یہ آیات اللہ کی نشانیوں کے طور پر پیش کی گئی ہیں جو ہر شخص کا روزمرہ کا ذاتی، اجتماعی، آفاقی اور معروضی تجربہ ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے کہ ہم نے جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اسے خود یہ جانتے ہیں: ۷۰:۳۹، ۸۶:۵، ۴:۱۲، ۲۲۸:۲، ۴:۱، ۱۸:۳۷، ۲۳:۱۳، ۲۳:۱۲، ۵۳:۴۶، ۷۵:۳۷، ۷۶:۲، ۸۰:۱۸، ۸۶:۶۵، ۷:۱۲، ۷۱:۶، ۲۰:۷۷، ۱:۲، ۳:۲۱ ان آیات میں انسان کو اس کے ذاتی تجربے، بیان اور واقعہ کے ذریعے متوجہ کیا گیا ہے کہ خود تمھارا وجود ایک قطرۂ منی سے ظہور پذیر ہوا ہے، یہ تمھاری حقیقت ہے اور تم جب بڑے ہوئے تو نہایت جھگڑالو بن گئے اور طوفان اٹھانے لگے یہ بھول گئے کہ تم محض ایک قطرہ تھے، ہماری مرضی نہ ہوتی تو تم رحم مادر سے باہر نہ آتے، باہر آتے تو زندہ نہ رہتے، زندہ رہتے تو معذور ہو سکتے تھے، اب ان آیات سے علم ایمبریالوجی نکالنا قرآن کے منشاء و مطالب و مقصد سے سراسر انحراف ہے، تخلیق سے متعلق تمام آیات کا سیاق و سباق حیات و موت اور حیات آخرت کے تین مباحث کے اردگرد گردش کرتا ہے۔ جب لوگ سوال اٹھاتے ہیں کہ مرنے کے بعد کیسے زندہ ہوں گے تو انھیں ان کی تخلیق کا وقت یاد دلایا جاتا ہے انھیں بتایا جاتا ہے کہ آدم عورت کے بغیر کیسے پیدا ہوئے؟ انھیں بتایا جاتا ہے کہ موت سے زندہ کرنا اس خالق کے لیے ایسا ہی ہے جیسے مٹی سے آدم بنانا، حضرت مریمؑ کے رحم سے نطفے کے بغیر

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور رحم مادر میں ایک قطرہ سے وجود انسانی کو خلق کرنا اور مردہ زمین پر پانی کے قطرے گرا کر اسے زندہ کرنا اور اس زمین کا اچانک لہلہا اٹھنا، اب ان آیات سے سائنس اور ایمبر یالوجی کی گتھیاں سلجھانا محض افسانہ سازی ہے، لیکن نائیک صاحب اس دلیل کے بجائے کیمپ بل کے جواب میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ 'قرآن کا علم عہد جدید کی سائنسی سطح کے مطابق ہے''۔ کیا وحی الٰہی کے علم کو اپنے عہد کی سائنسی سطح کے مطابق ہونا چاہیے؟ کیا ہر عہد کی سائنسی سطح ایک ہوتی ہے؟ اور وہ مستقل، دائمی، ابدی، قطعی و یکساں رہتی ہے یا قرآن کے مطابق ہوتی ہے؟ کیا ہر عہد کی سائنس کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیے؟ یا سائنس کو قرآن کے مطابق رہنا چاہیے؟ پیمانہ کون ہے سائنس یا قرآن یا تحریف معنوی؟ کیا ایسا ہونا کسی مذہبی دلیل سے ثابت ہے؟ کیا قرآن ایسا کوئی دعویٰ کرتا ہے کیا رسالت مآبؐ سے ایسا کوئی موقف ثابت ہے؟ کیا صحابہ کے فہم اور اجماع سے ایسی کوئی دلیل نکلتی ہے؟ ذاکر نائیک صاحب جب یہ کہتے ہیں تو دراصل امت کے تعامل کی نفی کرتے ہیں پھر وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کا علم سائنس کے مطابق ہوتا ہے یعنی ہر دور میں قرآن اسی عہد کی سائنسی سطح کے مطابق ہوگا جو ہر لمحے قابل تغیر ہے اور مسلسل ارتقاء کے سفر میں ہے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر عہد کی سائنسی سطح اگلے لمحے میں اور کبھی اگلے عہد میں بدل جاتی ہے، ارتقاء ہو جاتا ہے۔ ہر اگلا سائنسی زمانہ پچھلے سائنسی زمانے سے زیادہ بہتر ہوتا ہے یہ تغیر اور تبدیلی کا عمل ہی سائنس کے ارتقاء کا اصل سبب ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن بھی جدید سائنسی زمانے کے مطابق بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً معتزلہ کے عہد میں عیسوی مذہب فلسفہ اور سائنس کا اجماع تھا کہ زمین ساکن ہے معتزلہ نے اسی عقیدے کو قرآن کی آیات سے ثابت کر کے ذاکر نائیک صاحب کے اس اصول کی تائید کر دی کہ قرآن کا علم اپنے عہد کی سائنسی سطح کے مطابق ہوتا ہے، انیسوی صدی میں سائنس نے ثابت کر دیا کہ زمین متحرک ہے تو عہد جدید کے مصلحین [reformers] نے قرآن کی آیات کو کھینچ تان کر دوبارہ ثابت کر دیا کہ قرآن سے زمین کے متحرک ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ یقیناً ذاکر نائیک صاحب اگر پندرہ سو سال پہلے پیدا ہوتے تو معتزلہ کے فلسفے کے مطابق ثابت کر دیتے کہ قرآن سے زمین کے ساکن ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور اسے ٹھوس حقیقت قرار دیتے کہ دو ہزار سال سے فلسفۂ سائنس اور مذہب کا زمین کے ساکن ہونے پر اجماع تھا۔ سائنس اتنی غیر معتبر لایعنی اور نا قابل اعتبار علم ہے کہ دو ہزار سال کے بعد بھی ٹھوس نہیں رہتا۔ وہ دلیل دیتے ہوئے یہ بھول گئے کہ گزشتہ پندرہ سو برس میں اگر سائنسی سطح قرآن سے کمتر تھی تو اس عہد کے انسان جنین سے متعلق قرآنی آیات پر ایمان لانے کے مکلف تھے یا نہیں تھے، اگر تھے تو ان کے اس اندھے، غیر علمی اور غیر عقلی ایمان کی کیا حیثیت تھی، پھر یہ بھی کہ اس عہد کی سائنس کو کس بنیاد پر غلط قرار دیا جا سکتا تھا اس کی ایک ہی بنیاد تھی کہ تمھارا سائنسی علم نا قابل یقین ہے ہم تو صرف یقینی علم یعنی العلم اور وحی الٰہی بذریعہ ذات محبوب الٰہی رسالت مآبؐ کے عطا کردہ علم کو حتمی علم مانتے ہیں لہٰذا نقل کی پناہ گاہ ہی پندرہ سو برس تک اہل ایمان کے ایمان کی حفاظت کرتی رہی۔

عالم اسلام: مجموعی صورت حال: ادب سے مذہب تک:

اگر قرآن کی علمی سطح عہد حاضر کی سائنسی سطح کے برابر ہے تو یہ بھی بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ پندرہ صدیوں میں سائنس کے ذریعے جس نے بھی قرآن کی تفسیر کی کوشش کی وہ غلط تھی، ان سب کو سترہویں صدی تک کا انتظار کرنا چاہیے تھا تاکہ سائنس کی سطح بلند ہوسکتی پھر عالم اسلام کے تمام علماء کو یورپ جا کر تمام سائنسی علوم پر قدرت حاصل کرنا چاہیے تھی تاکہ وہ قرآن کی آیت ھم عنقریب انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے کی درست تفسیر پر قادر ہو سکتے جو شے نائیک صاحب کی دلیل کے مطابق خود ارتقاء پذیر ہے وہ وحی کے لیے کسوٹی اور منہاج کیسے ہوسکتی ہے۔ علامہ جوہری طنطاوی نے عقل کی پناہ گاہ کے ذریعے قرآنی آیات کی تفاسیر کی کوشش کی تو ان کی تفسیر خود سائنس کے ارتقاء کے باعث رد ہوگئی وہ اس ارتقاء کے نتائج دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہے اور یہی ابتلا ذاکر نائیک صاحب کے ساتھ درپیش ہے، لیکن انسان تجربات سے سبق سیکھنے کے بجائے اپنی عقل اور زور خطابت سے نفس کو نص صریح کے مساوی سمجھتا ہے۔ نائیک صاحب کو یاد نہ رہا کہ اس مباحثے میں فرقان، معیار حق و باطل، خیر وشر کی پہچان منہاج علم اور اصل کسوٹی تو سائنس کو قرار دیا گیا لہٰذا سائنس کو غیر محسوس طریقے پر برتر علم [Superior Knowledge] تسلیم کر لیا گیا۔ کیمپ بل کے جواب میں ڈاکٹر نائیک کہتے ہیں کہ "اگر کسی نے کوئی ایسی بات کی ھے جس سے قرآن کو اتفاق ھے تو اس سے یہ مراد لینا ھر گز درست نہ ھوگا کہ وہ بات قرآن نے اس شخص سے اخذ کی ھوگی"[1] ہی بات درست ہے کہ اگر ایک ہی بات کوئی دوسرا آدمی بیان کردے تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس بات کا سرقہ کیا گیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں مختلف زبانوں کے شاعروں کے اشعار میں حیرت انگیز مشابہت ومماثلت پائی جاتی ہے، حالانکہ ان شعرا نے کبھی ایک دوسرے سے استفادہ کیا نہ وہ ایک دوسرے کی زبانیں جانتے تھے پھر ان میں ترتیب زمانی کا بہت فرق تھا لہٰذا اس میں قرآن کا کیا کمال ہوا یہ تو ایک عام مشاہدہ ہے۔ یہ توارد ہے یا سرقہ یا انتحال۔ سرقے پر جرجانی، شمس رازی، آنندوردھن، راج شیکھر نے عجیب مباحثے پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی ان مباحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جرجانی کی نظر میں سرقہ کوئی اہم بات نہیں، قوت متخیّلہ کی ناکامی البتہ اہم بات ہے۔ شمس قیس رازی نے سرقہ واستفادہ کو انتحال، المام، سلخ اور نقل کی چار قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ "نقل" سے ان کی مراد چربہ یا [Copy] نہیں، بلکہ مضمون کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہے۔ انھوں نے جو مثالیں دی ہیں۔ اور ان پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نقل کو قابل ستائش سمجھتے ہیں۔ بعد میں ہمارے یہاں شمس قیس رازی کی انواع کو اور بھی تاریک اور لطیف طریقے سے سرقہ، توارد، ترجمہ، اقتباس، اور رواب کے زیر عنوان جگہ جگہ بیان کیا گیا۔

[1] ایضاً صفحہ ۱۰۱۔

سنسکرت شعریات میں جرجانی سے بھی پہلے آنندوردھن نے اور پھر راج شیکھر نے ان معاملات پر بہت عمدہ بحث کی ہے، مکندلاتھ کا کہنا ہے کہ ان دونوں مفکروں کی نظر میں ''نیا اس وقت وجود میں آتا ہے جب قوت متخیلہ کے ذریعے پرانے کی تعمیر نو کی جائے''۔ قدیم سنسکرت شعریات میں ایک مکتب کا خیال تھا کہ شعر میں نئی بات کہنا ہی ممکن نہیں، کیوں کہ شاعری کا اظہار کرتی ہے۔ مکندلاتھ نے اس کا ترجمہ universal experience کیا ہے۔ چونکہ یہ آفاقی حقائق تعداد میں محدود اور تمام انسانوں میں بہرزمان و بہروقت مشترک ہیں، اس لیے پرانے لوگوں نے انھیں پہلے ہی بیان کر دیا ہے۔ لہٰذا اب نئے کہنے والوں کے لیے بچا ہی کیا ہے؟ [اس کا جواب آنندوردھن نے یہ دیا کہ جب نیا لفظ ہوگا تو نیا مضمون اور نئے معنی بھی ہوں گے۔] کیا عجب کہ طالب آملی کا مشہور قول 'لفظے کہ تازہ است بہ مضموں برابر است'' پنڈت راج جگن ناتھ کے واسطے سے آنندوردھن کے یہاں سے حاصل ہوا ہو؟] لہٰذا پرانی بات کو نئے الفاظ میں بیان کرنے سے بات بھی نئی ہو جاتی ہے۔

ان نکات پر گفتگو کرتے وقت خود مکند لاتھ نے ''اردو فارسی ادب کی مشہور اصطلاح ''مضمون'' کا ذکر کیا ہے اور انھوں نے ''مضمون'' کا ترجمہ [Theme] یا [Substance] کیا ہے، جو بالکل درست ہے، لطف یہ ہے کہ حالی کو عربی فارسی شعریات کے حوالے سے ان باتوں کا شعور تھا۔ چنانچہ وہ ابن خلدون کا قول نقل کرتے ہیں کہ ''معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں اور اصل الفاظ ہیں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ان معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا گیا ہے''۔ [ابن خلدون کا یہ قول براہ راست جرجانی سے مستعار ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ جرجانی اور آنندوردھن نے ایک ہی مکتب میں تعلیم پائی ہے۔]

برٹرنڈرسل [Bertrand Russell] نے جب چین جا کر وہاں کی تہذیب اور روایات کا براہ راست مطالعہ کیا تو اس کو یہ جان کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ مولک پن [Originality] کا تصور صرف وہی ایک ہی نہیں ہے جو مغرب میں رائج ہے، بلکہ مولک پن [Originality] کے معنی یہ ہیں کہ پرانی بات کو نئے انداز میں دہرایا جائے۔ رسل کو محسوس ہوا کہ چینی تصور انشاء بھی اپنی جگہ پر درستگی کا حامل ہے اور ممکن ہے کہ یہ مغربی تصور سے بہتر بھی ہو۔ لیکن آزاد، حالی اور امداد امام اثر اور ان کے متبعین کو مشرقی تصور انشاء میں عیب ہی عیب نظر آتے تھے۔ سچ ہے، شکست خوردہ تہذیب سب سے پہلے فاتح تہذیب پر عاشق ہوتی ہے، اس اصول کو ہیری لیون [Harry Levin] نے ''اقلیتی طبقے کی اپنے آپ سے نفرت'' [Self-Hatred] سے تعبیر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ ابھی تک اس خودنفرینی [Self-hatred] سے آزاد نہیں ہوئے ہیں اور آج بھی ہم اپنے بیش تر ادبی سرمائے پر شرمندہ ہیں، یا اسے لائق اعتنا نہیں سمجھتے''۔[1]

---

[1] شمس الرحمن فاروقی، اردو دنیا قومی کونسل برائے فروغ اردو، اکتوبر ۲۰۰۹ء، ہندوستان۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے اس اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ مغرب کی پیروی، تقلید اور مرعوبیت کے باعث جس طرح ادبیات وشعریات اردو میں ہند کے مسلمان اسلامی تہذیب کے وارث ہونے کے باوجود فاتح تہذیب پر عاشق ہو گئے اور اپنی تاریخ، تہذیب، علمیت اپنے اداروں اور اپنے اعمال سے نفرت کرنے لگے۔ بالکل یہی صورت حال جدید سائنسی علوم کے بارے میں عالم اسلام میں بحیثیت مجموعی پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کو اسلامی تہذیب ایک غیر آراستہ دلہن لگنے لگی جو سائنس کے کمالات دکھانے سے عاجز وقاصر رہی لہٰذا عالم اسلام سائنس پر فریفتہ ہو گیا اور اس میدان میں متقدمین ومتاخرین کی عدم دلچسپی اور عدم پیش رفت کے باعث مسلمان اپنی تہذیب وتاریخ پر غور کرتے کرتے فاتح تہذیب کی سائنس وتاریخ پر عاشق ہو گئے۔ اس عشق کی دو صورتیں عالم اسلام میں پیدا ہوئیں کہ کس طرح اسلام اور سائنس یا سائنس واسلام کو تلفیق یا تطبیق کے اصول کے تحت ملا کر اسلامی سائنس پیدا کی جائے جو مغرب سے اعلیٰ ہو اور مغرب کو عبرتناک شکست دے کر مسلم قوم پرستی کے احیاء کا سبب بنے، لیکن یہ کوشش بالکل اسی طرح کی تھی جس طرح کہ گھوڑے اور گدھی کے ملاپ سے خچر پیدا کر لیا گیا جو نہ گھوڑا ہوتا ہے نہ ہی گدھا، خچر مردانہ خصوصیات سے عاری ہوتا ہے لہٰذا نسل میں اضافے کا ذریعہ نہیں بن سکتا، یہ نہ گھوڑا ہوتا ہے نہ ہی گدھا۔ مگر گدھے سے جسمانی طور پر کچھ بہتر ہوتا ہے مگر افزائش نسل کے لیے بے کار اور گھوڑے سے نہایت کمتر یعنی گھوڑے سے بہتر ہونا تو درکنار اس کے برابر بھی نہیں ہوتا۔ جدید سائنس اور مذہب کی تطبیق وتلفیق سے خچر جیسی کوئی چیز شاید پیدا ہو جائے مگر وہ نہ سائنس ہوگی نہ مذہب بلکہ صرف خچر۔ افسوس کہ جدیدیت پسند بے سمت کوششوں کے باوجود ایسی مخلوق پیدا کرنے سے بھی قاصر رہے۔

علم جنین کے ارتقائی مراحل کا سائنسی ذکر: قرآن کا مقصود نہیں:

اصل سوال یہ ہے کہ کیا قرآن دنیا میں موجود علوم عقلی سے [جو تجربات کے نتیجے میں مسلسل ارتقاء پذیر رہتے ہیں] اتفاق ظاہر کرنے، اس کی تائید، توثیق اور تصدیق کرنے اس کی خبر دینے اس کو موثق اور موکد کرنے نازل ہوا ہے، ذاکر نائیک کہتے ہیں کہ: قرآن گالن اور ہپو کریٹس وغیرہ کی ہر بات سے اتفاق نہیں کرتا ارتقاء کے جنین کے حوالے سے قرآن اور گالن کے نظریات میں مکمل یکسانیت نہیں پائی جاتی[1] یہ کہنا کہ قرآن گالن، ارسطو اور ہندو فلسفیوں کے نظریات سے اتفاق کرنے نازل ہوا۔ ذاکر نائیک کی نہایت کمزور اور غیر علمی دلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ علم جنین کے ارتقائی مراحل بیان کرنا کوئی ایسا عظیم کام نہیں تھا جو پیغام ربانی کے بغیر ممکن نہ ہو، اس علم کو کسی بھی زمانے کا کافر یا مسلمان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور طبعی ذرائع علم یعنی عقل وجدان کے ذریعے حاصل کر سکتا تھا۔ تجربات اور حادثات کے ذریعے بھی یہ علم ہو سکتا ہے

---

[1] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۱۰۱۔

اختیاریت، تجربیت اور مشاہدات مسلسل کے ذریعے بھی اس حقیقت کا حصول ممکن ہے۔ قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے، نہ علم گائنا کولوجی یا ایمبر یالوجی کی نصابی کتاب جس میں مراحل پیدائش کا تفصیلی بیان ہو۔ نطفے کے قرار مکین میں قیام سے لے کر اس کے ظہور کامل تک کے تمام مراحل، ہر عہد کے انسانوں کے علم میں مختلف سطحوں پر تھے۔ قرآن میں ان مراحل علم جنین کا بیان، بیان واقعہ [Statement of Event] ہے، بیان حقیقت [Statement of Reality] نہیں جس کے لیے قرآن نازل کیا جاتا۔ یہ کام قرآن کے نزول سے بہت پہلے مختلف مفکرین، فلسفی اور سائنس دان اپنی اپنی سطح پر کر رہے تھے یعنی جنین سے متعلق معلومات اس عہد کے اہل علم کے لیے نظام شمسی اور نظام کائنات کے سائنسی امور کی طرح معلوم اور معروف امور اور علوم تھے اور اس عہد کے عقلی ماہرین کے لیے رحم مادر میں پرورش انسانی کے معاملات اجنبی نہیں تھے، لہٰذا قرآن نے بیان واقعہ کے طور پر بتا دیا کہ یہ مراحل، یہ کائنات، یہ سورج سیارے کس کی صناعی کا شاہکار ہیں، اس خالق کائنات پر ایمان لانے کے بجائے ارتقائی مراحل کی سائنسی بحث میں الجھا دین کے مقصد اور نزول قرآن کے ہدف کو پس پشت ڈالنے کے مترادف ہے مثلاً قرآن نے بیان کیا کہ تمام مخلوقات پانی سے بنی ہیں یونانی فلسفی تھیلس [Thales] پانی کو حقیقت قرار دیتا تھا۔ وہ تمام مخلوقات کو پانی سے خلق ہوتا ہوا ثابت کرتا ہے۔ اس فلسفی کے انتقال کے کئی ہزار برس بعد قرآن نے بھی پانی کی حقیقت بتادی کہ یہی تخلیق کا وسیلہ ہے تو اس آیت کا مقصد کوئی سائنسی راز منکشف کرنا نہیں نہ ہی یونانی فلسفی تھیلس کے نظریات کی ربانی، آسمانی، نبوی اور الٰہی تائید فراہم کرنا ہے، انسان کی تخلیق پانی کے نطفے سے ہوتی ہے یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے جو توالد و تناسل کے عمل سے آگاہ ہے، ایک ان پڑھ دیہاتی بدو بھی اس حقیقت کو جانتا ہے بلکہ اس حقیقت سے جو نزول قرآن سے پہلے لوگوں کے علم میں ہے اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے کہ کائنات کا رب پانی جیسی حقیر شے جسے تم شب و روز حقارت سے پھینکتے ہو اس عظیم انسان کی نمود اور ظہور پر قادر ہے جو کائنات میں تہلکے برپا کرتا ہے۔ اگر تھیلس کے بیان کی تصدیق قرآن نے کی تو یہ کیا خاص بات ہوئی کیا قرآن تھیلس جیسے فلسفیوں اور سائنس دانوں کے بیانات کی تردید و تکذیب یا اصلاح کے لیے نازل ہوا ہے؟ اگر قرآن سے پہلے مختلف تہذیبوں اور زمانوں کے مفکرین اس کائنات، نظام شمسی، مراحل جنین اور تخلیق انسانی کے معجزے کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اپنے علمی، عقلی، سائنسی منطقی نتائج بیان کر رہے تھے اور یہ کام قرآن کی آمد سے ہزاروں سال پہلے قرآن کے بغیر رسالت مآب ﷺ کی لائی ہوئی آیات کے بغیر بھی خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا تو یہ کہنا کہ قرآن نے سائنسی مزاج دیا اور قرآن کی وجہ سے جدید سائنسی ارتقاء ممکن ہوا اور قرآن نے سائنس کی روح پیدا کی ایک احمقانہ استدلال ثابت ہو گیا۔ اگر ذاکر نائیک صاحب یہ کہیں کہ قرآن ارسطو، گالن اور دیگر حکماء کے بیانات و تحقیقات جنین کے مراحل ارتقا کی تصحیح اور درستگی کے لیے نازل ہوا تو یہ ایک کاذب بیانیہ ہو گا کیونکہ نزول قرآن کا مقصد سائنس دانوں کے تجربات مشاہدات نتائج کی تردید و تصحیح نہیں ہے۔ جو مفتی عبدہ سے لے کر ذاکر نائیک تک بغیر کسی دلیل کے دہرا رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ

قرآن سے پہلے آنے والے فلسفیوں، مفکرین اور سائنس دانوں نے مراحل جنین سے متعلق جو نتائج بیان کیے ان میں ماہ وسال کے طویل بُعد اور فاصلے کے باعث تحریف اور تلفیق کا امکان ہے۔ اگر قرآن بھی ان ہی پہلوؤں پر غور وفکر کی دعوت دے رہا ہے اور انہی پامال موضوعات پر تحقیق وارتقاء کے دروازے کھولنے کے لیے آیا ہے تو الٰہی اور انسانی یعنی دونوں طریقوں میں کیا فرق ہے؟ بات صرف یہ ہے کہ قرآن معلومہ حقائق سے ذات خداوندی کے اثبات کی طرف بلا رہا ہے مثلاً قرآن میں شیشے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب فن شیشہ سازی اور اس کی مصنوعات سے واقف تھے۔

مولانا ابو الجلال ندویؒ کے مطابق کسی لفظ کی قدامت کا پتا لگانے کا قاعدہ یہ ہے کہ دیکھا جائے وہ لفظ کس دور کے ادب میں ہمیں ملتا ہے۔ اگر ایک لفظ قرآن میں آیا ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کم از کم ہزار سال پرانا ہے اس لیے عرب جاہلیت کے قدیم تمدن کا پتا لگانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ قرآن میں جو تمدنی الفاظ یا تمدنی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں ان سے دور جاہلیت کے معاشرے کا پتا لگایا جائے کیوں کہ عربوں کے لیے قرآنی الفاظ جانے بوجھے تھے وہ ان کے معانی کو اچھی طرح جانتے تھے، قرآن میں جنت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کے لیے جو اعلیٰ تہذیبی اور تمدنی الفاظ لائے گئے ہیں ان سے یقیناً عرب آشنا تھے، سورہ غاشیہ [۱۳۔۱۶] میں خلد بریں کا تذکرہ کیا گیا ہے:

''جنت میں اونچے اونچے تخت بچھے ہوئے ہوں گے۔ آب خورے رکھے ہوئے ہوں گے۔ غالیچے نہایت قاعدے سے لگے ہوئے ہوں گے۔ مخمل کے نہالچے بچھے ہوئے ہوں گے۔

ان الفاظ سے کیا یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ عرب کسی زمانہ میں اسی طرح رہتے سہتے تھے اور یونہی کھاتے پیتے تھے؟ اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ الفاظ کبھی وجود میں نہ آتے قرآن میں قواریر استعمال ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب چاندی کی شیشیاں بناتے تھے اور اگر بناتے نہیں تھے تو استعمال ضرور کرتے تھے۔ اسی طرح سے پتا چلتا ہے کہ عربوں کے قدیم معاشرے میں منقش چراغ رائج تھے۔ چراغ تو عام چیز ہے لیکن چراغ کے علاوہ اور چیزیں بھی مذکور ہیں [۱] دیوٹ [۲] فانوس۔ یہ چیزیں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ عرب شیشہ سازی کا فن جانتے تھے اور اتنا اچھا جانتے تھے کہ شیشہ صیقل ہو کے موتی کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ اگر اسلام سے پہلے عرب تمدن کے اس اعلیٰ مقام پر نہ ہوتے تو قرآن عاد وثمود کی بابت یہ کیوں کہتا ''لم یخلق مثلها فی البلاد'' [ویسی متمدن قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی]

ان الفاظ کے علاوہ عربی زبان تہذیب وتمدن کے اور اعلیٰ لفظوں سے بھری پڑی ہے، چوں کہ عرب بدویانہ زندگی گزارتے تھے اور صحراؤں میں اور چراگاہوں میں وہ اپنے اونٹ اور بھیڑ بکری لیے پھرا کرتے تھے اس لیے انھیں نباتات کے متعلق پورا پورا علم تھا۔ بے برگ وگیاہ صحرا میں جو پودا بھی انھیں نظر آتا اس کے بارے میں تحقیق کرتے، عربستان جیسی بنجر زمین میں پودا تو کیا پودے کا ہر جز وانسانی اور حیوانی زندگی کو عزیز ہوتا ہے۔ نباتات کے بارے میں ان کی زبان اس درجہ مالدار رہی ہے کہ بعد کے علمی

دور میں وہ فلسفہ اور طب وغیرہ میں غیر ملکی اصطلاحات اور الفاظ لانے پر مجبور نہیں ہوئے۔ اُن کے خزانہ لغت میں نباتات کے بارے میں خود اتنے الفاظ تھے کہ دوسری زبان سے انھیں کچھ مانگنا نہیں پڑا۔ نباتات کے دقیق سے دقیق مسائل کے بارے میں پرانے عربوں کے علم ومعرفت کا اندازہ ہمیں اب بھی کتابوں سے ہوتا ہے''۔

قرآن میں شیشے کا ذکر ہے تو اس لیے نہیں ہے کہ اس سے شیشے کی صنعت ثابت کی جائے بلکہ اہل عرب شیشے کی مصنوعات سے واقف تھے اس لیے اسے بطور واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اگر عرب شیشے کے ظروف اس کی صفت اس کے کاری گروں کی صناعی سے واقف نہ ہوتے تو قرآن ان اشیاء کو بطور مثال پیش نہ کرتا۔ مثال دینے کے لیے ضروری ہے کہ سامع یا ناظر اسے پہلے سے جانتا ہو اور وہ اس کے لیے اجنبی نہ ہو۔ قرآن میں بیان کردہ اس طرح کی امثال، آیات اور اشاروں سے مختلف قسم کے سائنسی علوم کا جواز ثابت کرنا اہل مغرب کو اہل اسلام پر تمسخر کے مواقع مہیا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

ہر جاندار کی اصل پانی ہے: کیا اس حقیقت کا موجد قرآن ہے؟

ذاکر نائیک کہتے ہیں کہ: ''ھر زندہ چیز پانی سے بنی ھے اور قرآن یہ حقیقت ۱۴۰۰ سو برس پھلے بیان کرچکا ھے''۔[1]

قرآن سے تین ہزار سال پہلے یونانی فلسفی تھیلس Thales یہ حقیقت بیان کر چکا ہے کہ حقیقت [Reality] پانی ہے وہ تمام مخلوقات کو پانی سے خلق ہوتا ہوا محسوس کرتا تھا، اس کے وجدان، نفس اور عقل نے اس پر یہ حقیقت قرآن کے نزول سے کئی ہزار سال پہلے منکشف کردی تھی۔ کیا قرآن یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ تخلیق پانی سے ہوتی ہے؟ مالک الملک کو یہ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ کون سی چیز کس چیز سے بنتی ہے؟ کیا قرآن سائنس کی کتاب ہے؟ یا اشیاء کی تیاری کے اجزاء بنانے کا نسخہ ہے؟ یہ کوئی کیٹلاگ ہے؟ Blue Book ہے؟ فارماکوپیا Pharmacopia ہے؟ Data Bank ہے؟ نعوذ باللہ، کوئی Junkyard ہے؟ Workshop ہے؟ جس میں ہر بے کار مسئلے سے متعلق معلومات اور اشیاء کا علم اور انبار جمع کر دیا گیا ہے؟ اصلاً تو خالق مالک اور مصور تو ذات الٰہی ہے قرآن میں پانی سے تخلیق کے ذکر کا مقصد اس کے سوا کیا ہے کہ مخلوق کو یہ بتا دیا جائے کہ اللہ رب العزت تخلیق کے لیے جو وسیلہ چاہے؟ اپنے فرشتوں کو اسے اختیار کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟ پانی جیسی حقیر شے جسے دنیا کا ہر انسان حقارت سے استعمال کرتا روندتا اور پھینک دیتا ہے سرچشمۂ تخلیق بنا دیا جاتا ہے، پانی خود تخلیق ربانی ہے اور ایک ایسا وسیلہ جس کے ذریعہ اللہ نے مخلوقات کی تخلیق فرمائی اب آیت کے اصل مقصد پر توجہ دینے کے بجائے جدید مسلم مفکرین وسیلے کی تحقیق میں لگ گئے اور وسیلہ ہی اصل مقصد، ہدف اور منزل قرار پایا۔

سترہویں صدی میں مغرب کے ساتھ یہی المیہ پیش آیا کہ اس نے سائنس کو حقیقت کی تلاش

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۲۲۔

کے وسیلہ کے طور پر اختیار کیا اور آخر کار تلاش حقیقت سے دستبردار ہو کر مغرب نے اس وسیلے یعنی سائنس کو ہی اصل حقیقت، حقیقت الحقائق، حقیقت اولیٰ، حقیقت مطلق خیر کل اور الحق قرار دے دیا، عہد حاضر کا مذہب اور علم سائنس ہے، سائنس کے سوا کسی علم کو علم تسلیم نہیں کیا جاتا لہٰذا جب ہم قرآن کو سائنس سے ثابت کرتے ہیں تو اصلاً ہم اپنے احساس کم تری کو چھپانے کے لیے اپنے علم، الکتاب اور الحق کو الحق سمجھنے کے بجائے عہد حاضر کے علم اور مذہب سائنس کی پناہ لے لیتے ہیں ور اس کے حصار میں آ کر اپنے دین کو سائنس سے کمک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا اللہ کا دین اور اس کا کلام سائنس کے سہارے کے بغیر اس جدید دنیا میں چل سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ہے اصل سوال اور اس کا جواب بہت آسان ہے۔

سورۃ الانبیاء میں: اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ [۲۱:۳۰] جہاں پانی سے جاندار مخلوقات کی تخلیق کا ذکر ہے اس آیت کا مدعا سائنسی تحقیق نہیں نہ جدید یا قدیم سائنسی تحقیقات کی قرآن سے تردید و تصدیق مقصود ہے، نہ ان جدید و قدیم تحقیقات کی روشنی میں قرآنی آیات کی عظمت کو ثابت کرنا مطلوب ہے، یہ طرز تفسیر سلف سے لے کر خلف تک اسلامی تاریخ و تہذیب کے لیے اجنبی طرز ہے۔ اگر قدیم و جدید سائنسی تحقیقات اور آیات قرآنی میں اتفاقاً کوئی اشارہ مل بھی گیا ہے تو یہ منشاء کلام ربانی نہیں یہ منشائے جدید متکلمین و مفسرین ہے جو تفسیر ماثور پر شرمندہ ہوتے ہیں اور ''تفسیر علمی'' [سائنسی تفسیر] پر فخر کرتے ہیں، اگر علماء کرام قدیم و جدید تفاسیر کا مطالعہ کریں جو تفسیر ماثور سے ماخوذ ہیں اور اس کا تقابل سرسید، عبدہ، طنطاوی اور نائیک کی تفاسیر سے کریں تو ان سائنسی تفاسیر کی بے وقعتی اور بے توقیری نمایاں ہو جائے گی۔

سائنسی مفروضے کو قرآنی حقیقت میں تبدیل کرنے پر اصرار: نائیک صاحب کی گمراہ کن غلطی:

''Big Bang کل ایک محض مفروضہ تھا جب مفروضہ حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر ہم اسے استعمال کرسکتے ہیں''۔[1] Big Bang کل بھی مفروضہ تھا اور آج بھی مفروضہ ہے۔ اس کو تجربہ گاہ میں ثابت نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اسے حقیقت سمجھنا ذاکر نائیک صاحب کی کم علمی ہے۔ بگ بینگ سے متعلق بعض اہم تفصیلات اور کائنات کے بارے میں سائنس دانوں کے مسلسل تغیر پذیر نظریات کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔ ذاکر نائیک صاحب اس موضوع پر ڈاکٹر مظفر اقبال اور ڈاکٹر حسین نصر کا مکالمہ پڑھ لیں۔ تو ان کے بہت سے واہمے دور ہو جائیں گے۔ حسین نصر نے MIT سے سائنس میں اعلیٰ سند حاصل کی ہے اور فلسفے اور سائنس میں ذاکر نائیک ان کے سامنے طفل مکتب بھی نہیں ہیں، ڈاکٹر مظفر اقبال خود ایک بڑے سائنس دان ہیں اور علوم جدیدہ و علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بگ بینگ پر ان مفکرین کا مکالمہ نائیک صاحب کے خطیبانہ دعوؤں کی حقیقت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۲۵۔

کیا سائنس قبولیت مذہب کا پیمانہ بن سکتی ہے؟

نائیک صاحب کہتے ہیں:

"ایک غیر مسلم کے لیے شاید اصل معیار جدید سائنس ہو لھٰذا میں انھی کے معیار انھی کے پیمانے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن کی برتری کا ثبوت فراہم کرتا ہوں تاکہ وہ قرآن پر ایمان لائیں"[1]

نائیک صاحب کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ایک غیر مسلم جدید سائنس کو معیار سمجھتا ہے اور اسے علم کا پیمانہ قرار دیتا ہے؟ آدمی جس پیمانے پر ایمان لاتا ہے وہی پیمانہ اس کے ایمان کی کسوٹی بن جاتا ہے نہ کہ قرآن۔ جب منہاج، کسوٹی، پیمانہ اور علم سائنس ہے تو ایمان سائنس پر لایا جائے گا یا اسلام پر؟ اگر سائنس کے ذریعے اسلام پر ایمان لے آئیں تب بھی یہ ایمان جس وسیلے سے حاصل ہوا وہ سائنس ہے لہٰذا اصل اہمیت سائنس کی ہوئی وہ نہ ہوتی تو ایمان کیسے ملتا اور لہٰذا ایمان منحصر ہے سائنس پر۔ کیا انبیا نے اپنے عہد کے لوگوں تک دین پہنچانے کے لیے کبھی کفر اور اسلام کے مشترکہ مصطلحات، مشترکہ الفاظ، مشترکہ مابعد الطبیعیات، مشترکہ اقدار، روایات اور اصطلاحات کا سہارا لیا؟ کیا انبیاء نے مشرکین اور کفار کو دعوت ان کے منہاج علم کے مطابق دی یا اپنے منہاج علم سے مخاطب کیا؟ کیا ان کی مابعد الطبیعیات کے کفر سے اسلام کا چراغ عقل جلانے کی کوشش کی کہ شاید وہ سمجھ جائیں؟ انبیاء کی دعوت اس طریقہ کار کی تائید نہیں کرتی۔ قصص انبیاء سے یہ طریقہ کار ثابت نہیں ہوتا۔ کسی بڑے اہل علم غیر مسلم کا نام ذاکر نائیک صاحب نہیں بتا سکتے جو سائنس کو اصل معیار علم سمجھتا ہو۔ سائنسی علم تجربے، مشاہدے، حواس خمسہ اور عقلیت کے ذریعے ملتا ہے لہٰذا یہ علم صرف جزئیات کا علم دے سکتا ہے حقیقت کلی کا علم نہیں دے سکتا۔ عقل اور حواس خمسہ میں یہ صلاحیت اور استعداد ہی نہیں کہ وہ کسی حقیقت یا کلیت کا مکمل علم دے سکیں، وہ کل کو جزئیات میں تقسیم کر کے کسی ایک جز کا علم دے سکتے ہیں وہ بھی غیر قطعی اور وقتی ہوتا ہے اسی لیے مغرب کے تمام اہل علم سائنس کو قطعاً ناقابل اعتبار علم سمجھتے ہیں اور اس سے کاروبار دنیا چلانے کا کام لیتے ہیں۔ کانٹ کے فلسفے کے بعد سائنس کے ذریعے حقیقت کی تلاش، حقیقت کی معرفت اور ماورائے طبیعیات کی طبیعیات کے ذریعے جستجو کا فلسفہ ہی ختم ہو گیا، اب حقیقت تخلیق ہوتی ہے اور حقیقت وہی ہوتی ہے جو کسی ذہن میں، یعنی حقیقت صرف مادی ہوتی ہے اور اس ذہن کی کاری گری اور نقشہ کشی کے تحت حقیقت کی دنیا [World of Reality] سائنسی وسیلے سے تخلیق ہو رہی ہے۔ غیر مسلم کا اصل معیار سائنس نہیں اس کا نفس [Self] ہے، اس کی خواہشات نفسانی ہیں جن کی تکمیل جدید مغربی معیشت [Economics] کرتی ہے جو اس جدید مابعد الطبیعیاتی تصور انسان سے نکلی ہے کہ Man is a pleasure seeking animal جدید انسان اصلاً ایک لذت پسند جانور ہے، آسائشات زندگی

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۳۶۔

کا سریع حصول اور لذات تک اس کی پہنچ اس کا اصل مقصود و ہدف ہے۔ خواہ اس کا وسیلہ مذہب ہو یا سائنس یا فلسفہ اسے اس سے کوئی غرض نہیں۔ کاش نائیک صاحب جدید فلسفہ پڑھ لیتے تو انھیں جدید انسان کی ذہنی ساخت کا پتا چل جاتا اس معیشت کی انجیل میں اس کی مابعد الطبیعیات بیان ہوئی ہے۔ اس کا سرچشمہ Scottish Enlightenment ہے جس نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ صرف اور صرف دولت مند آدمی امیر آدمی کو شریف آدمی قرار دیا۔ gentleman وہ جس کے پاس مال دولت اور اسباب دنیا کی فراوانی ہو جسے اس دنیا میں نعمتیں میسر ہوں گی اسی کو آخرت میں بھی نعمتیں عطا ہوں گی جو اس دنیا میں محروم، نادار، فقیر، فقر و فاقہ اور افلاس کا اسیر ہے وہ اس دنیا میں بھی آخرت میں بھی مفلس، ٹھکرایا ہوا نادار، حقیر، فقیر اور راندہ درگاہ رہے گا۔ جس کو دنیا میں عیش کی زندگی ملے گی وہی آخرت میں عیش کی زندگی سے ہم کنار ہوگا۔ مغرب میں اس مذہبی تصور کی بھیانک ترین شکل پروٹسٹنٹ ازم کی صورت میں سامنے آئی اور عالم اسلام میں فتنۂ انکار حدیث پرویزیت اسی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے کہ جس کی دنیا بہترین ہے اسی کی آخرت بھی بہترین ہوگی، جو دنیا میں کامیاب ہے وہی آخرت میں رسوا نہ ہوگا۔ قرآن کی آیت: ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ کا مطلب اہل قرآن، منکرین حدیث اور جدیدیت پسند مسلم مفکرین بھی یہی بیان کرتے ہیں، یہ تصورات نہایت کلیۃً باطل ہیں اور عالم اسلام میں Scottish Enlightenment اور پروٹسٹنٹ ازم کے زیر اثر سرقہ اور ترجمہ کر کے مغرب سے منتقل کیے گئے ہیں۔ اہل قرآن نے دنیا اور آخرت کو بہترین کرنے کی آیات کا مطلب سرقہ اور ترجمہ کے ذریعے یہی اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں مادی طور پر مسلمان کو سب سے بہتر اعلیٰ اور ارفع کر دے کیونکہ اگر مسلمان دنیا میں غریب الدیار رہا ہے تو آخرت کے میدان حشر میں بھی غریب الوطن رہیں گے اور ٹھکرا دیے جائیں گے۔ جسے اللہ تعالیٰ دنیا میں نعمتیں اور عیش عطا نہیں کرے گا اسے آخرت میں بھی ان سے محروم ہی رکھے گا۔ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے انھوں نے دنیا سے متعلق آیات کا مفہوم کل [whole] سے اخذ کرنے کے بجائے جزئیات کی بنیاد پر اخذ کیا۔ آخرت میں وہ کامیاب ہوگا جو دنیا میں اعمال صالحہ کرتا رہے۔ ان اعمال صالحہ کے نتیجے میں اسے دنیا بھی مل سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں..... اسے نعمتیں بھی عطا ہو سکتی ہیں مگر لازمی نہیں۔ اگر یہ امر لازمی ہوتا تو فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کو مرفع الحالی نصیب ہو جاتی کہ اسلامی سلطنت قائم تھی اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماں روا تھے، لیکن صحابہ کرام مسکینی کی زندگی گزارتے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم وصال مبارک کے وقت مقروض تھے۔ اگر اعمال صالحہ کے باعث ہی دنیا کے رزق کی فراوانی ہوتی ہے تو حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدینہ میں قحط نہ آتا، جب روئے زمین پر اس عہد کے سب سے بہترین انسان موجود تھے اور خیر القرن پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے اس سے دنیاداری کا استنباط مناسب نہیں یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے: الدنیا مزرعۃ الآخرۃ جو یہاں بوؤ گے وہ آخرت میں کاٹو گے۔ یہ دارالامتحان ہے جو یہاں اعمال صالحہ کی فصل بوئے گا اس کا پھل اسے اس دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں یقینی طور پر ملے

گا:وَ قِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ [۱۶:۳۰] نیک لوگوں کے لیے دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔

جدید معیشت کی مابعد الطبیعی اساس:

آدم اسمتھ نے جدید معاشیات کی مابعد الطبیعیات کی تفصیل سے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

They consume little more than the poor, and in spite of their natural selfishness and rapacity, though they mean only their own conveniency, though the sole end they propose from the labour of all the thousands whom they employ be the gratification of their own vain and insatiable desires, they divide with the poor the produce of all their improvements. They are led by an invisible hand to make nearly the same distribution of the necessaries of life, which would have been made, had the earth been divided into equal portions among its inhabitants, and thus without intending it, without knowing it, advance the interest of the society, and afford means for the multiplication of the species. When Providence divided the earth among a few lordly masters, it neither forgot nor abandoned those who seemed to have been left out of the partition. These last too enjoy their share of all it produces.[1]

اسمتھ کا یہ موقف جدید علم معیشت کا مابعد الطبیعیاتی تناظر واضح کرتا ہے۔ اسمتھ نے بغیر کسی تحقیق، جانچ، پڑتال اور سائنسی اعداد وشمار کے صرف یہ دعویٰ کر دیا کہ تمام امیر فطری طور پر مفاد پرست لالچی اور حاسد وحریص ہوتے ہیں، ان کی سرگرمیوں سے جو وہ اپنے فائدے اور خواہشات کی تکمیل کے لیے مزدور کی خدمات سے فائدے اٹھاتے ہیں معیشت میں سرگرمی پیدا ہوتی ہے اور ہر شخص کو اس منصفانہ تقسیم رزق کے ذریعے وہی کچھ مل جاتا ہے جو روئے زمین پر آباد تمام انسانوں کے مابین زمین کی مساوی

---

1. Adam Smith, *The Theory of Moral Sentiments*. (Indianpolis, 1982) IV. 1.10, pp. 184-5.

تقسیم کے نتیجے میں ہر فرد اس قطعۂ زمین سے جو کچھ رزق حاصل کر سکتا وہی رزق سرمایہ دارانہ معیشت و کاروبار کے نتیجے میں اسے منصفانہ طور پر میسر آ جائے گا، اس منصفانہ تقسیم کا فریضہ ایک مخفی اور نادیدہ ہاتھ سرانجام دیتا ہے جو آجر اور اجیر کے مفادات کے مابین توازن قائم کر دیتا ہے اور سب کو ان کی اہلیت کے مطابق رزق مل جاتا ہے۔ روئے زمین پر آباد تمام انسانوں میں زمین کو مساوی تقسیم کرنا، پھر اس زمین سے حاصل ہونے والے رزق کا اندازہ کرنا، پھر تمام لوگوں کے رزق کا تقابل و موازنہ کرنا اور اسے مساوی قرار دینا عملاً کسی طور ممکن ہی نہیں، یہ محض اسمتھ کے ایمان و عقیدے کا مسئلہ ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ اسمتھ کا بلا دلیل دعویٰ تھا جسے بغیر کسی جرح و نقد کے ایمان عقیدے، نظریے اور یقین کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ اسمتھ کے اس نظریے کی کوئی علمی، تجرباتی اور سائنسی دلیل اس کے پاس نہیں تھی۔ یہ خالص مابعدالطبیعیاتی دعویٰ ہے یہ جھوٹ ہے کہ تمام امراء حریص و حاسد ہوتے ہیں صرف اپنی خواہشات کے لیے لوگوں سے اجرت پر کام لیتے ہیں، تاریخ اور تجربات اس کی نفی کرتے ہیں مگر اسمتھ کے اس دعوے کو قبول کر کے جدید معیشت کی بنیاد حرص و حسد و ہوس کے جذبے پر رکھی گئی اور تمام اخلاقی، دینی قدغنوں کو ختم کر کے آزادی اور مسابقت کی معیشت کو مسلط کر دیا گیا۔ اس معیشت کا علم سرمایہ داری [Capitalism] کہلایا جو جدید سائنس کا پہیہ چلانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے، آج سائنس کو کیپٹل ازم سے الگ کر دیا جائے تو اس کے تمام کمالات دم توڑ دیں گے، نائیک صاحب کیپٹل ازم سائنس اور کالونیل ازم کی مثلث کی تاریخ سے بھی واقف نہیں ہیں اور تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

غیر مسلم سے مراد ذاکر نائیک صاحب کے خیال میں Other than Muslim یعنی کل عالم، کفار، مغربی، سفید زرد رنگت والے ہندو عیسائی، یہودی جن کا ایمان عہد جدید کے خدا سائنس و ٹیکنالوجی پر ہے اور نائیک صاحب کے خیال میں عالم اسلام اور عالم کفر کی مشترکہ اساس اور نقطۂ اتفاق جدید سائنس و ٹیکنالوجی ہے، لیکن اہم ترین سوال یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنے عہد کے مشرکین، منافقین، متکبرین، کافر اور ملحدین کو کیا اس عہد کے کافرانہ علمی پیمانوں اور تحقیقی معیارات کے ذریعے دین کی دعوت دیتے تھے یا اپنے معیار، طریقے، اپنے اسلوب اور اپنے منہاج کے مطابق دعوت دیتے تھے؟ قرآن بتاتا ہے کہ: "فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ" [سورۂ مومن: ۸۳] جب بھی ان کے رسول ان کے پاس نشانیاں لے کر آتے ہیں وہ اُسی علم [یعنی سائنس فلسفہ، الحاد، مادیت ٹیکنالوجی] میں مگن رہے جو ان کے پاس تھا' رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو چین، ہند، ایران، روم اور یونان کا فلسفہ سائنس تہذیب تمدن علم ترقی ایجادات کمالات اپنے جوبن پر تھے اس عہد کا علم ہی فلسفہ اور سائنس تھا۔ جن کی پرستش تمام تمدنوں میں کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں اللہ رب العزت نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت نبی امی کو مبعوث فرمایا اور دنیا کو بتادیا کہ اصل جہالت وہ ہے جو تمھارے پاس ہے یعنی کتابی، حسابی، نصابی اور کاغذی علم، تمھارے یہاں علم کا اعلیٰ ترین مرتبہ صرف اور صرف فلسفہ اور فلسفہ کی شاخ جسے سائنس کہتے

ہیں اس کے ذریعے تم حقیقت کے حصول کا دعویٰ کرتے ہو لیکن حقیقت تک پہنچ نہیں پاتے جبکہ اصل علم یعنی العلم، الکتاب اور الحق ہے جو ہم نے نبیٔ امی اور امین پر نازل کی ہے اور اس کے ذریعے ہم نے روشنی، نور اور علم سے ان کے دلوں اور ان کی سرزمین کو منور کر دیا ہے۔ لہٰذا جو بظاہر تمھیں اُمّی لکھنے پڑھنے کی صفت سے محروم نظر آتا ہے حقیقت میں وہی عالم ہے، جاہل تو تم ہو کہ تمھاری تمام تہذیبیں، کتابیں، یونیورسٹیاں، مدرسے، کتب خانے، فلاسفہ ہیں جو اس علمی روشنی اور چکا چوند کے باوجود حقیقت الحقائق اللہ تک پہنچانے سے قاصر رہے۔

فلسفہ اور اس کی شاخ سائنس اور سوشل سائنس جو فلسفے کو اپنے وجود میں تحلیل کر کے ختم کر چکی ہے اس کائنات کے خدا کو پہچاننے سے قاصر ہے وہ علم، علم ہی نہیں جو حقیقت [Reality] کی خبر دینے سے معذور و مجبور ہو۔ قرآن کی نظر میں یہ علم نہیں جہالت کبریٰ ہے۔ رسالت مآب اُمّی ہونے کے باوجود اس لیے سراج منیر تھے کہ آپ کے پاس حقیقت کو جاننے کا علم تھا جو اصلاً اس العلم ہے۔ فلسفہ بھی حقیقت کو جاننے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن فلسفی آج تک حقیقت کے کسی ایک تصور پر متفق نہیں ہو سکے۔ لہٰذا فلسفے نے حقیقت کے تصور کو ناممکن الحصول بنا دیا اس لیے یہ جہالت ہے۔ فلسفہ اور سائنس اس مادی وطبیعی دنیا سے نکلتے ہیں وہ نفس انسانی سے ظہور کرتے ہیں یعنی ان کا مبدا یہ طبیعی دنیا ہے لہٰذا وہ اسی طبیعی دنیا سے متعلق امور کے بارے میں ہی کچھ بتا سکتے ہیں کیونکہ وہ اس طبیعی دنیا کا کل علم [whole knowledge] بھی نہیں رکھتے اور اس مادی دنیا سے متعلق مادی، حسی، تجربی اور طبیعی علوم کو مختلف خانوں، حصوں، ٹکڑوں میں غیر قطعی طریقے سے حاصل کرتے ہیں لہٰذا اس دنیا کا علم بھی انھیں کلیت میں نہیں اجزاء میں ملتا ہے اور یہ جزئی علم بھی غیر قطعی ہوتا ہے۔ جب یہ اس مادی دنیا کا علم کلی بلکہ جزوی طور پر بھی مکمل حاصل نہیں کر سکتے تو یہ حقیقت کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں؟ فہم حقیقت کے لیے جس علم کی ضرورت ہے یہ اس علم سے محروم ہیں لہٰذا مادی علم اس مادی دنیا کے چند مسائل میں کام چلا سکتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا لہٰذا وہ حقیقت مطلق [absolute reality] کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا، سائنس داں اس دنیا سے ماورا، اس انجانی، ہمہ گیر، وسیع و عریض دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔ صرف اور صرف طبیعیات کے ذریعے مابعد الطبیعیات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا، لہٰذا جدید فلسفے اور جدید سائنس کی تین سو سالہ تاریخ کے تلخ تجربات نے ثابت کر دیا کہ فلسفہ اور سائنس حقیقت کی تلاش کے تصور سے بھی دستبردار ہو گئے اور انھوں نے مابعد الطبیعیاتی سوالات کو سوالات کی فہرست سے ہی خارج کر دیا۔ تمام پوسٹ ماڈرنسٹ فلسفی کسی meta narrative کے قائل نہیں۔ اس کے باوجود کنگ فلاسفر ہائیڈیگر جو فلسفے سائنس و ٹیکنالوجی کی شکست و ریخت سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہتا ہے کہ اس دنیا کے لیے کسی اور طرز فکر، کسی اور نقطہ نظر کی ضرورت ہے لیکن نہ فلسفہ نہ سائنس نہ ٹیکنالوجی بلکہ کچھ اور The other thinking اس سے جب کچھ اور کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس کا بے ساختہ جواب تھا only God can save us المیہ یہ ہے کہ مغرب کا بہت بڑا فلسفی اور پوسٹ ماڈرن ازم کا نمائندہ ترین فلسفی

ہائیڈیگر جس کے فلسفے نے دنیا کو عصر حاضر کے تمام بڑے فلاسفہ عطا کیے ہیں کیونکہ عہد حاضر میں تمام بڑے فلسفی جدیدیت کے اہداف کو ناقابل حصول قرار دے کر جدیدیت کی شکست کا اعلان کر کے مابعد جدیدیت فلسفہ [Post Modern Philosophy] کو مستحکم کر چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مابعد جدیدیت [Post Modernism] اور جدیدیت [Modernism] کے اہداف ثلاثہ [آزادی، مساوات اور ترقی] میں کوئی فرق نہیں اسی لیے یرگن ہیبر ماس کہتا ہے کہ: "There is modernity after post modernity"۔ ہائیڈیگر نے ٹیکنالوجی کے بارے میں ۱۹۲۶ء میں *Question Concerning Technology* لکھ کر ٹیکنالوجی کے مضمرات پر حیرت انگیز بحث کی تھی اس کی زندگی میں ٹیکنالوجی خدا کی جگہ لے چکی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اصل خدا سے نجات اور سلامتی کی امیدیں باندھتا ہے، گو کہ اس کا خدا اس کے اپنے تصور کی تخلیق ہے۔

عالم مشرق کا المیہ:

المیہ یہ ہے کہ عالم مغرب فلسفہ، سائنس و ٹیکنالوجی کے تباہ کن رویوں کے باعث خدا کی پناہ مانگ رہا ہے اور خدا سے امیدیں وابستہ کر رہا ہے اسے سکون خدا کی آغوش میں نظر آرہا ہے لیکن مشرق کے تمام جدیدیت پسند مسلم مفکرین جنھیں خدا بغیر کسی محنت تلاش اور جستجو کے مل گیا ہے خدا کا دامن ترک کر کے کامیابی اور کامرانی کی تمام امیدیں سائنس و ٹیکنالوجی سے وابستہ کر رہے ہیں۔ مشرق کے بیشتر اسلامی مفکرین اور بعض راسخ العقیدہ اسلامی تحریکوں کا مشترکہ خیال یہی ہے کہ امت مسلمہ کو عروج خدا کے دامن سے نہیں سائنس و ٹیکنالوجی کی سجدہ گاہ سے ملے گا، وہ مسلسل سائنس و ٹیکنالوجی کے حصول کی باتیں کر رہے ہیں لیکن نہ مغرب انھیں سائنس و ٹیکنالوجی دیتا ہے اور نہ یہ خدا کے دامن سے وابستگی میں کوئی خیر پاتے ہیں، ان کے یہاں قرآن اور خدا کے تصورات علامتی طور پر باقی رہ گئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ڈیکارٹ اور ابتدائی جدیدیت پسند فلسفیوں نیوٹن وغیرہ کے پاس تھے کہ خدا نے کائنات بنا دی جو خود بخود گھڑی کی طرح چل رہی ہے، خدا کا تعلق اس کائنات سے خدائے زندہ کا نہیں بلکہ مجہول خدا کا ہے جو بے کار ہو گیا ہے [نعوذ باللہ] لہٰذا اب وہ آرام کر رہا ہے اب کام صرف انسان کو کرنا ہے، یہی تصور ارتقاء تمام جدیدیت پسندوں کے یہاں ملتا ہے کہ نبوت محمدی کے بعد انسانی ذہن اس قدر ارتقاء پذیر ہو گیا کہ اب نبوت کی ضرورت نہیں رہی اس لیے نبوت ختم ہو گئی اب انسان خود کفیل ہے۔ ''پیغمبر ظاہر'' کی ضرورت اس لیے نہیں رہی کہ ''پیغمبر باطن'' [عقل] اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ کر خیر و شر میں فرق کرنے کے قابل ہو گیا ہے اور اس فرقان کو پہچاننے کا اہل ہے جس کے لیے انبیاء مبعوث کیے جاتے تھے۔

چوتھا باب

خطباتِ ذاکر نائیک: ایک جائزہ

اب خطبات ذاکر نائیک میں نائیک صاحب کے دیگر خطبات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

قرآن اور سائنس

[نائیک صاحب کی یہ کتاب انگریزی میں ہے اور انٹرنیٹ پر www.irf.net اور www.ahya.org دستیاب ہے اس کا اردو ترجمہ "خطبات ذاکر نائیک" [ناشر کتاب سرائے لاہور] میں شامل ہے زیر نظر نقد میں صفحات کے حوالے اسی نسخے سے دیے گئے ہیں کیونکہ نائیک صاحب اس نسخے کو مصدقہ تسلیم کرتے ہیں]

ذاکر نائیک صاحب نے اس کتاب کے دیباچے میں نہیں بتایا کہ وہ کس سائنس کی بات کر رہے ہیں؟ اور سائنس سے وہ کیا مراد لیتے ہیں؟ سائنس کی مختلف اقسام کے بارے میں ابتدائی صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے لہٰذا اس روشنی میں بتایا جائے کہ کون سی سائنس؟ اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن میں جو انٹرنیٹ پر دستیاب ہے انھوں نے ۱۹ نیچرل سائنس کے علوم کا ذکر کیا ہے گویا پندرہ سو سال کے عرصے میں قرآن کو کھنگالنے کے بعد نائیک صاحب کو صرف انیس سائنسی علوم قرآن سے بڑی مشکل سے مل سکے، جب کہ اسماء العلوم کی کوئی بھی کتاب، یا فہرست دیکھ لی جائے تو اس میں عہد حاضر کے تین ہزار سے زیادہ سائنسی علوم مل جاتے ہیں، اس لحاظ سے جدید ذہن کے لیے، نعوذ باللہ، قرآن کوئی خاص فائدہ مند کتاب نہیں جس میں صرف بارہ سائنسی علوم کا ذکر ہے اس کی فہرست پڑھ لیجیے:

[1] Astronomy, [2] Physics, [3] Geography, [4] Geology, [5] Oceanology, [6] Biology, [7]Botony, [8] Zoology, [9], Medicine, [10] Physiology, [11]Embryology, [12] General Science.

جب کہ جدید سائنس کی بے شمار جامعات میں روزانہ نئے نئے سائنسی شعبہ جات کھل رہے ہیں، صرف پاکستانی جامعات میں سائنس کے ستر سے زیادہ شعبہ جات ہیں اور دنیا بھر میں چار ہزار سے زیادہ سائنسی علوم مغربی جامعات میں پڑھائے جاتے ہیں۔ نائیک صاحب کی فہرست میں شامل اکثر علوم اسلام کی آمد سے پہلے یونانی، چینی، ہندی، ایرانی اور بابلی تہذیبوں میں موجود تھے۔ اسلام کے آنے سے یہ علوم متعارف نہیں ہوئے لہٰذا جدید ذہن بارہ [۱۲] کے عدد اور ان علوم کو پڑھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکے گا کہ قرآن میں پندرہ سو سال میں صرف ۱۲ علوم بیان ہوئے جبکہ پانچ سو سال میں مغرب کے کافر سائنس داں قرآن پڑھے بغیر پانچ ہزار سے زیادہ علوم دریافت کر چکے۔ مغرب میں اس قسم کی دلیل اسلام کے حق میں پیش کی جائے تو لوگ بے اختیار قہقہہ لگائیں گے کہ ہمیں ایک ایسی کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے جس میں بیان کردہ علوم مغرب کے تخلیق کردہ علوم کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔

نائیک صاحب کی تحقیق انیق: پورے قرآن سے طب پر ایک آیت:

قرآن اور سائنس کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے ذاکر نائیک صاحب نے اپنی کتاب میں طب [medicine] کے ذکر میں آیت: ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [۱۶:۶۹] کا حوالہ دیا ہے۔

پورے قرآن میں انھیں مشکل سے یہ ایک آیت طب کے حوالے سے مل سکی جس میں شہد کو شفاء بتایا گیا ہے، مغرب میں جدید طب نے حیرت انگیز ترقی کی ہے ان کے سامنے آپ قرآن سے صرف شہد کو طب کے سلسلے میں پیش کریں گے تو یہ مضحکہ خیز صورت حال ہوگی۔ جدید ہسپتالوں میں شہد کو کہیں بطور دوا کے استعمال نہیں کیا جاتا، کوئی ایلو پیتھک ڈاکٹر اپنے نسخے میں شہد کو دوائی کے طور پر تجویز نہیں کرتا، اب مغرب کے یا آج کی جدید نسل کے کسی ذہین نوجوان کے سامنے طب کے ضمن میں صرف یہ ایک آیت پیش کی جائے تو کیا اس سے قرآن کی عظمت ثابت ہوگی یا اس کے دل پر جدید سائنس کی عظمت طاری ہوگی؟ اور کیا قرآن کو وہ حقارت سے دیکھنے پر مجبور نہ ہوگا؟ نعوذ باللہ۔ جدید طب نے جو عظیم الشان ترقی کی ہے اس ترقی کے پس پشت سرمایہ داری، استحصال، استعمار اور جدید فلسفے کا کتنا حصہ ہے یہ موضوع تفصیل کا طلب گار ہے لیکن قرآن سے صرف شہد کی ایک آیت نکال کر اسے جدید طب [medicine] کے مقابلے پر پیش کرنا محض اپنا مذاق اڑانا ہے۔ یہ ایک طفلانہ کوشش ہے جسے ترک کر دینا چاہیے۔ شہد کے فوائد کے بارے میں قرآن سے پہلے قدیم اقوام اور ملتیں بخوبی جانتی تھیں، فراعنہ مصر کے مقبروں سے ممیوں کے پاس رکھے گئے وہ پیالے جن میں شہد موجود تھا حال میں برآمد کیے گئے۔ شہد کے خواص چار ہزار سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود جوں کے توں تھے لیکن اس کا رنگ سیاہ ہوگیا تھا۔ مصری اسے جراثیم کش عنصر [Antiseptic] کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ مغل بادشاہ آموں کو شہد کے تالاب میں ڈبو دیتے تھے اور موسم گزرنے کے بعد بھی ان قدرتی محفوظ آموں سے لطف

اندوز ہوتے تھے۔ شہد قدرتی حفاظتی عنصر [natural preservative] کا کام دیتا تھا۔ طب یونان میں شہد سے ادویات تیار کی جاتی تھیں اور آج بھی طب اسلامی میں شہد سے یہی کام لیا جاتا ہے۔ شہد کے طبی اور مادی فوائد بیان کرنے کے لیے قرآن کو شہد کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، ان فوائد سے صرف اہل عرب نہیں دیگر اقوام وتہذیبیں بھی بخوبی واقف تھیں، قرآن میں شہد کا ذکر انکشاف نہیں بیان واقعہ ہے، یہ قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ ان اشیاء وامثال کے ذریعے لوگوں کو خالق کی طرف متوجہ کراتا ہے جن سے عام لوگ بھی بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن مکھی مچھر کی مثالیں دیتے ہوئے نہیں شرماتا قرآن نے ان کی توجہ شہد کے ذریعے سے خالق شہد کی طرف مبذول کرائی ہے نہ کہ شہد کے بنانے کے طریقوں کی طرف اور نہ اس کے سائنسی مقاصد کی طرف۔ عہد حاضر کے مغربی سرمایہ دار شہد کے چھتوں کی ساخت سے وہ برتن بنارہے ہیں جس میں زیادہ مقدار میں سیال اشیاء کو بھرا جا سکے اور زیادہ نفع کمایا جائے۔ قرآن میں شہد کے ذکر کا مقصد نظام سرمایہ داری کا پہیہ چلانا نہیں تھا نہ قرآن اس لیے آیا تھا کہ شہد کی مکھی کے چھتے کی ساخت دیکھ کر اس کی ساخت کے مطابق برتن تیار کر کے سیال مال کی برآمد ودرآمد کا نظام تیار کر کے فری مارکیٹ کے ذریعے غریبوں کو لوٹا جائے۔ نائیک صاحب نے سورہ نحل سے شہد کی آیت کا انتخاب کرتے ہوئے جدیدیت پسندوں کی روایت کے مطابق اس آیت کے سیاق وسباق کو دانستہ یا نادانستہ طور پر نظر انداز کر دیا۔ شہد سے متعلق اس آیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں سورہ نحل کی ۶۵ سے لے کر ۷۰ تک تمام آیات کا مطالعہ کرنا ہوگا تا کہ اصل صورت حال واضح ہو جائے کہ قرآن شہد کا ذکر کر کے انسانوں کو کیا سمجھانا چاہتا ہے: وَ اللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ..... وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ..... وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ..... وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ..... ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ..... وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ [۱۶:۶۵ تا ۷۰]۔ آغاز برسات سے ہوتا ہے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور یکا یک مردہ پڑی ہوئی زمین میں جان پڑ گئی اور وہ سبزہ اگلنے لگی، پھر بتایا کہ مویشیوں میں بھی اللہ کی آیات موجود ہیں، ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ایک چیز ہم پلاتے ہیں یعنی خالص دودھ جو نہایت خوشگوار مشروب ہے۔ اس طرح کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمھیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی ان سب امور میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور دیکھو تمھارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی ہے کہ پہاڑوں میں درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں

میں اپنے چھتے بناؤ اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوسو! اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہ پر چلتی رہو، اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے، یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں اور دیکھو اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے پھر وہی تم کو موت دیتا ہے اور تم میں سے کوئی بدترین عمر کو پہنچ جاتا ہے تا کہ بس کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل ہے اور قدرت میں بھی [۱۶: ۶۵-۷۰] نائیک صاحب نے اس سیاق وسباق کو ترک کر کے صرف آیت نمبر ۶۹ لے کر اسلام سے سائنس اور طب کا اثبات فرمادیا، جب کہ کل تناظر میں شہد کی آیت کا مطالعہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت، شانِ خلاقیت اور انسانوں کے لیے اس کے فضل وکرم اور عنایات کا بیان ہے۔ آغاز برسات سے ہوا تھا یعنی حیات بعد موت پر اعتراض کا جواب دینے کے لیے برسات کے نتیجے میں مردہ زمین کے زندہ ہونے کا منظر دکھا کر انسان کو متوجہ کیا گیا کہ خدا اسی طرح تمھیں دوبارہ زندہ کر دے گا پھر اس دلیل کو موکد کرنے کے لیے دودھ اور شہد کی مثال دی گئی کہ کس طرح دودھ اور شہد جانوروں اور کیڑوں کے پیٹ میں سے نکالا جاتا ہے جو انسانوں کے لیے شفاء ہے، حالانکہ انہی جانوروں کے پیٹ سے گوبر اور خون بھی نکلتا ہے مگر یہ اشیاء ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہوتیں، پھر اختتام پر کہا گیا کہ جس نے تم کو پیدا کیا ہے وہی تمھیں موت دیتا ہے لیکن نائیک صاحب کو ان آیات میں سائنس کے سوا کچھ نظر نہیں آسکا۔ نائیک صاحب نے طب کے باب میں صرف شہد پر اکتفا کیا ورنہ وہ چاہتے تو انجیر، زیتون، انار، انگور، کھجور، کلونجی، اور بے شمار خوردنی اشیاء، ثمرات سبزیوں، جڑی بوٹیوں کے اجزاء کو طب کے ذیل میں پیش کر سکتے تھے شاید ان پر ان کی نظر نہ پڑی ورنہ ان اشیاء کے طبی فوائد سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ ذاکر نائیک صاحب نے سورۂ مریم میں زچگی کے فطری طریقے کو الٰہی طب یا اسلامی طب کے طور پر پیش کرنے کی ہمت نہیں کی: فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا. فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا [۱۹: ۲۲-۲۳] کیونکہ عہد حاضر کا انسان اس کسمپرسی میں زچگی کو انسانیت کا قتل سمجھے گا، اسی لیے ذاکر نائیک صاحب کو زچگی کا یہ طریقہ قرآن سے بتاتے ہوئے سخت شرمندگی خجالت اور سبکی محسوس ہوئی اور انھوں نے اس کا ضمنی تذکرہ بھی نہیں کیا، یقیناً وہ تہذیب مغرب اور جدیدیت کی تقلید میں عالیشان اسپتالوں اور بڑے بڑے میٹرنٹی ہوم کے بغیر زچگی کو غیر انسانی اور غیر سائنسی رویہ تصور کرتے ہیں، لیکن دنیا کی سترہ تہذیبوں میں انسان فطری طریقے سے زندگی بسر کرتے تھے، فطری غذائیں کھاتے تھے اور فطری طریقے سے ولادت طفل کے مراحل اسی طور پر طے پاتے تھے۔ جس کا ذکر سورۃ مریم میں ہوا ہے لیکن ذاکر نائیک صاحب مغرب کی پیروی میں انسان کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے فطرت کو انسان سے ہم آہنگ کرنے کو عین سائنسی رویہ سمجھتے ہیں۔ آج بھی سعودی عرب کے بدوی علاقوں، کراچی، کے بہت سے حصوں، اندرون ملک کے قدیم قصبات، دیہات اور اضلاع میں ولادت سورہ مریم میں بیان کردہ

طریقے سے ہوتی ہے۔ افریقہ، ایشیا، ہندوستان، قطب شمالی، جنوبی اور دنیا کے ستر فی صد علاقوں میں زچگی سادہ اور فطری طریقوں سے ڈاکٹر اور میٹرنٹی ہوم کے بغیر ہوتی ہے۔

یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں چونکہ اب لوگوں نے جدید غیر فطری طرز زندگی اختیار کرلیا ہے اس لیے اب غیر فطری ولادت کے لیے جدید اسپتالوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ فطرت کو ترک کرنے کے نتیجے میں جدید بیماریاں فروغ پارہی ہیں لہٰذا جدید طبی طریقے وجود میں آرہے ہیں، جسے جدید طبی ترقی قرار دیا جاتا ہے۔ کراچی میں آج بھی میواتی مزدور عورتیں عمارتوں کی تعمیر کے دوران پتھر توڑتے ہوئے اور بھاری ملبہ اٹھاتے ہوئے اچانک کام ترک کرکے لیٹ جاتی ہیں ان کی ساتھی عورتیں ان کے گرد چادر تن دیتی ہیں اسی دوران وہ مزدور عورتیں زچگی کے مراحل سے گزرتی ہیں اور پھر دوبارہ کام شروع کردیتی ہیں کیا کبھی کسی جانور درندے، پرندے اور چرندے کی زچگی غیر فطری طریقے سے ہوئی ہے تمام جانور، درندے، پرندے، حشرات الارض اربوں کی تعداد میں اپنی نسلیں ہر سال فطری طریقے سے روئے زمین پر منتقل کرتے ہیں کیوں کہ وہ فطری غذائیں کھاتے ہیں اور فطری ماحول میں رہتے ہیں لہٰذا یہ مرحلہ بھی فطری طور پر طے کرتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا پرندہ نہیں دکھا سکتے جو مغرب کے بعد دانہ دنکا چگتا ہوا نظر آئے۔ خواہ وہ دن بھر بھوکا رہا ہو مغرب سے پہلے پرندے اپنے نشیمنوں کی طرف سفر شروع کردیتے ہیں اور تہجد کے وقت بیدار ہوکر خالق کائنات کی حمد وثنا میں مشغول رہنے کے بعد تلاش رزق میں نکل جاتے ہیں۔ وہ کل کے لیے کچھ ذخیرہ نہیں کرتے وہ کل کی فکر نہیں کرتے، وہ ھل من مزید کے رویے سے عاری ہوتے ہیں دنیا میں سات ہزار سال تک سترہ تہذیبوں کے لوگ اسی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک حدیث میں اسی لیے سچے مومنین کو پرندے سے تشبیہ دی گئی ہے اور کھجور کے درخت کی مانند قرار دیا گیا ہے، جس کا کوئی حصہ رائیگاں نہیں جاتا، کھجور لوگ کھاتے ہیں اس کی گٹھلیاں پتے، اونٹ اور جانور کھاتے ہیں یہ اشیاء کئی انسانی ضرورتوں کے کام آتی ہیں اگر کھجور کا درخت سوکھ جائے تو اس کا تنا ستون بنانے کے کام آتا ہے اس مثال کے ذریعے مومن کو سراپا خیر بتایا گیا ہے جس کا وجود خیر کے سوا کچھ نہیں ہوتا جس طرح کھجور کا درخت۔

ذاکر نائیک صاحب جدید سائنس کی تحقیقات کے ضمن میں اور جدید طب سے قرآن کی آیات تلاش کرنے کے جنون میں سورۃ مریم کی آیت بھی بھول گئے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ تم پر تر و تازہ کھجوریں جھڑیں گی: وَ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا [۱۹:۲۵] انھیں WHO کی تازہ ترین تحقیق یاد نہیں رہی جس میں دنیا بھر کی زچہ عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ حمل ٹھہر جانے کے بعد کھجور کا کثرت سے استعمال کریں WHO نے دنیا بھر کے غریب خطوں میں غریب عورتوں کے بچوں کو نہایت صحت مند پایا جبکہ WHO کے غذائی معیار کے مطابق ان عورتوں نے گوشت، پھل سبزیاں، انڈے اور اناج بہت کم مقدار میں اور اکثر و بیشتر غربت کے باعث استعمال نہیں کیا تھا تب یہ راز کھلا کہ یہ عورتیں کثرت سے کھجور استعمال کرتی ہیں جوان

کی اور بچوں کی صحت کا ضامن ہے، اس میں موجود فولاد اور قدرتی شکران کو تمام توانائی مہیا کرتی ہے۔ اگر نائیک صاحب یہ تحقیق پڑھ لیتے تو قرآن سے WHO کی رپورٹ ثابت کر دیتے، افسوس وہ اس سعادت سے محروم رہے اور قرآن کی سائنسی آیات سے تیارہ کردہ فہرست میں اس آیت کا اضافہ نہ کر سکے اور طب میڈیسن میں سورۂ مریم اور سورہ کہف کی آیات شامل نہ کر سکے۔ اسی طرح ذاکر نائیک صاحب کی نظر سے سورہ کہف کی وہ آیت نہیں گزری جس میں کہا گیا کہ ان نوجوانوں کو دائیں بائیں کروٹیں دلائی جاتی تھیں: وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ لَوِاطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا [۱۸:۱۸] ذاکر نائیک اس سے Bed Sore کا جدید مغربی علاج قرآن کی روشنی میں ثابت کر سکتے تھے حیرت ہے اس کا خیال انھیں نہیں آیا قرآن سے اس قسم کے سائنسی دلائل قرآن کے ساتھ عدم احترام کا رویہ ہے۔

قرآن: نشاناتِ انگشت کی انفرادیت:

قرآن کی آیت: اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ - بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ '[سورۃ القیامۃ: ۳ تا ۴] سے ڈاکٹر ذاکر نائیک نے استدلال کیا ھے کہ" آج سے ۱۴۰۰ سو سال پهلے کسی کو نشانات انگشت کی انفرادیت کے بارے میں معلوم نہ تھا"[1] یہ نتیجہ اس مفروضے کی بنیاد پر قائم کیا گیا کہ قرآن سے پہلے لوگ فنگر پرنٹ کا علم نہیں جانتے تھے، یہ محض مفروضہ ہے، تاریخ اس بیان کی نفی کرتی ہے، انگلیوں کے نشانات کے ذریعے شناخت کا علم تمام اقوام میں کسی نہ کسی طور پر موجود رہا ہے۔ دست شناسی کا علم دنیا کی ہر تہذیب و تاریخ میں موجود تھا۔ کل کسی کھنڈر یا کسی مخطوطے، کسی کتاب، آثار قدیمہ کی کسی نئی کھدائی، کسی دستاویز سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ دنیا کی کوئی قوم اس علم میں کمال رکھتی تھی اور اس کا استعمال کرتی تھی، تب ذاکر نائیک صاحب کا استدلال کہاں رہ جائے گا؟ قرآن نے جب کہا کہ ہم انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک کرنے پر قادر ہیں تو یہاں اللہ رب العزت کی خلاقیت اور شان تخلیق کا اظہار مقصود ہے نہ کہ علم تشریح دست تک رسائی کی دعوت ہے۔ یہ رویہ خالصتاً سادگی یا نہایت ہی گستاخانہ جسارت ہے۔

قرآنی اصطلاح ''اہل الذکر'' سے مراد ڈاکٹر کیتھ مور: ذاکر نائیک:

ذاکر نائیک صاحب نے قرآن کی سورہ ۱۶ آیت ۴۳: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [۱۶:۴۳] میں اهل الذکر کی قرآنی تشریح یہ فرمائی ہے کہ:

''اپنے زمانے کے سائنس داں سے پوچھ لو'' یہ تشریح نہایت لغو اور بے بنیاد ہے۔ اس تشریح

---

[1] ذاکر نائیک: ''قرآن اور سائنس''، مشمولہ خطباتِ ذاکر نائیک، صفحہ ۶۰۔

کے مطابق: ''جینیات اور دیگر سائنسی علوم کے بارے میں قرآن پاک اور مستند احادیث سے معلومات جمع کر کے قرآن پاک کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انمعلومات کو پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے سامنے پیش کیا گیا''[1] اب امت کا حال یہ ہو گیا ہے کہ قرآن کی آیات کے اصل معنی کی تفسیر کفار بتائیں گے، یا ان معانی اور اس کے فہم کی تصدیق کفار و مشرکین کریں گے، اور یہی کفار و مشرکین اھل الذکر ہیں، یہ تشریح واضح طور پر تحریف قرآن کے زمرے میں آتی ہے۔ اگر ذاکر نائیک صاحب کی دلیل کو مان لیا جائے تو کل سورہ فرقان کی آیت ۵۹ کی تفسیر بھی پروفیسر کیتھ مور ہی بیان کریں گے: اَلرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۔[۲۵:۵۹] رحمٰن اس کی شان بس کسی جاننے والے سے پوچھو اب اللہ تعالیٰ کی شان بھی کسی سائنس داں سے پوچھی جائے، کیا یہی قرآن کا مقصد ہے؟

ذاکر نائیک صاحب نے سورۂ نحل کی آیت: وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [۱۶:۴۳] ترجمہ: ''اے نبیؐ ہم نے آپ سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے''۔ ڈاکٹر نائیک نے اہل الذکر سے مراد سائنس داں اور کنیڈا کے ماہر ایمبریالوجی ڈاکٹر کیتھ مور کو لیا ہے، اھل الذکر کی اصطلاح قرآن میں سورۂ انبیاء میں بھی آئی ہے: وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ..... وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ [۲۱:۷،۸] ترجمہ: ''اور اے نبی آپ سے پہلے بھی ہم نے انسان ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کرتے تھے تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے''۔ ان دونوں آیات میں اہل الذکر سے مراد سائنس داں لینا تحریف قرآن کے سوا کچھ نہیں ہے، سورۃ نحل میں ''اہل الذکر'' سے مراد آسمانی کتابوں کا علم رکھنے والے یہود و نصاریٰ ہیں ان سے پوچھنے کا حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ کفار کو حیرت تھی کہ انسان نبی کیسے ہو سکتا ہے؟ لہٰذا تصدیق کے لیے اہل کتاب کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا کہ ان کے یہاں جو انبیاء آئے وہ بھی انسان تھے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس آیت میں ذکر کے نازل ہونے اور اس کی تشریح کے حکم کی توضیح بیان کر دی گئی ہے۔ سورۃ انبیاء میں بھی کم و بیش یہی مضمون ہے، وہاں بھی کہا گیا ہے کہ پہلے بھی رسول انسانوں میں سے آتے تھے اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل الذکر یعنی اہل الکتاب سے پوچھ لو۔ اب اہل الذکر سے مراد کفار سائنس داں یا ڈاکٹر کیتھ مور کو قرار دینا محض انتہاء درجے کی سادگی اور علم تفسیر سے کامل عدم واقفیت کے سوا کچھ نہیں۔ نائیک صاحب الاحزاب کی آیت ۳۵ فراموش کر گئے: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ

---

[1] ایضاً، صفحہ ۴۵۔

الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔ اس میں ذاکرین وذاکرات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان سے مغفرت اور اجر کا وعدہ بھی ہے۔ کیا یہاں مغفرت کا وعدہ ڈاکٹر کیتھ مور سے کیا گیا ہے؟ جو اہل ذکر ہے ہیں اور ذکر کرتے ہوئے عہد حاضر کی جہالت جدیدہ سائنس کی تصدیق فرمارہے ہیں؟ سورۃ ہود کی آیت ۱۱۴ میں ارشاد ہوتا ہے: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ [۱۱:۱۱۴] ترجمہ: ''اور دیکھو نماز قائم کرو، دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر در حقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں'' [۱۱:۱۱۴] کیا یہاں ذاکرین سے مراد ڈاکٹر کیتھ مور اور عصر حاضر کے سائنس داں ہیں جو قرآن کی آیات کا مطلب بتائیں گے؟ سورۃ طٰہٰ میں آتا ہے کہ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى [۲۰:۱۲۴] ''اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے'' یہاں ذکر اور ذکر کرنے والے یعنی اہل الذکر سے مراد کیا سائنس داں ہیں؟ کیا پروفیسر کیتھ مور ہیں؟ نائیک صاحب علم تفسیر سے لاعلم ہیں اگر وہ اس علم کے حامل ہوتے تو یہ غلط استدلال نہ کرتے۔ اسلام کی نظر میں ذاکر و عاقل، مدبر و مفکر اور دانش مند وہ ہے جو اپنے رب کو اور آخرت کو پہچان لے جو اس معرفت سے محروم ہے وہ جاہل ہے۔ قرآن رب کے پہچاننے کو علم قرار دیتا ہے رحم مادر میں گوشت کے ٹکڑوں کی تاریخ علم جنین کو جمع کرنا علم نہیں فن کاری ہے جو ہر فن کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے بھی پہلے اپنے اپنے طریقے پر انجام دے رہا تھا۔

پانچواں باب

بگ بینگ تھیوری: ذاکر نائیک کے دلائل: تجزیہ وتبصرہ

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب فرماتے ہیں:

''اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا [1]...۔ آیئے ہم سائنسی علوم کی روشنی میں قرآن کا جائزہ لیتے ہیں [2]....۔ قرآن میں Big Bang کا نظریہ سورہ الانبیاء آیت ۳۰ میں ۱۴۰۰ سو سال پہلے بتا دیا گیا تھا. ''یہ سب آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا [3]....۔ دراصل عربوں کے فلکیات میں ترقی کرنے کا سبب ھی قرآن تھا، قرآن سے عربوں نے سیکھا تھا، قرآن بہت سے سائنسی حقائق کا ذکر کرتا ھے''. [4]

عربوں سے بہت پہلے یونانیوں نے علم الافلاک میں ستاروں اور سیاروں میں قرآن کے بغیر محیّر العقول ترقی کی تھی، یونان کی سائنسی ترقی، طب میں کمالات کی تاریخ پڑھی جائے تو انسان ششدر رہ جاتا ہے آٹھ سیاروں planat کی دریافت کا سہرا مسلمانوں کے سر نہیں ہے۔ قرآن سے علم فلکیات حاصل کرنے والے مسلمان آج تک سائنس کی دنیا میں کسی ایک سیارہ کا اضافہ نہ کر سکے۔ یہ ان سے پہلے ایجاد ہو چکے تھے اور آج تک قدیم سیارے سیاروں کی جدید تعریف پر پورا اتر رہے ہیں بلکہ جدید سیارہ [Pluto] جسے امریکہ نے دریافت کیا سو سال کے بعد ۲۰۰۷ء کے آخر میں سیاروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ نائیک صاحب فرماتے ہیں: سائنس کا نامکمل علم آپ کو ملحد بنا دیتا ھے لیکن سائنس کا وسیع اور عمیق مطالعہ آپ کو خدا پر ایمان رکھنے والا بنا دیتا ھے. [5] سائنس کا مکمل اور نامکمل علم کیا ہوتا ہے؟ سائنس کے ہزاروں شعبے، ہزاروں شاخیں اور

---

[1] ذاکر نائیک، خطباتِ ذاکر نائیک، صفحہ ۳۰۔

[2] ایضاً، صفحہ ۳۴۔ [3] ایضاً، صفحہ ۳۵۔ [4] ایضاً، صفحہ ۳۹۔ [5] ایضاً، صفحہ ۵۶۔

ہزاروں اقسام ہیں سائنس کی تمام شاخوں کا احاطہ کسی ایک کے بس کی بات ہی نہیں سائنس کا حقیقی علم تو فلسفہ اور فلسفۂ سائنس پڑھ کر حاصل ہوتا ہے لیکن آج کل سائنس داں عموماً فلسفہ نہیں پڑھتے، نہ سائنسی تعلیم گاہوں میں فلسفہ پڑھایا جاتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ مکمل علم ملحد نہیں بناتا محض خطیبانہ دعویٰ ہے مکمل علم کی تعریف ممکن ہی نہیں تو مکمل علم کا حصول کیسے ممکن ہو؟

آغاز کائنات اور تخلیق کائنات: اسلام: جدید سائنس:

جدید مسلم مفکرین عموماً کائنات، آثار کائنات، مشاہدات کائنات تخلیق و تکوین کائنات سے متعلق آیات اور سائنس میں مشابہت ومطابقت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جیسے ہی یہ کوشش ادنیٰ سطح پر بھی کامیاب ہوتی ہے تو فوراً اسلام اور سائنس، سائنس اور اسلام، اسلام وعقل اور عقل واسلام کا غبارہ اڑانے لگتے ہیں حالاں کہ یہ ناداں یہ تک نہیں جانتے کہ مغربی سائنس دان تخلیق کائنات کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں ـــــ آغازِ تخلیق کے دو پہلو ہیں: آغاز کائنات اور آغاز تخلیق کائنات، مذہب اور سائنس کے میدان کا یہ بہت اہم موضوع ہے۔[1] نصر نے اپنی تصنیف: *An Introduction to Islamic Cosmological Doctrines*, [Cambridge: Belknap Press of Harvard University Press, 1964.] میں مسئلہ تخلیق پر تین خاص پہلوؤں سے بحث کی ہے، لیکن جدید کونیات جو خالص طبیعی کائنات ہے، نصر کے نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتی۔ سوال یہ ہے کہ ہبل کی دوربین اور دوسرے جدید آلاتِ رصد کے مشاہدات کے ذریعے جو نئے انکشافات وحقائق سامنے آئے ہیں اُن کی تطبیق ابن سینا، اخوان الصفا اور البیرونی کے نظریات سے کیوں کر ہوسکتی ہے؟ بالفاظ دیگر اب جو نئے شواہد وانکشافات سامنے آئے ہیں، اُن کی روشنی میں تخلیق کائنات کے آغاز کے بارے میں اب اسلامی نقطۂ نظر کیا ہوگا؟ اور ابن سینا اور البیرونی کے نظریات سے

---

[1] تفصیل کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا:

[1] William Polland, *The Cosmic Drama*, Ney York: National Council of the Episcopal Crurch, 1955.

[2] A.M. Corey, *God and the New Cosmology: The Anthropic Design Argument*, Powman and Lettlefild, 1993.

[3] William Lane Craig, *The Kalam Cosmological Argument*, London, Macmilian Pres Ltd. 1979.

[4] William Lane Craig, *The Cosmological Argument From Plato to Leibniz*, London, Macmillian Press Ltd. 1980.

ان کا موازنہ کن اصولوں کی بنیاد پر ہوگا؟ کیا جدید کونیات [Modern Cosmology] حتمی، قطعی اور لازمی ہے؟ کیا اس کی تحقیقات اور حاصلات نا قابلِ تغیر و تردید ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، سائنسی ایجادات و اکتشافات کو حتمی، نا قابلِ تغیر، قطعی اور لازمی سمجھنا سائنس کے منہاج کی نفی ہے۔ اسلام نے یا ہندومت یا عیسائیت یا کسی اور مذہب نے آغازِ تخلیق کائنات کے بارے میں جو بھی تعلیمات دی ہیں، جدید کونیات نے انھیں غلط اور منسوخ قرار نہیں دیا ہے۔ جدید کونیات محض طبیعیات ارضی کی توسیع ہے، جو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ طبیعیات کے تمام قوانین جو زمین پر لاگو ہوتے ہیں ان کا اطلاق تمام کائنات پر ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جس کی پیمائش آلات سے نہ ہو سکتی ہو، وہ کونیات کے دائرے سے خارج ہے پس جدید کونیات کلاسیکی طبیعیات کے علاوہ جدید طبیعیات اور کوانٹم میکانیات کی قابل پیمائش دنیا تک محدود ہے۔ جب کہ اس کے برعکس آغازِ تخلیق کائنات کے بارے میں اسلام کے یا کسی دوسرے روایتی مذہب کے عقائد حقیقت کے پورے عرفان یا جزوی عرفان پر مبنی ہیں۔ حقیقت میں صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہی نہیں بلکہ تمام ملکوتی یا غیر مادی جہات بھی شامل ہیں، جن پر کائنات کے طبیعی پہلوؤں کے بارے میں نئی تحقیقات و انکشافات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

کونیاتی نظریہ اور Big Bang تھیوری کیا ہے؟

ڈاکٹر حسین نصر جیسے فلسفی دانشور جو سائنس کے میدان میں MIT سے فارغ التحصیل ہیں اور کونیات ان کا خاص موضوعِ تحقیق ہے وہ بھی Big Bang کے مفروضات کو تسلیم نہیں کرتے، مظفر اقبال سے ایک مکالمے میں وہ جدید کونیاتی نظریوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں تمام جدید کونیاتی نظریات کو کوئی عقل مند کبھی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ یہ سب ہر دس سال کے بعد تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان نظریوں کے بارے میں قیاس آرائی بہت ہوتی ہے۔ نامعلوم [Unknown] کی ایک ایسی فضائے بسیط معلوم [known] پر محیط ہے کہ جسے تخلیق کائنات کے بارے میں آخری اور حیرت انگیز نظریے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ منصۂ شہود پر آنے کے بعد متروک و منسوخ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی دوسرا سائنس داں اپنی نئی دریافت کے ساتھ آ جاتا ہے کہ اس نے مشاہدۂ افلاک کے لیے نئے صوتی آلات ایجاد کر لیے ہیں، جو نتائج کو یکسر بدل کر رکھ دیں گے یا کوئی محقق نمودار ہو کر دعویٰ کرے گا کہ اس نے ایک نیا نظامِ پیمائش یا نیا ہندسی فارمولا دریافت کر لیا ہے۔ اس طرح یکے بعد دیگرے نظریات کی قطار لگ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر زمانہ حال میں متعدد نظریے مشہور ہیں۔ کثیر نوعی کائناتیں [Multiple Universes] سٹرنگ تھیوری [String Theory]، بگ بینگ تھیوری [Big Bang Theory] بلکہ گزشتہ پچاس برس کے اندر کونیات کے پانچ چھ بڑے نظریوں کی صحت کے بارے میں دلائل کا انبار لگ چکا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نیا سائنسی نظریہ اپنے سے پہلے کے سائنسی نظریے کو غلط قرار دیتا ہے یعنی وہ غیر سائنسی نظریہ ہو گیا ہر سائنسی فرقہ دوسرے سائنسی فرقے کو باطل ٹھہراتا ہے اور

اپنے افکار، نتائج، طریقوں، علمیت کو بالکل درست، خیر اور سچ قرار دیتا ہے۔

علم کونیات: مرئی یا غیر مرئی کائنات کا فہم: بگ بینگ:

جو لوگ جدید طبیعیات و کیمیا کی اساس پر کائنات کے بارے میں نظریہ سازی کرتے ہیں انھیں اصطلاح ''کونیات'' [Cosmology] استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ کونیات کا مطلب ہے: کون، یعنی کائنات کی سائنس۔ اور کائنات صرف مادی یا قابل پیائش یا مرئی چیزوں تک محدود نہیں ہے۔ یہ چیزیں کائنات کا حصہ تو ہیں لیکن یہی کل کائنات نہیں ہیں، دبستانِ روایت کی یہ دلیل، یہ نقطۂ نظر، یہ بات اسلامی تناظر میں تو ٹھیک ہے لیکن جدید فلسفے کے تناظر میں جو کانٹ کے بعد نہایت مضبوط نئی مابعد الطبیعیات کے ساتھ جلوہ گر ہے اور جس کی روشنی میں جدید سائنس نے اپنا سفر طے کیا ہے بالکل غلط غیر علمی اور مغرب کے لیے قطعاً ناقابل قبول ہے، وہاں غیر مرئی کائنات کو موجود اور محسوس کر کے تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس تک رسائی کو محال قرار دے کر اس کو سائنس اور علم انسانی کے دائرے سے باہر نکال دیا گیا ہے، لہٰذا جدید سائنسی تناظر میں اس غیر مرئی اور غیر مادی کونیات کی سائنس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض سنجیدہ مفکرین بھی ایسی نظریہ سازی کو سنجیدگی سے نہیں لیتے لیکن اکثریت کی رائے یہ نہیں ہمارے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق پہلے کائنات کے متعلق اسلامی نظریہ قائم کریں، پھر یہ دیکھیں کہ جدید ماہرین کونیات کیا کہتے ہیں؟ اسلامی نظریے اور جدید نظریوں میں خواہ مخواہ کی ظاہری مماثلتیں ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں، جیسے یہ کہنا کہ ہاں بگ بینگ کے بارے میں تو قرآن نے پہلے ہی کہہ رکھا ہے ''کن فیکون'' یا جیسے کہ بعض مسیحی علمائے دین کہا کرتے ہیں، امر ربی [Fiat Lux]۔ ہمارے ذاکر نائیک صاحب بھی یہی فرماتے ہیں، جدید سائنس اور فلسفے کے تناظر میں اسلامی تنقید کے حوالے سے حسین نصر ایک اہم نام ہے، اگر ذاکر نائیک حسین نصر کی تصانیف پڑھ لیں تو ان کو بہت سے امور میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہے، ڈاکٹر حسین نصر اور ڈاکٹر مظفر اقبال [مدیر، اسلام اور سائنس] کے مکالمے کے یہ الفاظ جدید کونیات کے حوالے سے نہایت اہم ہیں: ''اس طرح کے مذہبی اقتباسات کو سائنسی نظریات پر منطبق کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ عنقریب کوئی سائنس داں اٹھے گا اور ثابت کر دے گا کہ بگ بینگ نہیں ہوا تھا۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ دس پندرہ سال پہلے کی بات ہے فلاڈیلفیا میں یہودی علمائے دین اور یہودی ماہرین کونیات کے مابین بگ بینگ کے مسئلے پر ایک بڑی کانفرنس ہوئی تھی۔ آج بھی ایسے کئی ماہرین کونیات موجود ہیں جو بگ بینگ کو یا اس کے نظریے کو تسلیم نہیں کرتے۔

علم کے دو جداگانہ طریق:

مذہبی کونیات کو، جس کی اساس ماورائے طبیعی عرفان یا تصور کائنات پر ہے، اور جدید کونیات کو ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ علم کے دو جداگانہ طریق ہیں اور ان کی

اصطلاحیں، باتیں اور اخذ کردہ نتائج جدا گانہ ہیں۔ کیوں کہ دونوں دو مختلف مابعد الطبیعیاتی تصورات سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا یکساں نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ Idea of incommensurability کے مطابق دو مختلف مابعد الطبیعیات رکھنے والے نظریوں کی بنیاد پر صحیح نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے، ایک جانب مادی مابعد الطبیعیات ہے، دوسری جانب دینی و اسلامی مابعد الطبیعیات۔ ان دونوں کو ملا کر ہم کوئی علمی ملغوبہ تیار نہیں کر سکتے علم اور سائنس کی دنیا میں یہ نا قابل قبول رویہ ہوگا۔ ہمارے جدیدیت پسند مفکرین یہ بات سرے سے فراموش کر دیتے ہیں کہ نفس کا نمو اور ارتقا قرآن، سنت، حکمت، احسان، اور شرعی علوم کے امتزاج کے بغیر ممکن نہیں ہے، نفس کی تعمیر، تربیت، تزکیہ، تصفیہ، ترتیب، تہذیب، نمو اور تکمیل کے بغیر وہ روحانی وجود ظہور نہیں کر سکتا جو اسلام کو مطلوب ہے، زندگی آغاز سے انتہا تک المبداء سے المعاد تک ایک ربط، ضبط، تعلق، ترتیب اور ترکیب ہے جو مقاصد شریعہ کو حدود شریعہ کے بغیر حاصل نہیں کر سکتی، اس زندگی اور آنے والی زندگی میں ایک نامیاتی ربط ہے زندگی کے تمام لمحات اور منازل کا وجود آخری مقصد کی روشنی میں متعین ہوتا ہے اور وہ ہے خدا کے سامنے ہونا۔ اِس دنیا میں خدا کے سامنے ہونا اور اُس دنیا میں خدا کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف ہونا دو ایسے تصورات ہیں جو انسانی فطرت، اُس کی صلاحیتوں، قوتوں اور وجود کے مقاصد کو منظم، مُرتب و مربوط کر کے اس روحانی و مخفی قوت کا سبب بن جاتے ہیں جو اپنی اصل میں مکمل معرفت خداوندی اور اس سے پیدا شدہ سرور سرمدی ہے اس منشور [Prism] سے گزر کر حصول علم کا پورا عمل درجات وجود میں انسان کے صعود کا ذریعہ بن جاتا ہے جو اس حالت تکمیل کی طرف لے جاتا ہے جس کے لیے وہ تخلیق ہوا تھا۔ جدید مسلم مفکرین اس بات کا شعور ہی نہیں رکھتے کہ جدید سائنسی نظریات اور تخلیق وحیات انسان و کائنات کہ مغربی نظریات کے ذریعے معرفت خداوندی کی جانب ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا، یہ جدید علوم ''معرفت'' کے لفظ ہی سے نا آشنا ہیں اور اسے دائرہ علم سے باہر سمجھتے ہیں۔ ایسے علم سے ہمارے سادہ لوح مفکرین العلم کے اثبات اور توثیق کا کام لینا چاہتے ہیں۔

جدید کونیات کی اساس: تخلیق حیات اور بگ بینگ:

جدید کونیات اس نظریے کی بنیاد پر کھڑی ہے کہ کرۂ ارض کی طبیعیات کے مطابق جو قابل مشاہدہ چیز قابل پیمائش ہے، اس کا اطلاق پوری کائنات پر ہوتا ہے یعنی ستارے جس مادے سے بنے ہیں اسی مادے سے وہ گلیاں بنی ہیں، جن پر آپ اور میں چلتے ہیں۔ یہ بہت بڑا ادعا ہے جسے سائنسی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جدید تجزیہ پسندی، جدید سائنس پرستی کی نظریہ بازی کی تحریک کا ایک حصہ ہے۔ ہمارے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہ بات ثابت کریں کہ اسلامی کونیات کا جدید نظریوں اور مفروضات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک بالکل مختلف آرٹ، بالکل مختلف علم اور بالکل مختلف اندازِ فکر و نظر ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دو بالکل مختلف و متضاد چیزوں، دو بالکل

مختلف ومتضاد علوم، دو بالکل مختلف ومتضاد عقلی مشاغل کے لیے ایک ہی لفظ بولا جاتا ہے۔ روایتی کونیات اور جدید کونیاتی مفروضات میں زمین آسمان کا فرق ہے، جو پچھلی صدی میں وضع ہوئے ہیں اور جو محض ارضی طبیعیات کی توسیع ہیں۔ مغرب کے تخلیق حیات [Creation of life] کے تصورات گزشتہ تین صدیوں میں سرعت سے تبدیل ہوئے ہیں اور سائنس داں کسی ایک نقطۂ نظر پر متفق نہیں ہو سکے، اس کے برعکس تخلیق حیات کے آغاز کے تعلق کے بارے میں پوری اسلامی عقلی روایت کا فیصلہ ہے جس کی توثیق حکمتِ قدیمہ نے کر رکھی ہے کہ ہر چیز کا مبدا ذات باری تعالیٰ ہے۔ ہر چیز جو موجود ہے، اس کا وجود ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اگر مغربی فلسفے یا مذہب کی زبان میں بات کریں تو کہا جائے گا کہ تمام مخلوقات کا مصنف خدا کا ہاتھ ہے، جو چیز بھی خلق کی گئی ہے وہ اسی مصنف اعظم نے پیدا کی ہے۔ زندگی ایک عجیب اور مختلف نوعیت کی چیز ہے جو کرۂ ارض کی سطح پر پائی جاتی ہے جہاں ہم اس کا مشاہدہ بے جان مادے کے مقابل کرتے ہیں اور یہ خیال کہ خالق اور اس کی مخلوقات کا باہمی تعلق صرف مبدائے کائنات کے نقطۂ آغاز سے ہے اور اس کا نقطۂ آغاز بگ بینگ ہے اور بگ بینگ کے فوراً بعد خالق ومخلوق کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ یہ خیال محض ایک خود ساختہ مفروضہ ہے جسے اسلام ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک رضائے الٰہی ہر وقت اور ہمہ دم اپنی مخلوقات کے ساتھ رہتی ہے۔ رضائے الٰہی آپ کے ساتھ بھی ہے، میرے ساتھ بھی ہے لہٰذا مخلوقات کی ابتداء کا مسئلہ بہت آسان اور قابل فہم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک اور امر ربی ہے، ایک اور خداوندی شانِ نزول، مادی دنیا میں شمولیت، حقیقت مطلقہ کے ایک اور مکانی تانے بانے کا تعارف۔ پس اگرچہ ہم کیمیاوی اور حیاتیاتی عناصر میں زنجیری عمل پیدا کرنے کی بڑی کوشش کرتے ہیں لیکن ان مادوں میں کوئی مکمل تعامل پیدا نہیں ہو پاتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر تسلسل نہیں تو پھر ایک جست سہی، ایک لمبی کوانٹم چھلانگ۔ جدید سائنس میں اگرچہ قدرت کی تخلیق سے 'خدا کا ہاتھ' کاٹ دیا گیا ہے۔ یعنی تخلیق سے خدا کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی تخلیق کی قوت کائنات کے اندر الوہیت، وحدت اور ماورائیت کی صورت میں جاری وساری محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ سائنس داں ایسی اصطلاحات استعمال نہیں کرتے۔ یوں لگتا ہے جیسے تخلیق کی قوت خدا کے ہاتھوں سے لے کر قدرت کے ہاتھوں میں دے دی گئی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی یکا یک کیمیاوی عناصر کا ملغوبہ چھلانگ لگا کر ایک زندہ مخلوق بن جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چھلانگ خود دنیائے فطرت کے اندر سے لگائی گئی ہے۔ اور یہ سوچ کر کہ یہ سب کچھ خود بخود ہوا ہے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ اس پودے کا عمل ایک ماورائی سبب ہے تو وہ مضطرب ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے! یہ اُس فلسفے کی وجہ سے عین ممکن ہے جو آج دنیائے جدید پر مسلط ہے، حالانکہ اس کی کوئی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں اگر یوں کہا جائے کہ چھلانگ بیرونی عوامل کے سبب سے نہیں بلکہ اندرونی عوامل کے سبب سے لگی ہے تو یہ بڑی اہم، قابل فہم اور قابل ذکر بات ہے۔ [مغربی انسان حقیقت، علم، خیر، حق، سچ کے لیے باھر نہیں

اندر جھانکتا ھے اندرون اس کا اختصاص ھے اس کا نفس اس کا باطن ھی سر چشمہ علم و خیر ھے باھر سے نہ حق آتا ھے نہ خیر نہ علم ،اس کا فوارہ اندر سے پھوٹتا ھے لھذا بیرونی عوامل کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ھے کہ علم خارج سے آتاھے ، اسی تصور کے ساتھ ھی انھیں وحی الٰھی [Revelied Knowledge] اورروایتی تھذیبیں یاد آتی ھیں مذھب کی خارجی بیرونی مقتدرہ [External Authority] یاد آتی ھے ۔ا- یہ بات اس چھلانگ پر بھی صادق آتی ہے، جو زندگی سے شعور کی طرف لگائی جاتی ہے بلکہ یہ چھلانگ زیادہ بڑی اور لمبی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک پرندے کو اڑتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس سوچ میں پڑ جانے کی کوئی منطق نہیں ہے کہ پر ایک ایسے عضو سے بتدریج پیدا ہوئے تھے جس کا پرواز سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یا یہ فرض کرنے بیٹھ جائیں کہ آنکھ کسی عجیب عضو سے ارتقاء پا رہی تھی کہ یکایک اس نے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس قسم کی سوچ بالکل فضول ہے۔ لیکن ایسی باتوں پر ہم یقین کر لیتے ہیں اور حقیقت کی ان نشانیوں پر یقین نہیں کرتے جو قدرت میں نظر آ رہی ہیں اور جن میں کثرت ہے، تنوع ہے، متنوع حقائق ہیں، متنوع اشکال ہیں، متنوع انواع ہیں، زندگی کی متنوع صورتیں ہیں، متنوع صلاحیتیں اور توانائیاں ہیں۔ اسلامی کونیات کے تصورات، اسلامی تاریخ وتہذیب کے لیے اجنبی نہیں ان کی دریافت، شناخت اور فروغ کا عمل جاری و ساری ہے۔ اگر ہمارے پاس با صلاحیت مسلمان علماء اور مفکرین اور علوم عقلیہ کے ماہرین کی کھیپ موجود ہو جن کی جڑیں اپنی روایت میں بہت گہری ہوں تو وہ تمام چیزوں کے درمیان کمال درجے کا ارتباط پیدا کر سکتے ہیں۔ جدید نظریہ ارتقاء سے ہمارے جدید مفکرین عجیب وغریب خیالات اخذ کرتے ہوئے تخلیق کے مراحل کی درمیانی کڑیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے عجیب احمقانہ نتائج نکالتے ہیں مثلاً اخذ نتائج کا جو مقبول طریقہ یہ ہے کہ

جدید ارتقائی ذہن نظریہ ارتقاء کے اثبات کے لیے مختلف قسم کو اشیاء کی انواع اور اصناف میں تقسیم کر کے ان کے درجات قائم کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ تحقیق کا قدم آگے بڑھاتا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر یہ متنوع اور متفاضل اشیاء بنیں کیسے؟ اور ان کے تنوع اور تفاضل میں اور بعض کے باقی اور بعض کے معدوم ہو جانے میں کیا اسباب اور کیا قوانین کارفرما ہیں؟ چونکہ یہ ڈارونی جدید ارتقائی ذہن کسی ایسی ہستی کا قائل ہی نہیں جو ان چیزوں کو اپنی مختلف مصلحتوں کے لحاظ سے بناتی ہے جن چیزوں کی ضرورت باقی ہے انھیں بنائے چلی جاتی ہے، جن کی ضرورت باقی نہیں رہتی انھیں بنانا چھوڑ چکی ہے، اور جن کی ضرورت اب کسی دوسری شکل کی چیز سے بہتر طور پر پوری ہونے لگی ہے انھیں بنانا چھوڑتی جا رہی ہے۔ لیکن جدید سائنسی ارتقائی ذہن کسی وجہ سے کسی ایسی ہستی کو فرض کرنے سے بچنا چاہتا ہے، اس لیے وہ قیاس کا رُخ دوسری طرف پھیر کر اپنے منظر کی توجیہہ اس طرح شروع کر دیتا ہے کہ ان تمام مصنوعات کی ابتداء غالباً صنعت کے ایک ہی ابتدائی تخم سے ہوئی تھی، پھر اس میں ارتقاء شروع ہوا اور ماحول کے فلاں فلاں اسباب

سے ان اشیاء کی مختلف انواع وجود میں آئیں، پھر انواع نے ایک دوسرے کے خلاف کشمکش شروع کی اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے ماحول سے اپنے آپ کو موافق کرنے اور ماحولی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں جو مصنوعات ناکام رہ گئیں وہ مٹ گئیں اور جو کامیاب ہوئیں انھیں ماحول نے بقا کے لیے چن لیا، یہی کشمکش ان مصنوعات کی شکلوں اور صفتوں کے ارتقاء کی موجب ہوئی اور بقاء کی جدوجہد ہی میں ایک نوع کی چیزیں ترقی کرتے کرتے دوسری نوع کی مصنوعات میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ مثلاً وہ قیاس کرتا ہے کہ چھکڑے کی نوع مدتوں زور لگاتی رہی یہاں تک کہ اس کے بعض قابل تر افراد کی ترکیب میں تغیرات رُونما ہوتے چلے گئے اور بالآخر وہ بگھی میں تبدیل ہوگئے، پھر بگھی کی نوع نے زور لگانا شروع کیا حتی کہ اس کے بعض قابل افراد کی ترکیب میں پھر تغیر آنے لگا اور بالآخر وہ موٹر میں تبدیل ہوگئے، پھر بعض موٹروں نے اونچے اونچے درختوں اور مکانوں اور عمارتوں کو دیکھ کر ان کے اوپر پہنچنا چاہا اور اس کوشش میں اچکنا شروع کیا یہاں تک کہ اچکتے اچکتے ان کے پر نکل آئے اور بالآخر وہ ہوائی جہاز میں تبدیل ہوگئیں۔

اس ارتقائی ذہن کے ساتھ نظریہ ارتقاء پر ایمان رکھنے والے ہمنواء ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ قبلہ چھکڑے سے بگھی اور بگھی سے موٹر اور موٹر سے ہوائی جہاز تک بتدریج جو ارتقاء ہوا ہوگا تو لازماً چھکڑے اور بگھی کے درمیان اور بگھی اور موٹر کے درمیان اور موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان بہ کثرت ایسی کڑیاں پائی جانی چاہئیں جو ان میں سے ہر دو نوعوں کے بیچ کا فاصلہ ابھی طے کر رہی ہوں، اور اس فاصلے میں ہر ہر قدم پر اور درمیانی کڑیوں کے مختلف افراد ایک قافلے کی طرح آگے پیچھے چلتے نظر آنے چاہئیں مثلاً بگھی اور موٹر کے درمیانی فاصلے میں بہت سی ایسی اقسام کی گاڑیاں ملنی چاہئیں جو ابھی کچھ بگھی ہوں اور کچھ موٹر ہونے کے مختلف درجوں میں ہوں۔ اور اسی طرح موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان ایسی بہت سی اقسام کی سواریاں پائی جانی چاہئیں جو ابھی پر نکال رہی ہوں۔

اس سوال کو سن کر ارتقائی ذہن کے حامل کچھ دیر سوچتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ ہاں یہ درمیانی کڑیاں ضرور پائی جاتی ہوں گی۔ بگھی تو دیکھو تمھارے سامنے موجود ہے۔ اس بگھی سے ''بگھ موٹر'' بنا ہوگا پھر وہ ''موٹر بگھے'' میں تبدیل ہوا ہوگا پھر اس نے ''موٹر بگھ'' کی شکل اختیار کی ہوگی پھر وہ اس موٹر کار میں تبدیل ہوگیا جسے تم دیکھ رہے ہو۔ پھر موٹر اپنی ارتقائی جدوجہد سے ''پنکھ موٹرا'' بنی ہوگی، پھر وہ ''موٹر پنکھ'' میں تبدیل ہوئی ہوگی پھر ''موٹر پنکھا'' پیدا ہوا ہوگا، پھر وہی تبدیل ہوکر یہ ہوائی جہاز بن گیا جو تمھیں اڑتا ہوا نظر آرہا ہے۔ یہ بیچ کی کڑیاں جن کے نام میں نے لیے ہیں ضرور کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہوں گی جاؤ اور مٹی کے ڈھیروں میں انھیں تلاش کرو۔

بڑے استاد تو یہ کہہ کر خاموش ہوگئے مگر عقیدہ ارتقاء پر ایمان رکھنے والے بالشتیے جو ڈاروِن کی نبوت پر ایمان لا چکے تھے اس نادر تحقیق پر ایسا ایمان لائے کہ انھوں نے استاد کے کلام میں سے ''غالباً'' اور ''ہوا ہوگا'' کو بھی نکال دیا اور اب وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس کو ''یقیناً'' اور ''ہے'' کے ساتھ

بیان کرنے لگے ہیں ان کے علمی لکچروں میں ''موٹر بگھا'' اور ''پنکھ موٹرا'' وغیرہ خیالی موجودات کا ذکر اس طرح آتا ہے گویا کہ یہ چیزیں کہیں ان کے میوزیم میں موجود ہیں۔ حالاں کہ موجود اگر کچھ ہے تو وہ صرف بگھی، موٹر اور ہوائی جہاز ہے''۔ نظریہ ارتقاء، بقائے اصلح کے قانون، اور ڈارون کے خود ساختہ سائنسی نظریات کی روشنی میں اسی قسم کی الل ٹپ تحقیقات سائنسی تحقیقات کے نام پر پیش کی جارہی ہیں، انہی سے متاثر ہوکر کارل مارکس نے اپنی کتاب ''داس کیپٹل'' کا انتساب ڈارون کے نام کیا اور ڈارون کی سائنس سے اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ مارکس خود کو سائنس داں سمجھتا اور لکھتا تھا اور مارکس ازم کو بھی سائنس قرار دیتا تھا اس قسم کی جدید سائنس کی وکالت اب جدیدیت پسند مسلم مفکرین فرمارہے ہیں۔

بگ بینگ: قدیم وجدید نظریات کا خاکہ:

عہد یونانی سے لے کر عہد حاضر تک اس کائنات کے بارے میں سائنس دانوں اور فلسفیوں نے کیا کیا نظریات پیش کیے اس کا ایک اجمالی جائزہ ذاکر نائیک صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے:

Historical cosmologies

The following table outlines the significant historical cosmologies in chronological order.

Historical descriptions of the cosmos

Name	Author and date	Classification	Remarks
Brahmanda	Hindu Rigveda (1500-1200 B.C.)	Cyclical or oscillating, Infinite in time	The universe is a cosmic egg that cycles between expansion and total collapse. It expanded from a concentrated form -a point called a Bindu. The universe, as a living entity, is bound to the perpetual cycle

			of birth, death, and rebirth
Atomist universe	Anaxagoras (500-428 B.C.) & later Epicurus	Infinite in extent	The universe contains only two things: an infinite number of tiny seeds, or atoms, and the void of infinite extent. All atoms are made of the same substance, but differ in size and shape. Objects are formed from atom aggregations and decay back into atoms. Incorporates Leucippus' principle of causality: "nothing happens at random; everything happens out of reason and necessity." The universe was not ruled by gods.
Stoic universe	Stoics (400-200 B.C.)	Island universe	The cosmos is finite and surrounded by an infinite void. It is in a state of flux, as it pulsates in size and periodically passes through upheavals and conflagrations.

Aristotelian universe	Aristotle (384-322 B.C.)	Geocentric, static, steady state, finite extent, infinite time	Spherical earth is surrounded by concentric celestial spheres. Universe exists unchanged throughout eternity. Contains a 5th element called aether (later known as quintessence).
Aristarchean universe	Aristarchus (circa 280 B.C.)	Heliocentric	Earth rotates daily on its axis and revolves annually about the sun in a circular orbit. Sphere of fixed stars is centered about the sun.
Seleucian universe	Seleucus of Seleucia (circa 190 B.C.)	Heliocentric	Modifications to the Aristarchean universe, with the inclusion of the tide phenomenon to explain heliocentrism.

Ptolemaic model (based on Aristotelian universe)	Ptolemy (2nd century A.D.)	Geocentric	Universe orbits about a stationary Earth. Planets move in circular epicycles, each having a center that moved in a larger circular orbit (called an eccentric or a deferent) around a center-point near the Earth. The use of equants added another level of complexity and allowed astronomers to predict the positions of the planets. The most successful universe model of all time, using the criterion of longevity. Almagest (the Great System).

Aryabhatan model	Aryabhata (499 A.D.)	Geocentric or Heliocentric	The Earth rotates and the planets move in elliptical orbits, possibly around either the Earth or the Sun. It is uncertain whether the model is geocentric or heliocentric due to planetary orbits given with respect to both the Earth and the Sun.
Abrahamic universe	Medieval philosophers (500-1200)	Finite in time	The universe that is finite in time and has a beginning is proposed by the Christian philosopher, John Philoponus, who argues against the ancient Greek notion of an infinite past. Logical arguments supporting a finite universe are developed by the early Muslim philosopher, Alkindus; the Jewish philosopher, Saadia Gaon; and the Muslim theologian, Algazel.

Albumasar model	Ja'far ibn Muhammad Abu Ma'shar al-Balkhi (787-886)	Heliocentric	His planetary orbits are only given with respect to the Sun rather than the Earth, thus suggesting a heliocentric model.
Maragha models	Maragha school (1259-1474)	Geocentric	Various modifications to the Ptolemaic model and Aristotelian universe, such as the rejection of the equant and eccentrics at the Maragheh observatory, the first accurate lunar model by Ibn al-Shatir, and the rejection of a stationery Earth in favour of the Earth's rotation by Ali
Nilakanthan model	Nilakantha Somayaji (1444-1544)	Geocentric and Heliocentric	A universe in which the planets orbit the Sun and the Sun orbits the Earth, similar to the later Tychonic system.

Copernican universe	Nicolaus Copernicus (1543)	Heliocentric	The geocentric Maragha model of Ibn al-Shatir adapted to meet the requirements of the ancient heliocentric Aristarchean universe in his De revolutionibus orbium coelestium.
Tychonic system	Tycho Brahe (1546-1601)	Geocentric and Heliocentric	A universe in which the planets orbit the Sun and the Sun orbits the Earth, similar to the earlier Nilakanthan model.
Static Newtonian	Sir Isaac Newton (1642-1727)	Static (evolving), steady state, infinite	Every particle in the universe attracts every other particle. Matter on the large scale is uniformly distributed. Gravitationally balanced but unstable.

Cartesian Vortex universe	René Descartes 17th century	Static (evolving), steady state, infinite	A system of huge swirling whirlpools of aethereal or fine matter produces what we would call gravitational effects. His vacuum was not empty. All space was filled with matter that swirled around in large and small vortices.
Hierarchical universe	Immanuel Kant, Johann Lambert 1700s	Static (evolving), steady state, infinite	Matter is clustered on ever larger scales of hierarchy. Matter is endlessly being recycled.
Einstein Universe with a cosmological constant	Albert Einstein 1917	Static (nominally). Bounded (finite)	"Matter without motion." Contains uniformly distributed matter. Uniformly curved spherical space; based on Riemann's hypersphere. Curvature is set equal to. In effect is equivalent to a repulsive force which counteracts gravity. Unstable.

De Sitter universe	Willem de Sitter 1917	Expanding flat space. Steady state.	"Motion without matter." Only apparently static. Based on Einstein's General Relativity. Space expands with constant acceleration. Scale factor (radius of universe) increases exponentially, i.e. constant inflation.
MacMillan	William MacMillan 1920s	Static & steady state	New matter is created from radiation. Starlight is perpetually recycled into new matter particles.
Friedmann universe of spherical space	Alexander Friedmann 1922	Spherical expanding space. k= +1 ;no	Positive curvature. Curvature constant k = +1 Expands then recollapses. Spatially closed (finite).
Friedmann universe of hyperbolic space	Alexander Friedmann 1924	Hyperbolic expanding space. k= -1 ; no	Negative curvature. Said to be infinite (but ambiguous). Unbounded. Expands forever.

Dirac large numbers hypothesis	Paul Dirac 1930s	Expanding	Demands a large variation in G, which decreases with time. Gravity weakens as universe evolves.
Friedmann zero-curvature, also known as the Einstein-DeSitter universe	Einstein & DeSitter 1932	Expanding flat space. k= 0 ; Critical density	Curvature constant k = 0. Said to be infinite (but ambiguous). 'Unbounded cosmos of limited extent.' Expands forever. 'Simplest' of all known universes. Named after but not considered by Friedmann. Has a deceleration term q =½ which means that its expansion rate slows down.
Georges Lemaître the original Big Bang. aka Friedmann-Lemaître Model	Georges Lemaître 1927-29	Expansion Gravity	is positive and has a magnitude greater than Gravity. Universe has initial high density state ('primeval atom'). Followed by a two stage expansion. is used to destabilize the universe. (Lemaître is considered to be the father of the big bang model.)

Oscillating universe (aka Friedmann-Einstein; was latter's 1st choice after rejecting his own 1917 model)	Favored by Friedmann 1920s	Expanding and contracting in cycles	Time is endless and beginningless; thus avoids the beginning-of-time paradox. Perpetual cycles of big bang followed by big crunch.
Eddington	Arthur Eddington 1930	first Static then Expands	Static Einstein 1917 universe with its instability disturbed into expansion mode; with relentless matter dilution becomes a DeSitter universe. dominates gravity.

Milne universe of kinematic relativity	Edward Milne, 1933, 1935; William H. McCrea, 1930s	Kinematic expansion with NO space expansion	Rejects general relativity and the expanding space paradigm. Gravity not included as initial assumption. Obeys cosmological principle & rules of special relativity. The Milne expanding universe consists of a finite spherical cloud of particles (or galaxies) that expands WITHIN flat space which is infinite and otherwise empty. It has a center and a cosmic edge (the surface of the particle cloud) which expands at light speed. His explanation of gravity was elaborate and unconvincing. For instance, his universe has an infinite number of particles, hence infinite mass, within a finite cosmic volume.

Friedmann-Lemaître-Robertson-Walker class of models	Howard Robertson, Arthur Walker, 1935	Uniformly expanding	Class of universes that are homogenous and isotropic. Spacetime separates into uniformly curved space and cosmic time common to all comoving observers. The formulation system is now known as the FLRW or Robertson-Walker metrics of cosmic time and curved space.
Steady-state expanding (Bondi & Gold)	Herman Bondi, Thomas Gold 1948	Expanding, steady state, infinite	Matter creation rate maintains constant density. Continuous creation out of nothing from nowhere. Exponential expansion. Deceleration term q = -1.
Steady-state expanding (Hoyle)	Fred Hoyle 1948	Expanding, steady state; but unstable	Matter creation rate maintains constant density. But since matter creation rate must be exactly balanced with the space expansion rate the system is unstable.

Ambiplasma	Hannes Alfvén 1965 Oskar Klein	Cellular universe, expanding by means of matter-antimatter annihilation	Based on the concept of plasma cosmology. The universe is viewed as meta-galaxies divided by double layers -hence its bubble-like nature. Other universes are formed from other bubbles. Ongoing cosmic matter-antimatter annihilations keep the bubbles separated and moving apart preventing them from interacting.
Brans-Dicke	Carl H. Brans; Robert H. Dicke	Expanding	Based on Mach's principle. G varies with time as universe expands. "But nobody is quite sure what Mach's principle actually means."

Cosmic inflation	Alan Guth 1980	Big Bang with modification to solve horizon problem and flatness problem.	Based on the concept of hot inflation. The universe is viewed as a multiple quantum flux -hence its bubble-like nature. Other universes are formed from other bubbles. Ongoing cosmic expansion kept the bubbles separated and moving apart preventing them from interacting.
Eternal Inflation (a multiple universe model)	Andreï Linde 1983	Big Bang with cosmic inflation	A multiverse, based on the concept of cold inflation, in which inflationary events occur at random each with independent initial conditions; some expand into bubble universes supposedly like our entire cosmos. Bubbles nucleate in a spacetime foam.

Cyclic model	Paul Steinhardt; Neil Turok 2002	Expanding and contracting in cycles; M theory.	Two parallel orbifold planes or M-branes collide periodically in a higher dimensional space. With quintessence or dark energy.

نائیک صاحب اس فہرست کے مطالعے کے بعد حسین نصر اور مظفر اقبال کے مکالمے پر مشتمل کتاب *Islam, Science Muslims & Technology [2007]* کا مطالعہ فرمائیں یا حسین نصر اور مظفر اقبال کی مشترکہ کاوش *Science & Islam* کا جائزہ لیں تو نھیں معلوم ہوگا کہ سورۃ الانبیاء سے بگ بینگ کا استدلال ایک غیر علمی رویہ ہے جس سے رجوع کی ضرورت ہے۔

کیا عہد جدید کا سائنس دان باطل خداؤں کو رد کر چکا؟

ذاکر نائیک صاحب فرماتے ہیں:

"یہی وجہ ہے کہ آج کا سائنس دان جھوٹے خداؤں کو تو رد کر چکا ہے یعنی لا الہ کے مقام پر تو پہنچ چکا ہے لیکن الا اللہ کی منزل تک نہیں پہنچ پایا"۔[1] اس کے بعد ذاکر نائیک صاحب نے قرآن کی آیت ۵۳ حم السجدۃ نقل کی ہے:

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاھد ہے"۔[2] لیکن اس آیت کو پیش کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ اس سوال کا جواب جان بوجھ کر نہیں دیا کہ یورپی سائنس دان گزشتہ تین سو برس سے اپنے انفس و آفاق میں خدا کی نشانیاں برابر دیکھ رہے ہیں تو وہ اب تک اس قرآن پر ایمان کیوں نہیں لائے؟ اس ایمان میں کیا رکاوٹ ہے اور کیوں ہے؟ ذاکر نائیک صاحب کو یہ بات کن ذرائع سے معلوم ہوئی کہ آج کا سائنس داں جھوٹے خداؤں کو رد کر چکا ہے۔ براہ کرم دنیا کے ستر لاکھ سائنس دانوں میں سے سترہ سو کے نام بتایئے جو کس کس جھوٹے خدا کو رد کر چکے ہیں اور آپ کو انھوں

---

[1] ذاکر نائیک، خطباتِ ذاکر نائیک، صفحہ ۵۶۔

[2] ایضاً، صفحہ ۵۶۔

نے اس امر کی اطلاع کب دی؟ آپ نے ان ستر لاکھ سائنس دانوں سے کب انٹرویو کر کے یہ معلوم کرلیا کہ وہ لا الہ کے مقام پر پہنچ گئے ہیں، اس مقام کی اطلاع آپ تک کیسے پہنچی اور الا اللہ کے مقام تک پہنچنے میں خطبات ذاکر نائیک ان کی معاونت کیوں نہیں کر رہے؟ امید ہے ذاکر نائیک صاحب ہمیں جوابات سے محروم نہ رکھیں گے۔

چھٹا باب

اسلام: دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ

تمام ادیان کو مشترک نقطے پر آنے کی دعوت: قرآن کا مطالبہ؟

سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ کی تشریح کرتے ہوئے ذاکر نائیک صاحب کہتے ہیں کہ: ''کیونکہ یہ عقیدہ کا معاملہ ھے اور عقیدے کا رشتہ تمام رشتوں سے برتر ھے. عقیدے کے اس رشتے کی اساس اس یقین پر ھے که ایک ھی خدائے بزرگ و برتر اس کائنات کا خالق ھے تمام مذاھب فی الاصل اسی عقیدے کی تبلیغ کرتے ھیں اور جیسا میں نے آپ کے سامنے قرآن کی آیت پیش کی اسلام اسی مشترکه بات کی طرف آنے کی دعوت دیتا ھے''.[1] ذاکر نائیک صاحب یہاں وحدت ادیان کی وکالت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام محرف آسمانی مذاہب کی تعلیمات میں توحید کی مستور تعلیم مل جاتی ہے حتی کہ ہندومت میں بھی خدائے واحد پر ایمان کا پیغام موجود ہے لیکن یه توحید خالص نهیں مخلوط توحید ہے اگر دل کی آنکھ سے اس کا جائزہ لیا جائے تو آثار توحید ہر مذہب کے محرف ملبے میں آج بھی مل جائیں گے، امم سابقہ مثلاً عیسائیت اور یہودیت اپنے سابقہ ادوار میں توحید خالص کی ہی تعلیم و تدریس کے حامل تھے، لیکن ان کے احبار و رہبان نے دنیا کے فوائد سمیٹنے کے لیے کلام الٰہی میں تحریف کر کے اسے کفر و شرک سے معمور کر دیا، اس شرک سے آگاہ کرنے اس سے بے زار کرنے کے لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو کائنات میں آخری پیغمبر کے طور پر بھیجا گیا آپ کی لائی ہوئی تعلیمات تمام انبیا کے پیغام کا جامع اور کامل ترین مجموعہ ہے اور آپ کی تعلیمات تمام انبیا کے مقصد بعثت کا تتمہ ہیں۔ اس لیے نائیک صاحب کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ آج بھی تمام مذاہب فی الاصل ایک ہی خدائے بزرگ و برتر پر عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں مذاہب عالم توحید پر ایمان ہی نہیں رکھتے اور شرک کی تبلیغ کرتے ہیں یہ محض دعویٰ نہیں قرآن کے نصوص سے ثابت شدہ امر ہے، سورۃ مائدۃ کی آیت:

---

[1] ذاکر نائیک، ''اسلام دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ''، مشمولہ خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۴۵۔

۱۱۶ میں ہے: وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ. "اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو تو وہ عرض کریں گے سبحان اللہ میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا۔ قرآن کی نص کے مطابق عیسائیت خدائے بزرگ کے عقیدے کی تبلیغ نہیں کرتی وہ تثلیث کے عقیدے یا سراسر شرک کی تبلیغ کرتی ہے۔ اگر عیسائیت توحید کو مان لیتی تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو قبول کر لیتی جو قرآن کی زبان میں دی گئی ہے تو اسلام اور اہل کتاب میں کوئی تنازعہ اور اختلاف باقی ہی نہیں رہتا قرآن کے الفاظ پڑھیے: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ [۳:۶۴] اہل کتاب نے مخلوط توحید میں مشترک نقطۂ توحید پر متفق ہونے کی دعوت رد کر دی لہٰذا اہل کتاب اور عیسائیت نے عقیدہ توحید کو خالص کرنے سے انکار کر دیا۔ یہودیت، عیسائیت خالص توحید کی طرف دعوت نہیں دیتے وہ شرک کی طرف بلاتی ہے اگر تمام مذاہب توحید کی دعوت دیتے اور اگر فی الحقیقت ایسا ہوتا تو مذاہب عالم میں اتحاد ممکن ہو جاتا۔ مذاہب عالم میں اسلام کو خالص عقیدۂ توحید کی بنیاد پر منفرد مقام حاصل ہے، اسی لیے یہ دین الحق ہے اس کے تصور توحید کو دیگر ادیان عالم کے تصور توحید سے مماثل قرار دینا لاعلمی اور سادگی کی انتہا ہے۔

ساتواں باب

اسلام میں خواتین کے حقوق

جدیدیت کی اصطلاح سے کامل ناواقفیت:

ڈاکٹر ذاکر نائیک نے اس خطبے میں Modernize کا مطلب آکسفرڈ ڈکشنری اور ویبسٹر ڈکشنری سے اخذ کیا ھے اور ماڈرن کے معنی لکھے ھیں کہ جدید بنانا، جدیدمذاق کے مطابق ڈھالنا، دور حاضر کے تقاضوں سے ھم آھنگ کرنا ،ایک نئی شکل و صورت دینا مثال کے طور پر نظریات کو جدید شکل دینا... گویا موجودہ صورت حال بذات خود جدت نہیں کھلائے گی۔[1]

جدیدیت ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے لہٰذا اس کے معنی انگریزی زبان کی لغت میں تلاش کرنے کے بجائے لغت فلسفہ [Dictionary of Philosophy] یا دائرۃ المعارفِ فلسفہ [Encyclopedia of Philosophy] میں تلاش کرنا چاہیے یا ان جدید فلاسفہ مغرب کی اصل کتابوں سے رجوع کرنا چاہیے جنھوں نے سترہویں صدی میں جدیدیت سے دنیا کو روشناس کرایا ڈیکارٹ اور کانٹ اور عہد حاضر میں ریگن ہیبر ماس اس اصطلاح کے تعین کے سلسلے میں بنیادی مفکر ہیں جنھوں نے ایک جدید مابعد الطبیعیات کی بنیاد ڈالی جس پر عہد حاضر کا مغرب، اس کی سائنس اور اس کی اخلاقیات کھڑی ہوئی ہے۔ کانٹ کا مختصر مضمون *What is Enlightenment?*[2] اور اس مضمون کی مختصر شرح اس صدی کے بہت بڑے فلسفی فوکالٹ [Foucault] کے اس عنوان کے مضمون میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔[3]

---

1. ذاکر نائیک: ''اسلام میں خواتین کے حقوق: جدید یا فرسودہ''، مشمولہ خطباتِ ذاکر نائیک، صفحہ ۱۳۔
2. www.english.upenn.edu/~mgamer/Etexts/kant.html [31-08-2010]
3. Michel Foucault, *What is Enlightenment?* [ed. Paul Rabinow] New York: Pantheon Books, 1984, pp. 32- 50.

جدیدیت: جدید مغربی فلاسفہ کی نظر میں:

یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ جدیدیت سترہویں صدی سے پہلے کے زمانے کو تاریک دور کیوں کہتی ہے؟ سترہویں صدی سے پہلے کے اربوں انسانوں کو انسان ماننے سے انکار کرنے کا سبب یہ ہے کہ سترہویں صدی سے پہلے تاریخ میں کوئی ایسی تہذیب نہیں گزری جو آخرت، حیات بعد الموت، خارجی ذرائع علم، ملائکہ یا روحانیت کا سراسر انکار کرتی ہو، صرف اور صرف خواہش نفس کی پرستش، شکم اور شہوت کی پوجا اور سرمایہ کمانے کو انسان کا پہلا اور آخری مقصد زندگی سمجھتی ہو اور الوہیت انسان کی قائل ہو اور انسان کو خدا سمجھتی ہو۔ تمام تہذیبیں عبدیت کا تصور رکھتی تھیں، خواہ وہ ناقص ترین تصور ہی کیوں نہ ہو۔ سترہویں صدی سے پہلے ہر تہذیب مافوق الفطرت ہستی پر یقین رکھتی تھی اور اس کائنات کے پس پشت ایک اور کائنات کی قائل تھی۔ ہر تہذیب وراء الوراء کی قائل تھی۔ جدیدیت ماضی کو عہد مظلمہ کہتی ہے سترہویں صدی کے بعد کا مغربی انسان اس تصور کا قائل نہیں رہا لہٰذا یہ جدید انسان ہے، اسی طرز زندگی اور فلسفۂ حیات کا نام ماڈرن ازم ہے۔ ماڈرن ازم خود کیا ہے؟ مغربی فلاسفہ کی نظر میں ماڈرن ازم کی تعریفات درج ذیل ہیں:

[1] Modernity is not based upon one single principle.... it is the result of a dialogue between reason and subjectivity.[1]

[2] This cleavage between reason, rationality, or objectivity on the one hand, and the subject, the collective, and individual selfhood; or subjectivity on the other, occurs in the aftermath of the decline of a concept of transcendence that shaped the metaphysical worldview of Christianity.[2]

[3] Losing hold in traditional religion as a consequence of secularization; the subject is forced to take up the god-like position of a transcendental nodal point in

1.Alain Touraine, *Critique of Modernity.* Dr. David Macey. Cambridge Blackwell, 1995.

2. Cornelia Klinger, "*From Freedom Without Choice to Choice Without Freedom: The Trajectory of the Modern Subject*",in constellations, Volume 6; Volume 11, Blackwell Publishing Ltd., 2004, p.121.

order to ensure the unity and totality of being and experience.[1]

[4] To be autonomous is to be free in the sense of 'self governing' and 'independent'.[2]

[5] Modernity can and will no longer borrow the criteria by which it takes its orientation from the models supplied by another epoch; it has to create its normativity out of itself.[3]

According to Nietzie: "Transformation in the cultural role of science occurs not as an effect of any development in philosophy but with cultural decline of western religion.

By denying God from epistemology and ethics Kant broke that link between epistemology and God, which was still found in Descartes in particular and in classical thought in general.

[6] Kants Wellanchauung "The moral freedom of man is not merely a freedom from nature, but also freedom from external supernatural powers. No one before Kant ever exalted man so much no one had ever accorded him such a degree of metaphysical independence".[4]

[7] The Enlightenment does not take the ideal of this mode of thinking from the philosoplical doctrines of the past, on the contrary, it construct its ideal according to the

---

1. Ibid., p.122.

2. Routledge [Firm], *Concise Routledge Encyclopedia of Philosophy*, Routledge,2000,p.259.

3. Jürgen Habermas: *The Philosophical Discourse of Modernity: Twelve Lectures;* Trans.Frederick G. Lawrence, Cambridge:MIT Press, 1996, p.7.

4. Ibid.,p. 7.

model and pattern of contemporary natural science.[1] Western instrumental reason is embodied in modern technology.

[8] One of the central elements of this modernist world view is a conception of science as the supremely priviledged form of knowledge.[2]

[9] This enlightenment requires nothing but freedom and the most innocent of all that may be called "freedom": freedom to make public use of one's reason in all matters.[3]

[10] Kant in fact describes Enlightenment as the moment when humanity is going to put its own reason to use, without subjecting itself to any authority.[4]

اسلام: تصورریاست: مغرب کی ناگواری:

مغرب نے مذہب کو رد کرنے کے بعد سیاسی نظام اور نظام زندگی کے لیے اخلاقیات پر مبنی چند ضابطے صرف ان کے لیے ہیں جو سولائزڈ moral کہلاتے ہیں، یہ moral norms ترتیب دیے جو لوگ ہیں۔ سولائزڈ لوگ وہ ہیں جو کسی خارجی ذریعہ علم سے علم حاصل نہیں کرتے، عقل کو ماخذ علم تسلیم کہلاتے Human کرتے ہیں اور کسی اتھارٹی کو اتھارٹی تسلیم نہیں کرتے یہی لوگ مغرب میں Human صرف انہی انسانوں کے لیے ہیں۔ [Human Rights] ہیں۔ بنیادی حقوق انسانی ہیں۔ روشن خیال اور جدیدیت پسند وہ Modern ہیں، جو Enlightened کون ہیں یہ وہ ہیں جو ہیں جو وحی الٰہی یا کسی بھی خارجی ذریعہ علم کو اتھارٹی ماننے سے انکار کردیں۔ لہٰذا بنیادی حقوق کے منشور میں دیے گئے تمام حقوق صرف ان انسانوں کے لیے ہیں جو مغرب کے تصور انسان، تصور

---

1. Ernst Cassirer, *Philosophy of the Enlightenment*, U.S.A., princeston University press, 1979,p.7.

2. John Gray, *Enlightenment's Wake: Politics and Culture at the Close of the Modern Age,New York*: Routledge, 1995,p.159.

3. http://www.columbia.edu/acis/ets/CCREAD/etscc/kant.html [14-03-2010]

4. Michel Foucault, *The Foucault Reader*, [ed.,Paul Rabinow], Pantheon Books, 1984,p.38.

عقل، تصور آزادی اور تصور مساوات پر یقین رکھتے ہیں اور اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو آپ انسان کہلانے کے مستحق نہیں، Rawls کے الفاظ میں ایسے وحشیوں کو اس طرح مٹا دیا جائے جس طرح ملیریا کے جراثیم ختم کیے جاتے ہیں اور وباء کو ختم کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سا طریقہ سب سے زیادہ موثر ہے لہٰذا افغانستان اور عراق میں وبا اسی جدید سولائزڈ طریقے سے ختم کی جا رہی ہے۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام اور مسلمانوں سے نفرت مغرب کی تاریخ میں پیوست ہے یہ تاریخ صلیبی جنگوں میں اپنی اساس رکھتی ہے لیکن عیسائیت کے خاتمے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں سے اس نفرت کا خاتمہ نہ ہو سکا اور یہ تاریخی نفرت جدیدیت پسند مغربی مفکرین وفلاسفہ میں نہایت شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے، جدیدیت پسند مغرب مذہب کی کسی شکل کا قائل نہیں لیکن اسلام کا تصور اسے سب سے زیادہ ناگوار ہے۔

اس کی واحد وجہ اسلام کا تصور سیاست و ریاست ہے جسے مغرب بار بار [Political Islam] کے نام سے مطعون کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام اپنی سرشت میں ریاست کا داعی ہے کیوں کہ اسلامی قوانین، حدود، تعزیرات کا اطلاق ریاستی ڈھانچے کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا راسخ العقیدہ اسلام جہاں بھی موجود ہے خواہ اپنے چہرے پر جدیدیت کے کتنے ہی نقاب ڈالے اصلاً وہ اسلام کے لیے ریاست کا طالب ہے، شریعت کا کامل نفاذ اور شریعت کی کامل پابندی کا تصور ریاست اور حکومت کے بغیر ناممکن ہے۔ ریاست کے بغیر شریعت پر عمل درآمد میں اور اس کی تنفیذ میں بے شمار موانع درپیش ہوتے ہیں، لہٰذا اسلام جہاں جہاں اور جس جس شکل میں بھی موجود ہے آخر کار وہ سیاسی غلبے اور ریاستی تسلط کا پیغامبر بن جاتا ہے جب کہ ہندومت، عیسائیت اور یہودیت میں مذہب ریاست کے بغیر قابلِ عمل ہے لیکن اسلامی طرز زندگی اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ نجی خانے سے ریاستی بالا خانے تک منتقل نہ ہو۔ اسلام نجی اور عوامی Public اور Private دائروں کی تقسیم روا نہیں رکھتا یہاں ایک ہی دائرہ ہے، زندگی ایک ہی دائرہ کا سفر ہے جو خاندان کی ریاست سے شروع ہو کر حکومت و ریاست کے ایوانوں میں اپنے عروج کو پہنچتی ہے، اس کے بغیر اسلامی زندگی کا تصور ممکن نہیں، ایک مسلمان غلام نہیں رہ سکتا کیوں کہ غلامی شریعت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس تصور سیاست، حاکمیت اور ریاست کو مغرب کسی صورت قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ اسے اس تصور سے نفرت ہے۔

جدیدیت: خاص اوصاف اور انفرادیت:

جدیدیت کا خاص وصف ماضی سے رشتہ توڑ کر صرف اور صرف مستقبل سے رشتہ جوڑنا ہے، جدیدیت ماضی سے مکمل قطع تعلق کرتی ہے۔ خارجی ذریعۂ علم کو مسترد کرتی ہے وہ کسی روایت، وحی، آسمانی

علم، مابعد الطبیعیات، تصور حقیقت، ماضی کی کسی تہذیب، علم حقیقت اور علم کے کسی ذریعے کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے یہاں علم کا ماخذ نفس اور ذات انسانی ہے۔ علم بیرونی دنیا سے نہیں آتا اس کا فوارہ انسان کے اندر سے پھوٹتا ہے۔ جسم انسانی ہی علم کا ماخذ، منبع اور سرچشمہ ہے۔ وہ تاریخ کا انکار کرتی ہے اور ماضی کے کسی علم، روایت، وحی، آسمانی کتاب اور خیر کو قبول نہیں کرتی وہ ماضی سے کٹ کر ایک نئی تاریخ ایک نیا انسان ایک نیا دور تخلیق کرتی ہے اس لیے تمام جدیدیت پسند مفکرین سترہویں صدی سے پہلے کے ادوار کو قرون مظلمہ [Dark Ages] قرار دیتے ہیں اس دور کے انسان کو انسان نہیں سمجھتے اور جدید انسان کو جو سترہویں صدی میں پیدا ہوا صرف اسے انسان قرار دیتے ہیں، فوکالٹ اپنی کتاب *History of Sexuality: The Use of Pleasure*,[Penguin, 1992] میں بتاتا ہے کہ سترہویں صدی سے پہلے لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جنسی عمل کیسے کیا جاسکتا ہے؟ جدیدیت ماضی سے نفرت، انکار، اور ماضی کی تحقیر و تضحیک و تردید پر کھڑی ہے۔

جدیدیت کا بنیادی فلسفہ خارجی ذریعہ علم [External Source of Knowledge] کے انکار پر قائم ہے، یہ انسان کو فاعل خودمختار [self-autonomous] سمجھتا ہے جسے علم کے حصول کے لیے اپنے سے باہر نہیں اپنے اندر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور عقل وہ ماخذ علم ہے جس کی روشنی میں کسی بیرونی روشنی کی ضرورت نہیں۔ انسان کا نفس ہی نص صحیح ہے اس کے احکامات ہی منصوص احکامات ہیں وہ خود خدا ہے، احد ہے، صمد ہے اور قائم بالذات ہستی ہے اور کسی کو جواب دہ نہیں وہ صرف خود کو جواب دہ ہے۔ عقل کو پرکھنے کا پیمانہ عقل ہی ہے یعنی انسانی علم کی انتہا نفس سے شروع ہو کر نفس پر ہی ختم ہو جاتی ہے، خیر و شر کا تعین وہ عقل کی بنیاد پر خود کر سکتا ہے اور عقل ہی وہ منہاج ہے جو عالمگیر اصول و قوانین مرتب کر سکتی ہے۔

اس تعریف کو نظر انداز کرنے کے باعث ذاکر نائیک صاحب یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ: "اسلام کی تعلیمات میں جدت موجود ہے یا یہ فرسودہ ہیں"۔[1] اسلام کے عطا کردہ حقوق نسواں جدید ہیں یا فرسودہ؟ اس طرح ذاکر نائیک ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ایک جدیدیت پسند مذہب [modernist religion] ہے۔ یہ سوال جدیدیت کی درست تعریف کے تناظر میں درست نہیں، اسلام اور اس کی تعلیمات جدیدیت کے منہاج علم میں اس لیے جدید نہیں ہو سکتیں کہ ان کا ماخذ وحی الٰہی اور ذات محبوب الٰہی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی external authority ہے اور خارجی ذریعہ علم کو ماخذ علم ماننے والا مغرب کی نظر میں انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں، ایسے انسان کو زندہ رہنے کا بھی حق نہیں اسی فلسفے کے تحت مغرب ایک ارب پچھتر کروڑ انسانوں کو قتل کر چکا ہے، یورپی اقوام اسی فلسفے

---

[1] ذاکر نائیک، "اسلام میں خواتین کے حقوق جدید یا فرسودہ"، مشمولہ خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۱۹۔

کے تحت براعظم امریکہ کے دس کروڑ سرخ ہندی لوگوں [Red Indians] کا قتل عام کر چکی ہے۔

جدیدیت کے منہاج علم میں آزادی، مساوات اور رواداری [Freedom, Equality and Tolerance] بنیادی اقدار ہیں۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی خارجی ذریعہ علم سے خیر و شر کا تعین کرنے کا مجاز نہیں۔ ہر شخص کو اپنا تصور خیر [Good]، سچ [Truth] خود خلق [Creat] کرنے کی آزادی ہے، خیر و شر کا تعین کوئی خارجی علم نہیں کر سکتا، ہر فرد خود معیارات خیر و شر متعین کر سکتا ہے، ہر شخص کو اس بات کی آزادی ہے کہ وہ جب چاہے خیر و شر کے معیارات بدل لے۔روایتی، تاریخی، مذہبی اور الہامی تہذیبوں میں خیر و شر ایک عظیم و برتر ہستی متعین کرتی تھی اب معاملہ تبدیل ہو گیا ہر شخص کو خیر و شر کا خالق قرار دینے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ خیر و شر فی الاصل کچھ نہیں ہوتے یہ ہر فرد کے نفس کی تصویریں ہیں جب چاہے بدل لے۔ مغربی فلسفے میں یہ جسم اس کی ملکیت ہے اسے جس طرح چاہے استعمال کرے اور دوسرے کی آزادی متاثر کیے بغیر جو چاہنا چاہ سکے وہ چاہے اور وہ کر سکے۔ ان معاملات میں وہ برابر ہے حفظ مراتب کا جدیدیت میں کوئی وجود نہیں سب یکساں درجے کے انسان ہیں باپ، بیٹا، ماں، بیٹی، پیغمبر، امتی، استاد، شاگرد، مسلمان غیر مسلم، علم، العلم، حق الحق کسی کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں کیونکہ سب صاحب عقل وارادہ ہیں یہی عقلیت ان میں مساوات قائم کرتی ہے لہٰذا سب کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے تصور خیر کو الحق سمجھیں اور ایک دوسرے کے تصورات خیر کو برداشت کریں کیونکہ سب تصورات خیر یکساں سطح کے ہوتے ہیں دوسرے معنوں میں الحق اور الخیر کوئی چیز نہیں۔

آٹھواں باب

اسلام میں عورت کے معاشی حقوق

ذاکر نائیک فرماتے ہیں کہ: ''اسلام نے آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے عورت کو معاشی حقوق دیے''[1] یہ بیان مبہم ہے اور درست نہیں ہے۔ اگر یہ بیان درست تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام سے پہلے آنے والے انبیاء کرام کا دین اسلام نہیں بلکہ کچھ اور تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوگا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء، پیغمبر اور رسول دنیا میں آتے رہے لیکن کوئی بھی عورت کو معاشی حقوق نہ دلا سکا اور آخر کار یہ کام رسالت مآبؐ کے ذریعے انجام پایا، یہ تمام انبیاء کی توہین اور تضحیک ہے، نعوذ باللہ۔ حقوق کی بنیاد پر مطالبات کا مغربی منہاج جو امریکہ کے فیڈرلسٹ پیپرز سے شروع ہو کر بنیادی انسانی حقوق کے منشور تک نئی مابعد الطبیعیات کے ساتھ ظہور کر رہا ہے، ذاکر نائیک صاحب نے اسے نظر انداز کر دیا ہے، حقوق کی اصطلاح کا استعمال مغربی منہاج علم و مابعد الطبیعیات میں تو ٹھیک ہے اسلامی منہاج علم میں درست نہیں۔ ذاکر نائیک صاحب کے اس نقطۂ نظر سے خود بخود یہ بات بھی ابھرتی ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے بھی انبیاء آئے کیا ان کی شریعت میں عورت کو وہ سہولتیں حاصل نہ تھیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائیں؟ جبکہ قرآن کریم اس نقطۂ نظر کی تردید کرتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ آدم اول سے خاتم الانبیاءؐ تک تمام رسولوں اور پیغمبروں کا دین ایک یعنی اسلام تھا اور ان رسل وانبیاء کے مابین قرآن کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھتا جب آپ کہتے ہیں کہ صرف چودہ سو برس پہلے عورت کو سہولتیں دی گئیں، حقوق دیے گئے رعایتیں اور آزادی دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک، نعوذ باللہ، تمام انبیاء کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے عورت زنجیروں میں جکڑی ہوئی مخلوق تھی۔ جسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر، نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ اور سابق انبیاء کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرایا۔

عورت کی ملازمت پر دلائل: معذرت خواہی کا شاہکار:

عورت کی ملازمت کے حوالے سے ذاکر نائیک صاحب نے صفحات ۲۵، ۲۶، ۲۷ پر جو

---

[1] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۲۵۔

دلائل دیے ہیں وہ معذرت خواہی کی خوبصورت ترین شکل ہیں۔ اسلام ایک کُل ہے اور عورت اس کُل کا ایک جزو، اسی طرح اسلام ایک کل ہے اور مرد بھی اس کُل کا ایک جزو۔ اسلام ایک کُل ہے اور کسب معاش بھی اس کُل کا ایک جزو۔ لہٰذا اسلامی تہذیب و تاریخ اور اسلامی مابعد الطبیعیات کے تناظر میں جب سوال اٹھایا جائے گا کہ عورت کا سب سے بہترین مقام اور اصل جگہ کیا ہے تو قرآن کے الفاظ میں: وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ "اپنے گھروں میں ٹک کر رہو"، عورت کا اصل مقام اور محل اس کا گھر ہے، اس گھر کو مغربیت اور جدیدیت [Westernization & Modernization] کے نظریات اور تحریک نسواں کی مغربی تحریک [Feminist movement] سے متاثر ہو کر معاشی ترقی کے نام پر گھر سے باہر نکالنا محض جدیدیت ہے۔ عورت کا بنیادی کام کسب معاش نہیں گھر کی اخلاقی و روحانی اور ادارتی صف بندی کی تنظیم، تاسیس اور حفاظت اور نگرانی ہے اس کے سوا ہر کام محض اضافی یا کسی ضرورت کے تحت ہے، اس ضرورت کو مغرب کی اصطلاح میں خیر اور حق قرار دینا مغرب کی پیروی ہے۔

قرآن حکیم نے تمام ازواج مطہرات کے ایمان پر مہر ثبت کر کے ان سے دگنے اجر کا وعدہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پابند فرمادیا تھا کہ آپ کسی اُم المومنین کو طلاق نہیں دے سکتے کیونکہ ان ازواج نے دنیا کی یہ آسائش کو رضا کارانہ ترک فرما کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی رفاقت کو دنیا اور آخرت میں قبول فرمالیا اس ذلیل و حقیر دنیا اور اس کی آرائش و آسائش پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت و محبت آپؐ کے حضور حاضری اور حضوری کی لذت کو ترجیح دی اس دنیا کو ٹھکرادیا اور آخرت کو اختیار کرلیا، قرآن کے الفاظ پڑھیے:

تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُئْوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ مَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكَ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَ لَا يَحْزَنَّ وَ يَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۔ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا [۳۳:۵۱-۵۲] ترجمہ: اے نبیؐ! آپ کے لیے [دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان ازواج مطہرات کی جگہ اور ازواج لے آئیں، خواہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی پسند ہو، لہٰذا ذاکر نائیک کا یہ کہنا کہ اداکاری اور ماڈلنگ اور حسن و جمال نمایاں کرنے والے پیشوں کے سوا عورت کوئی دوسرا باعزت پیشہ اختیار کرسکتی ہے مثلاً ڈاکٹر، نرس، فیکٹریوں میں کام کرنا وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ اگر کارخانے جامعات اور تجربہ گاہیں عورتیں آباد کریں گی تو گھر کو برباد ہونے سے کون روکے گا؟ گھروں کو کون آباد کرے گا؟ بوڑھوں اور بچوں کا خیال کون رکھے گا؟ ٹھیک ہے! سری لنکا، فلپائن سے آپ عورتیں اس خدمت کے لیے منگوالیں، لیکن ان عورتوں کے گھروں میں جب یہی مسئلہ پیدا ہوگا جو آپ کی عورت کے گھر سے نکلنے کے باعث پیدا ہوا تو اس مسئلے کو کون حل کرے گا؟ یہ مغربی تہذیب کا پیدا کردہ نظریہ ہے

کہ گھر کے کام، گھر میں قیام، گھر کی ذمہ داری، بچوں کی تعلیم و تربیت نہایت حقیر، ذلیل کمتر ین کام ہے جس سے عورت کی صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں، اسی لیے مغرب گھریلو عورتوں کو Working Women تسلیم نہیں کرتا کیونکہ کام [Work] کا مطلب Capital سرمایہ کا حصول ہے، جس کام کا معاوضہ نہ ملے وہ مغرب کی معاشی اصطلاح میں کام ہی نہیں ہے، لہٰذا ایسی عورت بے کار عورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گھر کی حفاظت، اس گہوارہ محبت کی شان و شوکت برقرار رکھنے کا ذمہ دار عورت کو قرار دیا ہے۔ مغرب میں عورت باہر کیوں نکالی گئی اس کی پوری تاریخ ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہی، مردوں کی کمی، جنسی آزادی، خاندان کا خاتمہ، لذت پرستی، افادہ پرستی اور مادہ پرستی کا فروغ انفرادیت پرستی، صنعتی ترقی اور اعلیٰ معیارِ زندگی کے باعث خاندانوں کی ٹوٹ پھوٹ مغرب کی ایک طویل تاریخ ہے، اس کو نظر انداز کر کے مغرب کی پیروی میں اپنی عورت کو باہر نکالنے کی شرعی دلیلیں صرف معذرت خواہانہ جدیدیت ہے جس سے ہزار بار پناہ مانگنی چاہئے۔

عورت کی کاروبار میں شمولیت:

"نائیک صاحب عورت کو کاروبار کی بھی اجازت دیتے ھیں ......بشرطیکہ اختلاط مرد وزن نہ ھو اور اگر ھو تو عورت اپنے محرم مرد ،باپ ،بھائی، شوھر کی مدد حاصل کرے"۔[1] سوال یہ ہے کہ یہ محرم مرد اگر اپنی عورتوں کی کاروباری سرگرمیوں کے سرکاری ترجمان [Official Spokesman] بن جائیں تو پھر اپنے معاش کے لیے کس کی مدد حاصل کریں؟ کیا اسلامی تاریخ میں عورت کا مجموعی کردار یہی رہا ہے جس کی اجازت عام دی جارہی ہے؟ کسی عورت کا بہ حالت مجبوری کاروباری سرگرمی میں حصہ لینا اضطراری مسئلہ ہے یہ بھی محض اجازت کے درجے میں ہے اس کو اصول عام کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ خود نائیک صاحب فرماتے ہیں کہ عورت کو جائیداد میں آدھا حصہ اس لیے ملتا ہے کہ اس پر معاش کی ذمہ داری نہیں، جب ذمہ داری نہیں تو عورت کو کاروبار کی اجازت عام کس اسلامی قانون کے تحت دی جارہی ہے؟ نائیک صاحب خود اپنے ہی موقف کی تردید کررہے ہیں۔ اگر مرد حضرات اپنے اخراجات اپنی عورتوں کے کاروبار سے لیں تو یہ بے چارے خود کیوں نہ کاروبار کرلیں؟ اگر عورت مردوں کو روزگار مہیا کرنے لگے تو کیا وہ خود "قوام" کے منصب پر فائز نہ ہوجائے گی؟ مرد کی ذمہ داری گھر کے باہر کے تمام امور اور معاش کی مکمل نگرانی ہے، جس مرد کو کاروبار دنیا کی مکمل اجازت شریعت نے دی ہے اسے کاروبار سے نکال کر اپنی عورتوں کے کاروبار کی نگرانی سونپی جارہی ہے اس کا کیا شرعی جواز ہے؟ عورت کا بازار میں نکلنا، بیٹھنا، مردوں سے کاروبار کرنا اسلامی تاریخ تہذیب و علمیت میں ایک اجنبی تصور ہے، چند استثنائی واقعات کی بنیاد پر عورت کو جبراً

---

[1] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۲۷۔

کاروبار زندگی میں داخل کرنا بدعت، ضلالت اور جہالت ہے اور یہ تصور خالصتاً مغرب سے درآمد کیا گیا ہے۔ عصر حاضر میں مردوں کو روزگار ملنا مشکل ہو گیا ہے تو عورتوں کو کہاں سے روزگار دیا جائے؟ لیکن اگر اتفاقاً عورتوں کو بھی کثرت سے روزگار کے مواقع میسر بھی ہوں تب بھی گھر کی سلطنت کی کمر توڑنے سے بہتر ہے کہ مغربی تہذیب کے فلسفے سے انحراف کیا جائے اور بیرون ملکوں سے اہل ایمان یا دیگر ضرورت مند غیر مسلم افراد کو ملازمت کے مواقع مہیا کیے جائیں نہ کہ اپنے گھروں کو برباد کر کے کارخانوں کو آباد کیا جائے۔ ہمارے جدید مفکرین کا المیہ یہ ہے کہ وہ جزو کی بنیاد پر فتوے دیتے ہیں اور عورت کی ملازمت کے رجحان کو اس کے حقیقی مغربی تناظر میں نہیں دیکھتے اور اسلامی تاریخ میں چند ایک استثنائی واقعات کی بنیاد پر عورت کے گھر سے نکلنے کا پورا فلسفہ گھڑ لیتے ہیں، جزو کی بنیاد پر رائے دینے کا رجحان دن بدن بڑھ رہا ہے۔ دو مختلف مابعد الطبعیات میں اشتراک ممکن نہیں۔

دو متضاد مابعد الطبعیات میں اشتراک ممکن نہیں:

مغرب ایک کُل ہے اسلام دوسرا کُل۔ ایک کُل کے جزو کو لے کر دوسرے کُل کو نظر انداز کر کے اس کے جزو سے اپنے جزو میں مماثلت ومشابہت ومطابقت تلاش کرنا نادانی ہے۔ مسلمانوں، اور اہل تسنن اور اہل تشیع میں حضرت عیسیٰ اور حضرات حسنین وحضرت علیؓ وفاطمہؓ اور خاندان نبوت کی شخصیات مشترک ہیں، لیکن کیا مسلمان جس طرح عظیم پیغمبر حضرت عیسیٰ کو مانتے ہیں کیا عیسائی بھی انہی حضرت عیسیٰ کے قائل ہیں؟ ظاہر ہے نہیں، ہمارے یہاں مسیح رسول اللہ ہیں وہاں مسیح ابن اللہ۔ اب جزو کی بنیاد پر عیسائیت واسلام میں اتحاد پیدا نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اہل تسنن اور اہل تشیع کے یہاں حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ، حضرات حسنینؓ بلاشک وشبہ مشترکہ اور محترم ہستیاں ہیں لیکن ایک انھیں معصوم مانتا ہے دوسرا گروہ ان کی معصومیت تسلیم نہیں کرتا، لہٰذا دونوں کی مابعد الطبعیات الگ ہے لہٰذا دونوں کی مشترکہ اساسیات ظاہری مماثلتوں کے باوجود یکسر مختلف ہیں، اب جزوی مشابہت کی بنیاد پر یہ سمجھ لیا جائے کہ دونوں مکاتب فکر میں کوئی فرق نہیں ہے، تو یہ سمجھنے والے کی سادہ لوحی ہے دونوں مکاتب فکر کے اختلافات مابعد الطبعیاتی اختلافات ہیں اس لیے جزو کی بنیاد پر کل پر حکم لگانا اور جزئیات، ظاہری علامات، اور جزوی مماثلتوں ومشابہتوں کی بنیاد پر ایک شے کو دوسرے پر قیاس کرنا اور ایک مابعد الطبعیات کو دوسری مابعد الطبعیات سے ہم آہنگ سمجھنا مسئلے کو الجھانا ہے۔

اب دیکھیے تراویح کے موقع پر حافظ صاحب کا قرآن سننے والا سامع ان کے بھولنے پر ان کی تصحیح کرتا رہتا ہے، انھیں لقمہ دیتا ہے، اگر امام قرأت میں کچھ بھول جائے تو مقتدی انھیں سہو کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان دو طریقوں کی بنیاد پر یہ استدلال قائم کرنا کہ اسلام میں اظہار رائے کی آزادی [Freedom of Expression] ہے احمقانہ استدلال ہے یا یہ کہنا کہ قرآن میں آتا ہے: وَ

مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ [۹:۵۸،۵۹] ''اے اللہ کے رسول ان میں سے بعض لوگ یہ صدقات کی تقسیم میں آپ پر اعتراضات کرتے ہیں اگر اس مال میں سے کچھ انھیں دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اس کے رسول نے جو کچھ بھی انھیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے''۔ لہٰذا اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ عہد رسالت میں لوگوں کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اعتراض وتنقید کی آزادی قرآن سے ثابت ہے لہٰذا اظہار رائے کی آزادی ایک عالمگیر قدر ہے، جاہلانہ استدلال ہے۔ اسی طرح: وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ [۹:۶۱] ترجمہ: ''ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے''۔ اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ اسلام میں تنقید کی آزادی ہے احمقانہ دلیل ہے کیونکہ اس آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: ''اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک سزا ہے ان دونوں آیات میں منافقین کا ذکر ہے، منافقین کے بارے میں سورہ توبہ اور سورہ منافقون میں جو سخت احکامات آئے ہیں ان کے مطابق منافق کی نماز جنازہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے سے روک دیا گیا، ان کی مغفرت کی دعا کی ممانعت کی گئی، ان کی توبہ قبول کرنے سے اللہ نے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ ان کو دنیا اور آخرت میں عبرت ناک سزا دی جائے لہٰذا آیتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر عصر حاضر کے مسلمہ قدروں مثلاً جمہوریت، آزادی اظہار رائے سے ہم آہنگ کرنا تحریف فی القرآن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ آزادی اظہار رائے ایک خاص اصطلاح ہے جو ایک خاص مغربی تاریخ، تہذیب، ثقافت، خاص تصور علمیت، مابعد الطبیعیات، تصور انسان اور تصور کائنات سے نکلی ہے جبکہ سامع کا لقمہ دینا یا مقتدی کا امام کو غلطی پر متوجہ کرنے کے عمل کا آزادی اظہار رائے سے کوئی تعلق نہیں، اس کا تعلق تواصوا بالحق سے ہے اخوت اسلامی، جذبہ خیر خواہی ہے الدین النصیحۃ سے نہ کہ تنقید اور بکواس کی آزادی کے مغربی کفر سے۔ آج کل اکثر جدیدیت پسند مسلم مفکرین تاریخ اسلامی سے اس طرح کے واقعات چن چن کر جدید فتویٰ نویسی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں جو خطرناک رجحان ہے خواہ یہ کتنے ہی اخلاص سے کیا جائے۔

صحابہ کرامؓ کا ازواج مطہراتؓ سے علمی استفادہ: درست تناظر:

ذاکر نائیک صاحب نے عورت کی آزادی کے لیے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ صحابہ ازواج مطہرات سے دینی تعلیم حاصل کرتے تھے، یہ بات صد درجے قابل غور ہے کہ ازواج مطہرات سے علوم دینیہ میں استفادہ کرنے والے صحابہ اصلاً امہات المومنین کے ذریعہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے

استفادہ کررہے تھے جو ان کی مائیں تھیں جن سے نکاح ان پر حرام تھا۔ ازواج مطہرات صحابہ کرام کے لیے محترم تھیں کیونکہ قرآن نے انھیں ماں کا درجہ عطا فرمایا تھا لیکن یہ درجہ عطا کرنے کے باوجود ازواج کے لیے اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی تقلید کے لیے امت کی تمام عورتوں کے لیے احکامات حجاب نازل کیے گئے اور انھیں ضرورت کے مطابق پردے کے پیچھے سے گفتگو کی ہدایت کی گئی ازواج مطہرات کے ذریعے کاشانہ رسالت میں حکمت کی گفتگو امت تک پہنچائی گئی اسی مقصد کے لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی گئی کہ ازواج مطہرات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ اور آپ کے طرز عمل، طرز معاشرت برتاؤ اور آپ کی پوری زندگی کے ایک ایک لمحے کو اپنی آنکھوں، ذہن، دماغ اور قلب میں محفوظ کر کے امت تک منتقل کردیں۔ ازواج مطہرات کو اللہ تعالی نے یہ فریضہ سپرد کیا کہ کاشانہ نبوت میں جو دین سکھایا جارہا ہے اور جو انوار نبوت تقسیم ہورہے ہیں اسے اخذ و جذب کر کے محفوظ طریقے سے اسے علم وعمل کی قوت کے ساتھ امت تک منتقل کردیں، الاحزاب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تو چاہتا ہے کہ اے امہات المومنین آپ سے رجس [گندگی] کو دور کردے اور آپ کو پوری طرح پاک کردے اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو یاد رکھیے جو آپ کے گھروں میں سنائی جاتی ہیں، بے شک اللہ لطیف وباخبر ہے: وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا [۳۳:۳۳]۔ لہٰذا ازواج مطہرات سے دینی علوم کے حصول کو بنیاد بنا کر عورتوں سے مردوں کے تعلیم حاصل کرنے کے جواز کا استدلال ذاکر نائیک صاحب کا غلط، کمزور اور اسلامی تاریخ وتہذیب اور تعامل امت سے منحرف استدلال ہے۔

ایک ادھورا سچ:

ذاکر نائیک صاحب کہتے ہیں کہ: ''اسلام نے کسی عورت پر بہتان طرازی کے معاملے میں چار گواہوں کی شہادت لازمی قرار دی ہے گویا اسلام کی نظر میں کسی عورت کی عصمت و عفت پر انگلی اٹھانا ایک بہت بڑا جرم ہے[1]'' لیکن یہ ادھورا سچ ہے، نائیک صاحب نے مغرب کو مرعوب کرنے کے لیے نامکمل موقف پیش کیا ہے جو صداقت کے خلاف ہے، اصلاً مرد کے خلاف بھی انگلی اٹھانا اور اس کی پاک دامنی پر تہمت لگانا یکساں درجے کا جرم ہے، مرد پر اس تہمت کے اعلان کے بعد اگر تہمت لگانے والی عورت یا تہمت لگانے والا مرد چار گواہ اپنے دعوے کے حق میں پیش نہ کرے تو اسے بھی اسّی کوڑوں کی سزا ملے

---

[1] ذاکر نائیک: ''اسلام میں عورت کے تعلیمی حقوق'' مشمولہ خطبات ذاکر نائیک، صفحات ۴۳-۴۴۔

گی۔ اس سزا میں مرد وعورت کی کوئی تخصیص نہیں۔

عورت بہ طور سربراہِ مملکت اور قرآن:

ذاکر نائیک صاحب کہتے ہیں کہ:"میرے علم کی حد تک قرآن میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں، کوئی ایسا حکم موجود نہیں کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی"۔[1] قرآن تو اس بارے میں خاموش رہا لیکن ذاکر نائیک صاحب کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ لہٰذا قرآن میں اس کمی کا اعتراف کرنے کے بعد وہ عقلی دلائل کی بنیاد پر عورت کے سربراہ حکومت بننے کی نفی کرتے ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی نبوت ورسالت کے لیے عورت کو منتخب یا نامزد نہیں کیا، قرآن نے آیات کے ذریعے واضح کر دیا انبیاء ورسل ہمیشہ مرد رہے قرآن نے اللہ تعالیٰ کے لیے ہمیشہ ھُو کا صیغہ استعمال کیا کبھی ھِیَ کا صیغہ استعمال نہیں کیا، قرآن نے استخلاف فی الارض کا حق دار مرد انبیاء ورسل کو ٹھہرایا ان کی صالح مرد اولاد سے ان کے انتقال کے بعد خلافت کا وعدہ فرمایا، قرآن نے لڑکی کی پیدائش پر اظہار تعجب کرنے والی ماں سے جس نے لڑکے کی منت مانی تھی اور اسے رب العزت کی نذر کرنا چاہتی تھی واضح طور پر کہلوایا کہ:" فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْٓ اُعِیْذُهَابِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ [سورۂ آل عمران:۳۶]

قرآن نے جگہ جگہ جہاد میں پیچھے رہ جانے والوں کے لیے طنزاً: الخوالف، مخلفون، القعدین کا لفظ استعمال کیا سورۂ زخرف کی آیات: ۱۷، ۱۸، ۱۹ کا مطالعہ کیا جائے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث وحجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح نہیں کر سکتی": اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ [الزخرف:۱۸] قرآن بتاتا ہے کہ پیغمبر ہمیشہ مرد ہی مبعوث کیا گیا لہٰذا امامت کبریٰ اور امامت صغریٰ قرآن کی نص سے مرد ہی کو سزاوار ہے۔ ان نصوص کی تفصیل درج ذیل ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا [۳۳: ۴۰] وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ [۴۳:۳۱]

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [سورۂ یوسف:۱۰۹]، وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا

---

[1] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۶۹۔

اَھلَ الذِّکرِ اِن کُنتُم لَا تَعلَمُونَ [سورۃ النحل: ۴۳]، وَ مَآ اَرسَلنَا قَبلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوحِیٓ اِلَیھِم فَسئَلُوٓا اَھلَ الذِّکرِ اِن کُنتُم لَا تَعلَمُونَ [سورۃ الانبیاء: ۷] ان آیات میں واضح کر دیا گیا کہ انبیاء و رسل ہمیشہ مرد ہوتے تھے اور انہی مردوں سے اللہ نے استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا، یہی وعدہ سورہ نور کی آیت استخلاف میں بیان ہوا اور قیامت تک امت کے لیے یہی وعدہ ہے۔ ذاکر نائیک صاحب کی قرآن پر گہری نظر ہوتی تو انہیں امامت کبریٰ سے عورت کو محروم رکھنے کے لیے عقلی دلائل پر انحصار نہ کرنا پڑتا۔ ان آیات کی روشنی میں یہ استدلال کہ قرآن نے عورت کے حاکم بننے کی ممانعت نہیں کی معذرت خواہانہ استدلال ہے۔ اس بنیاد پر تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے عورت کو نماز کی امامت سے نہیں روکا لہٰذا عورت کی امامت بھی جائز ہے، سپہ سالار بنانے کی ممانعت نہیں کی لہٰذا وہ سالار لشکر ہو سکتی ہے، عورت کو اس بات سے نہیں روکا کہ وہ مرد کو طلاق نہ دے لہٰذا عورت مرد کو طلاق بھی دے سکتی ہے، عورت کو مرد پر حکم چلانے کی ممانعت نہیں کی اس کو مرد پر قوام بننے کی ممانعت نہیں کی لہٰذا وہ مرد کو حکم دے سکتی ہے کہ وہ گھر میں رہے عورت خود باہر کے کام کرے گی اور مرد گھر سنبھالے۔ قرآن نے مرد کی چار عورتوں سے بیک وقت نکاح کی اجازت تو دی ہے لیکن عورت کو بیک وقت دو مردوں سے نکاح کی ممانعت نہیں کی لہٰذا وہ دو مردوں سے بھی نکاح کر سکتی ہے، قرآن نے عورت کو غلام سے تمتع کی ممانعت نہیں کی البتہ مرد کو لونڈی سے تمتع کی اجازت دی لہٰذا عورت غلام سے بھی تمتع کر سکتی ہے، قرآن نے نہ مرد کو اذان دینے کا حکم دیا نہ عورت کو کبھی اذان دینے سے روکا لہٰذا عورت بھی اذان دے سکتی ہے۔ ظاہر ہے ذاکر نائیک صاحب عورت کو ان امور سے روکنے کے سلسلے میں قرآن کی کوئی آیت پیش نہیں کر سکتے لہٰذا وہ فوراً سنت، تعامل امت اور اجماع امت سے ثابت شدہ ان امور کو نقل سے ثابت کرنے کے بجائے عقل سے ثابت کرنے کی کوششیں کریں گے۔ نص سے ثابت ہے کہ انبیاء مرد تھے، وہی جماعت کی امامت کے بھی حقدار تھے، جب عورت امامت صغریٰ یعنی جماعت کی امامت کی مستحق نہیں تو وہ امامت کبریٰ یعنی خلافت ارضی کے منصب پر کیسے فائز ہو سکتی ہے؟

احادیث میں رسالت مآب کی مختلف دعوتوں کا ذکر ہے ان دعوتوں میں صحابہ کرام مدعو ہوتے تھے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھاتے تھے مگر مردوں کے ساتھ کبھی عورتوں کو کھانا نہیں کھلایا گیا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتوں نے کبھی مسجد نبوی میں جماعت کی امامت نہیں کی، جہاد کے تحت ایام میں بھی کسی عورت کو امامت، نیابت اور مدینہ منورہ میں خلافت کی ذمہ داری سپرد نہیں کی گئی بلکہ کسی نہ کسی مرد کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ حتیٰ کہ مدینہ سے جب بھی لشکر جہاد کے لیے کوچ کرتا تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کسی مرد کو اپنا خلیفہ نامزد فرماتے کبھی کسی عورت کو یہ منصب سپرد نہیں کیا گیا:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ مدثر میں بیان فرمایا: عَلَیھَا تِسعَۃَ عَشَرَ . وَمَا جَعَلنَآ اَصحٰبَ النَّارِ

اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ | سورۂ مدثر: ۳۰، ۳۱ | دوزخ پر انیس کارکن مقرر ہیں اب کفار کے عقلیین اس تعداد پر بپھر گئے کہ ایک ایسی جگہ جہاں ازل سے ابد تک کے انسانوں سے جہنم بھر دی جائے گی اس کا انتظام سنبھالنے کے لیے صرف ۱۹ کارکن فرشتے یہ کیا کر سکیں گے؟ اب عقلی، منطقی اور کلامی دلائل کے رسیا لوگ دلیل دیں گے یہ ایک کارکن ایک کروڑ کارکنوں کے برابر ہیں، ان کارکنوں کی طاقت، قوت، ہیبت اور شوکت کا کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، کچھ اور جدیدیت پسند آئیں گے اور کہیں گے کہ کھربوں انسانوں کے لیے صرف انیس فرشتے کیسے کافی ہو سکتے ہیں؟ یہ ناممکنات میں سے ہے۔ مینجمنٹ کرائسس سائنس [Management Crises Science] بھی یہی کہتی ہے کہ انیس فرشتے کھربوں انسانوں کی تنظیم کے لیے ناکافی ہیں، لہٰذا انیس کے ہندسے کی لغوی، نحوی، منطقی اور عقلی دلیلیں تراشنے میں یہ عقلیین عمریں بسر کر دیں گے۔ یہ جدیدیت پسند ذہن کے معذرت خواہانہ طرز استدلال کی ایک مثال ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں واضح طور پر جتلا دیا کہ انیس کی تعداد کو ہم نے کفار کے لیے فتنہ بنا دیا اہل کتاب اس بیان کو مانیں گے کہ وہ فرشتوں کی طاقت پر ایمان رکھتے ہیں اور کفار و مشرکین کہیں گے کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بیان سے کیا مطلب ہو سکتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔ اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض سے نہیں کیا گیا کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو | المدثر: ۳۱ | اس آیت سے قرآن کا طرز استدلال معلوم ہو گیا کہ جہاں کہیں کوئی ابہام، گنجلک اور عقدہ مشکل بہ ظاہر نظر آتا ہے وہ صرف کفار کی آزمائش کے لیے ہوتا ہے، ان کو ان کے کفر پر مزید مستحکم کرنے کے لیے ہوتا ہے اور اہل ایمان کو اپنے ایمان میں اٹل کرنے کے لیے ہوتا ہے نہ کہ ان آیات کے سائنسی معنی تلاش کرنے کے لیے جو جدیدیت پسند مسلم مفکرین کا طریقہ کار ہے۔

عورت کے سربراہ مملکت نہ بننے پر نائیک صاحب کے عقلی دلائل:

ذاکر نائیک صاحب نے عورت کے سربراہ مملکت نہ بننے کے سلسلے میں چند عقلی دلائل دیے ہیں:

[۱] ''عورت کو دوسرے سربراہان مملکت سے بند کمرے میں ملاقات کرنی ہوتی ہے جو عموماً مرد ہوتے ہیں۔ یہ ملاقات تنہائی میں ہوتی ہے جس میں کوئی دوسرا موجود نہیں ہوتا، اسلام ایسی ملاقات کی اجازت نہیں دیتا''۔[۱]

[۱] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۶۹۔

ذاکر نائیک صاحب نے عورت کو نامحرم مردوں سے کاروبار کی اجازت اس شرط پر دی تھی کہ عورتیں اپنے محرم باپ اور بیٹے، بھانجے وغیرہ کے ذریعے کاروباری امور انجام دیں، اس فلسفے کے تحت مسلم سربراہ عورت اور غیر مسلم مرد حکمراں کے مابین ملاقات کے وقت کوئی محرم موجود رہ سکتا ہے، مسئلہ حل ہوجائے گا یقیناً ذاکر نائیک اصرار کریں گے کہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ یہ خفیہ ملاقات ہوتی ہے اس میں کسی تیسرے فرد کو شامل کرنے سے بعض امور خفیہ نہیں رہ سکتے، اس کا جواب یہ ہے کہ حکمران بننے والی عورت ایک ایسے مرد سے شادی کرلیتی ہے جو اندھا بہرا گونگا ہے، اس شوہر کو وہ ہر خفیہ ملاقات کے موقع پر شریک محفل کرلیتی ہے اس صورت میں محرم کی شرط بھی پوری ہوجاتی ہے، تنہائی بھی مجروح نہیں ہوتی اور راز افشا ہونے کا معاملہ بھی ساقط ہوجاتا ہے، تو کیا اسلام میں ایسے مرد کی عورت کو حاکم بننے کی اجازت مل جائے گی؟ اگر دنیا کے تمام حکمران صنف نازک سے تعلق رکھتے ہوں تب تو مسلمان عورت حکمران ہوسکتی ہے؟

[۲] "ذاکر نائیک صاحب کے خیال میں عورت کے حکمراں نہ بننے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ بحیثیت سربراہ حکومت عورت کی تصاویر بنتی ہیں، ویڈیو فلمیں بنتیں ہیں، مردوں سے ہاتھ ملانا پڑتا ہے، اسلام اس طرح کے آزادانہ اختلاط کی قطعی اجازت نہیں دیتا"[۱]

یہاں یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ عورت کی تصاویر اور ویڈیو فلمیں ... حلال نہیں ہے مگر صرف عورت کے لیے کیوں مرد کے لیے کیوں نہیں؟ اور خود ذاکر نائیک صاحب کے لیے کیوں نہیں؟ ذاکر نائیک صاحب عورت کو فیکٹری میں کام کرنے کی اور شو بزنس کے سوا ہر پیشہ اختیار کرنے کی اجازت پہلے دے چکے ہیں ان کے مخلوط پروگرام میں عورتیں شریک ہوتی ہیں، سوال پوچھتی ہیں، ان کی ویڈیو بھی بنتی ہے اور تبلیغ دین کے لیے دنیا بھر میں استعمال بھی ہوتی ہیں، اب آزادانہ اختلاط پر قدغن عائد کرنے کا انھیں کوئی حق نہیں ہے۔ ایک مسلم سربراہ عورت اپنے ملک میں تصاویر کھینچنے پر پابندی لگادے، ویڈیو فلموں کی اجازت نہ دے، مردوں سے ہاتھ نہ ملائے تو کیا اس صورت میں وہ سربراہ مملکت ہوسکتی ہے؟ لہٰذا نائیک صاحب کی عقلی دلیلیں یہاں بھی مسترد ہوگئیں، دلیل، اصول کی بنیاد پر ہوتی ہے، نتائجیت [Pragmatism] اور ثمر [result] کی بنیاد پر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ویڈیو ساٹھ کے عشرے میں منظر عام پر آئی تو کیا ویڈیو فلم کی ایجاد سے پہلے جب عورتیں مرد سے ہاتھ بھی نہ ملاتی تھیں اور پردے کے پیچھے سے بات کرتی تھیں تو کیا اس دور میں عورت سربراہ مملکت ہوسکتی تھی؟ کیا ویڈیو کے خاتمے کے بعد عورت سربراہ مملکت ہوسکتی ہے تو یہ مسئلہ اصول کا ہے یا احوال کا کہ احوال کے تبدیل ہونے سے حکم تبدیل ہوگا؟ یا یہ مسئلہ اصولی ہے جو احوال کے تبدیل ہوجانے کے باوجود محکم رہے گا اس میں تبدیلی نہیں ہوگی؟

---

[۱] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۷۸۔

[۳] ''ذاکر نائیک صاحب کی تیسری دلیل یہ ہے کہ بحیثیت سربراہ مملکت ایک عورت کے لیے عوام کے قریب رہنا ان سے مل کر ان کے مسائل معلوم کرنا بھی مشکل ہو گا''۔[۱]

آج کل کوئی سربراہ مملکت عوام کے قریب رہتا ہے نہ ان سے گھل مل کر مسائل معلوم کرتا ہے یا پولر ڈیموکریسی یا Modisonian Democracy میں عوامی نمائندے یہ کام کرتے ہیں لہٰذا نائیک صاحب کی یہ دلیل بہت کمزور ہے۔

[۴] ''نائیک صاحب کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ ایام حیض میں عورت متعدد نفسیاتی تبدیلیوں سے گزرتی ہے، اگر عورت سربراہ ہے تو یہ تبدیلیاں اس کی قوت فیصلہ پر اثر انداز ہوں گی''۔[۲]

ایک مسلم عورت کو جو سربراہ مملکت کے عہدے کی طالب ہے پیدائش کے بعد کبھی حیض نہیں آئے تو کیا اس صورت میں وہ حکمران بن سکتی ہے؟ اگر کوئی عورت ادویات کے ذریعے اپنے حیض بند کرا لے تاکہ سربراہ مملکت بن جائے تو کیا اس کا سربراہ مملکت بننا شرعاً درست نہیں ہوگا؟ کیونکہ حیض ایک علت تھی جس کا قلع قمع ہو گیا جب علت ہی باقی نہ رہی تو حکمران نہ بننے کی قید بھی باقی نہ رہے گی؟ اگر عورت حیض کی عمر سے نکل جائے تو کیا وہ سربراہ مملکت بن سکتی ہے؟ اگر کسی عورت کو پیدائش کے بعد حیض ہی نہیں آئے اور یہ کیفیت دائمی رہے تو کیا وہ سربراہِ مملکت بن سکتی ہے؟ کیا سربراہِ مملکت کی شرط حیض کے آنے یا نہ آنے سے متعین ہوتی ہے؟

[۵] ''نائیک صاحب کی پانچویں دلیل یہ ہے کہ ایک عورت حاملہ بھی ہوسکتی ہے اس کے بچے ہوں گے، ماں کے فرائض بھی ہیں، سربراہ مملکت اور ماں کی ذمہ داریاں بیک وقت ادا کرنا مشکل ہے''۔[۳]

اگر کوئی عورت سن یاس میں پہنچ کر بچوں سے اور حیض سے فارغ ہو بچوں کو گھر والا بنا کر سربراہ مملکت بننا چاہے تو پھر کیا عذر شرعی ہوگا؟ یا اگر ایک عورت کو نہ حیض آیا نہ اس نے بچے پیدا کیے لیکن شادی ایک عنین، اندھے، بہرے اور گونگے سے کر لی تو کیا وہ سربراہ مملکت ہو سکتی ہے؟ اگر ایک عورت تجرد کی زندگی اختیار کر لے یا بیوہ ہو یا مطلقہ اور بچے بھی نہ ہوں تو کیا وہ سربراہ مملکت ہو سکتی ہے؟

[۶] ''عورت کو جائیداد میں آدھا حصہ اس لیے ملتا ہے کہ اسلام میں معاشی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے، خاندان کے تمام معاشی اخراجات پورے کرنے کی وجہ سے ضروری ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کو زیادہ حصہ ملے''۔[۴]

---

[۱] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۶۷۔ [۲] ایضاً، صفحہ ۷۰۔

[۳] ایضاً، صفحہ ۷۰۔ [۴] ایضاً، صفحہ ۹۳۔

اگر مرد بے روزگار ہے عورت کفالت کرتی ہے یا دونوں گھر کی مساوی کفالت کرتے ہیں تو یہ عقلی دلیل مسترد ہوگئی کہ مرد کو معاشی کفالت کی وجہ سے آدھا حصہ ملتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدھے حصہ کی شرط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد اور خیر القرون کے لیے تھی چونکہ ذاکر نائیک صاحب کیمپ بل سے مناظرے میں کہہ چکے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کے جو معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے عہد کے صحابہؓ نے اخذ کیے وہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے حتمی اور آخری نہیں ہیں۔ البتہ یہ اصول بائبل پر لاگو ہوگا کہ بائبل ایک خاص زمانے میں خاص قوم، ایک خاص عہد اور زمان مکان کے لیے نازل ہوئی تھی، لہٰذا اس عہد میں پیغمبر اور ان کے حواریوں نے بائبل کے جو معنی لیے تھے وہ صرف اس عہد کے لیے کارآمد تھے اور وہی معنی قطعی تھے۔ لہٰذا ذاکر نائیک صاحب کی یہ دلیل مسترد ہو جاتی ہے کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں آدھا حصہ ملنا عدل کا تقاضا ہے، خدا کی شریعت سراپا عدل ہے اس کا حکم آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے تب بھی وہ عدل، خیر، الحق اور العلم ہے جس میں کوئی شبہ نہیں اگر اسلام میں عورت کو جائیداد سے آدھا حصہ ملتا ہے تو قرآن کی رو سے ماں باپ کو اولاد کی جائداد میں برابر حصہ کیوں ملتا ہے؟ کیا ماں عورت نہیں ہے؟ جائیداد کی تقسیم کا الٰہی طریقہ اس کی حکمت بالغہ کے تناظر میں ہے آدھے پونے چوتھے حصے کی کوئی حیثیت نہیں۔ نائیک صاحب یہاں بائبل پر اعتراض کرتے ہوئے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتے کہ اگر بائبل کے احکامات صرف اسی کے زمانے کے لیے تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انجیل کی تصدیق و توثیق و تائید کیوں فرمائی اور مسلمان کے لیے یہ کیوں لازم قرار دیا کہ وہ ہر سابق نبی، رسول، پیغمبر اور ان کی کتاب پر بلاتفریق ایمان لائے اگر وہ کتابیں کسی خاص عہد کو مخاطب کر کے نازل کی گئیں تو امت رحمت للعالمین پر ان کی تصدیق کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ عہد گزر گئے ہیں۔

ائیر ہوسٹس کا انتخاب: ذاکر نائیک کے مضحکہ خیز دلائل:

ذاکر نائیک صاحب فرماتے ہیں: ''ایئر ہوسٹس کا انتخاب حسن کے حوالے سے ہوتا ہے. ایئر ہوسٹس کی نوکری اچھی اور مناسب نوکری نہیں ہے. آپ نے کبھی کوئی بدصورت ایئر ہوسٹس نہیں دیکھی ہو گی''۔[1]

نائیک صاحب کو یاد نہیں رہا کہ افریقی ائر لائنوں کی ائر ہوسٹس نہایت کالی اور نادانوں کی نظر میں بدصورت ہوتی ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق خوبصورت ہے حسن کسی کے چہرے میں نہیں دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اس لیے ایک حبشی وزیر کو ایک بادشاہ نے دنیا بھر کے سفر پر بھیجا کہ دنیا کے سب سے خوبصورت بچے کو تلاش کر کے لاؤ تو کئی سال کے سفر کے بعد اس نے ایک نہایت کالے کلوٹے بدشکل

---

[1] ایضاً، صفحہ ۹۵۔

بچے کو [دنیا کی زبان میں] بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا بادشاہ نے تعجب سے پوچھا کہ اس بچے میں تمھیں کیا حسن نظر آیا؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا عالم پناہ یہ میرا بچہ ہے اور یقین کیجیے دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت بچہ کوئی نہیں ہے۔ یہ یقین اور یہ نقطۂ نظر قلب کی آنکھ سے پیدا ہوتا ہے جب محبت قلبی ہوتی ہے تو ایک کالے کلوٹے کو بالکل دوسری نظر سے دیکھتی ہے۔ جب محبت عقلی [analytical]، ذہنی [mental]، مادی [material] اور طبعی [physical] ہوتی ہے تو وہ کالے رنگ کی منفی تفسیر پیش کر کے کالے حسن کی حُسن کُشی کرتی ہے۔ جس طرح صبح کے اجالے میں ایک حسن ہے بالکل اسی طرح رات کی سیاہی میں بھی حسن ہے اسے دیکھنے کے لیے فکر نہیں نظر چاہیے:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے　　　اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اگر دنیا بھر میں ائر ہوسٹس کا انتخاب بدصورتی کی بنیاد پر ہونے لگے اور کسی خوبصورت ایر ہوسٹس کو ملازمت نہ دی جائے تو کیا نوکری شرعی اور روحانی ہو جائے گی؟ اگر انتخاب حسن کے بجائے بد صورتی کی بنیاد پر ہو تو کیا یہ نوکری حلال ہوگئی؟

پھر فرماتے ہیں:

''ایئرہوسٹس کو مسافر کی سیٹ بیلٹ باندھنا ہوتی ہے، مسافروں کو راغب کرنے کے لیے خوبصورت خواتین سامنے لاتے ہیں....

ایئرہوسٹس چار برس تک شادی نہیں کرسکتی، حاملہ ہونے کی صورت میں نوکری ختم ہوجائے گی، ۳۵ سال کی عمر میں انھیں ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔''[1]

اگر کوئی ایئرلائن ان تمام شرائط کا خاتمہ کر دے، بدصورت عورتوں کو ملازمت دے، مردوں سے مردوں کی سیٹ بیلٹ باندھنے کا کام لے، ایئرہوسٹس کو شادی کی اجازت ہو، حاملہ ہونے کی اجازت ہو اور حالت حمل میں مسافروں کی خدمت کرنے کے فرض سے وضع حمل اور رضاعت تک رخصت دے دی جائے، اور اس کی نوکری کو حاملہ ہونے کے باوجود تحفظ مل جائے یا حالت حمل میں رخصت دے دی جائے مسافروں کو رغبت دلانے کے لیے طوائفیں رکھ لی جائیں، ایرہوسٹس صرف خدمت کرے تو کیا اس صورت میں ائرہوسٹس کی یہ نوکری حلال ہو جائے گی؟ آخر فیکٹری میں عورت ذاکر نائیک صاحب کی اجازت سے کام کرسکتی ہے جب کہ وہاں بھی یہی حالات ہوتے ہیں، ہر جگہ مردوں سے اختلاط ہوتا ہے، تعلیمی اداروں، ہسپتالوں میں، مردوں کا لڑکیوں اور خواتین سے اختلاط ہوتا ہے تو وہاں نوکری کیوں حلال ہے، ایئرلائن میں کیوں حرام ہے؟

---

[1] ایضاً صفحہ ۹۶۔

مخلوط تعلیم گاہ: طالبات کا جنسی استحصال:

ذاکر نائیک فرماتے ہیں: ”مخلوط تعلیم گاہ میں تعلیم ٹھیک نہیں، کیونکہ ”جداگانہ تعلیمی اداروں میں طالب علم تعلیم پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، لڑکیاں جنسی معلومات حاصل کرنے پر وقت صرف کرتی ہیں، اساتذہ طالبات کو زیادہ نمبر دے کر جنسی استحصال کرتے ہیں“۔[1]

اگر مخلوط تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے والے لڑکوں لڑکیوں اور مرد اساتذہ کو ایسی دوائیں دوران تدریس دے دی جائیں جن سے ان کے جنسی جذبات بالکل مردہ ہو جائیں تو کیا اس صورت میں مخلوط تعلیم جائز ہوگی؟ ایسی ادویات صدیوں سے موجود ہیں اور اب بھی دستیاب ہیں۔ کیا قوت مردی سے محروم مرد اساتذہ کے ذریعے عورتوں کو تعلیم دینا حلال ہوگا؟ اگر اساتذہ زیادہ نمبر نہ دیتے ہوں کم نمبر دیتے ہوں تب مرد اساتذہ سے تعلیم حلال ہوگی؟ اگر اساتذہ اور طالبات بہ رضا و رغبت جنسی تعلقات قائم کر لیں تو وہ جائز ہوں گے یا صرف جبراً نا جائز ہوں گے؟

اگر اساتذہ جنسی استحصال نہ کرتے ہوں تمام مرد اساتذہ کی بیویاں بھی اسی اسکول میں استاد ہوں، لڑکیاں لڑکے جنسی معلومات حاصل نہ کرتے ہوں، اسکول کا تخت دینی ماحول ہو تو کیا مخلوط تعلیم جائز ہو جائے گی اصولی دلیل کیا ہے؟ عقلی دلیل تو کبھی بھی عقلی بنیاد پر رد ہو سکتی ہے۔

لڑکیاں: مرضی کی شادی: مجرد قانونی دلیل اور اس کا انجام:

ذاکر نائیک فرماتے ہیں: ”لڑکیوں کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اجازت ہے، والدین اس پر زبردستی نہیں کرسکتے، بیٹی کو شوہر کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اس کے والدین نے نہیں“۔[2]

کیا لڑکی اس کے والدین اس کے خاندان ایک کل ہیں یا یہ سب الگ الگ وحدت ہیں؟ کیا لڑکی اور والدین اس کل کا ایک جزو ہیں یا ہر جزو اپنی اپنی جگہ خود ایک کل [whole] ہے؟ کیا خاندان کسی اجتماعیت کا مظہر ہے یا یہ خاندان مغربی اور یورپی خاندانوں کی طرح فلسفہ انفرادیت کے ذریعے ہر فرد کو خود مختاری آزادی عطا کرتا ہے؟ کیا نکاح صرف لڑکی اور لڑکے کے درمیان ایک رسمی کارروائی ہے یا اسلامی معاشرت کی اہم ترین اکائی ہے جس کے بغیر نہ خاندان وجود میں آتا ہے نہ دو خاندانوں کے اتصال سے رشتوں، تعلقات، محبت، معاملات کا ایک تانا بانا [Web of relations] وجود پذیر ہوتا ہے۔ اگر عورت مرد سے خاندان کی مشاورت کے بغیر شادی کرے تو کیا وہ خاندان کی محبت اور امان سے خود کو محروم نہ کرے گی؟ یہ عجیب بات ہے کہ سورۃ شوریٰ میں رسول کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے معاملات

---

[1] ایضاً، صفحہ ۹۸۔ [2] ایضاً، صفحہ ۱۰۴۔

آپس کے مشورے سے طے کرو: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ [۳۸:۴۲] آپ کو ہدایت کی جارہی ہے کہ ان کو دین کے کام میں شریک مشورہ رکھیے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ [۱۵۹:۳]۔ رسول مشورے کرنے کے پابند ہیں لیکن ایک نو سال کی لڑکی کو کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ بالغ ہے۔ لیکن عورت کو اتنی آزادی دی جارہی ہے کہ وہ بلوغت کی عمر میں داخل ہوتے ہی ماں باپ اہل خانہ سے مشورے کے بغیر ہی خود اپنی قسمت پر مہر لگا دے۔

جس طرح ماں باپ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بیٹی کی اجازت کے بغیر اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں تھما دیں اسی طرح بیٹی بھی آزاد نہیں ہے کہ وہ ماں باپ کو مطلع کیے بغیر ان کی سرپرستی ترک کر کے ان کی رضا، رائے اور مشورے کے بغیر اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرے، یہ رویہ صفت رحمت، مودت اور محبت کے منافی ہے ہر دو فریقوں کے اختیارات، تعلقات، معاملات، صرف اور صرف قانون کے دائرے میں نہیں دین محبت اور قانون کی کلیت کے دائرے میں بھی موجود ہوتے ہیں خواہ اس کا اظہار باقاعدہ کیا گیا ہو یا نہیں، اس دائرے کا ایک جزو [part] قانون ہے مگر یہ کل [whole] نہیں اسلام کے کل میں قانون بھی ہے لیکن صرف قانون اسلام نہیں ہے، جب آپ اسلام کی کُلیّت میں سے صرف قانون اور صرف محبت کو لیا جاتا ہے، تو ایک جزو کو لے کر کل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کل کو اجزاء میں توڑنے سے اس کی روح مر جاتی ہے۔ جس کے باعث مسائل پیدا ہوتے ہیں قانون اسلام کی کُلیّت کا ایک جزو ہے دین کو صرف قانون پر منحصر کر دیا جائے تو اس سے کبھی خیر برآمد نہیں ہو سکتا یہ کُل سے جزو کو الگ کرنے کا انجام ہے جیسے سوڈیم کلورائیڈ نمک [Nacl] سے کلورین کو الگ کر کے کھایا جائے تو موت واقع ہو جائے گی۔ لیکن اگر کلورین سوڈیم سے مل جائے تو یہ انسان کے لیے نافع ہو جائے گی۔

خاندان کا حصار اور رشتوں کی زنجیر: تحفظ کا ضامن:

صرف اپنی پسند سے شادی کرتے ہوئے اپنے خاندان کو نظر انداز کرنے والی لڑکی ماں، باپ، بھائی تایا، پھوپھا، نانا، دادا، چچا، خالو، ماموں کے ساتھ رشتوں کی لازوال زنجیر میں بندھی ہے، کیا ان میں کوئی بھی اس لائق قابل نہیں کہ عورت ان سے مشورے کرے عورت اس قدر قابل، لائق اور فائق اور ماہر ہے کہ کسی سے مشورہ نہ کرے گی؟ قرآن بتاتا ہے کہ ملکہ سبا بلقیس اور فرعون بھی اپنے ارباب حل وعقد سے مشورہ کرتے تھے، لیکن اسلامی تہذیب کی نو سالہ دوشیزہ بالغ لڑکی کو کسی سے مشورے کی ضرورت ہی نہیں وہ فرعون اور ملکہ سباء سے بھی اونچی مخلوق ہے۔ وہ ایسی مختار کل ہے کہ جب چاہے اپنی زندگی کا فیصلہ کر کے رخصت ہو جائے، جیسے اسے کبھی اپنے گھر واپس نہیں آنا، جیسے اس کا شوہر اس پر ہمیشہ مہربان رہے گا، جیسے موت نے اس کے شوہر کا پیچھا ترک کر دیا ہے، جیسے حالات ہمیشہ ان کے لیے بہتر رہیں گے جیسے اسے کسی کی ضرورت نہیں تنہا لڑکی اور تنہا لڑکا اپنے اپنے خاندان رشتہ داروں کی امان،

ڈھال اور سائبان کو ترک کر کے تنہائی کی زندگی بسر کر لیں گے، جیسے لڑکا اور لڑکی ہمیشہ صحت مند رہیں گے کبھی معذور و مجبور نہ ہوں گے، ہمیشہ فارغ البال رہیں گے، کبھی بے روزگار نہ ہوں گے، ان کو کبھی کسی کی مدد و اعانت کی ضرورت نہ ہوگی، یہ زندگی کی کشتی آفات و حوادث کے طوفان میں اور سخت موجوں میں تنہا ہی نکال لیں گے، ان کے بچوں کو کسی نانی، دادی، چاچی، پھوپھی، ممانی یا خالہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ انسانو ں کے بچے ہیں یا مغرب کی تجربہ گاہ میں پیدا ہونے والی ٹمیسٹ ٹیوب بے بی ہے جس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں حتی کہ ماں باپ سے بھی کوئی تعلق نہیں، کیا یہ کلون شدہ نسل ہے جسے رشتوں، محبتوں اور الفتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کل کوئی آزمائش مشکل تکلیف مصیبت اور پریشانی ہوگی تو خاندان کی امان رڈھال چھوڑنے والی عورت کس منہ سے اس امان کو طلب کرے گی؟ اگر شوہر نے اس سے دغا کر دی تو وہ کہاں رہے گی؟ کس کے سہارے جیے گی؟ وہ روز مرے گی اور کبھی جی نہ سکے گی اگر شوہر نے اسے طلاق دے دی اور دوسری شادی کر لی اس کو لٹکتا چھوڑ دیا کراچی کی عدالتوں میں ننانوے فی صد محبت کی شادیوں کا عبرتناک انجام دیکھ لیا جائے جہاں لڑکیاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتی ہیں اور دارالامان میں طوائف بن کر زندگی بسر کرتی ہیں اور اپنے ماں باپ کے گھر واپس جانے کے بجائے خودکشی کو ترجیح دیتی ہیں پسند کی نوے فی صد شادیاں طلاق پر ختم ہوتی ہیں دیہی علاقوں میں گھر سے بھاگ کر شادیاں کرنے والے جوڑے عدالتوں سے اپنے نکاح کو جائز قرار دلواتے ہیں مگر معاشرتی دباؤ کا سامنا نہیں کر پاتے وہ اپنے شہر، گھر، موسم، مٹی راستے راتیں پگڈنڈیاں باغ گلیاں چھوڑ کر اجنبی شہروں میں مجرموں کی طرح چھپ چھپ کر زندگی بسر کرتے ہیں اپنے گاؤں میں لوگوں کی خشمگیں نگاہیں ان کے قلب اور سینے کو چھلنی کرتی اور ان کی عزت تار تار کرتی ہیں، ہر خاندان کے کچھ غیرت مند متشدد لوگ معرکہ محبت و بغاوت کا فیصلہ اپنی طاقت سے کرنا چاہتے ہیں لہٰذا ان بھگوڑے جوڑوں کا سب سے بڑا مسئلہ جان کا تحفظ اور محفوظ ذریعۂ معاش بن جاتا ہے، عدالتیں ہر جوڑے کو پولیس کا تحفظ فراہم نہیں کر سکتی پولیس والا چوبیس گھنٹے دونوں کی حفاظت نہیں کر سکتا لہٰذا یہ دونوں ایک ذہنی عذاب میں زندگی بسر کرتے ہیں، اپنے ماضی پر شرمندہ اور اپنی زندگی سے بے قرار ہو جاتے ہیں، مگر پانی بہہ جائے تو واپس نہیں لوٹتا ایسے جوڑوں کی اذیت ناک زندگی کا مشاہدہ کیا جائے تو لڑکیاں محبت کی شادی کو ہمیشہ کے لیے نفرت سے دیکھیں گی۔ عصر حاضر کے جدیدیت پسندوں سے زیادہ وفادار تو سوہنی کا گھڑا تھا جس نے اپنے مالک سے عہد وفا نبھایا اس نے کہا کہ میں اپنے مالک کی عزت کو کسی کے ہاتھ نہیں ضائع ہونے دوں گا اس نے سوہنی کو دریا پار کرانے سے انکار کر دیا وہ گھلنے لگا گھلتا رہا گھلتا رہا اور سوہنی سمیت خود چناب کی موجوں میں ابد تک کے لیے گم ہو گیا کیا عہد حاضر کی مسلمان لڑکی میں گھڑے جتنی غیرت اور وفا اور حیا نہیں ہے۔

ذاکر نائیک صاحب نے ایک مشکل سوال کا تفصیل سے جواب دینے کے بجائے نہایت بچگانہ انداز میں دیا ہے جس سے مسئلے کی اصل حقیقت واضح نہ ہو سکی اور دین کا اس معاملے میں اصل منشاء بھی بیان ہونے سے رہ گیا۔

نواں باب

اسلام میں عورت کے سیاسی حقوق

قرآن کی آیت: يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُؤْمِنَـٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِٱللَّهِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَـٰدَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَـٰنٍ يَفْتَرِينَهُۥ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِى مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَٱسْتَغْفِرْ لَهُنَّ ٱللَّهَ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ [سورۃ الممتحنہ: ۶۰:۱۲] میں مومن عورتوں کی رسول اللہ سے بیعت کے متعلق ذاکر نائیک صاحب فرماتے ہیں: ''یہاں بیعت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بیعت کے لفظ میں آج کل کے الیکشن کا مفہوم بھی شامل ہے کیونکہ حضورؐ اللہ کے رسول بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی اور بیعت سے مراد انہیں سربراہ حکومت تسلیم کرنا تھا اس طرح اسلام نے اسی دور میں عورت کو ووٹ دینے کا حق بھی تفویض کر دیا''۔[1]

نائیک صاحب کا یہ نقطۂ نظر واضح کرتا ہے کہ وہ نہ اسلامی علمیت پر عبور رکھتے ہیں نہ مغربی فلسفہ سیاست سے انھیں آگہی حاصل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کو الیکشن قرار دینا عورتوں کی بیعت رسول اللہ کو صدارتی الیکشن کے انتخاب میں حصہ لینے سے تشبیہ دینا صریحاً جہالت ہے۔ سورۃ الفتح میں آتا ہے: إِنَّ ٱلَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ يَدُ ٱللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَـٰهَدَ عَلَيْهُ ٱللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ''اے نبیؐ جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا'' [الفتح: ۱۰] اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے نہ صرف جمہوری طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سربراہ مملکت کے طور پر منتخب کر رہے تھے بلکہ اللہ رب العزت کو بھی کائنات کی حاکمیت کا شرف ''جمہوری طریقے'' سے عطا کر رہے تھے سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ میں بیعت سے متعلق ارشاد الٰہی ہے کہ جب تمھارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے

---

[1] ذاکر نائیک: ''اسلام میں خواتین کے حقوق: جدید یا فرسودہ'' مشمولہ خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۵۰۔

ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان نہ گھڑیں گی کسی نیک کاموں میں رسول اللہ کی نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو"۔ اس پوری آیت میں بیعت سے مراد الیکشن جمہوریت، جمہوری عمل، ووٹ، رسول اللہ کی بحیثیت سربراہ حکومت عہدے کی تصدیق تائید وتصویب کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔ یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے رہے ہیں کہ مکہ سے ہجرت کر کے جو عورتیں دین اسلام قبول کرنے آ رہی ہیں ان سے گناہ کبیرہ سے بچنے کا عہد لے لو اور نیک کاموں میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی کامل تقلید کا وعدہ لے لو اگر وہ اس پر آمادہ ہوں تو ان سے بیعت لے لو ان کو دین کے دائرے میں داخل کر لو اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرو، اس آیت کا جمہوری الیکشن اور عورتوں کے ووٹ سے کیا تعلق؟ کوئی مستشرق ذاکر نائیک سے یہ سوال بھی کر سکتا ہے کہ اس آیت کی رو سے تو اسلام میں صرف عورتوں کو ووٹ دینے کی آزادی ہے بے چارے مردوں کو تو اسلام نے ووٹ سے محروم کر دیا ہے، ممکن ہے ذاکر نائیک صاحب مردوں کے ووٹ کے ثبوت میں سورہ فتح کی آیت ۱۸ پیش فرمائیں جو بیعت رضوان سے متعلق ہے "اللہ مومنوں سے خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے"، لیکن مومنین کے یہاں بیعت کا مطلب جمہوریت، ووٹنگ، حق رائے دہی، حکمران کی حیثیت سے رسول کے الیکشن قرار دینے کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، اس کا تعلق بیعت رضوان سے ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر پھیلنے کے باعث بیعت جہاد کے طور پر لی گئی تھی۔ اب اتفاق یہ ہے کہ قرآن میں مردوں کی بیعت کی کوئی آیت اس کے سوا موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نے عورتوں کو جمہوری ووٹ کا حق دیا لیکن مردوں کو اس حق سے محروم کر دیا، نعوذ باللہ، ذاکر نائیک صاحب کے غلط استدلال سے یہی اصول برآمد ہوتا ہے لہٰذا قرآن نے خود ہی جمہوریت کی نفی کر دی، جس مغربی جمہوریت کو نائیک صاحب قرآن سے برآمد کر رہے تھے؟ کیا بیعت کرنے والی عورتیں اگر رسول اللہ کو ووٹ نہ دیتیں تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدانخواستہ سربراہِ مملکت نہ بن سکتے تھے کیا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حاکمیت عورتوں کے ووٹوں سے وجود پذیر ہوئی تھی؟ کیا اسلام اس لیے آیا تھا کہ عورتوں کو ووٹ کا حق دے کر اس حق کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حاکمیت کو عورتوں کی مہر تصدیق بذریعہ جمہوریت ثبت کرا دے؟ جمہوری عمل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب چاہیں لوگ اور عورتیں اپنے حکمراں کے خلاف عدم اعتماد ظاہر کر دیں اسے عہدے سے برطرف کر دیں، اس کے خلاف جلوس نکالیں، جلسے کریں، نعرے لگائیں، پمفلٹ چھاپیں، اس پر تنقید کریں اعتراضات اٹھائیں، تو کیا رسول اللہ کی بیعت کرنے والیوں کو یہ تمام حقوق حاصل تھے؟ جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ ووٹ دینے والا جس کو چاہے ووٹ دے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی اور حریف امیدوار حاکمیت کا طالب تھا؟ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ جس میں صرف ایک ہی امیدوار تھا دوسرا امیدوار نہ تھا۔ جمہوریت میں

آپ کسی کو ووٹ نہ دینا چاہیں تو آپ یہ حق بھی استعمال کر سکتے ہیں کیا صحابہؓ یا میں سے کسی کی ہمت تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ووٹ دینے سے انکار کر دے؟ اس الیکشن کا بائیکاٹ کر دے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کسی اور امیدوار کو کھڑا کر دے؟ کم از کم مدینے کے منافقین عبداللہ ابن ابی کو اس الیکشن میں کھڑا کر سکتے تھے لیکن بے چارے عبداللہ ابن ابی کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمہوریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر الیکشن لڑنے کا جمہوری حق نہیں دیا گیا، نعوذ باللہ، ہمارے ذاکر نائیک صوفیہ کی بیعت سے بھی واقف نہیں ورنہ اس بیعت کو بھی جمہوریت قرار دیتے بیعت کسی کو منتخب کرنے کے لیے منعقد نہیں ہوتی بلکہ اپنے آپ کو کسی کے سپرد کرنے، کسی کے حوالے کرنے، کسی کے سامنے اپنے نفس کو سرافگندہ کرنے اور اپنے نفس کو اس روحانی ہستی کے مکمل سپرد کرنے کے لیے ہوتی ہے، بیعت کرنے والا صرف سمعنا و اطعنا کے دائرے میں ہوتا ہے، قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کے بارے میں یہی فرمایا کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت قبول کی سمعنا و اطعنا اس مقدس ترین بیعت کو الیکشن جیسے گندے عمل سے تشبیہ دینا یا تو شرارت ہے یا جہالت ہے۔ یہ کس قسم کی شرمناک جمہوریت ہے جو بیعت کی قرآنی اصطلاح سے برآمد کی گئی ہے یہ تحریف دین، تضحیک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور توہین آیات قرآنی ہے سلف سے خلف تک کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمہوریت کے ذریعے منتخب ہونے والا حاکم قرار نہیں دیا ذاکر نائیک صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے کچھ لوگوں نے حضرت سعد بن عبادہؓ کی خلافت کے لیے گفتگو کی، حضرت ابوبکرؓ نے امت کی خلافت کے لیے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کا نام پیش فرمایا اور خود اس منصب خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ رسالت مآب کا ارشاد گرامی ہے کہ جو کسی عہدے کا طالب ہے وہ اس عہدے کے لیے نااہل ہے لہٰذا اس اصول کے تحت امت نے اس ہستی کو خلیفہ منتخب کر لیا جس عظیم ہستی نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور سعد بن عبادہؓ اس انتخاب کے بعد گوشہ نشین ہو گئے اور اسی گوشہ نشینی کے عالم میں آپ نے انتقال کیا، حضرت ابوبکرؓ جمہوری طور پر منتخب ہوئے نہ حضرت عمرؓ۔ ایک کی خلافت کا اعلان حضرت عمرؓ نے کیا اور ہاتھ بیعت کے لیے بڑھا دیے، حضرت عمرؓ کو خلیفہ حضرت ابوبکرؓ نے نامزد فرمایا اور امت نے اُسے تسلیم کیا، حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے چناؤ کے لیے ایک مجلس قائم فرما دی کہ ان چھ افراد میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کیا جا سکتا ہے اس طرح حضرت عمرؓ نے خلافت کے منصب کو ان چھ اصحاب تک محدود کر دیا کہ انہی میں سے کوئی ایک اس منصب کا اہل ہے۔ حضرت عمرؓ کہتے تھے کہ اگر آج ابوعبیدہؓ بن الجراح زندہ ہوتے تو کسی مشورے کے بغیر بلاتردد انھیں خلیفہ نامزد کرتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں امین الامت کا خطاب دیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاکر نائیک صاحب نے، نعوذ باللہ، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی سطح پر پہنچا کر دین کی خدمت نہیں کی بلکہ مغربی جاہلیت جدیدہ اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کی توثیق کی ہے جبکہ وہ اس جمہوریت کے

فلسفیانہ مباحث اوراس کے اہم فلاسفہ سے قطعاً ناواقف ہیں جس موضوع پر وہ عبور نہیں رکھتے اس پر کلام کرنے سے پہلے انھیں سو بار سوچنا چاہیے، دینی امور اور مذہبی علمیت میں اپنے نفس کو نص تصور کرنا محض جدیدیت ہے۔

عورت: قانون سازی کا حق اور اختیار:

آگے فرماتے ہیں کہ: ''اسلام نے خواتین کو قانون سازی میں حصہ لینے کی اجازت دی ہے مشہور روایت ہے کہ حضرت عمر حق مہر کی بالا حد مقرر کرناچاہتے تھے ایک بوڑھی عورت اٹھی اس نے سورہ نساء کی بیسویں آیت پڑھی اور کہا جب قرآن یہ اجازت دیتاہے کہ مہر میں مال کا ڈھیر بھی دیا جاسکتاہے تو عمر کو حد مقرر کرنے کا اختیار نہیں[1] یہ عام خاتون تھی اسے حق حاصل تھا کہ وہ خلیفہ وقت سے اختلاف کی جرات کرسکے اور اس پر اعتراض کرسکے آج کل کی تکنیکی اصطلاحات میں ہم کہیں گے کہ اس خاتون نے آئین کی خلاف ورزی پر اعتراض کیاتھا کیونکہ مسلمانوں کا آئین تو قرآن تھا اس واقعے سے معلوم ہوا کہ اسلام عورت کو قانون سازی میں شرکت کا حق بھی دیتا ہے''[2]

اس بہ ظاہر معصوم ومختصر نثر پارے میں ذاکر نائیک صاحب نے نہایت اخلاص کے ساتھ کفارو مشرکین کو ان کی مسلمہ علمیت کے ذریعے ان کی کافرانہ اصطلاحات میں حقیقت دین اسلام سمجھاتے سمجھاتے ایسی بارودی سرنگیں بچھادی ہیں جس سے اسلام کی پوری عمارت منہدم ہوسکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں احکام اسلامی اخذ کرنے کا درست علمی طریقہ بھی معلوم نہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اسلام میں قانون سازی نہیں ہوتی بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں امت کے جلیل القدر فقہا اور علما احکامات اخذ کرتے ہیں، اجتہاد اور فتوئی ہر شخص کا بنیادی حق نہیں صرف اور صرف اہل علم اہل تفقہہ کی ذمہ داری ہے اور اہل علم وتفقہہ میں سے بھی صرف ان کی جو عابدین میں شامل ہوں اور ان فقہاء وعلماء کی ذمہ داری ہے جو خوف خدا رکھتے اور اس دنیا کو حقیر ترین سمجھتے ہوں۔ قرآن کو فیڈرلسٹ پیپر [Federalist Papers] کی طرز پر آئین کی کتاب سمجھنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ مغرب میں دستوریت اور آئین کی تاریخ [Constitutionalism] سے بھی ناواقف ہیں۔ اسلام میں قانون سازی سرے سے ہوتی ہی نہیں کیونکہ قانون کا ماخذ ومرجع قرآن وسنت اجماع اور قیاس ہے لہٰذا ان چار مصادر کی روشنی میں مختلف مسائل کے سلسلے میں فقہ کے ذریعے احکامات اخذ کیے جاتے ہیں یا ان کی تشریح وتعبیر وتوضیح کی جاتی ہے، اور اس کا اختیار صرف اہل تفقہہ وتدین کو حاصل ہے جو استنباط نتائج کی غیر معمولی صلاحیت

---

[1] ذاکر نائیک، خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۵۰۔ [2] ایضاً صفحہ ۵۱۔

رکھتے ہیں۔ ذاکر نائیک صاحب نے اس سادہ واقعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی خیر القرون میں احکامات اخذ کرنے کے لیے اہل علم جمع نہیں ہوتے تھے بلکہ عوام یعنی تمام مرد وزن اکٹھے ہو جاتے تھے اور جس مرد عورت کا جو دل چاہتا وہ وہاں دل کی بات بیان کر دیتا گویا خیر القرن، یونانی city states تھا جہاں [سوفی صد] صرف تمام مرد اکٹھے ہو کر کثرت رائے سے فیصلے کرتے تھے بلکہ خیر القرن یونانی شہری مرد ریاست سے بہتر ریاست تھی جہاں تمام عورتیں مرد اکٹھے ہو کر اجتماعی فیصلے کرتے تھے۔ ان عورتوں مردوں کی رائے سے حاکم وقت احکامات اخذ کرنے کی حکمت عملی تیار کرتے تھے، نائیک صاحب کا یہ تصور نہایت غلط تصور ہے۔ مدینۃ النبی، اور صحابہ کرام کی مجالس مشاورت کو یونان کی city states پر قیاس کرنا جہالت ہے، یونان کی شہری حکومتوں کے سینٹ میں اس شہر کے تمام شہری شامل ہوتے تھے اور تمام قوانین شہریوں کی کثرت رائے کی روشنی میں منظور کیے جاتے تھے، خیر القرون اور اسلام کی پوری تاریخ میں یونان کی شہری حکومتوں یا Athanian Democracy کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، اسلام میں ہر کسی کو دینی مسائل میں دخل اندازی کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی علمیت قرآن وسنت سے احکامات اخذ کرتی ہے لہٰذا رائے دینے والا اہل علم اور اہل بصیرت میں سے ہونا لازمی ہے، قرآن میں آتا ہے کہ علم والا اور لاعلم برابر نہیں ہوتے آنکھوں والا اور نابینا کبھی برابر نہیں ہوتے۔ ارشاد رسالت مآبؐ ہے: انما شفاء العیّ السوال ''لاعلمی وجہالت کا علاج تو سوال ہی ہے [سنن ابی داؤد باب فی المجروح یتیمم حدیث ۳۳۶] سورۃ النحل میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: فسئلوا اهلَ الذکرِ ان کنتم لا تعلمون ''اے لوگوں اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم یا ذکر سے پوچھ لو''۔ قرآنی حکم کے اصول وآداب میں آپؐ نے خاص طور پر بات سکھائی کہ: فاذا اختلفتم فیہ فقوموا [بخاری، مسلم، مسند احمد، نسائی] ترجمہ: قرآن حکیم پڑھو جب تک کہ تمھارے دل ملے رہیں اور جب اس میں تمھاری اختلاف ہو جائے تو اٹھ کھڑے ہو، حضرت عمرؓ مہر کے سلسلے میں اصحاب تفقہ سے مشورہ فرما رہے تھے اور اس سلسلے میں قرآن وسنت کی روشنی میں غور وفکر کے لیے اپنا خیال مجلس صحابہ میں پیش فرمایا تھا ایک عورت نے اتفاقیہ گفتگو سنی اور اپنی رائے پیش کر دی، اس رائے کو قانون سازی کا نام دینا بے بصیرتی ہے۔ حضرت عمر کی ایک رائے کو قرآن کی خلاف ورزی قرار دینا نہایت جرات اور جسارت کی بات ہے گویا کہ نعوذ باللہ، حضرت عمرؓ نے قرآن کی سنگین خلاف ورزی کی تھی شکر ہے کہ وہ عورت آ گئی اور اس نے اختلاف کی جرات کر کے حضرت عمرؓ کو آئین [یعنی قرآن] توڑنے سے روک دیا لہٰذا ثابت ہوا کہ اسلام عورت کو قانون سازی میں شرکت کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام میں کسی کو قانون سازی کی اجازت نہیں قانون سازی کی اصطلاح خالص مغربی تصور ہے جو ایک خاص تاریخ سے نکلی ہے جس میں فرد فاعل مختار ہے کسی کو جواب دہ نہیں، علم کا سرچشمہ نفس انسانی ہے لہٰذا انسان کسی سے ہدایت مشورے کا پابند نہیں، وہ کسی کو جواب دہ نہیں وہ جو چاہے قانون بنائے ہر زمانے کا خیر وشر زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اسلام

میں قانون سازی نہیں ہوتی بلکہ قرآن وسنت کے قانون سازوں کے بتائے ہوئے اور بنائے ہوئے قوانین کی روشنی میں صرف احکامات اخذ کیے جاتے ہیں، استنباط کیا جاتا ہے اور رائے قائم کی جاتی ہے، قرآن وسنت کے متصادم کوئی رائے اخذ نہیں کی جاسکتی اور اس دائرے سے باہر کوئی شخص نہیں نکل سکتا۔ نائیک صاحب کا یہ بیان کہ اسلام میں قانون سازی ہوتی ہے نہایت سطحی عامیانہ اور نرم سے نرم اور کم سے کم الفاظ میں اسلامی تاریخ وتہذیب وعلمیت اور مغربی جمہوریت وقانون سازی سے ذاکر صاحب کی نہایت سطحی واقفیت کا مظہر ہے۔ نعوذ باللہ، حضرت عمرؓ آئین کی خلاف ورزی نہیں کر رہے تھے وہ صحابہ کرام سے ایک معاملے میں مشورہ چاہ رہے تھے، ان کی تشویش صحابہ میں زیر بحث تھی ایک عورت جو وہاں سے گزری اس نے خیر خواہی کے جذبے کے تحت اپنا موقف پیش کر دیا، اس عہد کی ایک عام عورت قرآن کی اس آیت سے واقف تھی تو کیا حضرت عمرؓ جیسا جلیل القدر صحابی اس آیت سے واقف نہ تھا جن کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا مسئلہ یہ ہے کہ ذاکر نائیک صاحب نے رسالت مآبؐ کے وصال کے موقع پر حضرت عمر کا وہ جلال نہیں دیکھا جب آپ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ اگر کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے تو اس کی گردن تن سے جدا کر دوں گا حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر قرآن کی آیت [آل عمران:۱۴۴] پڑھی۔ ترجمہ: ''محمد تو بس ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم پیچھے پھر جاؤ گے''۔ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ تو حضرت عمرؓ کو یہ محسوس ہوا کہ یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے، تلوار ان کے ہاتھ سے گر گئی انھیں قرار آ گیا، شکر ہے کہ ذاکر نائیک صاحب کی نظر سے حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ نہیں گزرا خدانخواستہ یہ قصہ ان کے ہاتھ آتا تو یقیناً وہ اپنے مناظروں میں یہ قصہ جدید اصطلاحات میں اس طرح بیان کرتے کہ حضرت عمرؓ نے آئین کی خلاف ورزی کی یعنی قرآن کی سورۃ آل عمران کی ۱۴۴ کا انکار کر دیا صرف اس ایک آیت کا نہیں بلکہ قرآن کی ان تمام آیات کا جہاں بتایا گیا ہے کہ ہر رسول پر موت وارد ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان آیات کا صرف انکار نہیں کیا بلکہ آئین قرآن [Constitution of Quran] کی خلاف ورزی میں اتنے آگے بڑھے کہ لوگوں کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے انھیں قرآن کے آئین کا علم نہیں تھا، پھر حضرت ابوبکرؓ آ گئے انھوں نے آزادی اظہار رائے [Freedom of Speech] اور آزادی تنقید [Freedom of criticism] کا آئینی حق استعمال کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کو آل عمران کی آیت ۱۴۴: وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۔ پڑھ کر سنائی تو انھیں معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ وصال فرما سکتے ہیں لہٰذا حضرت

عمرؓ آئین کی خلاف ورزی سے باز آ گئے اور صحابہ کرام کی جانیں بچ گئیں پس ثابت ہوا کہ اسلام میں آزادی اظہار رائے کا استعمال حضرت ابوبکرؓ نے کر کے حضرت عمرؓ کو آئین کی خلاف ورزی سے نہ صرف روک لیا بلکہ آئین کو محفوظ کر کے خون ریزی سے بچایا لہٰذا اسلام میں آزادی اظہار رائے کا وجوب اس واقعے سے ثابت ہوا اور یہ بھی ثابت ہوا کہ اظہار رائے کی آزادی [Freedom of expression] سے امت خوں ریزی، قتل وغارت وخون سے بچ گئی مغرب کو اس آزادی کی اہمیت کا اندازہ میگنا کارٹا سے ہوا اور فیڈرلسٹ پیپر امریکی دستور اور انسانی حقوق کے منشور کے ذریعے سترہویں صدی میں جا کر مغرب آزادی کی اس نعمت سے ہم کنار ہوا جو مسلمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے نتیجے میں پندرہ سو برس پہلے آ چکی تھی۔ اس قسم کے جاہلانہ دلائل عصر حاضر کے مناظروں اور جدیدیت پسند مفکرین کا دل پسند مشغلہ ہیں کیونکہ وہ اسلامی تاریخ وتہذیب سے بے بہرہ ہیں، نہ صرف اسلامی تہذیب وعلمیت سے بلکہ مغربی فکر وفلسفے ودستوریت اور آئینی اصول قانون سازی کے طریقے سے بھی قطعاً ناواقف ہیں،

اب آیئے اس واقعے کی طرف جو حضرت عمر کے ساتھ پیش آیا، کیا حضرت عمر جیسا جلیل القدر صحابی آل عمران کی آیت ۱۴۴ سے ناواقف تھا؟ کیا صرف حضرت ابوبکر کو ہی یہ آیت یاد تھی؟ حضرت عمرؓ نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم ہم سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے حضرت عمر کی زبانی سنیے: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں مجھ سے فرمایا ابن عباسؓ آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت میں نے جو کہا تھا اس کا سبب کیا تھا؟ میں نے کہا امیر المومنینؓ میں نہیں جانتا آپ ہی زیادہ جان سکتے ہیں، اس کے بعد آپؓ نے یہ آیت کریمہ پڑھی: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا [۲:۱۴۳] ''اور یوں ہم نے تمھیں معتدل وافضل امت بنایا تا کہ لوگوں پر تم گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ رہیں''۔ بخدا جب میں اسے پڑھتا تو خیال ہوتا کہ رسولؐ اپنی امت میں اسی طرح باقی رہیں گے تا کہ اس کے آخری عمل کی بھی شہادت دیں اسی آیت نے مجھ سے وہ بات کہلوائی جو میں نے کہی[1]۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ سلم کے انتقال پر جو کچھ فرمایا تھا وہ قرآن کی سورۃ بقرہ کی آیت کریمہ کے معانی سے اجتہاد کی بنیاد پر کہا تھا، انھوں نے آئین قرآن کی خلاف ورزی نہیں کی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے انھیں آئین کی خلاف ورزی سے نہیں روکا تھا بلکہ ان کے سامنے وہ دلیل رکھ دی تھی جس نے ان کی گرہ کھول دی اور ان کی الجھن دور فرما دی، لیکن ذاکر نائیک صاحب کے فلسفے کے تحت حضرت عمرؓ کا یہ رویہ آئین کی خلاف ورزی پر مشتمل تھا اس قسم کی اغلاط خطرناک گمراہیوں کو جنم دیتی ہیں۔ عہد حاضر میں یہ گمراہیاں عام ہیں اور جدیدیت پسند مفکرین اس قسم کی اغلاط میں مبتلا ہیں۔

[1] سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحات ۶۶۱-۶۶۲۔

دسواں باب

ذاکر نائیک صاحب اور جمہوریت کی حمایت

رسول اللہ عورتوں کے ووٹ سے منتخب ہونے والے حکمران: [معاذ اللہ]

ڈاکٹر نائیک صاحب جمہوریت کے بڑے حامی ہیں وہ رسالت مآب کو ایک جمہوری حاکم ثابت کرتے ہیں جو صرف عورتوں کے ووٹوں سے منتخب ہوئے تھے [نعوذ باللہ] خطبات ذاکر نائیک [مطبوعہ فضلی سنز کراچی اور کتاب سرائے لاہور] میں قرآن حکیم کی جس آیت سے انھوں نے اسلام میں عورتوں کے ووٹ کا جواز پیش کیا ہے اس میں مردوں کا ذکر نہیں ہے اور نائیک صاحب مردوں کے حق رائے دہی کے سلسلے میں کوئی آیت پیش کرنے سے قاصر رہے: ''اے نبی آپ کے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گی، چوری نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی تو ان سے بیعت لیجیے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کیجیے'': يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ [۶۰:۱۲] اس آیت میں الیکشن کا کوئی ذکر نہیں اگر اس آیت کو عورتوں کے ووٹ کے حق میں سمجھا جائے تو قرآن کی اس آیت کی رو سے اسلام صرف مسلمان عورتوں کو ووٹ کا حق دیتا ہے کہ وہ حاکم منتخب کر سکتی ہیں، غیر مسلم عورتوں کو ووٹ کا حق نہیں ملے گا اور نائیک صاحب کے تناظر میں یہ آیت یقیناً صرف اور صرف مسلمان عورتوں کو ووٹ کا حق دیتی ہے لیکن مسلمان مردوں کو ووٹ کے حق سے محروم کرتی ہے کیوں کہ اس میں مسلمان مردوں کا ذکر نہیں ہے اور قرآن کی کسی دوسری آیت میں مسلمان مردوں کے ووٹ سے متعلق کوئی حکم موجود نہیں۔

مردوں کی بیعت سے متعلق دو آیتیں سورۃ الفتح میں ہیں، لیکن ان آیات کا تعلق ووٹ کی

بیعت سے نہیں قتال کی بیعت سے ہے جس کا تعلق بیعت رضوان سے ہے : اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا [۱۰:۴۸] ''اے نبی جولوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا'' اس بیعت کی وضاحت آیت نمبر اٹھارہ میں کی گئی ہے: ''اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا، جب وہ درخت کے نیچے آپؐ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا اس لیے اس نے ان پر شکست نازل فرمائی ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی'': لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا [۱۸:۴۸] قرآن کی اصطلاح ''بیعت'' کا مطلب اگر ذاکر نائیک صاحب کے الفاظ میں ووٹ ہے تو قرآن میں ووٹ یعنی بیعت کا ذکر صرف اور صرف سورۂ فتح اور سورۂ الممتحنہ میں آیا ہے۔ [۱۲:۶۰، ۱۰،۴۸] لہٰذا ذاکر نائیک صاحب کے فلسفے کے مطابق اسلام میں صرف عورتوں کو اور وہ بھی صرف مسلمان عورتوں کو ووٹ دینے کی آزادی ہے، لیکن ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم مردوں اور عورتوں کے ساتھ ساتھ مسلمان مردوں کو بھی ووٹ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نائیک صاحب اسلام میں عورتوں کی حکمرانی کے قائل نہیں ہیں اور اس کا ردوہ نصوص صریحہ کے بجائے عقلی بنیادوں پر کرتے ہیں، ان کی بیعت والی دلیل ان کے اس موقف کی تردید کرتی ہے کہ عورت حکمراں نہیں ہو سکتی کیوں کہ ووٹ دینے والا ہی حکمران منتخب ہونے کا اہل ہے، رائے دہندگان کے حلقے سے قرآن نے مرد کو خارج کر دیا اب صرف عورتیں ہی ووٹ دینے کی اہلیت رکھتی ہیں، مرد تو نااہل ہو گئے لہٰذا مسلمانوں کا حکمراں بھی عورتوں میں سے منتخب ہونا چاہیے کیونکہ جو مرد ووٹ دینے کا اہل نہیں ہے وہ حکمران بننے کا اہل کیسے ہو سکتا ہے [نعوذ باللہ] جسے ووٹ دینے کا حق قرآن نے نہیں دیا اسے حکمران بننے کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟ اگر عورت حکمراں نہیں بن سکتی تو وہ اہل ہوتے ہوئے [نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ] نا اہل مرد کو کیسے حکمراں منتخب کر سکتی ہے، اس تفصیل کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ایک کمزور عقلی دلیل اخلاص کے باوجود نصوص صریحہ کو غیر ارادی طور پر کس طرح مسترد کرتی ہے۔ کس طرح ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر حملہ آور ہوتی ہے، کس طرح اسلامی احکامات کا انکار کرتی ہے، اس کا اندازہ نائیک صاحب کے طرز استدلال سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

کیا پیغمبر ووٹوں کے ذریعے حکمرانی کے منصب پر فائز ہوتے ہیں؟ کیا پیغمبر کی حزب اختلاف بھی ہوتی ہے؟ کیا پیغمبر تمام فیصلے تمام لوگوں کی رائے سے کرنے کے پابند ہوتے ہیں یا کثرت رائے سے یا اس رائے سے جو سب کے لیے بہترین ہو؟ یعنی جدید سیاسی اصطلاحات میں will of all, will of majority or general will کیا رسالت مآبؐ انسانوں کے محتاج تھے کہ ان سے اپنے حق حکمرانی کی توثیق حاصل کرتے؟ یا انسان آپؐ کے محتاج تھے کہ آپؐ کی اتباع کر کے اپنی آخرت سنوارتے اور دنیا میں بھی شرف فضیلت حاصل کرتے؟ کیا اسلام میں عوام مقتدر اعلیٰ ہوتے

ہیں؟ لہٰذا نائیک صاحب کے فلسفے سے ثابت ہوگیا کہ اسلام میں صرف اور صرف عورت ہی حکمران ہوسکتی ہے مرد کا اسلامی ریاست میں کام صرف جہاد اور قتال ہے، ریاست چلانا عورت کی ذمہ داری ہے لہٰذا نائیک صاحب کہہ سکتے ہیں کہ Feminism کی تحریک مغرب سے بہت پہلے نعوذ باللہ، اسلام کے قرن اول میں موجود تھی اور اس کا ماخذ بھی قرآن تھا۔ قرآن کی ایسی آزادانہ تفسیر مستشرقین نے بھی نہیں کی اس تفسیر کے نتیجے میں مسلمان مرد اور عورت دونوں ہی منصب خلافت کے لیے نا اہل ہو گئے کیونکہ نائیک صاحب عورت کو حکمرانی کا اہل نہیں سمجھتے اور قرآن نے مرد کو حق رائے دہی ہی نہیں دیا تو مرد خود حکمراں کیسے بن سکتا ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ نائیک صاحب نے قرآن، علم تفسیر اور علم حدیث کا بہ غور مطالعہ نہیں فرمایا، کاش وہ ان علوم کی طرف توجہ دیتے اور جدید مغربی فلسفے اور سائنس پر عبور بھی حاصل کرتے تو امت ان سے استفادہ کرسکتی تھی، ادھورے علم کے ساتھ صرف زور خطابت کے ذریعے عالم کفر کو فتح کرنے کے لیے نکلنا عظیم المیہ ہے!

بہت سے لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سورۃ ممتحنہ کی آیت دس اور گیارہ کا آپس میں کیا تعلق ہے اور اللہ رب العزت نے عورتوں کو کیا مقام عطا فرمایا ہے۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آیت گیارہ جو بیعت سے متعلق ہے فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی۔ صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے مرد اہل ایمان پناہ کے لیے مدینہ تشریف لاتے رہے تو انھیں معاہدے کی شرائط کے مطابق واپس کیا جاتا رہا، پھر مسلمان عورتوں کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو کفار نے معاہدے کا حوالہ دے کر ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا حدیبیہ کے معاہدے کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے؟ معاہدے میں جو شرائط لکھی گئی تھیں ان میں بخاری کی روایت کے مطابق رجل [مرد] کا لفظ تھا یعنی عورتیں اس معاہدے سے مستثنیٰ تھیں لیکن کفار کا مطالبہ تھا کہ اس شق کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوگا، ان کا خیال تھا کہ عورت مرد کی تابع ہے جب عورت کا قوام رجل معاہدے کے تحت واپس کیا جائے گا تو اس کی مملوک، ملکیت اور تابع یعنی عورت خود بخود اس معاہدے کا حصہ ہے وہ رجل ہی کا جزو ہے اس سے الگ نہیں۔

عورتوں کے حقوق: اسلام کا احسان عظیم:

اس تذبذب کے موقع پر اللہ رب العزت نے عورتوں کو اپنی آغوش رحمت میں لیا، وہ مخلوق جسے کفار، مشرکین مکہ، فلاسفہ عرب وعجم کے کلام اور فلسفے میں حقیر، ذلیل اور کمتر سمجھا جاتا تھا [عورتوں سے متعلق فلاسفہ عرب وعجم کے فاسد خیالات کی تفصیلات جاننے کے لیے Nancy Tuana کی کتاب[1] ملاحظہ کیجیے۔ اس کی مدد کے لیے اس کے آنسو پونچھنے، اس کی عزیمت، ایمان کی شہادت اور سفر ہجرت کو قبول کرنے اور اسے خصوصی درجہ عطا کرکے اسے کفار کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی آیت

1. Nancy Tuana, *Woman and the History of Philosophy*, USA: Paragon Press, 1992 .

آسمانوں سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل ہوئی: فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ [۶۰: ۱۰] لہٰذا عورتوں کی حفاظت کے لیے معاہدہ حدیبیہ کی توجیہہ، تشریح، تبیین، تفسیر اور اصلاح آسمان سے کی گئی اور ہجرت کر کے آنے والی عورتوں کو مدینہ میں روک لینے کا حکم دیا گیا۔ عورتوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں ٹک کر رہیں: وَ قَرْنَ فِي بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا [۳۳:۳۳]۔ یہ خصوصی، عالی اور عظیم، درجہ عورتوں کو ان مردوں کے مقابلے میں عطا کیا گیا جن کو قرآن نے عورتوں پر ایک درجہ عطا فرمایا تھا: وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ [۲:۲۲۸] انھیں عورتوں کا قوام قرار دیا تھا اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ [۴:۳۴] مرد کو اللہ نے عورت پر ایک درجہ فضیلت عطا فرمائی ہے تو اس کی وجہ صنفی تفریق [gender discrimination] نہیں وہ اندرونی عظیم ذمہ داریاں [domestic responsibilities] ہیں جن کی ادائیگی کے لیے عورت کو تمام خارجی ذمہ داریوں سے بری الذمہ کر کے بیرونی ذمہ داریوں کا تمام بوجھ مرد کے کاندھے پر رکھ دیا گیا ہے، لہٰذا جس کی ذمہ داری زیادہ ہے اس کا درجہ بھی زیادہ رکھا گیا ہے، اسی لیے قرآن میں آتا ہے: وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا [۴:۳۲] ہم نے ایک کو دوسرے پر بلند درجہ دیا: وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ [۴۳:۳۲]، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ [۶۲:۴] مرد کو عورت پر یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے لہٰذا اس کی تمنا کرنے کی ضرورت نہیں اللہ نے اور بہت سی ایسی فضیلتیں عورت کو عطا کی ہیں جو مرد کو نہیں دیں مثلاً جنت عورت کے قدموں میں ہے اور مرد کے لیے جنت تلواروں کے سائے میں ہے دونوں اس فضیلت کا حصول اپنے اپنے دائرے میں کر سکتے ہیں دوسرے کے دائرے کی تمنا کرنا غیر ایمانی رویہ ہے۔

مرد کی قوامیت سے مراد:

قرآن نے واضح کر دیا کہ مردوں کو قوامیت اس بنیاد پر دی گئی ہے کہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں: بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ [۴:۳۴] اس نص سے ثابت ہوا کہ کسب معاش، اور مال کمانے کی جدوجہد کا مکلف صرف مرد ہے، مال خرچ کرنے کے باعث اسے عورت پر فضیلت دی گئی ہے لہٰذا وہ تہذیب و تمدن قرآن کو مطلوب ہے جس میں مرد نہایت سہولت اور آسانی کے ساتھ رزق حلال کما سکے تاکہ عورت و مرد کے فطری دائرۂ کار کی حدود قائم رکھی جا سکے۔ مرد جب تک بیرونی دنیا کے امور، رزق کی تلاش اور مال کمانے کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ دیگر تمام خارجی امور [external affairs] کی ذمہ داری نہیں اٹھائے گا عورت گھر کے میدان جہاد کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر رہے گی۔

مرد گھر کی تمام ضروریات پوری کرے گا اس میدان جنگ میں سپہ سالار خانہ [Women]

کو حسب ضرورت کمک اور رسد فراہم کرے گا تو عورت گھر کے میدان جہاد کو گرم اور تازہ رکھے گی لیکن اگر مرد کے لیے معیشت کا حصول مشکل سے مشکل ہونے لگے اس کے لیے وسائل زندگی محدود کر دیے جائیں اور عورت کو برابری کے نام پر مرد کے شانہ بشانہ لا کر مرد کے ذرائع رزق عورتوں میں تقسیم کر دیے جائیں مرد بے روزگار اور عورت روزگار والی ہو جائے یا معیار زندگی کے لیے عورت گھر چھوڑ کر بازار کا رخ کرنے پر مجبور کی جائے تو ایسے فاسد، غیر فطری اور غیر حقیقی تہذیب وتمدن اور نظام زندگی میں شریعت کے بتائے ہوئے طریقے سے اللہ کی مختص کردہ حدود اور دائروں کے مطابق عمل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیا معیارِ زندگی قائم رکھنے کا یہ معیار شریعت نے مہیا کیا ہے؟ کیا یہ معیار بذاتہٖ خود پیمانہ ہے یا اس کو کسی خارجی منہاج اور کسی دوسرے معیار پر پرکھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ انبیاء اور شریعت معیارِ زندگی کی کیا حدود متعین کرتے ہیں؟ یہ اہم ترین سوالات ہیں۔

معیار زندگی میں مسلسل اضافے کو ایک قدر سمجھنے کے نتیجے میں بھی فساد پیدا ہوتا ہے کیونکہ معیار کا حصول عموماً اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک مرد کے ساتھ عورت بھی کمانے کے قابل نہ ہو لہٰذا ہر ایسا معیار زندگی جو عورت کی معاشی اور مادی کوشش کے ساتھ قائم ہو ایک فاسد و باطل کام ہے۔ جس طرح دہشت گردی کی کوئی تعریف ممکن نہیں اس طرح معیار زندگی کی تعریف بھی ممکن نہیں ہے لیکن رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ سے زیادہ معیار زندگی کے بارے میں احادیث کے ذریعے رہنمائی فرمادی ہے لہٰذا اس معیار سے اعلیٰ تر معیار کی ہمہ وقت جستجو، آرزو اور خواہش قرآن، سنت، انبیاء، صالحین اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے انحراف ہے۔

مغربی فلسفہ اور تہذیب عورت مرد کے فطری دائروں کو توڑ کر مخلوط معاشرت کے ذریعے عورتوں کو ان کے اصل دائرۂ عمل سے باہر نکال کر ترقی، فلاح، آمدنی اور معیار زندگی کے نام پر ہزاروں سال سے موجود اس روایتی اور آسمانی تقسیم کار کی تخصیص کے تصورات کو عملاً ختم کرنا چاہتا ہے جس کے نتیجے میں مرد و عورت اپنے اپنے میدان ہائے کار میں جدوجہد کرنے کی تمام ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتے اور خاندانی نظام ختم ہو جاتا ہے۔

عورت کو گھریلو زندگی سے مستثنیٰ کرنے کا مطلب:

جو لوگ عورت کو گھر کے سوا ہر ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں وہ قرآن کی نص کا انکار کرتے ہیں جس نے واضح طور پر دونوں کی حدود کا تعین کر دیا ہے، ان حدود کو پامال کرنا فساد فی الارض ہے اور اس پامالی کے شرعی دلائل تلاش کرنا اجتہاد نہیں الحاد اور فساد ہے۔ بجائے اس کے کہ جدیدیت پسند مفتی حضرات عصر حاضر کے فاسد اور باطل نظام زندگی کو بدلنے کی کوشش کے لیے فتوے دیں وہ اسی مصنوعی مسلط کردہ تمدن کو عین فطری سمجھ کر عورت کو وہ تمام امور تفویض کر رہے ہیں جو صرف مرد کے لیے مختص ہیں۔ ہر وہ نظام، تہذیب، فلسفہ اور نظریہ جو عورت اور مرد کے مابین فطری دائرۂ کار، خلقی، جبلی، طبیعی اور حقیقی وظائف کو غیر فطری طور پر تبدیل کر کے دونوں کے لیے مساوی پیمانے اور یکساں دائرۂ کار مہیا

کرے وہ باطل ہے اور ایسی تہذیب اور نظریے کی مکمل شکست و ریخت تک جدوجہد جاری رہنی چاہیے نہ کہ اس باطل تہذیب کے مسلط کردہ نظام زندگی کے مطابق اسلام کی نصوص کو بدل کر عورت کا دائرۂ کار مرد کے مساوی کر دیا جائے، حالت اضطرار میں جہاں جہاں مجبوراً عورت کو اپنے دائرۂ کار سے ماورا کام کی اجازت، مصلحت، رخصت، عموم بلوہ کے تحت مشروط طور پر دی جا سکتی ہے وہ محض ایک عارضی صورت اور وقتی انتظام کے طور پر دی جائے گی، نہ عورت کا دائرۂ عمل وسیع ہو کر مرد کے مساوی ہوگا نہ عورت معاش کے لیے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کی جائے گی۔ اس سے شریعت کا اصل حکم معطل نہیں ہوگا۔ اس کی وضاحت بھی ایسی اجازت دیتے ہوئے صاف الفاظ میں مفتی، فقیہہ اور مجتہد کو انہی الفاظ میں کرنی چاہیے جس طرح قرآن نے رخصت دی ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [۵:۳] یعنی جو کام بھی حالت اضطرار میں مجبوراً کیا جائے وہ ایک عارضی حل کے طور پر صرف اسی حد تک جس حد تک شدید ضرورت کا تقاضا ہو اور اس حالت میں بھی دل میں گناہ، بغاوت احکام شریعت سے انحراف کا کوئی تصور اور شائبہ تک موجود نہ ہو۔ ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکامات پر عمل سے گریز یا حیلے بہانوں سے انحراف کفر کا رویہ ہے۔ سورۂ نحل کی روشنی میں جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کے لیے [وہ اگر] مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو [تب تو خیر] مگر جس نے دل کی رضا مندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ [۱۶:۱۰۶] عہد حاضر میں مغرب کے مسلط کردہ جبری سرمایہ دارانہ اور کمیونزم کے نظریات کے باعث عورت مجبور کر دی گئی کہ وہ گھر سے باہر نکلے، ایسا طرز زندگی جبراً مسلسل مسلط کیا جا رہا ہے کہ مرد اپنے وظائف ادا کرنے کے قابل نہ رہے اور اس کمی کو عورت پورا کرے تاکہ خاندان کی اکائی منتشر ہو جائے اور فلسفہ انفرادیت پرستی [Individualism] اور لذت پرستی [Hedonism] ممکن ہو جائے۔ اس حالت اضطرار میں اگر عورت اپنے فطری دائرۂ کار سے باہر نکلنے پر مجبور کر دی گئی ہے تو اسے سرمایہ دارانہ نظام جبر کا اثر سمجھا جائے نہ کہ عین فطرت کا تقاضا اور دینی تعلیمات کا منشا قرار دے کر دین کے نصوص کو مسخ کر کے یا دین کی نئی تشریح و تعبیر کے ذریعے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ [Reconstruction of Religious thought] کے مغربی تصورات کی تکمیل کی جائے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ عہد حاضر میں حالت اضطرار کو ایک فطری حالت تصور کر لیا گیا ہے اور مسئلے کے اصل تناظر کو نظر انداز کر کے سادہ طریقے پر فتوے دیے جا رہے ہیں۔ فتوے دینے والے ٹی وی کے ٹاک شو کے مفکرین وہ ہیں جن کا علوم اسلامی سے کوئی تعلق عموماً نہیں ہوتا۔

مرد اور عورت کی مساوات کا مطلب:

عورت اور مرد بلاشبہہ اللہ کے عبد اور بندے ہیں، بندگی میں برابر ہیں اس لیے قرآن نے مومنین مردوں اور عورتوں کی جو مشترکہ خصوصیات بتائیں ہیں ان میں صنفی بنیادوں پر کوئی فرق نہیں رکھا۔ دونوں اپنے اعمال کے باعث ایک دوسرے سے آگے بڑھ سکتے ہیں اور کسی بھی عبد کا درجہ دوسرے عبد سے بلند ہوسکتا ہے خواہ وہ کسی طبقے کا فرد ہو۔ معرفت رب کے حصول میں عورت کی نسوانیت کسی صورت میں حائل نہیں ہوتی اس کا حصول صرف اور صرف عمل سے مشروط ہے اور عمل کے لیے تذکیر و تانیث کی کوئی قید نہیں اسی لیے قرآن میں آتا ہے: اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّ الذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا [۳۳:۳۵] اور وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ☆م یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَ یُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِکَ سَیَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ...... وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ مَسٰکِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ [۹:۷۱،۷۲] یہاں عورتوں اور مردوں کی مشترکہ خصوصیات ایک ساتھ بیان کی گئیں لیکن قرآن میں جہاں جہاں عورت و مرد کی خصوصیات الگ الگ بیان ہوئی ہیں وہاں دونوں کے مابین خلقی و فطری فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور اس فرق کے مطابق ذمہ داریوں کی تقسیم کو مدنظر رکھ کر ان کے اوصاف و وظائف بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً مردوں کے لیے کہا گیا: اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ [۹:۱۱۲] اس آیت میں عورتوں کو خصوصاً شامل نہیں کیا گیا اور عورتوں کے لیے دوسری جگہ الگ سے فرمایا گیا: عَسٰی رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْکَارًا [۶۶:۵] سورۂ توبہ کی آیت: ۱۱۲ میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر نہ کرنے کی حکمت توبہ کی آیت ۱۱۱ میں بیان کی گئی ہے۔ جدیدیت پسند اپنی جدیدیت کے زیر اثر عورت اور مرد کی مساوات خواہ مخواہ ثابت کرتے ہوئے زور خطابت میں اس آیت کو سہواً فراموش کر جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے، مارتے اور مرتے ہیں ان سے [جنت کا وعدہ] اللہ تعالیٰ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکالیا ہے یہی سب سے بڑی کامیابی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ

اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ [۹:۱۱۱]

اس آیت میں يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا ذکر ہے لہٰذا عورتوں کو اس فریضے سے الگ کر دیا گیا جب عورتوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی ادائیگی سے بری الذمہ کیا گیا تو لامحالہ وہ امامت کبریٰ کے منصب کی ذمہ داری سے بھی بری ہو گئیں کیوں کہ کفر کے خلاف جہاد اور نہی عن المنکر کے لیے قوت کا استعمال صرف مرد کرے گا لہٰذا امامت کبریٰ کی ذمہ داری مرد کا دائرہ کار ہے، اسی طرح امامت صغریٰ کے لیے بھی عورت اہل نہیں ہے مسجد کی امامت مردوں پر فرض ہے دوسرے لفظوں میں جو امامت صغریٰ کا اہل ہے وہی امامت کبریٰ کا اہل ہوگا اسی لیے تمام انبیاء مرد تھے [۱۲:۱۰۹، ۱۶:۴۳، ۲۱:۷]، سورۂ توبہ کی آیت ایک سو گیارہ نے عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار کی واضح طور پر تخصیص کر کے عورت کو گھر کے میدان جہاد تک محدود کر دیا یہی اس کا اصل دائرہ ہے، عورت جب بھی اس دائرے سے تجاوز کرے گی، باہر نکلنے کی کوشش کرے گی یا جدید تمدنی تقاضے اسے جبراً باہر نکلنے پر مجبور کریں گے تو لازماً اس کے گھر کی بنیادی ذمہ داریاں متاثر ہوں گی، وہ دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہے گی جس کے نتیجے میں تہذیب وتمدن میں فساد رونما ہوگا، مغرب میں خاندان کی تباہی اور اخلاقیات کا زوال اس کا بیّن ثبوت ہے۔ مغرب میں برطانیہ جیسے روایتی ملک میں ستر فی صد بچے حرامی پیدا ہوتے ہیں، بہت سے یورپی ملکوں میں یہ شرح نوے فی صد تک ہے اور اکثر مغربی ممالک ایسے ہیں جہاں بچوں کی پیدائش ہی ختم ہوگئی ہے اور آبادی میں اضافے کی شرح منفی ہے، منفی آبادی کا مطلب یہ نہیں کہ بچے پیدا ہی نہیں ہوتے بلکہ رحم مادر ہی کو بچوں کی قبر، قتل گاہ، مدفن، آخری آرام گاہ اور قبرستان میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ عورت لذت کی خاطر دردِ زہ کی کلفت گوارا نہیں کرتی، اسے بچے بوجھ لگتے ہیں وہ باہر نوکری بھی کرے اور بچے بھی پالے، راتوں کو اٹھ کر انھیں سنبھالے ان کے ہر مسئلے کو حل کرے، پھر ان کی تعلیم، تربیت، بیماریاں، شادیاں مسلسل ذمہ داریوں پر ذمہ داریوں میں اضافے قبول کرے، پھر نانی دادی بھی بنے اور اپنے پوتوں، پوتیوں، نواسے، نواسیوں، دامادوں کے ناز نخرے برداشت کرے، مغربی عورت سے دو بوجھ اٹھائے نہیں جاتے لہٰذا مغربی عورت نے ایک بوجھ پھینک دیا۔

گھر سے باہر نکلنے والی عورت کا فطرت پر قائم رہنا مشکل ہے:

پاکستان جیسے مذہبی ملک میں وہ مذہبی خواتین جو مختلف مذہبی تحریکوں اور جماعتوں میں جوش و خروش سے شریک عمل ہیں وہ ان بیرونی تحریکی اور مذہبی فرائض کی ادائیگی کے باعث اپنے چھوٹے بچوں کو دودھ تک نہیں پلا سکتیں جبکہ قرآن کی نص سے دو سال تک دودھ پلانا عورت کی ذمہ داری ہے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی عورت کے فرائض کی ترتیب خود بخود بدل جاتی ہے۔ خواہ نکلنے والی عورت کیسی ہی دین دار کیوں نہ ہو وہ اپنے کو فطرت پر قائم نہیں رکھ سکتی، اس کے فطری وظائف بدلنے لگتے ہیں مگر خبر و نظر سے

محروم نفس اس تبدیلی کو آسانی سے محسوس نہیں کرسکتا۔اس تبدیلی کو جاننے کے لیے وہ تعقل قلبی چاہیے جو ہم میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنا مارنا اور شہید ہونا عورتوں کی بنیادی ذمہ داری نہیں ہے،سورۃ توبہ کی آیت :۱۱۲ میں ان مجاہدین فی سبیل اللہ کی خصوصیات کا ذکر کیا گیا تو وہ خصوصیات بیان کی گئی ہیں جو ایک مرد کے لیے مطلوب ہیں۔اسی لیے اس تذکرے میں عورتوں کو شامل نہیں کیا گیا،اس آیت میں صرف مومن مردوں کو بشارت دی گئی ہے کیونکہ یہ بشارت جہاد میں شامل مجاہدین کو دی گئی ہے جو مرد ہیں۔جہاد اور حدود اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا فریضہ،طاقت سے امر بالمعروف کا حکم اور قوت کے ساتھ نہی عن المنکر کے خاتمے کی ذمہ داری عورتوں کے لیے نہیں ہے۔انھیں ان آہنی،جہادی،جلالی و جنگی امور سے بری الذمہ کیا گیا ہے لہٰذا جہاد سے متعلق خوش خبری بھی مردوں کے لیے خاص ہے جو اپنی جانوں پر کھیل کر حدود اللہ کی محافظت کرنے کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں اس میں کسی صنفی امتیاز کا کوئی دخل نہیں ہے۔

عورت: گھریلو امور کی انجام دہی: عظیم ترین جہاد:

اللہ تعالیٰ کی سنت بالغہ کے مطابق عورتیں گھروں کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی تیاری کے لیے خلق کی گئی ہیں،ان کا جہاد گھریلو امور ہیں۔جو عورت ان امور کی انجام دہی میں جان دے دے اس کا درجہ شہید کے برابر رکھا گیا ہے،اسے شہادت کا مقام و مرتبہ گھر کے میدان جہاد میں عطا ہوتا ہے،یہ جہاد اکبر ہے اسے اصغر سمجھنا عہد حاضر کے جدیدیت پسندوں کی نادانی ہے۔حدیث میں آتا ہے: علی النساء جهادٌ لا قتال فيه الحج و العمرة [مسند احمد] ''عورتوں کے لیے ایسا جہاد ہے جس میں قتال نہیں وہ حج اور عمرہ ہے''۔اس مقام پر بخاری کی حدیث: ماترکت بعدی فتنةً اشد علی الرجل من النساءُ اور بزار کی حدیث: لو لا النساء لدخل الرجال الجنة اور دیلمی کی حدیث: لو لا النساء لعبد الله حق عبادته کی تطبیق کی جائے تو میدان جہاد میں عورتوں کا مردوں کے شانہ بشانہ دشمن کے خلاف حصہ نہ لینے کے فلسفے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کے نتیجے میں نفس کے خلاف جہاد اکبر ضروری ہو جاتا ہے،اس لیے اسلامی تاریخ و تہذیب و علمیت میں عورتوں کے مسجد میں روزانہ عبادت کے لیے آمد و رفت کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو ان کی خلقی ساخت کے مطابق آبگینوں سے تشبیہ دی،یہ آبگینے جہاد کی سختیوں کے لیے تخلیق نہیں کیے گئے،الادب المفرد میں امام بخاریؒ نے روایت درج کی ہے: ارفق انجشه ویحک بالقواریر عورتوں کے دلوں کو شیشہ کہا گیا ہے،عورت فولاد نہیں ہے،نرمی اس کی خاص صفت ہے،ان شیشوں کو بال سے محفوظ رکھنے کے لیے انھیں میدان جنگ سے ہمیشہ کے لیے رخصت عطا کر دی گئی۔ذاکر نائیک صاحب ان آیات اور احادیث سے عورت و مرد کے دائرۂ کار کا تعین قرآن و سُنت کی روشنی میں خود کر سکتے تھے،اس تعین کے لیے خواہ مخواہ عقل پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں تھی،نہ قرآن کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت تھی کہ اس نے عورت کی قیادت کی ممانعت نہیں کی لیکن اس کا منشا یہی ہے۔

قرآن: عورت اور مرد کے دائرۂ کار کا تعین:

سورۃ توبہ کی آیات: ۱۱۱، ۱۱۲ کے ذریعے عورت اور مرد کے دائرہ کار کا نص سے تعین کا پس منظر یہ ہے کہ عورت اور مرد کا دائرہ کار ان کے فطری، خلقی اور طبعی وظائف کے فرق کے باعث ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے، رحم مادر اور صفت رحم کا حد کمال سے تجاوز عورت کے خاص اوصاف ہیں جن کے باعث وہ بچے کی پرورش کے تمام مراحل نہایت محبت، کمال ضبط اور تحمل سے خوشی خوشی برداشت کرتی ہے حتیٰ کہ دردِ زہ بھی اس کے لیے درد نہیں مظہر کمال محبت کا عنوان بن جاتا ہے۔ امامت کبریٰ کی ذمہ داریاں مرد کے لیے مختص کی گئیں اسی لیے تمام انبیاء اللہ تعالیٰ نے مردوں میں سے بنائے: وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [۲۱:۷] یعنی نبوت، رسالت، امامت، خلافت، حکومت، سیاست، سفارت، شجاعت، بسالت، اور دیگر تمام بیرون خانہ کار دنیا کی تمام تر ذمہ داری بالفاظ دیگر اصطلاح شریعت میں امامت کبریٰ کا منصب مرد کے لیے مختص کر دیا گیا۔ قرآن حکیم نے واضح طور پر ہدایت فرما دی کہ عورتوں کو بیرونی دنیا کے امور اور اس کے متعلقات سے الگ رہ کر اپنی نسلوں کی حفاظت، نگہداشت، پرداخت، دیکھ بھال، تعلیم، تدریس اور تربیت کی اہم ترین ذمہ داری ادا کرنا ہے تاکہ امامت کبریٰ کے اہم ترین منصب کے لیے ایک عالی شان نسل اور بہترین لوگ تیار کیے جا سکیں، یہ جہاد کبیر عورت کی اہم ترین ذمہ داری ہے اس تقسیم کار کے ذریعے عورتوں کو علائق دنیا، گھر سے باہر کی مشقت، تکالیف، تکان، دوڑ دھوپ، سے روز محشر تک آزاد کر دیا گیا اور ایک اسلامی خاندان، قبیلے، معاشرے، ریاست اور حکومت کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ اپنے قول و عمل سے اللہ تعالیٰ کی اس حکمت بالغہ کو روبہ عمل لانے کے لیے تمام ممکنہ ذرائع اور طریقے اختیار کرے۔ جدید طرز زندگی کے باعث مرد وسائل حیات سے رزق کفاف حاصل کر سکتا ہے مگر عیش وعشرت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا اور کہیں وہ رزق کفاف بھی حاصل نہیں کر پاتا لہٰذا عورت گھر سے نکل رہی ہے تاکہ قوت لا یموت مہیا کرنے میں تعاون کرے یا عیش وعشرت کی زندگی کو ممکن بنانے میں اپنا حصہ ادا کرے، بجائے اس کے کہ اس جدید طرز زندگی اور نظام حیات کو بدلنے کی کوشش کی جائے اور اس کے بارے میں اظہار رائے کیا جائے اور لوگوں کی تعلیم، تربیت اور تزکیہ کیا جائے کہ خاندان اپنے لوگوں کی ذمہ داری قبول کریں معیار زندگی کو خدا ماننے سے انکار کر دیں اس کے بجائے عورتوں کے باہر نکلنے کی مذہبی تاویلیں محض فساد فی الارض میں اضافے کے بہانے ہیں۔

اگر عورتیں جہاد نہ کریں تو ان بشارتوں سے کیوں محروم کی جائیں جو صرف مجاہدین کے لیے مخصوص ہیں؟ اگر عورت ہونے کے باعث وہ فریضۂ جہاد سے سبکدوش ہوئی تو کیا اس کے فضائل، برکات اور انعامات سے بھی محروم کی گئی؟ اللہ تعالیٰ نے رسالت مآبؐ کے ذریعے عورت کے گھر میں قیام اور امور خانہ داری میں انہماک استغراق اور محنت کو جہاد قرار دیا اور گھر کا صحن عورت کے لیے صبح قیامت تک میدان جہاد میں تبدیل کر دیا گیا۔

عورت کو ازل سے کارِ نبوت ورسالت اور شجاعت [جہاد] کی ذمہ داریوں سے الگ رکھا گیا، اسی لیے جب حضرت مریمؑ کی پیدائش ہوئی تو ان کی والدہ نے اظہار تاسف سے کہا تھا مالک میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا اللہ کو اس کی خبر تھی اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا: فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْٓ اُعِیْذُهَابِکَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ [۳:۳٦] اس آیت کے ذریعے عورت اور مرد کے حدودِ کار کی تخصیص کر دی گئی اس آیت کا پس منظر یہ تھا کہ "جب عمران کی عورت کہہ رہی تھی کہ اے میرے پروردگار میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا میری اس پیش کش کو قبول فرما" [۳:۳۵] ایک وہ زمانہ تھا کہ جب عورتیں اپنے متوقع بیٹے کو دین کی خدمت کے لیے وقف کرتی تھیں آج یہ زمانہ ہے کہ عورتیں اپنے ذہین لڑکے کو پیدائش سے پہلے ہی صرف فوجی، دنیا کے لیے وقف کر کے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا عہدہ دار، فنانس اور اکاؤنٹ کا ماہر، کسی مغربی ملک کا شہری، ڈاکٹر، انجینئر، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، بنانا چاہتی ہیں اور غبی بچوں کو دینی مدرسوں میں داخل کراتی ہیں کیونکہ دنیا مقدم ہے۔ پھر علما سے پوچھتی ہیں کہ اس امت کا زوال کیسے رکے گا؟ جب تک عورتوں کی مادی خواہشات کا زوال نہیں ہوگا اور وہ اپنی اولاد کو دین کے لیے وقف نہیں کریں گے امت کو کبھی عروج نہیں مل سکتا، جب اس امت کی آغوشِ مادر ہی مادیت پر فریفتہ ہے تو اس آغوش سے اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے شہید ہونے والی نسل کیسے اٹھ سکتی ہے؟ جب دین کے لیے وقف کردہ نسل ہی موجود نہیں ہے تو اُمت کی قیادت و امامت سنبھالنے والے کہاں سے آئیں گے اور اس کی تقدیر کیسے بدلے گی؟

غالباً نائیک صاحب کی نظر سے ذیل کی احادیث نہیں گزریں اگر وہ یہ احادیث پڑھ لیتے تو کبھی نہ کہتے کہ قرآن نے عورت کی امامت کو ممنوع تو نہیں قرار دیا۔ دوسرے لفظوں میں اسلام میں عورت کے دائرۂ کار کا تعین نص سے نہیں صرف اور صرف عقل سے کیا گیا ہے، اگر عقل منہاج اور پیمانہ ہے تو ہیگل کے فلسفے کے تحت عقل ارتقاء پذیر رہتی ہے اور ہر اگلے زمانے کی عقل پچھلے زمانے سے بہتر اور عمدہ ہوتی ہے تو اب عقل کا فیصلہ یقیناً بدلا جا سکتا ہے کہ عقل تو تغیر اور ارتقا پذیر ہے وہ عورت کے دائرۂ کار کے تعین کے لیے صرف عقل پر انحصار کر کے ایسے دلائل پیش نہ فرماتے جن کی نہایت آسانی سے عقل تردید کر سکتی ہے۔ نائیک صاحب کو جوشِ خطابت میں یہ کہنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی کہ: "میرے علم کی حد تک قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی"[1]

---

[1] ذاکر نائیک، "اسلام میں خواتین کے حقوق جدید یا فرسودہ؟: سوالات وجوابات"، مشمولہ خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ٦٩۔

اگر وہ قرآن کا بالاستیعاب مطالعہ فرما لیتے جس کے حوالے اوپر آ چکے ہیں اور احادیث کے ذخیرے پر نظر ڈال لیتے جو درج ذیل ہیں۔ تو یہ بات ہرگز ارشاد نہ فرماتے:

[۱] اسماء بنت یزید انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تشریف فرما تھے۔ کہا! میرے والدین آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا، میں عورتوں کی جانب سے قاصد بن کر آئی ہوں۔ میری جان آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا۔ مشرق و مغرب کی کسی عورت کو بھی میری آمد کی اطلاع نہیں۔ نہ کسی نے سنا، مگر جو میری طرح رائے [ذہن] رکھتی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ مردوں اور عورتوں کی جانب بھیجا ہے ہم آپ پر اور جو آپ لے کر آئے ہیں اس پر ایمان لائے۔ ہم عورتوں کی جماعت گھروں میں بند بیٹھی مردوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں، حمل اور اولاد کے بوجھ کو برداشت کرتی ہیں اور مرد حضرات جمعہ، جماعت، مریضوں کی عیادت، جنازے میں حاضری اور حج پر حج کرنے اور اس سے افضل خدا کے راستے میں جہاد کرنے کی وجہ سے فضیلت [زیادہ ثواب] پاتے ہیں۔ یہ مرد حضرات جب حج، عمرہ اور خدا کی راہ میں جاتے ہیں تو ہم ان کے مال کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کے لیے کپڑے تیار کرتے ہیں اور ان کے بچوں کی پرورش کرتے ہیں تو اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم کیسے ثواب میں شریک ہوں گے۔ [یعنی برابر ہوں گے کہ وہ تو ان اعمال سے ثواب میں بڑھ گئے]۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رخ اصحاب رضی اللہ عنہم کی طرف کیا اور کہا تم نے اس عورت کا سوال سنا؟ دین کے بارے میں کتنا اچھا سوال تھا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نہیں معلوم کہ اس عورت کی طرح کوئی ان باتوں کی معلومات رکھتی ہوگی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی طرف رخ کیا اور فرمایا جاؤ اور تم اپنے علاوہ تمام عورتوں کو بتا دو کہ عورتوں کا شوہروں کے ساتھ حسن برتاؤ اور ان کی خوشیوں کا خیال رکھنا، ان کی باتوں کا ان کے موافق ماننا، ان سب اعمال [جو مرد کر رہے ہیں] کے برابر ہے چنانچہ وہ عورت مارے خوشی کے تہلیل و تکبیر کہتی ہوئی چلی گئی۔[1]

[۲] حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ازواج مطہرات ؓ سے حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس تمھارے لیے یہی حج ہے۔ اس کے بعد گھروں کی چٹائیوں پر بیٹھنے کو لازم پکڑ لینا۔ یعنی گھر سے بلا ضرورت نکلنا۔[2]

[۳] حضرت ضمرہ بن حبیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق فرمایا کہ وہ گھریلو کام کریں گی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر سے باہر کام کریں گے۔'' ابن حبیب نے کہا کہ گھر کی خدمت سے مراد آٹا گوندھنا، پکانا، بستر بچھانا، جھاڑو دینا اور

---

[1] بیہقی فی الشعب، جلد ۶ صفحہ ۴۲۱۔

[2] مجمع، صفحہ ۲۱۷، طبرانی۔

پانی نکالنا اور گھریلو سارے کام ہیں۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے ذمہ گھریلو تمام امور کو انجام دینا اور گھر کے نظم کو صحیح اور بہتر ڈھنگ سے چلانا ہے۔ گھریلو کام میں کھانا پکانا، کپڑے بستر کی صفائی کا انتظام کرنا ،گھر کی صفائی جھاڑو وغیرہ لگانا اور گھریلو تمام اشیاء کی حفاظت اور بچوں کی دیکھ بھال، ترتیب اور نگرانی شامل ہے۔ غلہ وغیرہ کا نظم اس کی صفائی اور تمام خوردنی اور برتن والے سامانوں کی نگرانی اور دیکھ بھال اس کے ذمہ ہے۔ باہر سے تمام سامان [حتیٰ کہ پانی تک لا کر دینا مرد کے ذمے ہے] گھر سے باہر کا جو کام ہو عورت اس کے لیے باہر نہ جائے گی۔

[۴] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے [ایک طویل] روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اس بات پر خوش نہیں ہے کہ جب وہ اپنے شوہر سے حاملہ ہو اس حال میں کہ وہ اس سے راضی ہو تو اس کو اتنا ثواب ملتا ہے جتنا کہ اس روزہ دار کو جو راہ خدا [جہاد] میں روزہ رکھ رہا ہو اور جب اسے دردزہ ہوتا ہے تو نہ آسمان والوں کو نہ زمین والوں کو علم ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا چھپا رکھا گیا ہے اور جب وہ بچہ جن دیتی ہے تو اس کے دودھ کا کوئی قطرہ نہیں نکلتا اور اس کا بچہ ایک مرتبہ چوستا نہیں مگر یہ کہ اسے ہر قطرہ اور ہر گھونٹ پر ایک نیکی ملتی ہے اور اگر کوئی رات کو [بچے کی وجہ سے] جاگے تو اسے ستر صحیح و سالم غلاموں کی راہ خدا میں آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے یہ ان خوش نصیب عورتوں کے لیے ہے جو صالح ہیں، فرمانبردار ہیں، جو اپنے شوہروں کی ناشکری نہیں کرتی ہیں۔[2]

[۵] حدیث پاک میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا کہ تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ جب تم میں سے کوئی اپنے شوہر سے حاملہ ہوتی ہے تو اس کو ایسا ثواب ملتا ہے جیسا کہ اللہ کے راستے میں روزہ رکھنے والے اور شب بیدار کو ثواب ملتا ہے اور جب اس کو دردزہ ہوتا ہے تو اس کے لیے [جنت میں] جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ہوتا ہے، اسے آسمان و زمین کے فرشتے بھی نہیں جانتے اور پیدائش کے بعد جب بچہ ایک گھونٹ بھی دودھ پیتا ہے یا چوستا ہے، اس پر ماں کو ایک نیکی ملتی ہے۔ اگر بچہ کے سبب سے رات میں جاگنا پڑ جائے تو راہ خدا میں ستر غلاموں کے آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے۔[3]

[۶] ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عورت حمل سے لے کر بچہ جننے اور دودھ چھڑانے تک ایسی ہے جیسے اسلام کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرنے والا ہو۔ اگر اسی دوران انتقال ہو جائے تو شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔[4]

[۷] حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ عورتوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

[1] ابن القیم الجوزیؒ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، بیروت: دار الکتب العلمیۃ، جلد ۵ صفحہ ۹۔

[2] ابوبکر الہیثمیؒ، مجمع الزوائد و منبع الفوائد، بیروت: دار الفکر، جلد ۴، صفحہ ۵۶۰، رقم: ۷۶۲۹

[3] متقی بن الحسامؒ، کنز العمال فی سنن الاقوال و الافعال، بیروت: دار الکتب العلمیۃ، جلد ۱۶ صفحہ ۱۶۸، رقم: ۴۵۱۱۴۔

[4] ایضاً، صفحہ ۱۷۱، رقم: ۴۵۱۵۱۔

کہا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کرنے سے مرد تو فضیلت لوٹ لے گئے۔ ہم عورتوں کے لیے بھی کوئی عمل ہے جس سے جہاد کی فضیلت ہم پا سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ،ہاں گھریلو کام میں تمھارا لگنا یہ جہاد کی فضیلت کے برابر ہے۔[1]

[۸] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے۔ تم میں سے ہر ایک سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا اور امام راعی ہے اور اس سے اپنی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا اور آدمی اپنے اہل وعیال کا نگہبان ہے۔ عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگہبان ہے اور خادم ونوکر اپنے آقا کے مال میں نگہبان ہے۔[2]

[۹] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا جن عورتوں سے تمھاری ملاقات ہو کہہ دو کہ شوہر کی اطاعت اور ان کے احسان کا اعتراف جہاد کے برابر ہے۔ مگر ایسی عورتیں تم میں بہت کم ہیں۔[3] حدیث میں ہے کہ عورتوں نے پوچھا کہ عورتوں کا غزوہ و جہاد کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا شوہر کی اطاعت اور اس کے احسان کا اعتراف ہے۔[4]

[۱۰] حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو عورت اپنے شوہر کی اطاعت کرے اور اس کے حق کو ادا کرے، نیک باتوں کو یاد کرے، نفس اور مال کی خیانت سے پرہیز کرے [تو ایسی عورت کا] جنت میں شہیدوں سے ایک درجہ کم ہوگا۔ اگر شوہر بھی اس کا مومن اور بہتر اخلاق والا ہے تو یہ عورت اسے ملے گی، ورنہ ایسی عورت کی شادی اللہ تعالیٰ شہیدوں سے کردے گا۔[5]

[۱۱] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن عورتوں سے سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال کیا جائے گا [کہ پابندی کے ساتھ وقت پر ادا کی تھیں کہ نہیں]۔ پھر شوہر کے متعلق سوال ہوگا کہ اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا تھا؟[6]

[۱۲] حضرت ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، عورت خدا کا حق اس وقت تک ادا کرنے والی نہیں

---

۱ بیہقی، ج۶، ص۴۲۰

۲ ادب المفرد، ص ۴۴، بخاری، ج ۲، ص ۷۸۳

۳ مجمع الزوائد، ج۴، ص ۳۰۸

۴ بیقھی، ج۶، ص ۴۱۷

۵ کنزل العمال، ج۱۶، ص ۴۱۴

۶ کنزل العمال، ج۱۶، ص ۱۶۶

ہوسکتی جب تک کہ وہ اپنے شوہر کا حق ادا نہ کرے۔[1]

[۱۳] حصین کی پھوپھی سے روایت ہے کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معلوم کیا کہ کیا وہ شوہر والی [شادی شدہ] ہیں۔ انھوں نے کہا، ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا، تمھارا ان کے ساتھ کیا برتاؤ ہے؟ کہا، مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو کہ وہ تمہارے لیے جنت و جہنم ہیں۔[2]

[۱۴] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورتوں کو حمل سے لے کر بچہ جننے تک اس کا اتنا ثواب ملتا ہے جتنا کہ خدا کے راستہ میں سرحد کی حفاظت کرنے والوں کو ثواب ملتا ہے، اگر اسی درمیان اس کا انتقال ہو جائے تو اس کو شہید کا ثواب ملتا ہے۔[3]

[۱۵] حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حمل اور ولادت کی مشقت کو برداشت کرنے والیاں، اپنے بچوں پر کرم مہربانی کرنے والیاں اگر شوہر کی نافرمانی نہ کریں گی تو جنت میں داخل ہو جائیں گی۔[4] حضرت عائشہ زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت آئی، اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھی۔ اس نے سوال کیا۔ میرے پاس سوائے ایک کھجور کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے دے دی اس نے دونوں بیٹیوں کو آدھا آدھا کھجور دے دیا، پھر کھڑی ہوئی اور چلی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو ان لڑکیوں کے ذریعہ آزمایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تو یہ اس کے لیے جہنم سے نجات کا باعث ہوں گی۔[5]

[۱۶] حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید میں حاضر ہوا۔ خطبہ سے پہلے عید کی نماز ہوئی بلا اذان واقامت کے۔ نماز ختم ہوئی تو آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے سہارے کھڑے ہوئے، حمد وثنا کے بعد وعظ فرمایا، نصیحت فرمائی اور ان کو اطاعت کی ترغیب دی۔ پھر عورتوں میں تشریف لے گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ وعظ فرمایا خدا سے ڈرنے کا حکم دیا۔ اور ان کو نصیحت فرمائی۔ اطاعت کی جانب ابھارا اور فرمایا تم عورتو! صدقہ وخیرات کرو۔ تم جہنم میں

---

[1] ابن ماجه، ج۳، ص ۳۶

[2] بیهقی، ج۶، ص ۴۱۸

[3] کنز العمال، ج۱۶، ص ۱۷۱

[4] اتحاف لسادة السادة ج ۵ ص ۴۰۱، بیهقی فی الشعب ج۶ ص ۴۰۹، اتحاف المهر ۵ ج ۴ ص ۵۶۷

[5] ادب المفرد، ص ۵۲

زیادہ جلوگی۔ایک عورت نے پوچھا کیوں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپؐ نے فرمایا تم لوگوں کوتی زیادہ ہواورشوہروں کی ناشکری کرتی ہو۔ چنانچہ عورتوں نے اپنے زیوروں کو، ہاروں کو، بندوں کو، انگوٹھیوں کونکال کرحضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے پر پھینکنا شروع کر دیا۔ان کوراہ خدامیں دے دیا۔[1]

[۱۷] ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں جانے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا تم عورتوں کا جہاد حج ہے۔

[۱۸] ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے جہاد کے متعلق معلوم کیا تو آپ نے فرمایا بہترین جہاد [تمھارے لیے] حج ہے۔[2]

عورت اور مرد: الگ الگ دائرۂ کار کی تخصیص:

قرآن، سنت، احادیث، اجماع اور تعامل امت کی روشنی میں عورت و مرد کا دائرۂ کار بالکل متعین ہے، اس میں کوئی ابہام اور شبہ نہیں ہے، مرد اگر عورتوں کی خصلت اختیار کر لے اور جہاد کے موقع پر گھر میں بیٹھ جائے تو وہ اپنے دائرۂ عمل سے نکل گیا اس نے نص کی خلاف ورزی کی لہٰذا ایسے لوگوں پر جو اپنے میدان عمل سے فرار اختیار کریں خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں ان پر لعنت کی گئی۔لہٰذا جہاد کے موقع پر جو مرد منافق جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے ان کے بارے میں کہا گیا تم نے گھروں میں عورتوں کی طرح رہنا پسند کیا مرد تو میدان جہاد میں جاتے ہیں، عورتیں اور معذور لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں گھروں میں رہتے ہیں قرآن میں آتا ہے کہ اگر اندھا، لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں: لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا [۱۷:۴۸] ضعیف، بیمار اور زادراہ سے محروم جہاد میں شرکت نہ کریں پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں: لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [۹:۹۱] زادسفر سے محروم یہ وہ لوگ تھے جن کا حال یہ تھا کہ مجبوراً میدان جہاد سے واپس جاتے تھے اور شدت غم سے ان کا دل پھٹا جاتا اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری و ساری ہوتے: وَّ لَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ [۹:۹۲]۔مگر مریض دل منافق بھی جہاد کے لیے نہیں آتا اس لیے فرمایا تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے: اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ [۹:۳۸] یہ منافق جہاد میں شرکت سے بچنے کی درخواستیں کرتے تھے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے: وَ اِذَآ اُنْزِلَتْ

---

[1] بخاری، مسلم

[2] بخاری، ج ۱، ص ۴۳

سُوْرَۃٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ جَاھِدُوْا مَعَ رَسُوْلِہِ اسْتَاْذَنَکَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْھُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَکُنْ مَّعَ الْقٰعِدِیْنَ..... رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَ طُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ [۹:۸۶،۸۷]۔ بیٹھ رہو بیٹھنے والیوں کے ساتھ: اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ [۹:۴۶]۔ گھروں میں بیٹھنے کی اجازت صرف عورتوں کو دی گئی تھی ان کے لیے جہاد فرض نہیں تھا ان کی گھریلو ذمہ داریاں ہی ان کا جہاد اور ان کا گھر ہی ان کا اصل میدان جہاد ہے، مگر گھر بیٹھنے والیوں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو جوان ہیں، دوسری وہ جو سن یاس سے گزر گئیں ان کو القواعد من النساء کہہ کر خطاب کیا گیا ہے: وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْھِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَھُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ م بِزِیْنَۃٍ وَّاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّھُنَّ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ [۲۴:۶۰]۔ منافق مردوں اور عورتوں کا ذکر بھی قرآن میں مشترکہ طور پر کرتے ہوئے بتایا گیا کہ یہ برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُھُمْ مِّنْ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْکَرِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ یَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَھُمْ نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ [۹:۶۷] یہ منافق گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِھِمْ [۹:۸۱] تم نے بیٹھنا پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو: فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ [۹:۸۳] انھوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا: رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ [۹:۹۳] یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے: اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِھَا وَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ [۱۰:۷] ان کو زیب نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں گھر جاتے: اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ وَ لَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِھِمْ عَنْ نَّفْسِہٖ [۹:۱۲۰] عورتوں کو جہاد سے مستثنیٰ کر کے گھر میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی اور وہ منافق لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر یا بغیر اجازت گھر بیٹھنے والی عورتوں اور معذوروں کے ساتھ ہی بیٹھے رہ گئے ان کے لیے قرآن میں طنز کے بہت سے تیر استعمال کیے گئے ہیں تفصیل کے لیے دیکھیے [۹:۶۴،۸۱،۸۳،۸۶،۸۷،۹۰،۹۳،۱۲۰،۳:۱۶۸،۴:۹۵،۵:۲۴] سورہ نور میں عمر رسیدہ عورتوں کو گھروں میں سر سے چادر اتارنے کی اجازت دی گئی تو انھیں القواعد من النساء کہا گیا، جہاد سے استثنیٰ صرف عورتوں کو حاصل ہے یا معذوروں اور مجبوروں کو۔ منافقین جن کو پیچھے رہ جانے کی اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر بہت خوش ہوئے] حالانکہ اگر یہ سچے مومن ہوتے تو اجازت ملنے پر بھی یہ مجبوراً گھر میں رہتے اور جہاد میں شرکت کے اجر سے محروم رہ جانے پر افسردہ ہوتے، اسی لیے وہ مومن جو زاد سفر نہ پانے کے باعث مجبوراً جہاد میں شرکت نہ کر سکے اور روتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ گئے ان کے بارے میں رسول اللہ نے فرمایا کہ وہ مدینے میں تھے مگر ہر وادی اور ہر راستے میں وہ لشکر جہاد کے ہمراہ تھے یہ دل کے یقین کا

ثمرہ ہے [قرآن نے ایسے لوگوں کو متنبہ کیا کہ تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ اس جرم میں ان کے لیے یہ حکم بھی فرمایا کہ آئندہ اگر ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی آپؐ سے اجازت مانگے تو انھیں واپس کر دیجیے اور کہہ دیجیے کہ تم میری معیت میں کسی دشمن سے لڑنے کے قابل نہیں ہو تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو]: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ...... فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ [۹: ۸۱، ۸۳] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ نے انھیں کیوں رخصت دی: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ [۹: ۴۳] جہاد سے صرف ضعیف بیمار اور زادراہ سے محروم مجاہدین مستثنیٰ ہیں بشرطیکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں: لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [۹: ۹۱]۔ یہ تمام آیات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ عورت کا فریضہ گھر میں ٹک کر رہنا ہے خواہ حالت جہاد کیوں نہ ہو اور مرد کا دائرہ کار گھر سے باہر ہے۔ اگر مرد عادتاً گھر میں ہی محصور رہتا ہے اور بیرونی زندگی سے اس کا تعلق بہت کم ہے تب بھی بعض حالات میں اس کا گھر سے باہر نکلنا لازمی ہے، عورت کے لیے لازمی نہیں خصوصاً حالت جہاد میں اسے گھر میں ٹک کر بیٹھنے کی ہرگز اجازت نہیں۔

عورت کا امور دنیا سے استثنیٰ: دائمی سنت الٰہی:

عورتوں کو امور دنیا سے محفوظ، مامون اور سبکدوش رکھنے کی سنت الٰہی جو ازل سے ابد تک کے تمام انسانوں معاشروں اور تہذیبوں کے لیے ہے۔ یہ حکم صرف رسالت محمدیؐ کے ذریعے امت محمدیہؐ کو نہیں دیا گیا پچھلی امتوں میں بھی یہی حکم تھا لہٰذا ہم قرآن میں دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں بھی دستور یہی تھا کہ گھر سے باہر کے تمام کام مرد کرتے تھے لیکن جب معاشرہ اپنی ذمہ داریاں عورتوں سے متعلق امور میں موثر طریقے سے ادا کرنے میں ناکام ہو جائے تو مجبوراً عورتیں بیرون خانہ امور دنیا بھی انجام دیتی تھیں۔ اس صورت حال میں انھیں کس قسم کی دشواریاں پیش آتی تھیں وہی صورت حال مردوں کے ساتھ کام کرنے میں عورتوں کو آج بھی درپیش ہیں قرآن بتاتا ہے: وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ......فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ" [۲۸: ۲۳، ۲۴] اگلی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شرم وحیاء اس عہد میں بھی عورت کا زیور تھا فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا

تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ [۲۸:۲۵] اللہ تعالیٰ کو مرد کے لیے کس قسم کی عورت پسند ہے؟ اس کا حکم سورۂ تحریم میں ملتا ہے، اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ بہو کے انتخاب کے وقت قرآن کی نص کے مطابق لڑکی کو پسند کرے افسوس کہ اس معاملے میں امت شدید غفلت کا شکار ہے، ارشاد ربانی ہے: اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ...... عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا [۶۶:۴،۵] بعید نہیں کہ اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم آپ تمام ازواج مطہرات کو طلاق دے دیں تو اللہ آپ کو ایسی بیویاں بدلے میں عطا فرمادے جو ان سے بہتر، سچی مسلمان، باایمان، اطاعت گزار، توبہ گزار، روزہ دار، ثیب یا باکرہ ہوں عہد حاضر کے مسلمان اپنی حالت کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں۔

شرم وحیا: تمام روایتی تہذیبوں کا مشترک ورثہ:

سورۂ قصص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرم وحیا کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھ کر عورت ضرورت کے وقت دائرۂ شریعت وحیا میں رہتے ہوئے اجنبی شخص سے بھی ہم کلام ہوسکتی ہے اور کسی اجنبی نامحرم کے سوال کا جواب بھی دے سکتی ہے اور حدود کے اندر رہ کر نامحرم سے گفتگو بھی کرسکتی ہے، اس سورۃ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں بھی گھروں میں اجنبی نامحرم مرد کو ملازم رکھنے کا دستور نہ تھا یہ پاکیزگی معاشرت کے خلاف تھا اسی لیے حضرت موسیٰ کو نکاح کا پیغام دیا گیا: قَالَ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ [۲۸:۲۷] سورۂ قصص سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسالت مآبؐ سے پہلے بھی دنیا میں محرم ونامحرم کی تفریق موجود تھی اور تمام روایتی تہذیبیں فطری، جبلی اور خلقی احکام حجاب وحیاء کی وارث اور پابند تھیں اسی لیے سورۂ احزاب میں بنی اسمٰعیل کی عورتوں مردوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دے کر ایک دوسرے سے گفتگو کا سابقہ طریقہ بھی سکھایا گیا جو مدت ہوئی یہ قوم بھول چکی تھی: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا [۳۳:۳۲] انھیں یہ بھی بتایا گیا کہ بے تکلفی سے پرہیز کیا جائے یہ فساد کی اصل جڑ ہے اس جڑ کو ختم کرنے کے لیے حکم دیا گیا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ [۴۹:۱۱]۔ دلوں کی پاکیزگی برقرار رکھنے کے لیے سورۂ احزاب وسورۂ نور میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ اگر تمھیں کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو اور لوگوں کو حکم دیا گیا کہ کسی کے گھر میں سلام کیے بغیر گھروں میں بلا اجازت داخل نہ ہو، اجازت نہ ملے تو واپس آجاؤ اس پر ناگواری ظاہر نہ کرو: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ

،وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ [۵۳:۳۳]، يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ...... فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ [۲۴: ۲۷، ۲۸]۔سورۃ النمل کی آیت ۴۴ کے مطابق جب حضرت سلیمانؑ کے محل میں ملکہ سباء داخل ہونے لگی تو شیشے کے فرش کو پانی کا حوض سمجھ کر اس میں اترنے کے لیے اس نے اپنے پائنچے اٹھالیے: قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [۲۷:۴۴] اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار اور مشرک عورتیں بھی عہد قدیم میں ساتر لباس پہنتی تھیں اور ان کا لباس پیروں تک ہوتا تھا رسالت مآب ﷺ کا حکم ہے عورتوں کا کپڑا اتنا لٹکے کہ ٹخنے کو چھپائے: من عقبها شبراً وقال حذا ذيل المرءة [مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۲۷] امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں عورتوں کو ٹخنے سے نیچے کپڑا رکھنے کا حکم ہے تاکہ ان کے لیے زیادہ ستر پوش ہو: رخصة النساء في جر الازار لانه يكون استر لهن [ترمذی ص ۲۰۶]۔دوسری جانب عصر حاضر کے مسلم گھرانوں کی عورتیں ہیں جن کے پائنچے بغیر کسی حوض اور پانی کے اوپر چڑھ رہے ہیں اور لڑکوں کی پتلونیں ایڑی کے نیچے تک چلی گئی ہیں لڑکیاں اور لڑکے گڑیوں کی چولیاں پہن رہی ہیں لڑکے چٹیا ڈال رہے ہیں اور لڑکیاں چٹیا کٹوا رہی ہیں یہ تہذیب حاضر ہے جس پر تمام مسلم جدیدیت پسندوں کو کوئی تشویش نہیں۔

قدیم مصر جیسے متمدن ملک میں بھی عفت، حیا، پاکبازی، تہذیب کی علامت تھے، اسی لیے جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسفؑ کو ورغلانے کی کوشش کی اور آپ اللہ تعالیٰ کی برہان دیکھنے کے بعد صراط مستقیم پر قائم رہے اور قید قبول فرمائی مگر دعوت گناہ قبول نہیں کی اس الزام تراشی کے موقع پر عزیز مصر کے یہ الفاظ: فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ [۱۲:۲۸] بتاتے ہیں کہ یہ کید عظیم اس کی بیوی کا ہے۔مصر کی تمام عورتوں اور کل عالم کی تمام عورتوں کا نہیں یہ اس کا ذاتی تجربہ تھا اس کا بے ساختہ اظہار ہوا، یہ آیت بتاتی ہے کہ ایسے افعال جو جنسی بے راہ روی سے متعلق ہوں مصری تہذیب میں قابل قبول نہ تھے۔اسی باعث عزیز مصر نے اسے اپنے گناہ سے توبہ کرنے کی ہدایت کی: يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ [۱۲:۲۹] اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس جاہلی معاشرے میں بھی جھوٹ بولنے اور جنسی جذبات کا اس طرح اظہار کرنے کو گناہ سمجھا جاتا تھا اور گناہ کو قابل عزت کام نہیں سمجھا جاتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرم و حیاء دنیا کی ہر روایتی تہذیب کا وصف خاص تھا۔

شرم و حیا اور حجاب تمام روایتی تہذیبوں کا مشترکہ ورثہ ہے، حضرت مریم کو جب مرد کے مس کیے بغیر استقرار حمل کی آزمائش سے گزرنا پڑا تو آپ نے ان خوفناک لمحات کو کیسے برداشت کیا، قرآن

بتاتا ہے حضرت مریم کہنے لگیں کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام ونشان نہ رہتا: فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا [۱۹:۲۳] بچے کو جنم دینے کے بعد وہ واپس لوٹیں تو قوم کے لوگوں نے کہا کہ اے مریم! تم نے بہت بڑا گناہ کیا نہ تمھارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں ہی کوئی بدعورت تھی: فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ...... یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا [۱۹:۲۷،۲۸] اس پر آپ نے فرمایا کہ بچے سے کلام کرو پھر حضرت عیسیٰ نے اللہ کے حکم سے گہوارے میں معجزانہ طور پر کلام کیا: فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ...... قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ...... وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا [۱۹:۲۹ تا ۳۱] اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عفت، عصمت اور حرمت کی حفاظت تمام روایتی تہذیبوں کا اختصاص تھا۔

میثاق کی اہمیت:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ [۱۳:۲۵] اللہ تعالیٰ سے میثاق باندھنے اور اہل ایمان میں شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس فرد نے خود کو اپنے رب کے حوالے کر دیا لہٰذا عملاً اسے نیک ہونا چاہیے اور اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا ہے: وَ مَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ [۳۱:۲۲] قرآن نے مومن مرد اور عورت کی شان یہ بتائی کہ وہ اپنی امانتوں کی حفاظت کرنے والے اور اپنے عہد کا پاس نبھانے والے ہوتے ہیں جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں: وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ...... وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآىِٕمُوْنَ ...... وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ [۷۰:۳۲ تا ۳۴] عہد کی حفاظت، میثاق کا لحاظ، اپنی شہادت اور گواہی پر قائم رہنا الفاظ کی حرمت کو ہر حال میں برقرار رکھنا، وعدے نبھانا، سچی شہادت دینا اہل ایمان کی نشانی ہے۔ قرآن نے میثاق نبھانے کی اس قدر ہدایت کی ہے کہ سورۂ انفال میں دارالکفر میں مقیم ان مسلمین کی دین کے سلسلے میں نصرت کرنے سے مسلمانوں کو روک دیا اگر یہ نصرت کفار سے ہونے والے کسی معاہدے کے خلاف ہو۔ مسلمانوں کو دین پر قائم رکھنے کے لیے دارالکفر میں مقیم اہل ایمان کی نصرت دارالاسلام والوں پر فرض ہے لیکن اگر کفار سے کوئی معاہدہ ہو چکا ہے تو پھر یہ نصرت فرض نہ رہے گی بلکہ میثاق کو نبھانا فرض ہو جائے گا۔ اس سے وعدے، عہد، معاہدے اور میثاق کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰى یُهَاجِرُوْا وَ اِنِ

اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ...... وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ [۸:۷۲،۷۳]

نکاح: میثاق ہی کی ایک قسم:

اپنے عہد میثاق کو نبھانے پورا کرنے اور اپنی قسموں کو ہر حال میں پورا کرنے کا حکم قرآن میں بار بار دیا گیا ہے، لہٰذا نکاح کا عہد جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں اللہ تعالیٰ، بندے اور ایک خاتون کے درمیان ہوا ہے اس کو بلاوجہ توڑنا سنگین جرم ہے، جب قسموں کو توڑنا جرم ہے اور اس کا کفارہ ادا کرنا لازمی ہے تو عہد نکاح کو بلاوجہ توڑنا کس قدر بڑا جرم ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس لیے قرآن میں عہد کی تاکید کی گئی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ [۵:۱]، اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ [۱۳:۲۰]، لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ [۲:۲۲۵]، لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَ احْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ [۵:۸۹]، وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ [۱۶:۹۱]، وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا [۱۷:۳۴]۔ لہٰذا ایک مسلمان اپنی بیوی کو بلاوجہ طلاق دے کر اس عورت اور اس کے رب سے باندھے گئے میثاق کی خلاف ورزی کر کے گناہ عظیم کا مرتکب قرار پاتا ہے۔ اسی حکمت کے تحت قرآن نے صلح کو ہر حال میں جنگ، تنازعے اور کشمکش پر ترجیح دی ہے بشرطیکہ اس سے دین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ قرآن نے کفار کی جانب سے صلح کی پیش کش کو بعض خاص حالات کے سوا عمومی طور پر قبول کرنے کی ہدایت کی ہے کہ صلح بہر حال جنگ اور کشمکش سے بہتر ہے جب کفار سے تنازعات، کشمکش، جنگیں، صلح کے ذریعے ختم کی جا سکتی ہیں تو ایک مسلمان شوہر اپنی نیک بیوی کو بلاوجہ کیوں طلاق دے سکتا ہے؟ اس سے صلح پر کیوں مائل نہیں ہوتا؟ جو دین دشمنوں کے ساتھ صلح کو ترجیح دیتا ہے وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اہل ایمان کفار سے صلح کر لیں اور اہل ایمان عورتیں اور مرد آپس میں لڑ جھگڑ کر اپنے گھر برباد کر دیں، قرآن حکم دیتا ہے کہ اگر وہ [کفار] تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمھاری طرف صرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا [۴:۱۰] رسالت مآب

کو ہدایت کی گئی کہ اے نبیؐ اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کے لیے آمادہ ہو جائیں اور اللہ پر بھروسہ کیجیے۔یقیناً وہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے: وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَ تَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ [۸:۶۱] طلاق کی اجازت صرف اس وقت کے لیے ہے جب اختلافات کی کچھ حقیقی بنیادیں موجود ہوں اور تمام امکانی ذرائع استعمال کرنے کے باوجود موانست، مصالحت اور مفاہمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو رہی ہو۔لیکن اگر کوئی عورت نیک ہے، دین دار ہے، بچوں والی ہے اور اس میں کوئی عیب نہیں تو اسے طلاق دینا اللہ تعالیٰ سے باندھے گئے میثاق کو توڑنا ہے ایسا کرنا حلال کام نہیں ہے، اس کا ثبوت یہ نص ہے: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ وَ لَاۤ اَنۡ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَكَ حُسۡنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُكَ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ رَّقِيۡبًا [۳۳:۵۲]۔

جو اللہ تعالیٰ سے اس میثاق کی خلاف ورزی کرے اس کا نتیجہ رحمت سے دوری اور دل کا سخت ہو جانا ہے: فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَ جَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً [۵:۱۳]

میاں بیوی کے درمیان اختلاف سے طلاق تک قرآنی ہدایات:

نکاح زندگی بھر کے نباہ کے معاہدے کا نام ہے اس معاہدے کو حتی المقدور نبھانا فریضۂ دینی ہے جو شخص اس پختہ عہد کی نیت کے بغیر نکاح کرتا ہے وہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔قرآن کا منشاء ہے کہ نکاح سے پہلے تلاش وتحقیق اور کفو کی شرائط پوری کر لی جائیں، نکاح کے بعد اگر فریقین میں مطابقت اور موانست خدانخواستہ پیدا نہ ہو سکے تو قرآن ایسی صورت حال کے مختلف حل پیش کرتا ہے:

[۱] ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا وَ لَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَ عَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـًٔا وَّ يَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا [۴:۱۹]۔

[۲] ایسی عورتیں جو مزاج میں سرکشی کی حامل ہوں ان کو طلاق دینے کے بجائے اصلاح کے طرائق قرآن بتاتا ہے کہ انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے علیحدگی اختیار کرو اور انھیں ضرب لگاؤ: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ وَّ بِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَ الّٰتِىۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَ اهۡجُرُوۡهُنَّ فِى الۡمَضَاجِعِ وَ اضۡرِبُوۡهُنَّ فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا [۴:۳۴]

[۳] لیکن واضح طور پر انتباہ کرتا ہے کہ اگر وہ اس کے بعد تمھاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے بہانے تلاش نہ کرو: فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا

كَبِيرًا [۴:۳۴]

[۴] ان طریقوں کے باوجود کسی عورت کی اصلاح نہ ہو تو قرآن پھر بھی طلاق کی اجازت نہیں دیتا بلکہ حکم دیتا ہے کہ فریقین ثالث مقرر کر کے اصلاح اور صلح کی کوشش کریں اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا: وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا [۴:۳۵]

[۵] اگر حکمین بھی صلح جوئی کرانے میں ناکام ہو جائیں تو قرآن مصالحت کا ایک عجیب و غریب طریقہ بتاتا ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں [میاں بیوی، کچھ حقوق کی کمی بیشی پر] آپس میں صلح کرلیں، صلح بہر حال بہتر ہے، نفس تنگ دلی کی طرف جلد مائل ہو جاتے ہیں لیکن تم احسان سے پیش آ ؤ: وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا [۴:۱۲۸]

[۷] ان تمام مراحل کے باوجود اگر صورت حال میں بہتری پیدا نہ ہو سکے تب قرآن طلاق کی اجازت دیتا ہے، یہ طلاق بھی تین طہر میں وقفے وقفے سے دی جاتی ہے تاکہ عورت اور مرد دونوں کو سوچنے آخری فیصلے تک پہنچنے کا موقع ملے اور اصلاح کی صورت نکل آئے۔ اگر مرد پہلی یا دوسری طلاق کے بعد رجوع کرے تو صلح ہو جاتی ہے، اگر تیسری طلاق دے دی جائے تو پھر رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

[۸] ان تمام مراحل کے بعد قران بتاتا ہے لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا: وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا [۴:۱۳۰] طلاق دینے کے بعد قرآن صرف مرد کو ہدایت کرتا ہے کہ احسن طریقے سے عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے: وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ [۲:۱۳۰] یہ طلاق دینے کا وہ عمومی قانون ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے اور اس قانون کا اتباع ہر صحیح العقل مرد کے لیے لازمی ہے۔

استثنائی حالات میں طلاق کا طریقہ:

بعض مرتبہ ایسے معاملات، واقعات، حادثات اور حالات ہوتے ہیں جن میں ان تدریجی مراحل پر عمل محال ہو جاتا ہے لہٰذا ایسے استثنائی حالات میں طلاق کی اجازت قرآن اس شرط کے ساتھ دیتا ہے کہ عورت پر عدت لازم نہیں ہوگی اور تم انھیں ہاتھ لگائے بغیر بھلے طریقے سے رخصت کر دو: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا [۳۳:۴۹]، وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِیْنَ [۲:۲۳] یہ اجازت بھی صرف اس شخص کو دی جا رہی ہے جس نے منکوحہ کے ساتھ عائلی زندگی بسر نہیں کی، اس نے بیوی کے ساتھ نہ وقت گزارا، نہ اس کے بچے پیدا ہوئے، نہ اسے ازدواجی زندگی بسر کرتے ہوئے کچھ عرصہ گزرا اس نے نکاح کے ذریعے عائلی زندگی بسر کرنے کا پختہ ارادہ میثاق کے ذریعے کیا لیکن بعض ایسے موانع، مصالح، معاملات، حادثات اور واقعات سامنے آئے یا ان کے پیدا ہونے کا امکان ظہور پذیر ہو گیا جن کی موجودگی میں مستقبل میں اس رشتے کے بچنے، پنپنے، اور مستحکم رکھنے کے امکانات معدوم ہوتے نظر آئے تو خلوت صحیحہ سے پہلے ہی اس نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا، یہ ایک ذمہ دارانہ فیصلہ ہے کیونکہ خاندان مکمل ہونے کے بعد یہ فیصلہ اولاد کی بربادی اور نفرتوں میں اضافے کا سبب بنتا ہے لہٰذا ایسے استثنائی حالات میں طلاق کا طریقہ عمومی حالات سے مختلف رکھا گیا ہے اور ان میں تدریجی مراحل کو شامل نہیں کیا گیا، عملی زندگی سے ہم ایسے بے شمار واقعات اور مثالیں پیش کر سکتے ہیں جب ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے مالک الملک نے اپنے بندوں کی آسانی کے لیے ان استثنائی حالات کا بھی خاص لحاظ رکھا ہے۔

مہر کی ادائیگی: نکاح کا شرط لازم:

نکاح کا معاہدہ پختہ عہد پر قائم ہوتا ہے اس قلعے کی تعمیر کے وقت مہر [مال] کی ادائیگی لازمی ہے جسے مرد واپس نہیں لے سکتا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْھًا وَ لَا تَعْضُلُوْھُنَّ لِتَذْھَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ وَ عَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ کَرِھْتُمُوْھُنَّ فَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّ یَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا [۴:۱۹] یہ مہر خوش دلی سے ادا کیے جانے چاہئیں اور اپنی حیثیت کے مطابق بہتر سے بہتر مہر کی ادائیگی کو فرض قرار دیا گیا ہے: وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِھِنَّ نِحْلَۃً فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْہُ نَفْسًا فَکُلُوْہُ ھَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا [۴:۴] مہر کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ فرض ہے لہٰذا یہی حکم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیا گیا: لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَ لَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِھِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُھُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا [۳۳:۵۲] مہر کی ادائیگی معروف طریقے سے کی جائے گی: وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِّنْ فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ وَ اٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۴:۲۵] کسی مرد کو اجازت نہیں ہے کہ وہ ڈھیروں مال اگر مہر میں دے دے تو طلاق یا نکاح ثانی کی صورت میں اسے واپس لینے کا مطالبہ کرے: وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّکَانَ زَوْجٍ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْہُ شَیْئًا اَتَاْخُذُوْنَہٗ بُھْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا [۴:۲۰] عورت خود کچھ

دے کر مرد کے نکاح سے نجات پانا چاہے تو الگ بات ہے [۲:۲۲۹]، [۲:۲۳۷] اگر کوئی عورت خوشی سے مہر چھوڑ دے تو یہ الگ بات ہے: وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓــًٔا مَّرِيۡٓــًٔا [۴:۴]۔ مہر پر نکاح کے انعقاد کے بعد اگر کوئی مرد خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دے تب بھی مہر واپس نہیں لے سکتا بلکہ قرآن نے حکم دیا کہ اسے کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کرو: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ فَمَا لَـكُمۡ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ عِدَّةٍ تَعۡتَدُّوۡنَهَا‌ فَمَتِّعُوۡهُنَّ وَسَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا [۳۳:۴۹]۔ مرد طلاق دیتے وقت اس مال میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتا جو وہ دے چکا ہے، البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین حدود الٰہی پر قائم نہ رہ سکیں گے تو عورت مرد کے مابین یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ‌ فَاِمۡسَاكٌ ۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌ ۢ بِاِحۡسَانٍ‌ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـــًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ‌ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ‌ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا‌ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ [۲:۲۲۹] بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مرد جوش جذبات اور وفور محبت میں اپنی تمام ملکیت و جائیداد عورت کے نام کر دیتا ہے بعد میں مزاج اور طبیعت کی عدم مناسبت سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتا ہے مگر یہ بھی دیکھتا ہے کہ مال و متاع سے محرومی کے بعد میرا کیا ہوگا تو طلاق دینے سے احتراز کرتا ہے اس صورت میں حدود الٰہی پر قائم رہنے کے لیے عورت مال واپس دے کر اس معاملے کو حل کر سکتی ہے یہ طریقہ خلع کہلاتا ہے خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق مرد دے تو نصف مہر کی ادائیگی لازمی ہے: وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّکَاحِ‌ وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى‌ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ‌ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ [۲:۲۳۷] اس آیت میں بھی کہا گیا ہے کہ عورت نرمی برتے اور مہر نہ لے یا وہ مرد نرمی سے کام لے اور پورا مہر ادا کر دے مگر مرد کو واضح طور پر ہدایت کی گئی کہ تم نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، مرد کو یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ وہ قوام ہے اس کا درجہ عورت سے بلند ہے لہٰذا اس فضیلت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت کے مقابلے میں زیادہ نرمی زیادہ فیاضی اور زیادہ سخاوت کا ثبوت دے۔ کہ یہی اس کے تقویٰ کی بلندی کا سبب ہے جو صاحب اختیار و اقتدار ہو اس کو پاکیزگی اور تقویٰ کی زیادہ ضرورت ہے۔ چونکہ مرد کو امامت کبریٰ کا منصب دیا گیا ہے، اس منصب کے تقاضے بہت بلند ہیں لہٰذا اسے اپنے بلند مرتبے کا ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے اور شح نفس سے بچنا چاہیے، اقتدار خلافت چھوٹے دل کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ قرآن نے مردوں کو حکم دیا ہے کہ وہ عورتوں کے مہر کو استعمال کرنے کی کوشش نہ کریں یہ ان کا مال ہے جس میں مرد کا کوئی حق نہیں اگر وہ بدچلنی کا ارتکاب کریں تو سزا کے طور پر مہر میں سے مال روکا جا سکتا ہے: يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا‌ وَلَا

تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا [۴:۱۹] لیکن بلا وجہ اور بلا سبب نہیں۔ اگر کوئی فرد مہر معجل اور مہر مؤجل ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اس کے بغیر بھی نکاح منعقد ہو سکتا ہے بشرطیکہ فرد صاحب مقدرت نہ ہو اور فریق ثانی تیار ہو اور مہر کا متبادل کچھ اور تجویز کر کے فریقین اس پر اتفاق کر لیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ کے نکاح کا معاملہ ہے کہ آٹھ سال کی خدمت کے عوض نکاح منظور کیا گیا۔ مہر کا حکم قرآن میں [۴:۲۴]، [۴:۲۵]، [۶۰:۱۰]، [۲:۲۳۶]، [۲۸:۲۷]، [۵:۵] تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد فیاضی پر ہے۔ قرآن نے حکم دیا کہ آپس کے معاملات میں فیاضی کو مت بھولو: وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ [۲:۲۳۷]۔ جو لوگ عورتوں کے مہر کے معاملے میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس تہذیب کی بنیاد کو ڈھا دیتے ہیں فیاضی کے بغیر نہ خاندان چل سکتا ہے نہ سلطنت، مرد کو امامت کبریٰ کا منصب دیا گیا ہے لہٰذا اسے سخاوت کی صفت پر عامل ہونا چاہیے تمام مالی ذمہ داریاں مرد پر عائد کی گئی ہیں لہٰذا فیاضی کی صفت مرد کے لیے نہایت ضروری ہے کہ یہ اس کے منصب کا تقاضا ہے۔

بخیل، حاسد، حریص، کینہ پرور، بغض میں مبتلا اور شح نفس کا مریض مرد خاندان بھی تباہ کرتا ہے اور خلافت و ریاست بھی، ایسے لوگوں سے کسی معاملے میں فیاضی کی امید نہیں کی جا سکتی اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں نواز دیا ہے اسے چھپاتے ہیں: اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا [۴:۳۷] فیاضی کا حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ اس ذہنیت کا قلع قمع کر دیا جائے جو انسان کو باور کراتی ہے کہ یہ مال اس کا ہے اس کی محنت علم اور جدوجہد کا ثمر ہے قرآن کے الفاظ میں: من مال اللّٰه الذی اٰتٰکم اس مال میں سے دو جو تم کو اللہ نے دیا ہے [۲۴:۳۳] یہ مال اس کی عطا، کرم، نعمت، بخشش، فضل اور انعام ہے یہ تمہارا نہیں ہے یہ اللہ کا مال ہے تمھارے پاس امانت ہے انسان اپنی مرضی سے مال جتنا چاہے کمائے لیکن خرچ وہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا خرچ کرنے کے لیے آداب، اصول، طریقے اللہ رب العزت وحی کے ذریعے بتاتے ہیں اور اہل ایمان ان ضابطوں کی پیروی کرتے ہیں۔ اس لیے جب حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو مال کے اسراف سے روکا تو ان کا جواب یہ تھا کہ کیا تیری نماز یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشاء کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو: قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ [۱۱:۸۷] اسلامی علمیت و تہذیب مال کے کمانے پر حد مقرر نہیں کرتی لیکن اس کے خرچ کرنے پر قدغن عائد کرتی ہے اور اسراف کی ثقافت و معیشت اور افراط و تفریط کے رویوں کا خاتمہ کرتی ہے، اس مقصد کے لیے قوت سے احکام الٰہی نافذ کرتی

ہے۔ اسی لیے قرآن نادانوں اور سفہاء کو مال سپرد کرنے کی ممانعت کرتا ہے البتہ اس مال سے ان کی ضروریات پوری کرنے کا حکم دیا ہے: وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا [۴:۵] مال، ترکہ، وراثت اور اس کی تقسیم انسانی زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے۔ قرآن حکیم نے عورت اور مرد کے دائرہ کار کے تعین کے لحاظ سے مال کی تقسیم میں بھی ان کی ذمہ داری کے مطابق طریقہ بتایا ہے کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ کون وارث کس قدر مرنے والے کے قریب ہے اور اس کا کتنا حصہ ہونا چاہیے [۴:۱۱] اسی لیے بیٹے کے وارث ماں باپ میں میراث مساوی طور پر تقسیم ہوگی اگر بیوی اولاد کے بغیر مر جائے تو شوہر نصف میراث کا وارث ہوگا، میت کی ماں کو تیسرا حصہ ملے گا اور باپ کو چھٹا حصہ۔ باپ کی میراث میں ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے، اگر میت کے اولاد نہ ہو صرف ماں باپ ہوں تو ایک تہائی حصہ ماں کا، میت کے صرف بھائی نہیں ہوں تو ہر ایک کا چھٹا حصہ اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے، ایک عالم کی تحقیق کے مطابق میراث کی بیس حالتوں میں سے صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں عورت کی میراث مرد سے نصف ہے، اس کے سوا باقی حالتوں میں عورت کی میراث کا تناسب مرد کے برابر ہے یا اس سے زیادہ اور کسی میں صرف وہی وارث قرار پاتی ہے۔ میراث کی یہ آیات اور اصول عورت اور مرد کے دائرہ کار کا تعین کرنے کے لیے کافی ہیں۔ نکاح، طلاق اور مہر سے متعلق تمام احکامات تمام شریعتوں میں موجود رہے ہیں یہ شریعت محمدی کا اختصاص نہیں ہے اس لیے قرآن میں سورہ نساء میں تمام اہم ترین معاشرتی احکامات بتانے کے بعد یہ کہا گیا کہ "اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہیں طریقوں پر تمھیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے: یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ وَ یَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ یَتُوْبَ عَلَیْكُمْ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ [۴:۲۶] معاشرتی احکامات کے سلسلے میں تمام امتوں کے صلحا کے طریقے پر چلنے کا حکم بتا رہا ہے کہ خاندان اس کائنات کا فطری اور قدیم ترین ادارہ ہے اور اس ادارے کی دیواروں اور اس میں رہنے والے نفوس کی حفاظت ان کے مابین کام کی تقسیم اور ان کے حفظ مراتب کی تعیین صرف مالک الملک کر سکتا ہے اور ازل سے مرد و عورت کے دائرہ کار کی تخصیص تمام امتوں میں ایک رہی ہے یہ قرآن کی نص سے ثابت ہے، جب کہ نائیک صاحب فرماتے ہیں کہ میں قرآن سے تو عورت کے لیے امامت کبریٰ کی ممانعت ثابت نہیں کر سکتا البتہ اپنی عقل سے ضرور ثابت کر کے دکھادوں گا۔

سورۃ النساء، الطلاق، الحجرات، النور میں معاشرتی احکامات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پابندیاں عائد نہیں کی ہیں بلکہ ان کو وہ طریقے بتائے ہیں جن سے پابندیاں ہلکی اور آسان ہوگئیں۔ انبیاء کی بعثت کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو ان رسوم و رواج سے آزاد کرتے ہیں جن میں وہ بندھے ہوتے ہیں ان پر سے وہ بوجھ اتارتے ہیں جو ان پر لدے ہوئے ہیں اور وہ بندشیں کھولتے ہیں جن میں جکڑے ہوئے ہیں: یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [۷:۱۵۷] انبیاء یہ فریضہ اس لیے انجام دیتے ہیں کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے وہ زیادہ پابندیاں برداشت نہیں کرسکتا لہٰذا اسلام اور قرآن بہت محدود پابندیاں عائد کرتا ہے تا کہ زندگی آسان ہوجائے۔ ان سادہ پابندیوں کے باعث جن میں ابہام نہیں پاکیزہ زندگی بسر کرنا ہر مومن کے لیے آسان تر ہوگیا ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا [۴:۲۸]۔ قرآن کے بتائے ہوئے نکاح سے آسان تر نکاح کون سا ہوسکتا ہے؟ اپنے خود ساختہ نکاح کو آسان سمجھنا محض جدیدیت ہے۔

نفاذ حدود کے متعلق اسلامی ہدایات وقوانین:

اسلامی تہذیب وتاریخ میں نفاذ حدود کی ذمہ داری ریاست کی ہے فرد مکلّف نہیں ہے کہ وہ کسی جرم کو سرزد ہوتا دیکھ کر خود سزا دے دے، اگر اس نے اپنی آنکھوں سے جرم زنا کو خود دیکھا ہے تب بھی بیان نہ کرے خاموش رہے کہ برائی پر پردہ ڈالنا ضروری ہے ورنہ حد قذف جاری ہوگی۔ جو جرم اخفاء کے ساتھ کیا گیا ہو اس کو پردہ اخفاء میں رکھنے کی ہدایت کی گئی تا کہ معاشرے میں فحش باتوں اور واقعات کی تشہیر نہ ہو جس جرم پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا بندوں کو اجازت نہیں کہ اس جرم پر زبان نصاب شہادت مکمل ہوئے بغیر کھولیں۔ نصاب شہادت مکمل ہونے کے باوجود اس جرم کی تشہیر کی قطعاً اجازت نہیں یہ پاکیزگی اور طہارت کے خلاف ہے ایک روایت جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! اگر ہم اپنی کسی عورت کو کسی غیر مرد کے ساتھ حالت گناہ میں دیکھیں تو ہماری غیرت یہ کیسے گوارا کرے گی کہ ہم چار گواہوں کا انتظار کریں ہم تو اسی وقت معاملہ چکا دیں گے؟ اس پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اے سعدؓ! اس حکم کا نازل کرنے والا خدا ہم سے زیادہ غیرت مند ہے اور اس کا رسول تم سے زیادہ غیرت مند ہے۔ سورۂ نور کی آیات میں اسلامی تہذیب وتاریخ وعلمیت ومعاشرے میں احکام کے عملی نفاذ کا ایک سنہری اصول بھی بتا دیا گیا کہ کسی بھی معاشرتی جرم کی سخت سے سخت سزا کے وقت تمھارے اندر موجود جذبۂ ترحم کسی حالت میں بیدار نہ ہو کیونکہ تم اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ رحمان ورحیم اور کریم نہیں ہوسکتے لہٰذا قبیح معاشرتی جرائم کا علم ہونے پر اس کی سخت ترین سزا نافذ کرتے ہوئے تمھیں مجرموں پر کسی قسم کا ترس نہ آئے، دل کے پورے ثبات اور ایمان کی پوری طاقت کے ساتھ ان سخت سزاؤں کا نفاذ کرو تا کہ اسلامی معاشرت خبیث مردوں اور خبیث عورتوں سے خالی ہوجائے اور معاشرت میں رخنہ پیدا کرنے والا کوئی عنصر باقی نہ رہے: اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ [۲۴:۲] رحم اسی وقت تک مطلوب ہے جب رب کی اجازت ہو، جب رحم سے منع کردیا گیا اس وقت رحم کا جذبہ حد سے تجاوز کرکے ظلم بن جاتا ہے اسی لیے قرآن نے زمین میں فساد اور فحاشی پھیلانے والوں کے بارے میں

واضح طور پر کہا: قتلوا تقتیلا [۳۳: ۶۱] انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دو، کسی قسم کا رحم نہ کھاؤ، جس بدنصیب زانی وزانیہ مسلمان نے اسلامی تہذیب ومعاشرت میں رہتے ہوئے مسلمان عورت اور مرد پر رحم نہ کھایا اسے فساد گناہ میں مبتلا کیا وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں۔ اسلامی تہذیب ومعاشرت میں مومن مردوں اور عورتوں پر ہر اس مرد عورت سے میل جول نکاح ابد تک حرام ہے جن کی بدچلنی ان پر واضح ہو جائے ایسے بدچلن لوگوں کو عبرتناک سزا دینا اوران کا معاشرتی مقاطعہ کرنا ضروری ہے۔

نقل سے جو حکم ملے اسے من وعن قبول کرنا اور نفس کے تمام تقاضوں اور مطالبوں کو اس حکم کے سامنے سرنگوں کر دینا ایمان کا جوہر ہے، تمام صحابہ اس جوہر کے اصل وارث اور امین تھے۔ منکرات کی حدود اور سزا پر رحم اور رحمت کا جذبہ ابھر آنے کا مطلب یہ ہے کہ رحم کی آڑ میں منکر گوارا ہے سزا منظور نہیں ہے، یہ رویہ اس مقصد کے خلاف ہے جس کے تحت اس امت کو امت وسط بنایا گیا ہے جس کا بنیادی کام معروف کا حکم اور منکر سے روکنا ہے یہی تمام امتوں اور انبیاء کا اصل فریضہ تھا، یہ حکم قرآن میں بار بار بیان ہوا ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [۳:۱۰۴]، كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ [۳:۱۱۰]، يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ [۳:۱۱۴]، كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ [۵:۷۹]، اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [۷:۱۵۷]، اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [۹:۶۷]، فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ [۹:۸۱]، اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ [۹:۱۱۲]، اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ [۱۶:۹۰]، اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ [۲۲:۴۱]، اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ

تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ [۲۹:۴۵]، يٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ [۳۱:۱۷] میں باری باری بیان ہوا ہے۔

نفاذ حدود: خاندانی حصار اور مقام و مرتبے کا پاس ولحاظ:

قرآن حکیم حکمت وموعظت کی عجیب وغریب کتاب ہے اسی لیے سزاؤں کے سلسلے میں فرد کے مقام و مرتبے کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے، مقام و مرتبہ کم ہونے سے سزا میں تخفیف ہو جاتی ہے اور مقام و مرتبہ بلند ہونے سے سزا بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس اصول کے تحت زانیہ باندی کنیز کی سزا نصف کر دی گئی اسے رجم سے بھی تحفظ دیا گیا کہ اسے اپنے کردار کی تعمیر وتشکیل کے لیے اس فطری قوت و طاقت یعنی خاندان کا تحفظ حاصل نہ تھا جو اخلاقی مرتبے بلند کرنے کے لیے لازمی ضرورت ہے جہاں رشتوں کی فطری زنجیریں انسان کی تعمیر وتربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں: فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ [۴:۲۵] کیونکہ ان باندیوں کو اپنے خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے لہٰذا نرمی برتی گئی، تخفیف کی گئی، اس رویے سے کردار کی تعمیر میں خاندان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے لہٰذا اس کمی کا ازالہ سزا میں کمی کے ذریعے کر دیا گیا۔ خاندان کا حصار اخلاق، کردار گفتار، چال چلن سب کو تہذیب وشرافت کا حصار مہیا کر کے ایک بہترین شخصیت کی تعمیر وتشکیل کرتا ہے، اسی لیے باپ سے محروم بچے پر دست شفقت رکھنا اسلامی معاشرے کی بنیادی ذمہ داری ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے یتیم کی سرپرستی کی وہ روز قیامت میرے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح انگلیاں، اسی طرح اس ماں کو عظیم ترین درجہ دیا گیا جو بیوہ ہونے کے بعد نکاح کی مقدرت رکھتے ہوئے بھی اپنے بچے کی خاطر ازدواجی زندگی کو خیر آباد کہہ کر اپنے مستقبل کو ایک بہترین نسل کے مستقبل پر قربان کر دیتی ہے، خاندان کے لیے یہ قربانی، نسلوں کی حفاظت کے لیے یہ ایثار تمام روایتی تہذیبوں کا کمال تھا۔ قرآن حکیم نے بتایا کہ میاں بیوی جب ایک دوسرے پر بدچلنی کا الزام لگائیں تو انھیں چار مرتبہ قسم کھانا ہوگی ورنہ ان پر اللہ کا عذاب کوڑوں کی صورت میں برسا دیا جائے گا لہٰذا اس عذاب سے بچنے کا طریقہ قسم ہے: وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ [۲۴:۸]۔ حصان محفوظ کی ہوئی عورت یعنی محصنات وہ عورت جو شادی شدہ ہو یا کنواری جسے خاندان یا شوہر کی حفاظت حاصل ہو، یہ لفظ حصن سے ماخوذ ہے جو محفوظ مقام [قلعہ] کے معنوں میں آتا ہے نکاح ایک قلعہ، ایک حصار اور آہنی دیوار ہے جس کا مقصد معاشرت کی آہنی بنیادوں پر ایسی تعمیر ہے کہ اس کی فولادی دیواروں میں کوئی رخنہ، کوئی خلل، کوئی تعطل، کوئی شگاف پیدا نہ ہو سکے اس لیے نکاح زندگی ایک ساتھ گزارنے کا پختہ عہد ہے، اگر یہ عہد مطلوب نہ ہو تو نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا اسی لیے میاں بیوی کے مابین اختلافات کی صورت میں بھی قرآن یہی حکم دیتا ہے کہ دونوں حقوق میں کمی بیشی کر کے اس عہد وفا اور میثاق غلیظ کو نبھانے کی کوشش کریں اور اس قلعہ کو چھوڑنے کے بجائے محفوظ رکھیں: وَ اِنِ امْرَاَةٌ

خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا [۴:۱۲۸] اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرت میں نکاح کا مقصد صرف جنسی جذبات کی تکمیل نہیں کہ دل بھر گیا تو طلاق دے دی اور کسی دوسری لڑکی سے شادی رچالی اور ایک کے بعد دوسری شادی اور طلاق کا کھیل کھیلا جانے لگے۔ حدیث میں ایسے ذواقین کی شدید مذمت کی گئی ہے اسی لیے سورۃ نساء میں واضح طور پر فرمادیا گیا کہ نکاح کا مقصد لذت اندوزی نہیں: وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا [۴:۲۴]۔

آزاد عورت اپنی پاک دامنی، عفت، خاندانی حفاظت و تربیت اور ذاتی شرف وغیرت کے باعث خاندان کے قلعے میں ہوتی ہے جو رشتوں کی دیواروں سے آراستہ ہوتا ہے یا شادی کر لینے کی وجہ سے مکمل حصار، حصن میں ہوتی ہے لہٰذا اگر یہ اس حصار کو توڑ دے تو اس کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوسکتا لہٰذا آزاد خاندانی زانی وزانیہ کی سزا [۲۴:۲] سو کوڑے مقرر کی گئی اور شادی شدہ زانی وزانیہ کو کوڑوں کی سزا کے ساتھ یا سزا کے بغیر رجم کی سزا بھی دی گئی کہ نکاح اور خاندان کی حفاظت کے بعد زنا کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔

سزا کا تعلق ذمہ داری سے ہے جس کی ذمہ داری زیادہ ہوگی اس کے حقوق بھی زیادہ ہوں گے لیکن اس کی سزا بھی زیادہ ہوگی۔ ازواج مطہرات امت کی مائیں تھیں لہٰذا ان کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ صریح فحش کے ارتکاب پر ان کو دوہری سزا دی جائے گی: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا [۳۳:۳۰] حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے اطمینان قلب کے لیے آسمان سے مائدہ کے نزول کی خواہش کا اظہار کیا تو جواب دیا گیا کہ اگر مائدہ کے نزول کے بعد انکار کیا گیا تو وہ عذاب مسلط کروں گا جو اہل عالم میں سے کسی کو نہ دیا گیا ہوگا: قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ [۵:۱۱۵] رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ہم آپ کی شہ رگ منقطع کر دیتے: تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ...... وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ...... لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ [۶۹:۴۳ تا ۴۵]۔ اسی اصول کے تحت قیامت کے دن سب سے پہلے انبیاء کو امت کے سامنے شہادت کے لیے طلب کیا جائے گا اور ان کی شہادت سنی جائے گی، اسی لیے قیامت میں سب سے پہلے حساب قاری، عالم اہل خیر اور شہید کا لیا جائے گا کہ پیغمبر کے وصال کے بعد امت کی اصلاح اور قیادت کی ذمہ داری انہی گروہوں کے ہاتھ میں تھی۔ سب سے پہلے ان کو ان کا نامۂ عمل دکھایا جائے گا۔

ذاکر نائیک: جمہوریت پر استدلال: حقیقت، اثرات، نتائج

نائیک صاحب نے ووٹ کے حق اور مغربی جمہوریت کو اسلام سے ثابت کرنے کے لیے قرآن کی آیت [۴:۶۰] کا سہارا لیا تھا جو درست نہیں۔ کیا جمہوریت مشاورت، اصلاح، خیر خواہی، نصیحت، کا مترادف و متبادل ہے؟ اس بحث کا جائزہ لینے کے لیے ہم قرآن پر دوبارہ نظر ڈالتے ہیں دیکھیے:

کیا مشاورت اور جمہوریت ایک ہی ہیں:

قرآن میں مشاورت کا لفظ صرف تین جگہ استعمال ہوا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ [۳:۱۵۹]، وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ [۴۲:۳۸]، وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ [۲:۲۳۳] اور آپ دین کے کام میں ان کو شریک مشورہ رکھیں [۳:۱۵۹] اپنے معاملات آپس کے مشورے سے طے کرتے ہیں [۴۲:۳۸] رضاعت کے معاملے میں میاں بیوی کے اختلاف آپس کی رضامندی اور مشاورت سے حل کرنے کا ذکر ہے [۲:۲۳۳] افہام و تفہیم کے لیے مشاورت کی ایک اور قسم کا ذکر سورۂ نساء [۴:۳۵] میں ہے جب میاں بیوی کے معاملات میں اختلاف ختم نہ ہوں تو دونوں کی جانب سے ایک ایک ثالث مقرر کرنے کا حکم دیا گیا اور اگر ثالث اصلاح کے خواہش مند ہوں گے تو تبادلہ خیالات، مشورے سے دونوں فریقین کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر دیں گے: وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا

فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا [۴:۳۵] نائیک صاحب کا جمہوریت پر استدلال: حقیقت، اثرات اور نتائج اب اس تمام عمل کو جس میں اختلافات، تنقید، مشورہ اور اصلاح موجود ہے اسے کیا جمہوری مشاورتی عمل کہا جا سکتا ہے؟ آپس میں مشورہ ازل سے ہو رہا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ یہ ایک بدیہی، فطری اور ازلی ضرورت ہے اس کا جمہوریت یا مغربی ڈیموکریسی کی جعلی مشاورت سے کوئی تعلق نہیں لیکن جناب نائیک صاحب سورۂ شوریٰ کی آیت وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ [شوریٰ: ۳۸] سے استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہے کیونکہ اللہ نے اس آیت میں اپنے معاملات کو آپس کے مشورے سے چلانے کا حکم دیا ہے''۔ اس آیت سے مغربی جمہوریت نکالتے ہوئے وہ یہ نہیں بتا سکے کہ جمہوریت کی کس قسم کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے؟

جمہوریت: وسیع مفہوم اور تناظر:

اگر اس آیت سے جمہوریت نکالی جا سکتی ہے تو عزیز مصر، برادران یوسف، ملکہ سبا، فرعون کے قصص کے بارے میں نائیک صاحب کیا فرمائیں گے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے ہزاروں سال پہلے اپنے وزراء، اہل دربار، اہل دانش اور قوم سے مشورہ کرتے تھے، لہٰذا تاریخی طور پر رسالت مآب کی آمد سے پہلے فرعون اور ملکہ سبا، جمہوریت کے علمبردار تھے کیوں کہ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔ خود عہد رسالت کے مشرکین، کفار، اہل کتاب رسول اللہؐ کے خلاف تمام کام آپس کی مشاورت یعنی جمہوریت سے کرتے تھے۔ حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے بھی آپس کی مشاورت سے پہلے حضرت یوسف کے قتل اور بعد میں ترمیم کر کے انھیں اندھے کنویں میں پھینکنے کا جمہوری فیصلہ کیا تھا: اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۨ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ..... قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَالَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ...... اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ [یوسف: ۸، ۹، ۱۱، ۱۲]۔

عزیز مصر: جمہوریت کی پاسداری:

عزیز مصر کے یہاں بھی جمہوریت تھی لہٰذا قمیض کے پھٹنے کے قضیے میں مجرم کے تعین کا فیصلہ کسی غیر جانبدار شخص کی مشاورت کے ذریعے کیا گیا اور اس کا تقرر عزیز مصر نے کیا حالانکہ وہ بادشاہ تھا اسے چاہیے تھا کہ اپنی بیوی کی جانب سے حضرت یوسف پر دست درازی کا الزام سنتے ہی انھیں قتل کرتا یا ملک بدر کرا دیتا کیونکہ جمہوریت پر ایمان رکھنے والے عہد جدید کے جہلاء کا بادشاہت اور ملوکیت کے بارے میں یہی خیال ہے لیکن عزیز مصر نے اعلیٰ ترین جمہوری روایات صبر، تحمل اور رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے معاملے کا منصف خود بننے کے بجائے، اس ذاتی اور نازک ترین معاملے کا فیصلہ خود کرنے کے بجائے دوسرے منصف کی شہادت اور مشاورت سے کیا: قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَ

شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ … وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ … فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ … يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَ اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ [یوسف: ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹] اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اپنے معاملے کا منصف خود نہیں ہوسکتا جب کوئی شخص خود کسی معاملے کا فریق بن جائے تو وہ اس معاملے کا فیصلہ خود نہیں کرسکتا سوائے پیغمبرؑ کے اس لیے کہ وہ اللہ کی حفاظت میں ہوتے ہیں اور اپنے نفس سے کچھ نہیں بولتے عصمت انبیاء اسی کا نام ہے۔ اسی لیے میاں بیوی کے تنازعے میں حکم دیا گیا کہ دونوں فریق ایک ایک حکم مقرر کریں: وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا [۴: ۳۵] اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکالے گا۔

عزیز مصر نے مشورے سے حضرت یوسفؑ کو پاکیزہ ہونے کے باوجود قید رکھا: ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ [یوسف: ۳۵]

فرعون: ''جمہوری اقدار'' کا پاس ولحاظ:

فرعون نے بھی حضرت موسیٰؑ کے سلسلے میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے جمہوری عمل کے ذریعے مشاورت کرکے جمہوری اقدام کیا، یہ فرعون وہ شخص ہے جو نہایت عالی درجے کے متکبرین میں تھا، قرآن نے فرعون اور شیطان کے لیے لفظ ''عالی'' استعمال کیا ہے: اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ [۲۳: ۴۶]، قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ [۳۸: ۷۵]، مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ [۴۴: ۳۱]، فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ [۱۰: ۸۳] فرعون کے تکبر کا عالم یہ تھا کہ ''فرعون نے کہا اے اہل دربار! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا، ہامان ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں [۲۸: ۳۸]۔

سرداران بنی اسرائیل: ''جمہوریت'' پر عمل:

ملاء بنی اسرائیل [سرداران] بھی اپنے نبی سے اور ان کے نبی ان سے مشورہ کرتے تھے، بحث ومباحثہ کرتے تھے یہ امتی اپنے انبیاء پر اعتراض بھی کرتے تھے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآىِٕنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

بالظّٰلمین ..... و قال لھم نبیّھم انّ اللّٰہ قد بعث لکم طالوت ملکا قالوٓا انّی یکون لہ الملک علینا و نحن احقّ بالملک منہ و لم یؤت سعۃ من المال قال انّ اللّٰہ اصطفٰہ علیکم و زادہ بسطۃ فی العلم و الجسم و اللّٰہ یؤتی ملکہ من یّشآء و اللّٰہ واسع علیم [۲:۲۴۶، ۲۴۷] ثمود کے سردار کمزور طبقے کے اہل ایمان سے تبادلہ خیالات کرتے تھے: قال الملا الذین استکبروا من قومہ للذین استضعفوا لمن اٰمن منھم اتعلمون انّ صٰلحا مرسل من ربّہ قالوٓا انّا بمآ ارسل بہ مؤمنون [۷:۷۵] حضرت شعیبؑ کی قوم کے سرداران بھی آپس میں مشورے کرتے تھے: و قال الملا الذین کفروا من قومہ لئن اتّبعتم شعیبا انّکم اذا لّخٰسرون [۷:۹۰] حضرت شعیبؑ سے مذاکرات کرتے تھے: قال الملا الذین استکبروا من قومہ لنخرجنّک یٰشعیب و الذین اٰمنوا معک من قریتنآ او لتعودنّ فی ملّتنا قال او لو کنّا کٰرھین [۷:۸۸] فرعون کے سردار بھی اسے مشورے دیتے تھے: قال الملا من قوم فرعون انّ ھٰذا لسٰحر علیم ..... و قال الملا من قوم فرعون اتذر موسٰی و قومہ لیفسدوا فی الارض و یذرک و اٰلھتک قال سنقتّل ابنآءھم و نستحی نسآءھم و انّا فوقھم قٰھرون [۷:۱۰۹، ۱۲۷] حضرت نوحؑ کی قوم کے سردار بھی ان سے مباحثے کرتے تھے: فقال الملا الذین کفروا من قومہ ما نرٰک الّا بشرا مثلنا و ما نرٰک اتّبعک الّا الذین ھم اراذلنا بادی الرّای و ما نرٰی لکم علینا من فضل م بل نظنّکم کٰذبین ..... قالوا ینوح قد جٰدلتنا فاکثرت جدالنا فاْتنا بما تعدنآ ان کنت من الصّٰدقین [۱۱:۲۷، ۳۲]، مثل الفریقین کالاعمٰی و الاصمّ و البصیر و السّمیع ھل یستوین مثلا افلا تذکّرون ..... و لقد ارسلنا نوحا الٰی قومہٖ انّی لکم نذیر مّبین [۱۱:۲۴، ۲۵]

حضرت سلیمان: ''جمہوری رویہ'':

حضرت سلیمانؑ جیسے پیغمبر بھی ہدہد جیسے حقیر جانور کے علم و معلومات سے مستفید ہوتے تھے اور اس کے مشورے پر عمل کرتے تھے: فمکث غیر بعید فقال احطت بما لم تحط بہ و جئتک من سبا م بنبا یّقین ..... انّی وجدتّ امراۃ تملکھم و اوتیت من کلّ شیء وّلھا عرش عظیم ..... وجدتّھا و قومھا یسجدون للشّمس من دون اللّٰہ و زیّن لھم الشّیطٰن اعمالھم فصدّھم عن السّبیل فھم لا یھتدون [۲۷:۲۲ تا ۲۴]

حضرت ابراہیمؑ: نارِ نمرود میں ڈالے جانے کا ''جمہوری فیصلہ'':

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کا فیصلہ بھی جمہوری طریقے سے ہوا: قالوا ابنوا لہ بنیانا فالقوہ فی الجحیم [۳۷:۹۷]

قوم حضرت صالحؑ اور ''جمہوری عمل'':

حضرت صالحؑ کی قوم کے نو سردار بھی آپس کے مشورے سے حضرت صالح کو قتل کرنا چاہتے

تھے: قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ [۲۷:۴۹] بلکہ نعوذ باللہ، جدیدیت پسند یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح جمہوریت میں بحث و مباحثہ ومجادلہ، جھگڑا، کٹ حجتی پارلیمان میں ہوتا ہے یہ اصل میں یوم ازل کا قصہ ہے جب ملاء اعلی میں فرشتوں سے مباحثہ ومجادلہ ہو رہا تھا: مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ [۳۸:۶۹] روز ازل اللہ تعالیٰ اور فرشتے بھی مباحثے میں مصروف تھے اسی لیے جمہوری مباحثے قرآن کی نص سے ثابت ہوتے ہیں اور جمہوریت اور جمہوری نظام کا آغاز اللہ تعالیٰ نے خود بحث ومباحثے کی آزادی سے فرمایا ہے لہٰذا تخلیق آدمؑ سے متعلق آیات جہاں فرشتوں شیطان اور اللہ رب العزت کی گفتگو کا ذکر ہے وہ اس کا ثبوت ہے لہٰذا آزادی اظہار رائے کا فلسفہ اور ہر کسی پر تنقید کی آزادی قرآن سے ثابت ہے حتی کہ اللہ پر بھی تنقید کی آزادی ہے [نعوذ باللہ] قرآن اسی مطلق آزادی اظہار کے لیے نازل کیا گیا ہے]: قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ...... قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ...... قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ...... وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ...... قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ...... قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ...... اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ...... قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ...... اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ [۳۸:۷۵تا۸۳] تخلیق آدمؑ کے وقت بھی اللہ تعالیٰ فرشتوں سے مکالمہ فرما رہے تھے لہٰذا جمہوری مکالمے بھی نص سے ثابت ہو گئے۔ اور روز ازل فرشتوں اور شیطان کے اللہ تعالیٰ سے مکالمات کی روشنی میں دنیا کی پہلی حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا وجود بھی ثابت ہو گیا۔

حشر وجہنم میں بھی ''جمہوریت'' پر عمل درآمد:

بلکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ روز حشر بھی کفار ومشرکین اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جھگڑیں گے، جس طرح پارلیمنٹ میں جمہوری جھگڑے ہوتے ہیں: قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ [۵۰:۲۸]، قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ [۲۶:۹۶] اور اللہ رب العزت فرمائیں گے میرے حضور جھگڑے نہ کرو [۵۰:۲۷،۲۸]۔ اہل دوزخ میں بھی جمہوری جھگڑے ہوں گے: اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ [۳۸:۶۴] فرعون اپنی قوم کے سرداروں سے مشورہ کرتا تھا: يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ...... قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ...... وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ [۷:۱۱۰، ۱۱۱، ۱۲۷]، يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ [۲۶:۳۵] وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ [۲۸:۲۰] حضرت موسیٰ کی قوم بھی سفر ہجرت میں اپنے نبی سے بحث مباحثے کرتی

تھی: وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ...... اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ [۷:۱۳۸،۱۳۹] عزیز مصر بھی اپنے اہل دربار اور سرداروں سے مشورہ لیتا تھا: یا ایها الملأ افتونی [۱۲:۴۳] حضرت موسیٰ کے سسر اپنی لڑکیوں سے مشورے کرتے تھے اور ان کے مشورے پر عمل کرتے تھے [۲۸:۲۶،۲۷]

فرعون: ''جمہوری فیصلے'' کا احترام:

فرعون کے زمانے میں مشاورت اور جمہوریت کا مکمل نظام تھا بلکہ لوگوں کو آزادی اظہار رائے [absolute freedom of expression] کا حق حاصل تھا اس کے درباری فرعون کی کھلم کھلا مخالفت اس کے سامنے کرتے تھے اور فرعون کے دشمن حضرت موسیٰ کی بھرپور حمایت کرتے تھے اور فرعون سمیت کوئی شخص اس حمایت پر سوائے خاموشی کے کوئی ردعمل تک ظاہر نہیں کرتا تھا، تاریخی طور پر یہ دنیا کی بے مثال جمہوری بادشاہت یا جمہوری آمریت تھی اس کی تفصیل دیکھیے: قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ [الشعراء:۲۵]، وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ [الزخرف:۵۱]، وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ [المومن:۲۶]، وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَکْتُمُ اِیْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّکُمْ وَاِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْهِ کَذِبُهٗ وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ ...... وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ [المومن:۲۸،۳۰]، وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَکَ وَاٰلِهَتَکَ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ [الاعراف:۱۲۷]، قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ [الشعراء:۳۴]، یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِهٖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ [الشعراء:۳۵]، قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَکُمْ اِنَّ هٰذَا لَمَکْرٌ مَّکَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ [الاعراف:۱۲۳]، قَالَتْ یٰٓاَیُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّیْٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیْمٌ ......، فرعون دنیا کی تاریخ کا عاجز ترین بادشاہ تھا جو اپنے ملا حولہ سے پوچھتا تھا: فماذا تامرون [۲۶:۳۵] اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو فرعون کی شرافت دیکھیے کہ سورۂ مومن کے مطابق اس نے اپنے ایک درباری کی حضرت موسیٰ کے حق میں تقریر سن کر صرف اتنا کہا'' ما اریکم الا ما اری'' میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ شرافت کا مظاہرہ صدر بش نے افغانستان پر حملے کے وقت کیا تھا؟ عہد حاضر کے فرعون اصل فرعون سے بھی بڑھ کر ہیں۔

جزئیات کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے کے نتائج:

الیکشن، استصواب رائے، منتخب نمائندے، عوام کی نمائندگی کیا قرآن سے ثابت کی جاسکتی ہے؟ یہ مشکل سوال ہے لیکن نائیک صاحب کی معاونت کے لیے ہم یہ مشکل بھی حل کر دیتے ہیں، غالباً نائیک صاحب کو سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۵ نظر نہیں آئی جس میں کہا گیا ہے ''اور اس [موسیٰ] نے اپنی قوم [بنی اسرائیل] کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ [اس کے ساتھ] ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں: وَ اخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِیَّایَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ [۷:۱۵۵] کوہ سینا پر قوم کے ستر نمائندوں کی طلبی گوسالہ پرستی کے جرم پر معافی مانگنے کے لیے ہوئی تھی، اس آیت سے نائیک صاحب عصر حاضر کے تمام جمہوری نظام کو ثابت کر سکتے ہیں کہ اللہ اور اس کے پیغمبر موسیٰ بہت پہلے جمہوریت کا سبق سنا چکے ہیں، افسوس کہ خلافت اسلامیہ کو پندرہ سو برس تک یہ سبق یاد نہ آیا اب امریکہ قرآن کی اس آیت پر دنیا بھر میں جبراً عمل کرا کر جمہوری حکومتیں قائم کر رہا ہے۔ اور امت مسلمہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلا رہا ہے۔

عہد ملکہ سباء: جمہوریت اور فتوے کا ثبوت:

ملکہ سباء بھی جمہوریت کی اعلیٰ اقدار پر ایمان رکھتی تھی اس کی سلطنت میں جمہوریت، مشاورت، شوری بینھم کا نظام چل رہا تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے ہُد ہُد کے ذریعہ اسے خط ارسال کیا تو اس نے درباروں سے مشورے کیے: قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰی تَشْهَدُوْنِ...... قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ وَّ الْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ [النمل: ۲۹،۳۲،۳۳]۔ ذاکرنائیک صاحب نے لفظ افتونی پر غور نہیں کیا ورنہ فتوے کا وجوب قوم سباء کے یہاں ثابت کر دیتے اور دنیا کا پہلا دارالافتاء بھی قوم سباء سے ڈھونڈ لاتے اور ثابت کرتے کہ مفتی تو ملکہ سباء کے دربار میں بھی ہوتے تھے جن سے وقت کی ملکہ فتوے پوچھتی تھی، جزئیات سے کلیات اخذ کرنے کے سائنسی طریقے میں اسی طرح کے جاہلانہ نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

سیدہ مریم کی سرپرستی پر مباحثہ: پہلی مذہبی حزب اختلاف:

حضرت مریمؑ کی پیدائش کے بعد ان کی سرپرستی کے لیے ہیکل کے خدام میں بحث و مباحثہ قرعہ اندازی اور جھگڑا ہو رہا تھا۔ جو جمہوریت کی بنیاد ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مریمؑ کے زمانے میں حضرت عیسیٰ کی آمد سے بھی پہلے مذہبی جمہوریت میں آزادانہ بحث و مباحثہ ایک دوسرے سے کھلے عام اختلافات کرنے کی آزادی اور جمہوری لڑائی جھگڑے کی آزادی موجود تھی: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ [آل عمران: ۴۴]

عہد اصحاب کہف: دوسری مذہبی حزب اختلاف:

اصحاب کہف کے زمانے کے تین سو سال بعد عیسائیت کے ساتھ ہی دنیا میں دوسری مذہبی جمہوریت [Religious Democracy] آ چکی تھی کیونکہ قرآن کے مطابق اصحاب کہف کے غار پر کوئی عمارت بنانے کے لیے مشورہ کرتے ہوئے عیسائیوں کے دو گروہ آپس میں اختلاف بھی کر رہے تھے: وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا [الکہف:۲۱]۔ لہٰذا تاریخ انسانی میں دوسری مذہبی حزب اختلاف کی روایت اس آیت سے نکلتی ہے۔

حضرت موسیٰ اور ہارون کا مکالمہ: تیسری مذہبی حزب اختلاف:

تیسری مذہبی حزب اختلاف کی روایت حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ کے مکالمات سے نکلتی ہے جس میں حضرت موسیٰؑ طور سے واپسی پر حضرت ہارونؑ پر سخت ناراض ہوئے۔ واضح رہے کہ ہم یہاں مذہبی تہذیبوں میں جمہوریت اور دستوریت کی بحث کر رہے ہیں ورنہ غیر مذہبی تہذیبوں یونان وغیرہ میں جمہوریت کا تاریخی ثبوت موجود ہے لیکن یہ جس قسم کی جمہوریت تھی اس کا جدید مغربی جمہوریت سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ ذاکر نائیک صاحب آزادی اظہار رائے اور جمہوری طرز حیات کی تلاش کرتے کرتے سورہ توبہ کی بعض آیات تک نہیں پہنچ سکے ورنہ وہ خیر القرون میں [نعوذ باللہ] تنقید کی آزادی، جمہوری رویے اور بے مثال جمہوری عمل کے طور پر ان آیات کو پیش فرما دیتے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ [۹:۵۸]، وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ [۹:۶۱] ترجمہ: اے نبیؐ ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں آپ پر اعتراضات کرتے ہیں اگر اس مال میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں [۹:۵۸] ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے [نعوذ باللہ] کہو وہ تمھاری بھلائی کے لیے ایسا ہے [۹:۶۱] وہ سورہ البقرہ سے ثابت کر سکتے ہیں کہ نعوذ باللہ، لوگ رسول اللہ کو راعنا طنزاً کہتے تھے تب بھی ان کو کوئی سزا نہ دی گئی بس یہ کہہ دیا گیا کہ آئندہ یہ لفظ استعمال نہ کرنا اسے متروک کر دو بلکہ اب انظرنا کہنا قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتنے روادار [tolerant] تھے [۲:۱۰۴] وہ سورہ نساء سے عہد نبوت میں درگزر، جمہوریت اور اور آزادی اظہار رائے کے کافرانہ فلسفے کو ثابت کر سکتے ہیں: مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّاۢ بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ

بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا [۴:۴۶]۔ اور اس پر یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ قرآن حکیم نے اس رویے کے باوجود صرف اس تنبیہ پر اکتفا کیا'' حالانکہ اگر وہ کہتے :سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا اور اسْمَعْ اور انْظُرْنَا تو یہ انہی کے لیے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا [۴:۴۶]۔ اگر قرآن سے لنگڑی لولی جمہوریت ثابت کرنا ہو تو نائیک صاحب ان تمام آیات کو بھی پیش نظر رکھیں ان سے ،نعوذ باللہ، مشاورت، اختلاف رائے اور جمہوریت ثابت ہو جاتی ہے۔ اگر اس طریقے سے قرآن کی آیات سے کوئی اصول اخذ کرنا درست ہو جائے تو نائیک صاحب قرآن کی آیت [۳۹:۲۰] سے ملٹی اسٹوری بلڈنگ کا ثبوت بھی پیش کر سکتے ہیں اور دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ جدید مغرب نے ملٹی اسٹوری بلڈنگ کا تصور قرآن سے لیا ہے: لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّن فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَعْدَ اللَّهِ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ [۳۹:۲۰] ترجمہ: البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈر کر رہے ان کے لیے بلند عمارتیں ہیں منزل پر منزل بنی ہوئی ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ بلند عمارتوں کا مضمون قرآن میں ۲۵:۷۵، ۲۹:۵۸، ۳۴:۳۷ میں بھی بیان ہوا ہے۔ اسی طریقے سے نائیک صاحب يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا [۹۹:۴] اس آیت سے اخبارات کی تاریخ قرن اول کی بنیادوں میں تلاش کر سکتے ہیں اور جدید صنعت اخبار کو اس آیت کا مادی ثمر و مظہر کہہ سکتے ہیں جو مغرب پر القاء ہوا اور امت مسلمہ اس سے محروم رہی۔

حضرت یوسف علیہ السلام: ذخیرہ اندوزی کے موجد:

جناب ذاکر نائیک صاحب کو سورۂ یوسف میں علم ذخیرہ اندوزی، اور علم حفاظت اجناس [Science of Storage and Preservation] کے اسباق نظر نہیں آئے ورنہ وہ فوراً یہ دعویٰ کر دیتے کہ ذخیرہ اندوزی، گوداموں اور علم حفاظت اجناس کے موجد حضرت یوسفؑ تھے، اس سے پہلے ذخیرہ اندوزی کے علم سے دنیا ناواقف تھی اور اس کی دلیل سورۂ یوسف سے لے آتے جہاں حضرت یوسفؑ نے شاہ مصر کے خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے اس علم کے اصولوں سے آگاہ فرمایا ہے۔

حضرت یوسفؑ کے پاس وہ فرستادہ آیا جس نے بادشاہ مصر کا خواب انھیں سنایا جس کے مطابق ترجمہ ''سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی ہیں'' [۱۲:۴۷]

اس کے جواب میں حضرت یوسفؑ نے کہا: ''ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ ... ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ [یوسف: ع ۴۸، ۴۹] ترجمہ: یوسف نے کہا سات برس تک تم لگاتار کھیتی باڑی کرتے رہو گے اس دوران میں جو فصلیں تم کاٹو ان میں سے بس تھوڑا سا حصہ جو تمھاری خوراک کے کام آئے نکالو اور باقی کو اس کی بالوں میں ہی رہنے دو پھر سات برس بہت سخت آئیں گے اس زمانے میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اس وقت کے لیے جمع کرو گے اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو''۔

ان آیات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عصر حاضر میں کیمیائی مادے استعمال کیے بغیر بھی حضرت

یوسف کی بتائی ہوئی سائنس سے خوراک اور اجناس کے ذخائر نہایت فطری طریقے پر محفوظ کیے جا سکتے ہیں حیرت ہے کہ ذاکر نائیک صاحب کو قرآن میں یہ سائنس نظر نہیں آسکی ورنہ ان کی کتاب اسلام اور سائنس میں ایک اور خطبے کا اضافہ ہو جاتا۔

ذاکر نائیک صاحب کس جمہوریت کے حامی ہیں؟

عورتوں کے ووٹ کی آیت اصلاً عورتوں کی بیعت سے متعلق ہے اس کا جمہوریت، الیکشن، ووٹ سے کوئی تعلق نہیں۔ بیعت ایک مذہبی فریضہ ہے، بیعت کرنے والا اپنے آپ کو اپنے نفس، جان، ضمیر، جسم اور روح سب کو پیغمبر کے سپرد کر دیتا ہے اس کے احکام پر نہ وہ نقد کر سکتا ہے نہ بیعت فسخ کر سکتا ہے۔ ذاکر نائیک صاحب علم تفسیر اور علوم اسلامی سے ناواقف ہیں لہٰذا وہ اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے، وہ آج تک اپنے سامعین و قارئین کو یہ نہیں بتا سکے کہ وہ کس جمہوریت کے حامی ہیں۔ جس طرح سانپوں کی ہزاروں قسمیں ہیں اسی طرح جمہوریت کی بھی ہزاروں قسمیں ہیں۔ نائیک صاحب ہمیں یہ بتائیں کہ وہ اسلام میں کس جمہوریت کا عکس دیکھتے ہیں؟ مثلاً وہ یونانی جمہوریت کو مانتے ہیں یا جدید مغربی جمہوریت کو وہ Athenian Democracy کو مانتے ہیں یا Madisonian Democracy کو۔ Popular Democracy کو یا Constitutional Democracy کو۔ Reflective Democracy کو یا inculsive Democracy کو۔ Deliberative Democracy کو یا ورلڈ بینک کی Particpating Democracy کو۔ Iranian Democracy کو یا Russian and Chinese Democracy کو۔ Illiberal Democracy کو یا Liberal Democracy کو۔ Authoritarian Democracy کو یا Social Democracy کو Theocratic Democracy کو یا Limited Democracy کو Rawl's Democracy کو یا Kantian Republicanism کو۔ نائیک صاحب اگر جمہوریت کے حامی ہیں اور اس قدر کہ اسے قرآن کی آیات سے ثابت کر رہے ہیں تو وہ یہ بھی بتائیں کہ کیا وجہ ہے کہ جمہوریت کی عالمگیریت کے باوجود تمام مغربی جمہوریتوں میں لوگ جمہوری عمل، جمہوری سیاسی جماعتوں، جمہوری اداروں اور جمہوری انتخابات [Elections] سے مسلسل لاتعلق کیوں ہو رہے ہیں؟ امریکہ، جاپان مغرب، مغربی یوروپ اور دنیا کے تقریباً ہر ملک میں انتخابات میں ووٹ ڈالنے والوں کی تعداد کیوں مسلسل کم ہو رہی ہے؟ جنھوں نے جمہوریت ایجاد کی وہ جمہوریت سے لاتعلق ہو رہے ہیں اور جن کا جمہوریت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے وہ خواہ مخواہ جمہوریت کی مدح سرائی میں مصروف ہیں۔ فرید زکریا جیسے جمہوریت کے حامی لکھ رہے ہیں کہ:

Democratic renewal requires not more but less Democratic

participation.[1]

نائیک صاحب اس بات سے بھی واقف نہیں کہ دستوری جمہوریت کا اصل ماخذ Madisonian Democracy ہے، امریکی مفکر Madison کے مضامین جو فیڈرلسٹ پیپر [Federalist Papers] کا حصہ ہیں انھیں دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جمہوریت کا سرمایہ داری [Globalization of Capital] کے تحفظ، غلبے اور عالمگیریت سے براہ راست تعلق ہے اس کا اصل وظیفہ، مقصد، ہدف اور منزل صرف اور صرف Rule of the Law of Capital ہے۔ اور جمہوری عمل کا مقصد سرمایہ دارانہ اقلیت [Capitalist minority] کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ عقلیت [Capitalist Rationality] آزادی [Freedom]، مساوات [Equality]، ترقی [Development] کا تحفظ اور سرمایہ داری کے فروغ کے بنیادی طریقے، ہتھیار، حربے، بنیادی حقوق کی استعماریت کا تسلط [Imposition of human rights Imperialism] بذریعہ جمہوریت [Democracy] ہے، فریدزکریا مدیر نیوز ویک جو صدر بش کی پانچ رکنی مجلس خاص کے رکن تھے لکھتے ہیں کہ:

It is the constitutional rather than the popular element of Democratic order which is essential for securing and sustaining the global hegemony of capital and America.[2]

جمہوریت: مقاصد واہداف:

عصر حاضر میں جمہوریت کا مقصد سرمایہ دارانہ تعقل [Capitalist Rationality] کے فروغ میں حائل رکاوٹوں کو دور کر کے سرمایہ دارانہ اقلیت [Capitalist minority] کو دستوری وآئینی تحفظات فراہم کر کے ارتکاز سرمایہ [Accumulation of Capital] کے عمل کو جو اپنے حق ہونے کا جواز خود اپنے اندر رکھتا ہے [End itself] زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنا ہے، سرمایہ داری کے تحفظ کے جواز کے لیے اسے کسی دلیل اور خارجی ذریعۂ علم کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا جمہوریت اس مابعد الطبیعیات کے ذریعے سرمائے کی عالمگیر گردش [Globalization of Capital] کو ممکن بناتی ہے اور اس عمل میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہر قوت کو [اگر کوئی موجود ہے] ختم کر دینا جمہوریت اور سرمائے کے دفاع کے لیے ضروری ہے لہٰذا دنیا میں جہاں بھی مغرب قتل عام کرتا ہے غلطی سے نہیں کرتا اور اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کرتا، بنیادی حقوق کے فلسفے کی نفی نہیں کرتا بلکہ

---

1. Fareed Zakaria, *The Future of Freedom: Illiberal Democracy at Home and Abroad*, W.W. Norton & Co., 2004 Chapter 7.

2. Fareed Zakaria, *The Rise of Illiberal Democracy*, Foreign Affairs Vol. 76 No. 6, pp.21-37.

بنیادی حقوق کی روح کے عین مطابق کام کرتا ہے کیونکہ بنیادی حقوق صرف اور صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو آزادی کو ایک قدر مطلق [Absolute Value] تسلیم کرتے ہیں اور کسی خارجی ذریعۂ علم سے ہدایت وصول نہیں کرتے، وہ لوگ جو کسی خارجی ذریعہ علم خدا، وحی، رسالت اور روایت سے علم اخذ کرتے ہیں وہ بنیادی حقوق کے فلسفے کے تحت انسان کہلانے کے مستحق ہی نہیں ہوتے۔ ہر وہ شخص جو اپنی آزادی، ارادے، تعقل اور قوت فیصلہ کو کسی بیرونی ذریعے پر منحصر کردے وہ انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔ لہٰذا عراق، افغانستان، پاکستان، سوڈان، صومالیہ، لاطینی امریکہ کے اکثر ممالک میں قتل عام سرمایہ داری کے دفاع کے لیے ہے۔ اس قتل عام کو بنیادی حقوق کی نفی کہنا اور امریکہ کو بنیادی حقوق کا مخالف کہنا محض جہالت ہے اور دنیا کی سوفی صد اسلامی تحریکیں جہالت کے اس اندھیرے سے ابھی تک باہر نہیں آسکیں۔ سرمایہ میں اضافے کی راہ میں حائل قوتوں کے خاتمے کا یہ عمل خواہ سرمایہ دارانہ تعقل کو مقبول عام کر کے ممکن ہو، آمروں کی حمایت سے ہو یا جبراً طاقت کے بھرپور استعمال کے ذریعے ہو ان طریقوں سے ہر اس قوت کو ختم کیا جائے جو سرمایہ دارانہ تعقل کی عالمگیریت، غلبے اور نفوذ میں رکاوٹ بنے خواہ وہ مجاہدین ہوں، اسلامی تحریکیں ہوں، لاطینی امریکہ کے کافر، مشرک انقلابی ہوں، کلیسا ہو یا اس کے پادری ہوں، خدا کو ماننے والے ہوں یا ملحد و بے دین ہوں۔ خواہ وہ سیاسی جماعتیں ہوں، عوام ہوں یا کوئی مضبوط قومی ریاست ہو لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط کے باعث اب قومی ریاستیں تحلیل ہو رہی ہیں ان کے عوام اور پارلیمنٹ کی ماضی میں بہ ظاہر جو بھی حیثیت تھی اب وہ نام نہاد حیثیت بھی نہیں رہی ہے، ان کا کام صرف غیر منتخب عالمی استعماری سرمایہ دارانہ اداروں کے مسلط کردہ فیصلوں کی توثیق و تائید اور ترویج و اشاعت رہ گیا ہے۔ جمہوریت جہاں آتی ہے لاکھوں لاشوں کے ملبے پر آتی ہے، برعظیم پاک و ہند کی جمہوری تقسیم کئی لاکھ لاشوں، لاکھوں عصمتوں اور معصوم بچوں کے لہو سے طلوع ہوئی۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی جمہوریت اور جمہوری عمل کے ذریعے عمل میں لائی گئی، لاکھوں لوگ مارے گئے، لاکھوں لوگ بنگلہ دیش کے کیمپوں میں قیدیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں، کراچی، سندھ، پنجاب، بلوچستان، سرحد میں جمہوری عمل اور ردعمل کے ذریعے اب تک کئی لاکھ لوگ مارے گئے۔ پرویز مشرف کی آمرانہ جمہوریت اور آصف زرداری کی وسیع المشرب جمہوریت کے ذریعے فاٹا، اور صوبہ سرحد میں لوگ دہشت گرد قرار دے کر شہید کر دیے گے، اپنے ہی ملک میں چالیس لاکھ بے گناہوں کو زبردستی ہجرت پر مجبور کر دیا گیا، اپنے ہی وطن میں ہجرت کی کوئی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ یہ جمہوریت کے کمالات ہیں، جمہوریت سرمایہ داری کی آلۂ کار ہے لہٰذا ہر وہ کام جو سرمایہ دارانہ نظام کے غلبے، فروغ، تسلط اور حاکمیت کو ممکن بنادے خواہ طاقت اور تشدد کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو، اس کا جواز جمہوریت مہیا کرتی ہے اور واحد جواز جمہوریت کا وسیع تر مفاد ہوتا ہے لہٰذا اگر امریکہ کہیں آمریت کی حمایت کرتا ہے تو جمہوریت کے وسیع تر مفاد میں کہ جمہوریت کے ذریعے کہیں امریکہ دشمن اقتدار میں نہ آجائیں اور سرمایہ داروں اور سرمایہ داری کو خطرہ لاحق نہ ہو لہٰذا سرمایہ دارانہ جمہوریت اور لبرل ازم کے وسیع تر مفاد میں اس

آمریت کو عارضی حل کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ یہ عارضی مدت بہت طویل بھی ہوسکتی ہے آمریت قبول کرنا سرمایہ داری کے فروغ، تسلط اور وسعت پذیری کا جمہوری تقاضا بن جاتا ہے۔ مطلق آزادی اور جمہوریت [absolute freedom & democracy] اگر سرمایہ داری اور جمہوری عمل کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اسے سرمایہ داری کے وسیع تر مفاد میں طویل ترین مدت کے لیے معطل اور منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسی اصول کے تحت مشرق وسطیٰ، انڈونیشیا اور پاکستان میں مطلق العنانیت کو برداشت کیا گیا لیکن اگر یہ مطلق العنان حکومتیں جمہوریت و جمہوری عمل کے مقاصد اور سرمایہ داری کے فروغ میں رکاوٹ محسوس ہوں گی تو اسی لمحے امریکہ اور اقوام متحدہ ان ممالک کے لیے جمہوری حقوق کا ڈھنڈورہ شدت سے پیٹنے لگیں گے۔ اسی اصول کے تحت آزادی اظہار رائے پر پابندی بھی اس آزادی [Freedom] کے وسیع تر مفاد میں اکثر و بیشتر عائد کی جاتی ہے اسی لیے کسی امریکی سپاہی کی لاش کی رسمِ تدفین دنیا کے کسی ٹی وی پر نہیں دکھائی جاسکتی کیونکہ ان لاشوں اور ماتم گزار سوگواروں کو دیکھ کر موت کا خوف امریکی عوام پر طاری ہوسکتا ہے، رائے عامہ امریکہ کے خلاف ہوسکتی ہے اور سپاہی فوج سے بغاوت کر کے میدان جنگ سے کوچ کر سکتے ہیں جس کے نتیجے میں عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے محافظ امریکہ کی قوت میں کمی ہوسکتی ہے اس قوت کو برقرار رکھنے کے لیے جو نظام سرمایہ داری کے لیے ضروری ہے۔ آزادی اظہار رائے پر قدغن عائد کر کے ابلاغ عامہ کے اداروں کو امریکی سپاہیوں کی رسم تدفین دکھانے سے روک دیا گیا، یہ عمل بنیادی حقوق کی نفی اور انکار نہیں بلکہ بنیادی حقوق کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے ایک تسلیم شدہ مسلمہ حکمت عملی ہے۔ اس عارضی پابندی کے نتیجے میں مستقبل میں آزادی اظہار رائے کے دائرے کے وسیع ترین ہونے کا امکان ہے کیونکہ یہ آزادی بنیادی حقوق جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے ذریعے ہی مل سکتی ہے اور اس نظام کی حفاظت کی ذمہ داری صرف اور صرف امریکہ پر ہے اگر اس وقت آزادی اظہار رائے کی اجازت دے کر تدفین کی رسومات دکھائی گئیں تو امریکی عوام پر منفی اثر پڑے گا جس سے نظام سرمایہ داری کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے لہٰذا وسیع تر مفاد کا تقاضا اس وقت عارضی طور پر پابندی ہے۔ عموماً اسلامی مفکرین امریکہ کے بظاہر بنیادی حقوق سے منافی رویوں کو اس کی منافقت اور دوغلا پن سمجھتے ہیں حالانکہ بنیادی حقوق کے فلسفے اور ان کے منہاج سے واقف شخص جانتا ہے کہ امریکہ اور مغرب کا رویہ بنیادی حقوق کے عین مطابق ہے اس میں کوئی تضاد نہیں ہے، اسی فلسفے کے تحت ۱۰ کروڑ سرخ ہندیوں کو امریکہ میں قتل کیا گیا یہ انسانی حقوق کے عین مطابق رویہ تھا۔ سرخ ہندی [Red Indian] روایات اور دیو مالا کے اسیر تھے وہ زندگی کا مقصد سرمایہ کمانے کو نہیں سمجھتے تھے لہٰذا وہ انسان نہیں، درندے تھے انہیں اس طرح مار دینا جائز تھا جس طرح جانوروں کو ہلاک کیا جاتا ہے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ ایسا کر کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کر رہا ہے وہ مطلق جاہل ہیں ایسا کرنا بنیادی حقوق کے فلسفے کا عین تقاضا ہے۔ مغرب کے بڑے فلاسفہ نے ریڈ انڈین کے بارے میں جو کچھ زہر اگلا ہے اس کا مطالعہ کرلیا جائے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔

دنیا بھر میں جمہوریت کے نام پر جو قتل عام ہوا ہے اگر اس کا حساب لگالیا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ بھارت میں انتخابات کے موقع پر جو قتل ہوئے ہیں ان کا شمار نہیں، جمہوریت اور بے رحمانہ قتل عام [Genocide] جمہوریت اور جرائم، سفاکی، درندگی، بہیمیت، خونخواری، آگ اور خون لازم وملزوم ہیں اور ان کا نتیجہ ایک ارب چھتر کروڑ انسانوں کے لاشے اس کی تفصیل ۲۰۰۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہونے والی مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of the Democracy میں پڑھی جاسکتی ہے۔ جناب ڈاکٹر نائیک صاحب Paul Kivel کی کتاب[1] کا مطالعہ کرلیں تو انھیں اس جدید، جعلی، تباہ کن، مہلک، خطرناک انسان اور مذہب دشمن جمہوریت کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ وہ www.paulkivel.com کی ویب سائٹس سے جمہوریت کے موضوع پر بے شمار کتابوں، دستاویزات، فلموں اور اعداد وشمار کا انبار اکٹھا کر سکتے ہیں۔

فرید زکریا صدر بش کے مشیر خاص ہیں جنھوں نے اپنی کتاب Future of Democracy میں لکھا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت امریکہ میں کانگریس اور سینیٹ میں موجود منتخب نمائندوں کے پاس حاکمانہ اختیارات کا صرف دس سے پندرہ فی صد حصہ ہے بقیہ اختیارات لابیوں، پریشر گروپوں، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہیں۔ امریکہ میں ایک صدارتی انتخابات ہارنے کے لیے امیدوار کو کروڑوں ڈالر خرچ کرنے پڑتے ہیں، صدارتی امیدوار بھی اس کو بنایا جاتا ہے جو اپنے الیکشن کے لیے زیادہ سے زیادہ سرمایہ اکٹھا کر سکے۔ Capitalism کے بغیر ڈیموکریسی کا پہیہ نہیں چلتا لہٰذا اس وقت اصلاً دنیا میں سرمایہ داری، انتخابات اور سیاسی جماعتوں کا پہیہ چلا رہی ہے۔ ملٹی نیشنل کارپوریشن عہد حاضر کی سیاست، انتخابات اور سیاسی عمل کو ممکن بنانے کے لیے سرمایہ مہیا کررہے ہیں اور سرمایہ داروں کی طاقت کے سامنے سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ نمک کی طرح تحلیل ہورہے ہیں اور دنیا عالمی سرمایہ داری، ان کی کارپوریشنز، ان کے مسلط کردہ غیر منتخب عالمی اداروں WTO، ISO 2000، IMF، WB، UNO وغیرہ کے رحم وکرم پر ہے، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کے الفاظ میں:

In post-modern capitalism it is the state which captures the party and not vice versa.[2]

Imperialism must [at least partially] de-soverignise national

---

1. Paul Kivel, *You Call this a Democracy? Who Benefits, Who Pays and Who Really Decides?* New York: The Apex Press, 2004.

2. Javed A. Ansari, *The Living Death of West European Democrecy*, in Market Foress, April 2008, Vol. 4, No. 1, p.6.

parliments to ensure universal application of capitalist Law.[1]

ورلڈ بینک کے گڈ گورنس لٹریچر ۱۹۹۹ء کے مطابق:

In third world countries Western funded NGOs plus "Impartial" courts ensuring the rule of the law of capital=democracy.[2]

اس نقطۂ نظر کی بلیغ ترین ترجمانی ۲۰۰۳ء میں ورلڈ بینک کے اہم کارندے Amy Chua نے علمی طور پر پیش کی ہے۔

یہ بات حددرجے قابل لحاظ ہے کہ جمہوریت میں فیصلے جمہور [People] نہیں پارلیمنٹ اور وزیر نہیں غیر منتخب [Non elected] قومی اور عالمی استعماری ادارے کرتے ہیں مثلاً بیوروکریٹ، سرمایہ دارانہ اقلیت، فلاسفہ IMF، World Bank، UNO، ISO 2000، ورلڈ اکنامک فورم، WTO، Kyotoprotocol، اسٹاک ایکسچینج، منی مارکیٹ، کیپٹل مارکیٹ، فری ٹریڈ پارلیمنٹ، عدلیہ، بیوروکریسی، وغیرہ جیسے ادارے اور معاہدے عوامی رائے سے نہیں سرمایہ دارانہ اقلیت [Capitalist minority] اور سرمایہ دارانہ تعقل [Capitalist Rationality] کے علمبر دار شرافیہ کی مرضی سے لوگوں پر ان کے نام نہاد عوامی نمائندوں یعنی کونسلر، اراکین اسمبلی، اراکین سینٹ کے ذریعے مسلط کیے جاتے ہیں ان اداروں کا مقصد صرف اور صرف:

Colonization of the state by the universalization of market decision making practices and the necessary de-legitimation of majoritarian [Popular democratic] decision making that it entails.[3]

سرمایہ دارانہ تسلط کی عالمگیریت کے باعث اب یورپی ممالک کی کابینہ کے وزراء کے پاس کوئی اختیارات نہیں رہے ہیں، ان جمہوری نمائندوں پر غیر منتخب عالمی اداروں کے فیصلے مسلط کیے جاتے ہیں:

That decision making by non majoritarian institutions enjoys greater procedural legitimacy than the decisions of west European national Cabinets because decisions by non majoritarian public institutions follow due process of law [of capital] and allow access to stake holders.[4]

---

1. Ibid., p. 5. 2. Ibid. 3. Ibid. 4. Ibid.

لہٰذا Thatcher and Sweet نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

Non majoritarian institutional [market modeled] decision making provides a democratically superior alternative to partisan majoritarian decision making by Cabinets.[1]

جمہوریت میں جمہور [people] کی حیثیت:

اس وقت دنیا میں لوگوں کی قسمت کے تمام فیصلے غیر منتخب ادارے [Non elected Institutions] کر رہے ہیں اور ان اداروں کے فیصلوں کو عوامی نمائندے، منتخب لوگ، دنیا کی تمام پارلیمنٹ، سینٹ بخوشی قبول کر رہے ہیں کیونکہ سب سرمایہ دارانہ نظام کے خادم اور غلام ہیں، امریکہ جسے دنیا کی طاقت ور ترین جمہوریت کہا جاتا ہے وہاں کانگریس اور سینٹ جیسے منتخب ایوانوں کے پاس اقتدار کا صرف دس سے پندرہ فیصد حصہ ہے بقیہ پچاسی فیصد اقتدار پریشر گروپس، لابیز اور سرمایہ دارانہ اقلیت اور کثیر الاقومی کارپوریشنز [capitalist minority and corporations] کے پاس ہے، اس کی تفصیل صدر بش کے مشیر نیوز ویک کے مدیر فرید زکریا کی کتاب *The Future of Freedom* میں پڑھی جا سکتی ہے، جب ہم نظام سرمایہ داری کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم سوشلزم یا کمیونزم کے حامی ہیں کیونکہ یہ دونوں نظام بھی سرمایہ داری کی دو مختلف شکلیں ہیں، سرمایہ داری، کمیونزم، سوشلزم، نیشنل ازم، لبرل ازم، انارکزم، مسولینی و ہٹلر ازم، سوشل ویلفیئر ازم سب ایک ہی نظام کے چٹے بٹے ہیں، ان تمام نظاموں کا بنیادی مقصد ہر فرد کو آزاد کرنا، اسے تمتع فی الارض کے زیادہ سے زیادہ قابل بنانا کہ انسان ایک لذت حاصل کرنے والا جانور ہے اور لذت ہی اصل مقصد زندگی ہے لہٰذا تمام علوم، فنون، سائنس اور سوشل سائنس کا مقصد صرف اور صرف انسانی لذتوں میں اضافہ اور مسلسل اضافہ ہے اور سرمایہ دارانہ، لبرل، مارکسی، سوشلسٹ، کمیونسٹ، نیشنلسٹ انقلاب کا مطلب صرف یہی ہے کہ انسان یا طبقہ یا نوع، یا قوم یا فرد دنیاوی نعمتوں سے کس قدر تمتع کر سکتا ہے لہٰذا معیار زندگی کو [standard of living] مسلسل بلند کرنا ان تمام نظاموں کی مشترکہ مابعد الطبیعیات کا حصہ ہے یہ انسان کو جانور کی سطح سے بھی نیچے گرا دیتے ہیں اور اس کی خواہش نفس حرص وحسد و ہوس میں اضافے کے لیے سائنس و سوشل سائنس کے جادوگروں سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ عہد جدید کے تمام ممالک تمام جدید سیاسی نظریات، تمام جدید سیاسی نظام کی مابعد الطبیعیات صرف اور صرف تمتع فی الارض کو عوام کے لیے زیادہ سے زیادہ ممکن بنانا ہے، سرمایہ داری اور کمیونزم میں اختلاف صرف طریقوں کا ہے کہ تمتع فی الارض کے لیے فرد یا ریاست، معاشرت، معاشرے اور حکومت، پیداوار، ذرائع پیداوار اور اسباب و

1. Ibid.

مسائل کی تقسیم و تنظیم کا عمل کیسے ہو ان امور میں جزوی اختلافات اصلاً طریقہ کار لائحہ عمل کے اختلافات
ہیں اصول [basic princple] اور ایمان [belief] کے اختلافات نہیں ہیں کیوں کہ تمام ازم
[isms] انسان کی حرص وحسد وہوس کے مطابق زندگی کی تعمیر کو ممکن بنانے پر مشترکہ اور متفقہ ایمان رکھتے
ہیں۔ معیار زندگی کا مطلب ہے زیادہ سے زیادہ کھانا پینا پہننا عیش کرنا صَرف کرنا
[consumption] اسراف کرنا لذت حاصل کرنا جو سرمایہ کے بغیر ممکن نہیں ہے لہٰذا پیسہ کمانا ہی اصل
مقصد حیات ہے کیونکہ لذت اور سہولت صرف سائنس و ٹیکنالوجی کے ذریعے نہیں بلکہ سرمایہ کے ذریعے
ملتی ہے اور آزادی جو محض ایک تصور ہے اصلاً کچھ نہیں وہ سرمایے کے بغیر نہیں ملتی جو زیادہ freedom
چاہتا ہے اسے زیادہ capital چاہیے آزادی کا کوئی تصور سرمایے کے بغیر بے معنیٰ ہے جس کے پاس
زیادہ سرمایہ ہے وہ زیادہ آزاد ہے purchasing power یعنی آزادی صرف مارکیٹ کے ذریعے
یعنی سرمایہ Capital کے ذریعے اپنی طاقت کا آزادانہ اظہار کرتی ہے۔ اس کے سوا آزادی کے کوئی
معانی نہیں اس مسلسل جدوجہد کا مقصد ارتکاز سرمایہ، مال جمع کرنے کے سوا کچھ اور نہیں رہتا اور انسان
قرآن کے الفاظ میں: **جمع مالاً وعدده یا الهکم التکاثر** کی عملی تفسیر بن جاتا ہے۔ کیونکہ معیار
زندگی ایک اضافی یعنی غیر متعین relative term اور متغیر اصطلاح ہے۔ جس کی تعریف طے کرنا ممکن
نہیں۔ کبھی بھی یکساں معیار زندگی ہر فرد کو حاصل نہیں ہوسکتا لہٰذا سرمایہ داری، کمیونزم، نیشنل ازم کبھی
کامیاب ہی نہیں ہوسکتے لیکن ان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ ناکام ہونے والے لوگ معیار زندگی بلند کرتے
ہوئے اور حرص و حسد و ہوس کے جذبات کو ہی ایمان سمجھتے ہیں اور شکست پر شکست کے باوجود اس
ایمانیات، عقیدے اور مابعد الطبیعیات سے دستبردار نہیں ہوتے، اس تصور کے فریب مسلسل میں مبتلا
رہتے ہیں، اگر سوشلزم کمیونزم کو روس چین میں شکست ہوتی ہے تو یہ فوراً لبرل کیپٹل ازم کو اختیار کر لیتے
ہیں، اگر وینزویلا کیوبا وغیرہ میں لبرل کیپٹل ازم شکست کھاتا ہے تو یہ ممالک فوراً سرمایہ داری کی دوسری
شکل نیشنل ازم، کمیونزم وسوشل ازم کی آغوش میں چلے جاتے ہیں، اگر فرانس، جرمنی، اور مشرقی یورپ میں
سوشلزم کو شکست ہوتی ہے تو یہ سوشل ڈیموکریسی اور ویلفیئر ازم کے دائرے میں چلے جاتے ہیں، ہر جگہ
سے شکست ہوتی ہے تو یہ نیشنل ازم، ریس ازم، انارکزم کے دائرے میں آجاتے ہیں ان کا سفر دائرے کا
سفر ہے اور اس دائرے کی مابعد الطبیعیات تمتع فی الارض، تسخیر کائنات، عیاشی، حرص و حسد و ہوس اور نفس کی
خدائی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔ سرمایہ داری کی جدید مذہبی شکلیں پروٹسٹنٹ ازم، کیتھولک
ازم ہندوتوا، اسلامک نیشنل ازم، اسلامک پان ازم، اسلامک انٹرنیشنل ازم اور اسلامک سائنس ہیں۔

ذاکر نائیک صاحب یہ نہیں بتاتے کہ اگر جمہوریت عین اسلام، عین حق اور عالمگیر قدر ہے تو
مغربی یورپ، امریکہ، جاپان بلکہ دنیا بھر میں سیاسی عمل، جمہوری انتخابات اور سیاسی پارٹیوں سے لوگوں کی
دوری کیوں بڑھتی جارہی ہے؟ سیاسی جماعتیں کیوں سکڑ رہی ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ منصوبہ سازی کے
امور عالمی استعماری اداروں کے باعث سیاسی جماعتوں کے دائرۂ کار سے باہر ہو گئے ہیں، قومی سیاسی

جماعتیں قومی و بین الاقوامی امور کے بجائے گلی محلوں کی سطح کے مسائل تک محدود ہوتی جارہی ہیں، اکثر سیاسی جماعتیں کسی نعرے، جذبے، کسی گرما گرم موضوع [hot issue] جو اکثر منفی [negative] ہوتے ہیں اور یک نکاتی پروگرام [One Point Agenda] پر زندہ ہیں، NGO کا اثر بڑھ رہا ہے، سیاست داں سیاست ترک کر رہے ہیں، عوامی نمائندگی یعنی جمہوریت کے نام پر سرمایہ دارانہ استعماری تسلط [Capitalist Imperialism] اب اپنے خالق جمہور [Public] اس کے دائرے ریاست [Republic] انسان کی خود مختاری [Autonomus being]، حاکمیت جمہور [Dictatorship of people] کے سنہرے مگر جھوٹے دعووں کو خود نگل رہا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی یوروپ میں امریکہ سے زیادہ رائے دہندگان [Voters] انتخابات میں حصہ لیتے تھے لیکن اس تعداد میں اسّی کی دہائی تک چار فیصد کمی ہوگئی ۶۰ سے ۹۰ کے عشرے تک آسٹریلیا، ڈنمارک، فن لینڈ، فرانس، جرمنی، آئس لینڈ، آئر لینڈ، اٹلی، لکسمبرگ، سویڈن، سوئٹزر لینڈ اور برطانیہ میں انتخابی عمل میں شریک ہونے والے رائے دہندگان کی تعداد میں دس فی صد کی حیرت انگیز کمی ہوئی۔ اکیسویں صدی کے اولین سالوں میں برطانیہ، ناروے، پرتگال، اسپین، یونان، آسٹریا اور فن لینڈ میں رائے دہندگان کی تعداد خطرناک حد تک کم ہوگئی۔ نائیک صاحب ان اعداد وشمار کے سلسلے میں:

[1] M. Franklin, "*The Dynamics of Electoral Participation*, in *Campaign Democracies*", [et. all, ed. Le Dac p.], London: Verso, 2004.

[2] P. Morris, *Democratic Phoenix*, London: C.U.P, 2001.

[3] R. Dalton, *Parties Without Partisans*, Oxford: O.U.P, 2000.

[4] P. Mair, "*Aggregate Mass Electoral Behaviour in Western Europe*", in *Contemporary European Politics*, [ed., L. Keen], London: Croon Helm, 2002, pp. 40-71.

ناروے، اٹلی، نیدرلینڈ، برطانیہ، سویڈن، جرمنی، میں سیاسی جماعتوں کے اراکین کی تعداد میں پچاس فیصد کمی ہوئی ہے، ۲۰۰۰ء کے انتخابات میں فرانس میں سیاسی جماعتوں کے اراکین کی صرف تین فی صد تعداد نے حصہ لیا۔ فرانس میں سیاسی جماعتوں کی رکنیت کی شرح ستر فی صد تک کم ہوگئی ہے، ۲۰ لاکھ سے زیادہ لوگ سیاسی پارٹیاں چھوڑ گئے ہیں۔ اٹلی میں بھی ۲۰ لاکھ لوگوں نے سیاسی جماعتوں سے علیحدگی اختیار کر لی ہے، ان اعداد وشمار کے سلسلے میں Mair کا مضمون دیکھا جاسکتا ہے جو مشہور کتاب *Contemporary European Politics* میں شامل ہے۔

بنیادی حقوق اور جمہوریت: منتخب کتابوں کی ایک فہرست:

بنیادی حقوق اور جمہوریت کے بارے میں خود مغرب کے فلاسفہ ومفکرین کیا کہتے ہیں، وہ ان اقدار کو عالمگیر اور زماں ومکاں سے ماورا نہیں سمجھتے نائیک صاحب ان کتابوں کا مطالعہ فرمالیں تو جمہوریت کی غیر مشروط حمایت سے تو کم از کم دستبردار ہو ہی جائیں گے:

[1] Peter Singe , *The Limits of Democracy.*

[2] Vali Reza Nasr , *The Rise of Muslim Democracy*, Journal of Democracy, Volume 16, Number 2, April 2005, pp.13-27.

[3] Robert A. Dahl, *Democracy and its Critics*, New Haven & London: Yale University Press, 1989 .

[4] Richard Rorty, *The Priority of Democracy to Philosophy: Objectivity, Relativism, and Truth*, Philosophical papers, Volume 1, Cambridge: Cambridge University Press, 1991.

[5] Michael J. Sandel [ed.], *Liberalism and its Critics*, Basil Blackwell, 1984.

[6] Michel Mann:*The Dark Side of Democracy: Explaining Ethnic Cleansing*. Cambridge: Cambridge University Press, 2005.

[7] John Gray, *Post-Liberalism: Studies in Political Thought*. Routledge, 1993.

[8] Robert A. Dahl, Chapt 8, "*Dilemmas of Pluralist Democracy: The public good of which public?*" in *Individual Liberty and Democratic Decision- Making* [ed. Peter Koslowski], Tubingen, 1987.

[9] Michel Foucault, *Discipline and Punish: the Birth of the Prison*, New York: Random House, 1975.

[10] Herbert Marcuse, *One Dimensional Man: Studies in the Ideology of Advanced Industrial Society*, Boston: Beacon Press 1991.

[11] Fareed Zakaria, *The Future of Freedom: Illiberal Democracy*

at Home and Abroad, W.W. Norton & Company, 2003, p. 177.

[12] Hannah Arendt, *"What Is Authority?"* in *Between Past and Fiture*. New York: Penguine, 1968.

[13[Hannah Arendt, Chapt. 12, *"The Revolutionary Tradition and its Lost Treasure,"* in *Liberalism and its Critics*, [ed., Michael J. Sandel], Basil Blackwell, 1984, pp.239-263.

[14] Roxanne L. Euben, *Enemy in the Mirror: Islamic Fundamentalism and the Limits of Modern Rationalism.* Princeton: Princeton University Press, 1999.

[15] James Good and Irving Velody[ed.], *The Politics of Postmodernity*,. Cambridge: Cambridge University Press , 1998.

[16] Michael Walzer, *Sphers of Justice: A Defense of Pluralism and Equality*, Basic Books, reprint [1990] [first published in 1983].

[17] Jürgen, Habermas, *The Philosophical Discourse of Modernity*, [Tr. by Frederick Lawrence], Cambridge: The MIT Press, 1987.

[18] J. Rawls: *Law of the People: "The Idea of Public Reason Revisited."* Cambridge, Massachusetts: Harvard University Press, 1999.

[19] J. Rawls: *Political Liberalism*: The John Dewey Essays in Philosophy, 4. New York: Columbia University Press, 1993.

[20] J. Rawls: *A Theory of Justice*, Cambridge: Belknep Press, Harvard University Press, 1971.

چارلس ٹیلر، سانڈل میکنٹائر و الزر انسانی حقوق کو Abstract خاص تصورِ خیر سے اخذ شدہ سمجھتے ہیں ان کے خیال میں Value neutral نہیں ہیں۔

[21]Alasdair MacIntyre, *After Virtue: A Study in Moral Theory*, London: Gerald Duckworth and Co. Ltd., 1981.

[22] M. Sandel., *Liberalism and the Limits of Justice*, Cambridge: Cambridge University Press, 1982.

[23] Will Kymlicka, *Liberalism, Community and Culture*, Oxford: Clarendon paperbacks, 1989.

[24] Joseph Raz, *The Morality of Freedom*, Oxford: Clarendon Paperback, 1986.

[25] Michael Walzer, "*Philosophy and Democracy*" in *Political Theory*, 9/3 1981, pp. 379-99.

[25]Charles Taylor, *Sources of the Self: The Making of the Modern Identity*, Cambridge: Cambridge University Press, 1989, p. 89.

Which (Good) defined the Right 89

نائیک صاحب کو اس بات کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ: Structuralism، Romanticism، Phenomenology، Nihilism، Existentialism، Hermeneutics، Marxism، Critical Theory کے جدید فلسفیانہ افکار نے جمہور عالم پر کیا اثرات مرتب کیے اور جمہوریت کے بدلتے ہوئے رویوں کے مابین کیا تال میل ہے؟ یا ان افکار نے جمہوری دہشت گردی کو اور زیادہ مہلک بنانے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ دنیا میں جہاں جہاں جمہوریتیں ہیں وہاں درندگی، شیطانیت اور بہیمت کا رقص سب سے زیادہ شدید کیوں ہے؟ کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہونے والی مائیکل مین کی کتاب *The Dark side of the Democracy* اس راز سے پردہ اٹھاتی ہے جب سے دنیا میں شیطانی جمہور کا زمانہ آیا ہے ایک ارب بہتر کروڑ انسان اس جمہوری دور میں ہلاک کیے گئے ہیں تاریخ کا بدترین قتل عام کرنے والے جدید انسان کے ہاتھوں جدید جمہوریت تاریخ کا بدترین باب ہے، ذاکر نائیک صاحب اس کتاب کا مطالعہ بھی فرمائیں تو جمہوری دہشت گردی کی انسانیت کا حقیقی چہرہ واضح ہو سکے گا۔ ذاکر نائیک صاحب یہ بھی بتائیں کہ جدید جمہوری ریاستوں کے کتنے صدر اور کتنے وزیر اعظم اپنے ملک کے دفاع کے لیے میدان جنگ میں گئے اور دفاع وطن کے لیے جان قربان کردی؟ آج تک کسی جمہوری صدر اور وزیر اعظم کی موت میدان جنگ میں نہیں ہوئی۔ ان کے بچے، خاندان، کبھی دفاع وطن میں یا کسی اور اعلیٰ مقصد کے لیے موت کی آغوش میں نہیں گئے لیکن دنیا کی تاریخ کے تمام بادشاہ اپنے نظریات کے دفاع، اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے اپنے لہو کا پرچم اپنے ہاتھوں میں تھام کر میدان موت میں اترے، اپنی زمین کا دفاع کیا اور اس جنگ میں سب سے پہلے بادشاہ پھر اس کے خاندان کے لوگ جان قربان کرتے رہے، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ

میدان جنگ میں امت کی قیادت فرماتے تھے۔کوئی جمہوری وزیر اعظم میدان جنگ میں لڑنے مرنے کیوں نہیں جاتا ایسے بزدل لوگوں کی جمہوریت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تشبیہ دینا نہایت نامناسب رویہ ہے۔

گیارہواں باب

عقلی موشگافیاں اور دینی مزاج

یہ خیال کہ روشنی اور اندھیرے میں فرق صرف عقل کی بنیاد پر ممکن ہے۔ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کوئی تضاد ممکن نہیں۔ عقل اگر خالص ہو تو وہ اسی نتیجے پر پہنچتی ہے جس نتیجے پر انسان نقل کے ذریعے پہنچتا ہے، پیغمبر ظاہر [انبیا و مرسلین] جس منزل پر لے جاتے ہیں پیغمبر باطن [عقل] بھی اسی منزل کی طرف رہنمائی کرتی ہے ـــــــ درست نہیں۔ اگر عقل ہی خیر و شر کو جانچنے کا پیمانہ ہے، تو کیا عقل کو بھی جانچنے کا کوئی پیمانہ ہے؟ یا عقل کو جانچنے کا پیمانہ محض عقل ہے، اگر عقل کو جانچنے کا پیمانہ خود عقل ہی ہے تو پھر عقل کو جانچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بالفاظ دیگر اگر عقل کو جانچنے کا پیمانہ اس کے اندر، یعنی عقل، سے ہی نکلتا ہے، اگر وہ خود ہی پیمانہ ہے تو اسے پرکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ خیال کہ حسیات سے ورا عقل کچھ نہیں کر سکتی، یعنی وہ عقل کا دائرہ نہیں تو پھر حسیات سے متعلق امور میں اگر اختلاف ہو تو فیصلہ کون کرے گا؟ عقل یا وہ مابعد الطبیعیات جو عقل سے ماورا ہے۔

عقلیت کی تحریک ان خطوں سے اٹھی جہاں انبیا کی تعلیمات بالکل معدوم ہو گئیں، عقل کے طالب عقل کی حدود کو نظر انداز کر کے category mistake کرتے ہیں۔ عقل مقاصد کا تعین نہیں کر سکتی لہٰذا قرآن و سنت کے طے شدہ مقاصد کے لیے عقل جب کام کرتی ہے تو یہ سرگرمی اجماع و اجتہاد کی صورت میں ظہور کرتی ہے۔ عقل کے استعمال سے پیدا ہونے والے فطری اختلافات کا حل اجماع اور مسلک جمہور ہے۔ جس طرح بائبل اور قرآن میں تقابل بہ ظاہر عقل کے ذریعے ہوتا ہے، لیکن عملاً یہ تقابل نقل کے منہاج میں ہوگا، عقل یہاں ایک ذریعہ وسیلہ ہوگی جس طرح زبان بھی اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ قرآن و بائبل کا تقابل کرنے کے لیے پہلے قرآن پر ایمان لانا ہوگا پھر اس ایمان کی دلیل عقل کے ذریعے بیان ہوگی، یعنی پہلے ایمان ہے پھر عقل۔ عقل ایمان کے تابع ہے، ایمان عقل سے ماورا ہے اس کا تابع نہیں۔ جو چیز یا تصور انسان کی عقل سمجھنے سے قاصر ہے تو وہ شے خلاف عقل نہیں ماورائے عقل ہوتی ہے۔ خلاف عقل ہونا اور ماورائے عقل ہونا دو مختلف نقطۂ ہائے نظر ہیں جن کے نتائج یکسر مختلف ہوتے ہیں،

کسی شے اور وجود کا عقل سے ماورا ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ شے وجود ہی نہیں رکھتی اسی لیے اصول یہ ہے کہ یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔ قرآن ہمیں عقل کے ذریعے نہیں، مشاہدے اور تجربے کے ذریعے نہیں، بلکہ نقل کے ذریعے ملا ہے، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قرآن کتاب اللہ ہے تو ہم نے تسلیم کیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کے بارے میں براہ راست کچھ نہیں بتایا اس ایمان کو بلاشبہ عقلی دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن یہ نقل کا اثبات ہے بہ ذریعہ عقل۔ عقل ہمارے ایمان کی دلیل مہیا کرتی ہے صرف دلیل سے ایمان مہیا نہیں ہوتا، دلیل عقل کی رہنمائی کر دیتی ہے لیکن قلب کی ہدایت یا قبولیت کے بغیر عقل کی رہنمائی کارآمد نہیں رہتی۔ عقل مان لیتی ہے دل نہیں مانتا، دلیل قلبی کے بغیر دلیل عقلی بے معنی ہے اسی لیے ایمان تعقل قلبی کا نام ہے۔ قرآن نے عالم وعاقل اور اہل فکر اس کو قرار دیا جو الحق اور الکتاب کو قبول کرے، جو اس کو رد کر دے وہ کم عقل، جاہل، ظالم اور شر الدواب ہے لہٰذا عقل کو پرکھنے کا پیمانہ قبولیتِ ایمان ہے جو عقل ایمان قبول نہ کرے وہ عقل نہیں جہل ہے۔ عقل کے استعمال کا لازمی نتیجہ ایمان ہے، عقل کا واحد نتیجہ عبدیت کا اقرار یعنی سجدہ ہے، عقل کی اصل شکل بندگی اور حالت سجدہ ہے۔ اسی لیے قیامت کے دن وہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے جو دنیا میں نعمتِ سجدہ سے محروم ہے: يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ○ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ [۶۸:۴۲،۴۳] دین میں قیاس اور اجتہاد اصلاً تدبر اور تفکر فی القلب ہے، عقل کلی، بصیرت تامہ کا نام ہے، محض خیال آرائی کا نام نہیں۔ یہ محض کوئی تخلیقی، علمی، تحقیقی اور عقلی سرگرمی نہیں بلکہ روحانی عمل ہے جس کا مقصد ہر عہد میں روح کی حفاظت ہے۔ یونانی عقلیت اپنے دورِ زوال میں ارسطو کے ذریعے ابدیت دنیا کے نتیجے پر پہنچی لہٰذا یونان میں حقیقت کے علم کی سرگرمی نے آخر کار صرف اس دنیا کے علم کو ہی اصل علم قرار دینے میں کلیدی کردار ادا کیا، ارسطو کے زیر اثر مغربی فلسفہ آخر کار حقیقت کے سوال سے ہی دستبردار ہو گیا۔ ایک ہی عقل مختلف لوگ استعمال کرتے ہیں تو نتیجہ ایک نہیں نکلتا مختلف ہو جاتا ہے کیونکہ ہیوم کے مطابق عقل جذبات کی غلام ہے: Reason is the slave of Passion بالفاظ دیگر عقل نفس امارہ کی غلام ہے۔ عقل اگر کبھی کسی درست نتیجے پر پہنچ بھی جاتی ہے تب بھی اس درست نتیجے کو تسلیم کرنے سے قاصر رہتی ہے کیونکہ اس درست نتیجے کی تصدیق کا پیمانہ بھی عقل خود ہی ہے، یعنی عقل خود نتیجہ قائم کر کے اس نتیجے کو عقلی یا جذباتی بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے اہلکاروں کا مکالمہ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی دلیل سے مطمئن ہو گئے کہ اگر یہ بت بول سکتے دیکھ نہیں سکتے تو تم ان کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ مگر اگلے ہی لمحے وہ بولے کہ یہ ہمارے باپ دادا کے طریقے سے ہٹانا چاہتا ہے اگر عقل خود ہی مقصد ہے، مقاصد کا تعین خود ہی کر سکتی ہے تو پھر عقلی کوشش کے نتیجے میں جو بھی عمل سرزد ہوگا وہ عقلی ہی ہوگا۔ مسلّمہ اصول ہے کہ پیمانہ ہمیشہ باہر ہوتا ہے لیکن عقلیت کو پرکھنے کا پیمانہ

عقلیت ہی ہے، یعنی انسان کے نفس میں پنہاں ہے لہٰذا نفس ہی حقیقت مطلق ہے۔ عقلیت کو دوام نہیں وہ ہر لحظہ بدلتی ہے جب کہ پیمانہ مستقل ہوتا ہے۔ اگر کسی فیصلہ کی بنیاد صرف عقل ہے تو فرقان، منہاج، کسوٹی، عقل ہی ٹھہری لہٰذا عقل کبھی بھی ایمان سے دستبردار ہو سکتی، کہ عقل تو ارتقا کا نام ہے، یہ تغیر اور تنوع ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ [Believe in Reason] عقل اور دلیل پر ایمان لاؤ، لیکن سوال یہ ہے کہ خود عقل پر ایمان لانے کی کیا دلیل ہے؟ کانٹ کے مطابق دلیل یہ ہے کہ یہ آفاقی سچ ہے، مگر اس کا ثبوت کیا ہے؟ ظاہر ہے ایمان کی دلیل نہیں ہوتی عقل پر ایمان لاؤ کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ اپنے نفس اور اپنے آپ پر ایمان لاؤ، کیونکہ علم کا ماخذ تو عقل ہے جو انسان کے پاس ہے لہٰذا انسان خود اپنے آپ کی پرستش کرے، اپنی ہی عبادت کرے کسی دوسرے کی عبادت نہ کرے۔ کیوں کہ عبادت اس کی کی جاتی ہے جس کے پاس علم ہوتا ہے اور علم صرف انسان کے پاس ہے اسی لیے کانٹ کہتا ہے کہ انسان اپنے سوا ہر مقتدرہ [authority] کا انکار کردے۔ روایتی، الہامی اور دینی تہذیبوں میں اسی لیے ایمان عقل کے تابع نہیں عقل ایمان کے تابع ہے، مغرب میں عقل ماخذ علم [Source of knowledge] ہے۔ اسلام میں عقل محض ذریعۂ علم، ہتھیار اور اوزار ہے۔ عقل مقصد کا تعین نہیں کر سکتی، کسی متعین مقصد کے لیے وسیلے اور آلے، کا کام انجام دے سکتی ہے۔ عقل اپنے منہاج میں نتائج اخذ کرتی ہے اسی لیے اگر آپ جدیدیت کے منہاج میں کھڑے ہوں گے تو اس کے دعوے آپ کو عقلی لگیں گے لیکن اگر آپ مذہبی منہاج میں آ جائیں تو مذہب کے عقائد، اعمال عقلی لگیں گے عقل محض زماں و مکاں سے ماورا نہیں ہو سکتی، عقل محض معروضی [Objective] نہیں ہو سکتی وہ موضوعی [Subjective] رہتی ہے۔ عقل زمان و مکان سے اٹھا سکتی ہے مگر اس ماورائیت پر دوام عطا نہیں کر سکتی، صرف عقل سے علم، الحق اور الکتاب نہیں ملتے بلکہ اس میں جذبات، وجدان، طلب، ہدایت، حواس، کوشش سب مل کر کوئی نتیجہ پیدا کرتے ہیں یہ مغرب کا المیہ ہے کہ اس نے ارسطو سے متاثر ہو کر انسان کو صرف عقلیت کے دائرے میں محصور و مقید اور محدود کر دیا۔ اگر محض عقل اور فطرت، ہدایت، فلاح، کامیابی کے لیے کافی ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد کہ شجر ممنوعہ کے پاس مت جانا، حضرت آدمؑ کبھی تشریف نہ لے جاتے ان کی فطرت بالکل محفوظ اور عقل ہر داغ سے خالی تھی وہ شر اور گناہ کے تصور سے ماورا، مصفّٰی و منزہ عقل و فطرت تھی، مگر جب ہدایت ربانی [نقل] کی موجودگی میں فطرت و عقل کو ذریعۂ علم تصور کرنے اور اس پر اعتماد کرنے کی خطا سرزد ہوئی تو عقل دستگیری نہیں کر سکی صرف توبہ کام آئی اور حضرت آدمؑ نے اللہ رب العزت سے کلمات توبہ سیکھ کر عقل و نفس کی غلطی کی معافی طلب کی: وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ [۲:۳۵ تا ۳۷] شیطان

نے عقلی استدلال پیش کیا تھا لافانی زندگی اور لافانی سلطنت ایک فانی انسان کے لیے۔

قرآن میں جہاں جہاں ایسے بیانات ہیں جو ذہن انسانی کی دسترس سے باہر ہیں ان کا مقصد سائنسی تحقیق وترقی ہیں بلکہ اہل ایمان کے ایمان میں اور اہل کفر کے کفر میں اضافے کے لیے ہیں، ان بیانات کو سائنسی تحقیقات سے جوڑ کر خواہ مخواہ غلط سلط سائنسی نتائج کی میزان پر کسنا معذرت خواہانہ جدیدیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جدیدیت پسند مسلم مفکرین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ عقلی دلائل سے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں لیکن محدود عقل قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔عہد حاضر کے جدید ذہن کو، جو علمی موشگافیوں کا ماہر ہے، نت نئے سوالات سوجھتے ہیں یہ سوالات تحصیلِ علم، حصولِ معلومات، راہِ ہدایت کی طلب، علم میں اضافے اور استفسار کے لیے نہیں ہوتے بلکہ اعتراض، ہجو، تضحیک، تنقید محض اور وہ بھی بلا علم، اس کا مقصد دینی تعلیمات وافکار پر کسی نہ کسی طرح کوئی عقلی اعتراض وارد کرنا ہوتا ہے۔عہد حاضر کے جہلا کے سوالات کا جواب دینے کا طریقہ وہ نہیں ہے جو عالم آن لائن کے معروف فنکار اور ان کے منتخب کردہ نو آموز جدید علماء اختیار کرتے ہیں اور دین کو رسوا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر سوال کا جواب دینا پاگل پن ہے جہلا کے سوالات کے جواب میں ہمہ وقت تیار رہنا اور جواب دینا خود جہالت ہے، وہ شخص عالم کہلانے کا مستحق ہی نہیں جو لا ادری کہنا نہیں جانتا یا کہتے ہوئے ہچکچاتا ہے علم بحر بے کراں ہے جو شخص ہر سوال کا جواب دینے کے لیے ہمہ وقت آمادہ ہے بلا شک وشبہہ جید جاہل ہے اور تمام ٹی وی پروگرام ان جید جہلاء کی جہالت سے منور ہیں اس "منور اندھیرے" سے نکلنے کے کئی طریقے ہیں مثلاً:

[۱] اگر عالم دین کو سوال کا جواب معلوم نہیں ہے تو واضح طور پر لا ادری کہہ دے یا کہہ دے کہ میں نہیں جانتا اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں ایسا کہنا نصف علم ہے، ایک شخص نے حضرت مالکؒ بن انس سے ایک مسئلہ پوچھا اور کہا کہ ان کی قوم نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے مجھے ایک ایسی جگہ سے بھیجا ہے جس کی مسافت یہاں سے چھ ماہ کی ہے آپ نے کہا جس نے بھیجا ہے اس سے جا کر کہہ دینا کہ میں نہیں جانتا، اس شخص نے شکوہ کیا کہ اگر آپ نہیں جانتے تو پھر اس مسئلے کو کون جانے گا فرمایا اسے وہ جانے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اس کا علم دیا ہے، ملائکہ کہتے ہیں: لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔علم کے کوہ گراں کی عاجزی کا اندازہ کیجیے۔

امام مالکؒ سے اڑتالیس مسئلے پوچھے گئے جن میں سے تیس کے جواب میں آپ نے فرمایا: لا ادری [میں نہیں جانتا]۔خالد بن خداش سے روایت ہے کہ انھوں نے بتایا میں چالیس مسائل پوچھنے کے لیے عراق سے امام مالک کے پاس آیا اور ان سے پوچھا تو صرف پانچ کے جوابات آپ نے دیے۔امام

مالکؒ اس راز کو جانتے تھے کہ جب عالم لا ادری نہ کہنے کی غلطی کرے تو وہ ہلاکت کی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ امام مالکؒ سے روایت ہے ان سے عبداللہ بن یزید بن ہرمزؒ نے روایت کی کہ عالم کو چاہیے کہ اپنے ہم نشینوں کو لا ادری سکھائے تاکہ ان کے ہاتھ میں ایک ایسی اصل اور ٹھکانہ ہو جہاں وہ پناہ لیں، اور ان سے جب کوئی ایسی بات پوچھی جائے، جسے وہ نہیں جانتے تو لا ادری کہہ دیں۔ حضرت ابو درداءؓ سے صحیح روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا لا ادری [میں نہیں جانتا] کہنا نصف علم ہے۔ اسی لیے امام غزالیؒ نے مناظرے کی مذمت کی ہے اور اس کے لیے کڑی شرائط رکھی ہیں کیونکہ مناظرے کا مروّجہ ماحول اور اسلوب، الا ماشاءاللہ، لا ادری کہنے کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے یہ حق کے دروازے بند کرنے کا راستہ ہے۔

عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ اس مسجد [مسجد نبوی] میں ایک سو بیس صحابہ کو میں نے پایا کہ ان سے کسی حدیث یا فتوے کے بارے میں پوچھا جاتا تو ان کی خواہش و کوشش ہوتی کہ کوئی دوسرا بھائی ہی اسے بتائے اور بالفاظ دیگر کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ دوسرے کے پاس بھیجتے اور وہ کسی دوسرے کے پاس۔ اس طرح سائل گھومتے ہوئے پھر اس شخص کے پاس پہنچ جاتا جس سے پہلی مرتبہ اس نے سوال کیا تھا۔[1]

[۲] اگر سائل صرف تنقید کے لیے بغیر علم کے سوال کر رہا ہے یا مقصود دین یا دینی روایت کی تحقیر، تضحیک اور توہین ہے یا اپنے علم کا غرہ، تو ایسے سائل کا براہ راست جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا جائے کہ آپ سائل ہیں یا ناقد؟ آپ استفسار کرنے آئے ہیں یا اعتراض وارد کرنے؟ مقصود حصول علم ہے یا مباحثہ؟ اگر سائل ہو تو سوال کے آداب سیکھ لو اور اس کے بعد سوال کرو، اگر معترض اور ناقد ہو تو تمھیں علوم دینیہ پر عبور ہونا چاہیے تاکہ اصولوں کی بنیاد پر اعتراض وارد کر سکو اور ہمارے سوالات کے جواب دے سکو۔ مثلاً ایک ناقد نے سوال کیا کہ قرآن میں شرابی کے لیے کوڑوں کی سزا بیان نہیں ہوئی لہٰذا میں فقہا کی سزا کو نہیں مانتا کیونکہ اصل ماخذ تو قرآن ہے؟ ایسے ناقد سے پوچھا جائے کہ آپ قرآن کو عربی میں سمجھ سکتے ہیں؟ چند آیات پڑھ کر اس کا امتحان لے لیا جائے کیا آپ نے تمام قرآن پڑھ لیا ہے؟ علم تفسیر حاصل کر لیا ہے؟ قرآن سے اخذ احکام کے اصول پڑھے ہیں؟ کن کن تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے؟ اور عربی، انگریزی اور اردو میں کون سی تفاسیر اور احادیث کے مجموعے پڑھے ہیں؟ اس سے عربی قواعد کے کچھ اصول ماضی اور مضارع کی گردان وغیرہ پوچھ لی جائے۔ پھر پوچھا جائے کہ ایمان آپ نے کس ذریعے سے حاصل کیا کہ اصل ماخذ قرآن ہے سنت نہیں؟ اس ماخذ پر نقد و جرح کیجیے پھر اس سے اصول بحث طے کر لیجیے کہ احکامات و قوانین کا ماخذ محض قرآن ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا ماخذ نہیں تاکہ اسے ایک ہی موقف پر رکھ کر گفتگو کی جائے، اس سے پوچھا جائے کہ قرآن کو ماخذ کس کی سند پر مانا گیا ہے؟ کیا قرآن کے کلام اللہ ہونے کی شہادت خود اللہ نے تمھیں دی ہے یا یہ تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

[1] اتحاف السادۃ المتقین، جلد ا صفحات ۲۷۹-۲۸۰۔

ذریعے پہنچی ہے؟ تو پہلے تم رسول اللہ پر ایمان لائے تھے یا قرآن پر؟ تو رسول پر ایمان مقدم ہے یا قرآن پر؟ اس تقدیم و تاخیر کا حکم کس نے دیا ہے اللہ تعالیٰ نے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے تو اختلاف میں حکم کون ہوگا رسول اللہ یا کلام اللہ؟ یا دونوں؟ یا کلام اللہ بذریعہ رسول اللہ؟ اس کے بعد وہ تمام احکامات پوچھ لیے جائیں جو قرآن میں درج نہیں ہیں لیکن پوری امت کا جن پر اجماع ہے مثلاً اذان، نماز جنازہ، عورت کے ایام حیض میں روزوں کی قضاء وغیرہ وغیرہ۔

ایک سائل نہایت بدتمیزی سے ایک عالم پر حملہ آور ہوا، عالم نے اس کے اعتراضات، ہجو، بدتمیزی کے جواب میں کمال تحمل سے پوچھا آپ سائل ہیں یا واعظ یا ناقد؟ کہنے لگا اس کا کیا مطلب؟ انھوں نے کہا آپ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟ یا مجھے کچھ بتانا چاہتے ہیں یا سنانا چاہتے ہیں یا تنقید کرنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا پوچھنا چاہتا ہوں، فرمایا اگر سائل ہو تو پہلے سوال کرنے کا ادب سیکھو! اس نے کہا میں ناقد ہوں کہا تو اعتراض کرنے کے لیے علم چاہیے، آپ کے اعتراض اسلام پر ہیں لہٰذا یہ بتایئے کہ کیا آپ نے دینی علوم سیکھے ہیں؟ کیونکہ اعتراض کے لیے علم ضروری ہے اور تقلید کے لیے جذبۂ اطاعت اور اپنے جہل کا ادراک اور اعتراف ــــ کہنے لگا میں دینی علوم سے واقف ہوں عالم نے چند سوال پوچھے جواب نہ دے سکا، انھوں نے کہا اچھا آپ اردو تو یقیناً جانتے ہوں گے کہنے لگا ظاہر ہے میں اردو بول رہا ہوں ویسے میں بہت عمدہ اردو جانتا ہوں کہا اگر تم اردو میں مہارت رکھتے ہو تو ہم تم سے بات کریں گے اور تمھارے اعتراضات ضرور سنیں گے کیونکہ زبان کا علم اہم ہوتا ہے اور زبان اظہار علم کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے، کہنے لگا میرے ہمیشہ اردو میں اسّی نمبر آئے ہیں عالم نے کہا ــــ اردو الفاظ میں زیر زبر کا فرق بتا سکتے ہو؟ کہنے لگا ہاں! اسے شعر لکھ کر دیا کہ زیر زبر لگا دو یا صحیح تلفظ سے شعر پڑھ دو:

گئے چارِ سَن ترا کم تھا سِن کہ لیے تھے سُن ترے گھونگرو
ہوا سینہ چھَن گیا دل بھی چھِن جو نہی بولے چھُن ترے گھونگھرو

وہ زیر زبر کا فرق تلفظ سے ادا نہ کر سکا، عالم نے کہا اچھا لفظ تلفظ کو صحیح مخارج سے ادا کرو، وہ اس پر بھی قادر نہ تھا اس نے تل الگ کہا اور فظ الگ تشدید بھول گیا۔

عالم نے کہا بیٹے نہ علوم اسلامی جانتے ہو، نہ اردو جانتے ہو، نہ علم سے تعلق ہے اور تنقید ایسے کرتے ہو جیسے سب علوم سے واقف ہو یعنی بحر العلوم ہو۔ تم سے کیا بات کی جائے، سائل نے کہا آپ کچھ اور پوچھ لیں انشاء اللہ صحیح جواب دوں گا انھوں نے کہا اچھا مختلف الفاظ کا فرق بتاؤ جو بہ ظاہر ایک جیسے لگتے ہیں آواز میں بھی تلفظ میں بھی اور ایسے الفاظ جن کی آواز یکساں ہے یعنی سننے میں ایک جیسے لیکن تحریر میں الگ ہیں مثلاً بَر، بِر، بُر کا فرق بتا سکتے ہو؟ ــــ باز اور بعض، باد اور بعد، معاش اور ماش، خال اور خال، جال اور جعل، لعل اور لال، ابر اور عبر، مہر اور مُہر، بحر اور بہر، سحر اور سحّر، سطر اور ستر، خطرہ اور قطرہ، آج آنا اور آجانا، آم اور عام، بام اور بام، دام اور ردام، نام اور نعم، حمل اور حمل، طور اور طُور، بیر اور بِیر، پیر پَیر

اور پیر، سیر سیَر اور سَیر اور سِیر، تیر اور تِیر، درّ اور دُر، گر گُر اور گَر، چَر چُر اور چِر، سَر سِر اور سُر، تہ اور تے، ماہ اور ماہ، بار اور بار، نال اور نعل، زیر زبر پیش کے ساتھ بال بُعل اور بال، رم اور رَم، مرثیہ اور ہریسہ، حال اور ہال، ڈال اور ڈال، دِل دَل، مِل مَل، مت ومت، لُعاب اور لعب، بَن بِن بُن اور بن، دھن اور دُھن، گھن، گھُن اور گھَن، بھن اور بھَن، بین، بَین، بیّن اور بین، خط اور قط، قِسط اور قسط، جست منشور اور منثور، جُوں اور جوں، جون اور جُون، گو اور گُو، کَل کَل، کَل گُل، کَلی کُلی گُلی، دَم دُم، بم بم، تار اور تار محَل اور مِحل، لو اور لَو، لُو، کے اور کے، آر اور عار، ظن اور زن، بیت بیت اور بیعت۔ میت، معیت اور میّت، سَت اور سُت، بَد اور بِد، بس بِس، تاخت اور تخت، غَل اور غُل، رجس اور رجز، گن اور گُن، تن اور تُند، تان اور طعن، کن اور کُن، لعان اور لعن، جام اور جام، مطلع اور مُطلّع، مقطّع اور مُقطع، جہل اور جُہل، عاصم اور آثم، ٹال اور ٹال، گُل گَل اور گَل، تَل تِل، اور تُل، بَل اور بِل، بلا، بِلا، بلّا، بَلّا، گھوٹ اور گھونٹ، اوٹ اور اونٹ، گش اور گُش، جَل اور جُل، دم اور دُم، کل گُل اور، دیر اور دیر، ٹھر اور ٹھر، مَیل مِیل اور میل، ہول ہول، اَب اور اب، بیَل بِیل، بانٹ، باٹ، ڈاٹ اور ڈانٹ، کَٹ اور کِٹ اور کُٹ، شیر اور شیر، ذم اور ضم، چین اور چَین، انس اور اُنس، چخ اور چق، شکر اور شُکر، قسم اور خصم، صرف اور سرف، بست اور بسط، ملت اور ملط، ملک مُلک اور مَلک، تلک اور تلّک، کشت اور گشت، حُسین اور حسین، خلا اور خلع، عین اور عین، طلاء، تلا، تلا، تُلا اور تلّا، سِل اور مَل، قاصر اور خاسر، بسر اور بصر، نصر اور نثر، نخل اور نقل، قصر اور خسر، بطر اور بتر، عقل اور اقل، بط اور بت، شور اور شور، صر اور سر، عصر اور اثر، چہل اور چِہل، صم، سُم، سم، کانچ اور کانچ، اُتر اور عطر، بھیڑ اور بھیڑ، بھڑ اور بھڑ ——————

عالم نے اپنی گفتگو کا لب ولہجہ بالکل دھیما رکھتے ہوئے ناقد کی علمیت کی حقیقت چند سوالات میں واضح کر دی اس کی جہالت کو واضح کرنے کے بعد دلائل کی ضرورت ہی نہیں رہی، پھر اسے ہدایت کی چونکہ تمھیں ان امور کا علم نہیں لہٰذا تم ناقد نہیں بن سکتے، البتہ مقلد بن سکتے ہو کیونکہ جو نہیں جانتے وہ کسی جاننے والے سے پوچھ لیں اور پوچھ کر اہل علم کی تقلید کریں، دنیا میں یہی طریقہ ہے اگر نقد کرنے کا شوق و ذوق ہے تو اس کے لیے دینی علوم کی تحصیل کیجیے پھر مباحثے کے لیے تشریف لائیے۔

[۴] اسی طرح ایک ناقد اور معترض نے سوال کیا کہ کیا خدا کوئی ایسا پتھر بنا سکتا ہے جسے خود نہ اٹھا سکے؟ اگر سوال کا جواب ہاں میں ہو تب اگر نفی میں ہو تب خدا کی شان ان اللہ علی کل شئی قدیر کو زک پہنچانا مقصود تھا، عالم نے سائل سے پوچھا کیا تم خدا کو مانتے ہو؟ اس نے کہا ہاں؟ پوچھا خدا کو تم نے کس ذریعے سے پہچانا؟ اور کس ذریعے سے مانا؟ اس نے کہا دین اسلام کے ذریعے؟ پوچھا تم دین اسلام کو مانتے ہو؟ اس نے کہا ہاں، پوچھا کتنے فی صد مانتے ہو؟ اور کیوں مانتے ہو؟ اور کس کے کہنے سے مانتے ہو؟ کہنے لگا سو فی صد مانتا ہوں، انھوں نے پوچھا اگر سو فی صد مانتے ہو تو یہ بتاؤ کہ ذات وصفات خداوندی میں تدبر و تفکر کی حدود تمھارے دین نے کیا متعین کی ہیں؟ اس نے کہا میں نہیں جانتا تو کہا پہلے

ان حدود کو جان لو پھر سوال کرنا۔ چند روز کے وقفے کے بعد اس نے رابطہ کیا اور عرض کیا کہ میں خدا کو نہیں مانتا سوال کے لیے سنجیدگی، لگن اور تڑپ شرط لازم ہے عالم نے جواب دیا جب تم خدا کو ہی نہیں مانتے تو تمھارا سوال محض ذہنی مشق ہے اور دین ذہنی ورزش کے لیے نہیں آیا لہٰذا سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس قسم کے سوال عموماً منطق اور ذہنی مشقت کے ذریعے گھڑ لیے جاتے ہیں۔ جو لوگ بہ ظاہر خدا کا انکار کرتے ہیں اصلاً خدا کے منکر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں سے بحث و مباحثے کے بجائے محبت کا رویہ اختیار کیا جانا چاہیے، ایسے افراد کے ساتھ دلائل کے بجائے اخلاق کے اعلیٰ ترین رویے سے پیش آنا ضروری ہے، ان کے اندر موجود خیر کو ابھارنا ضروری ہے، نہ کہ بحث حجت کر کے ان کے قلب میں موجود کفر کی کونپل کو تناور درخت میں تبدیل کر دیا جائے۔ ایسے لوگوں سے دلیل، حجت بازی اور قیل و قال میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے، ممکن ہے وہ اپنے کفر میں اتنا آگے بڑھ جائیں کہ دین سے منحرف ہونے کا اعلان کر دیں ایسے لوگوں کی خاطر داری اور تالیف قلب کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا چاہیے، یہ وہ لوگ ہیں جو دلائل کی تلوار سے نہیں محبت کی یلغار سے گھائل ہوتے ہیں۔ انھیں خبر کی نہیں نظر کی ضرورت ہے، ان کے ذہن اور دماغ کو نہیں قلب کو پکارنے اور ان کے دروازۂ دل پر دستک دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے افراد کو نہایت تعظیم، اکرام اور خاطر تواضع کے بعد کبھی رات کے وقت سیر کراتے ہوئے قبرستان تک لے جایئے اس وادیٔ خاموش میں پہنچ کر بڑے بڑوں کا دل دہل کر نرم ہو جاتا ہے اور خدا یاد آ جاتا ہے:

کہنے کو زندگی تھی بہت مختصر مگر
کچھ یوں بسر ہوئی کہ خدا یاد آ گیا

ملحدین اور دین بے زار لوگوں سے بحث و مباحثے کے بجائے یہ رویہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، کسی بات کو کسی پر مسلط کرنا یا مرعوب و مغلوب کرنا یا عاجز و قاصر کر دینا کمال نہیں ہے، فرد کو لاجواب کرنے اور اس کے ذہن کو معطل کرنے کے بجائے اس کے قلب کو فتح کرنے کی حکمت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے، مناظرانہ دلیل سے فرد خاموش اور مغلوب ہو سکتا ہے مگر متاثر و مفتوح نہیں۔ دلیل کا مقصد شکست دینا نہیں قلب میں جذبۂ قبولیت پیدا کرنا ہے، قلب کو بدلنا اصل ہدف ہونا چاہیے۔ اس کے لیے امام مالکؒ جیسے تحمل، صبر، حوصلے اور عمل کی ضرورت ہے۔ امام مالک نے حدیث و افتاء کی بیش بہا خدمت کی اور مؤطا جیسی گرانقدر کتاب تالیف فرمائی، جس میں اہل حجاز کی قوی احادیث اور مستند اقوال صحابہ و فتاوی تابعین جمع کر دیے اور اس کے بہترین فقہی ابواب قائم کیے۔ مؤطا آپ کی چالیس سالہ جاں فشانیوں کا ثمرہ ہے۔ اسلام میں حدیث و فقہ کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ ستر معاصر علمائے حجاز نے بھی اس کی تائید و موافقت فرمائی۔ اس کے باوجود خلیفہ منصور نے جب اس کے چند نسخے کرا کے دوسرے شہروں اور ملکوں میں بھیجنے کا ارادہ کیا تاکہ لوگ اس فقہ پر عمل کریں اور پیدا شدہ اختلافات ختم ہو

جائیں تو سب سے پہلے آپ نے اس خیال کی مخالفت کی اور فرمایا ـــــ امیر المومنین! آپ ایسا نہ کریں۔ لوگوں تک بہت سی باتیں اور احادیث وروایات پہنچ چکی ہیں اور ہر جگہ کے لوگ ان میں سے کچھ کو اپنا چکے ہیں جس سے خود ہی اختلاف رونما ہو چکا ہے اور اب اس اقدام سے مزید اختلافات پیدا ہو جائیں گے، اس لیے انھوں نے اپنے لیے جو اختیار کر لیا ہے اسی پر انھیں آپ چھوڑ دیں ـــــ خلیفہ منصور نے یہ سن کر کہا: ابوعبداللہ آپ کو اللہ اور توفیق بخشے۔

امام مالک ؒ کتنے جلیل القدر تھے جو بغیر رضامندی کے اس کتاب پر دعوتِ عمل کا اقدام بھی نہیں کرنے دیتے جس میں انھوں نے اپنی سنی ہوئی سب سے اچھی احادیث اور اپنا محفوظ و قوی علم منقل و محفوظ کر دیا تھا جس پر اہل مدینہ اور بہت سے معاصر علماء کا بھی اتفاق تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے موطا کو ریاستی سطح پر ریاست کے ذریعے رائج نہیں کیا اسی طرح گفتگو اور مناظرے میں اپنی رائے مسلط کرنے کی ضرورت نہیں۔

[۵] ایک سائل نے ایک عالم سے پوچھا ''جو شخص بحالت احرام شکار کرے اس کے بارے میں آپ کا کیا فتویٰ ہے؟'' [شرعاً حج ادا کرنے والے شخص کے لیے شکار کھیلنا منع ہے] اس نیک سیرت اور صاحب عمل عالم نے جواب دیا: ''آپ کا سوال مبہم اور گمراہ کن ہے، آپ کو بالصراحت بتانا چاہیے تھا کہ آیا اس شخص نے خانہ کعبہ کی حدود میں شکار کیا یا اس سے باہر کیا؟ آیا وہ پڑھا لکھا تھا یا اَن پڑھ تھا؟ آیا وہ غلام تھا یا آزاد تھا؟ آیا وہ بالغ تھا یا نابالغ تھا؟ آیا اس نے یہ فعل پہلی دفعہ کیا یا پہلے بھی اس کا ارتکاب کر چکا تھا؟ آیا اس نے کسی پرندے کا یا کسی اور جاندار کا شکار کیا؟ آیا جس جاندار کا شکار کیا گیا وہ بڑا تھا یا چھوٹا تھا؟ آیا اس شخص نے دن میں شکار کیا یا رات میں کیا؟ آیا اس نے اپنے فعل سے توبہ کر لی یا اس کے ارتکاب پر بضد رہا؟ آیا اس نے چھپ چھپا کر شکار کیا یا کھلم کھلا کیا؟ اور آیا اس نے احرام عمرے کے لیے باندھا تھا یا حج کے لیے باندھا تھا؟ جب تک ان تمام امور کی وضاحت نہ کی جائے اس سوال کا کوئی جواب دینا ممکن نہیں''۔ ہر سوال کا جواب دینے کے بجائے علماء کرام سائل سے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیں تو بہت سے جہلاء سوال کی جرات سے محروم ہو جائیں گے اور ان کا جہل واضح ہو جائیگا، جو اپنی چرب زبانی اور طلاقت لسانی سے علماء کو جاہل ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دینی سوالات کا جواب دینے اور پرچون کی پڑیا باندھنے میں بہت فرق ہے، عالم آن لائن [ALIM on Line] جیسے پروگرام میں ''علماء'' کی عجلت بتاتی ہے کہ وہ گاہک کو اپنی دکان سے خالی ہاتھ نہ جانے دیں گے اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی پڑیا تھما دیں گے یہی حال عصر حاضر میں ہونے والے ہمارے مکالموں، مناظروں مباحثوں اور ٹاک شوز کا ہے۔

عقلی بنیادوں پر موشگافیاں اور سوالات اٹھاتے رہنا کوئی کمال نہیں قرآن حکیم میں کفار کے ایسے سوالات موجود ہیں جو سننے والے کو پہلی مرتبہ متاثر کرتے ہیں مگر غور کرنے پر سوال کرنے والے کی خباثت نفس اور دنائت واضح ہو جاتی ہے مثلاً کفار مشرکین اور یہود کا قرآن کے اس اصرار پر کہ بھوکوں کو

کھانا کھلاؤ اور اگر نہ کھلاؤ تو کم از کم دوسروں کو کھانا کھلانے کی ترغیب تو دو۔ ان کا مشترکہ جواب، دوسرے معنوں میں استفہامیہ جواب، یہ تھا کہ اگر خدا چاہتا تو بھوکوں کو خود کھلا دیتا: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ [۳:۱۸۱] کہتے ہیں اللہ فقیر ہے ہم غنی ہیں۔ جن کو خدا خود دنیا میں بھوکا رکھنا چاہے ان کو کھانا کھلانے کے لیے ہم سے اصرار کیوں؟ کیا خدا کے خزانے میں کسی شے کی کمی ہے؟ اس طرح کفار مردار کھانا چاہتے تھے انھیں دکھ ہوتا تھا کہ جانور مر گیا اور مال ضائع ہو گیا اس مرے ہوئے کو کیوں نہ کھایا جائے اس خواہش کے لیے انھوں نے عقلی سوال تراشا جسے انسان ذبح اور قتل کردے مار دے وہ حلال اور جسے خدا خود مار دے وہ حرام یہ تو بڑی عجیب بات ہے! ارسطو کہتا ہے کہ میں اس طرف جاؤں گا جدھر مجھے دلیل لے جائے گی لیکن یہ احمقانہ بات ہے ایک بندۂ مومن اس طرف جاتا ہے جدھر اس کا خدا لے جانا چاہتا ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ میری عقل کی کیا مرضی ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی مرضی کیا ہے؟ اس کا حکم کیا ہے؟ اس کی منشاء کیا ہے؟ اس کی رضا کیا ہے؟ وہ جو چاہے گا وہ ہوگا جدھر وہ لے جائے گا ادھر ہم جائیں گے یعنی اگر عقل اللہ تعالیٰ کی رضا کو عقلی طور پر تسلیم نہ کرے یا رضائے الٰہی کی پیروی سے انکار کردے تو وہ عقل نہیں جہل ہے۔ تقلید رضائے الٰہی کے بغیر عقل بے کار ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ عقل پیمانہ ہے یا عقل کو پرکھنے جانچنے اور دیکھنے کا بھی کوئی پیمانہ ہے؟ یہ پیمانہ نفس کے اندر یعنی عقل ہی سے نکلتا ہے یا باہر، خارجی دنیا سے آتا ہے؟ یہ ہے مسئلے کی اصل کنجی۔ دنیا کی سترہ تہذیبوں میں پیمانہ ہمیشہ باہر سے آتا تھا۔ ہر قدر، معیار اور اصول کسی بیرونی پیمانے پر جانچا جاتا تھا اور یہ پیمانہ یا روایت تھی، یا وحی الٰہی، یا دیومالا یا اساطیر، ہر تہذیب میں عقل بھی ہوتی تھی، عدل بھی ہوتا تھا، مگر عقل اور عدل خود پیمانہ نہیں ہوتے تھے انھیں کسی اور پیمانے پر جانچا اور پرکھا جاتا تھا۔ عقل اور عدل بذاتہٖ حق، معیار اور اصول نہیں ہیں ان کو دیکھنے، پرکھنے جانچنے کا پیمانہ ان کے اندر نہیں ان کے باہر ہوتا ہے۔ یہ پیمانہ اس تہذیب یا مذہب کی علمیات، ایمانیات اور مابعد الطبیعیات سے نکلتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے خوارج، اہل تشیع، معتزلہ، اہل قرآن، اور عقلیین سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ وہ عقل اور عدل کی اصطلاحات کو ہی پیمانۂ حق وصداقت سمجھ بیٹھے اور اس بنیاد پر عہد حاضر میں اہل قرآن نے سورۃ بنی اسرائیل کے احکام عشرہ کی روشنی میں عالمی متفقہ اخلاقیات کا منشور خود تخلیق فرما لیا اور یہ تصور کرلیا کہ پوری دنیا احکام عشرہ سے متفق ہے۔ انھیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ دنیا احکام عشرہ پر نہیں بنیادی حقوق کے منشور [Human Right Declaration] پر جبراً متفق کی گئی ہے۔ حق خیر اور سچائی کی واحد مسلط کردہ دستاویز صرف اور صرف یہی منشور ہے۔ اس منشور کے ہوتے ہوئے احکام عشرہ کی اخلاقیات کا روبہ عمل ہونا محال ہو جاتا ہے۔ تین سو سال کی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ عقل مند کون ہے؟ یہ بات عقل بتائے گی یا کوئی خارجی بیرونی ذریعۂ علم [external knowledge]، مثلاً ارسطو کو دنیا نے

معلم اول تسلیم کیا ہے۔ تو ارسطو کے عقل مند ہونے کا فیصلہ عقل انسانی کرے گی یا کوئی الہامی متن کرے گا؟ یہ ممکن ہے کہ عقل اگر تاریخ، تہذیب، خواہشات، خدشات اور زمان و مکان سے ماورا ہو کر معروضی طور پر کام کرے تو وہ کسی صداقت، خیر اور حق کو پالے لیکن اس بات کی تصدیق کون کرے گا کہ عقل نے جس صداقت، خیر اور حق کو پالیا ہے وہ ٹھیک ہے، اگر اس معروضی عقل کو انسان کی عقل یا اس کے نفس کے سپرد کر دیا گیا تو یہ عقل پھر معروضی نہیں موضوعی ہو جائے گی اور اس کے پرکھنے جانچنے کا پیمانہ خود عقل و نفس ہی ہوں گے لہٰذا غلط ہی ہوں گے مشرکین مکہ اور اہل کتاب نے عقل مشاہدے اور تجربے کے ذریعے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں مگر ان کا اعتراض صرف یہ تھا کہ قرآن مکہ کے دو بڑے آدمیوں پر کیوں نازل نہ ہوا، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول کیوں ہوا؟ اہل کتاب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں قبلۂ اول کعبہ کو بھی کفار اپنے بیٹے کی طرح پہچانتے تھے لیکن ان کے قلب نے عقل کے فیصلے کو قبول نہ کیا، تعقل قلبی سے وہ محروم رہے۔ عقل ہر تاریخ، تہذیب، مذہب، معاشرت میں ہوتی ہے لیکن وہ اپنے منہاج کے مطابق عمل کرتی ہے اور اس منہاج علم میں اس عقل کا ہر فیصلہ عقلی معلوم ہوتا ہے، منہاج علم بدل جانے سے وہی عقلی فیصلہ دوسرے منہاج علم میں جہالت قرار پاتا ہے۔ یورپ و امریکہ میں اگر کوئی عورت بے لباس یا برائے نام لباس میں مردوں کی محفل میں آجائے تو وہاں کی عقلیت کے لیے یہ معمول کی بات ہوگی، عقل کا تقاضا ہوگی کیونکہ مغرب کی عقل اپنی علمیت، آزادی اور مساوات کے عطر سے کشید کرتی ہے لہٰذا مساوات و آزادی کا عقلی تقاضہ یہی ہے۔ اس کے برعکس عالم اسلام یا روایتی دینی تہذیبوں میں کوئی عورت اس لباس میں آجائے تو وہ ذلت و رسوائی اور لعنت و ملامت کی حق دار ٹھہرے گی، اس کا معاشرتی مقاطعہ ہوگا ان تہذیبوں کا خبیث سے خبیث آدمی بھی اس رویے کی حمایت نہیں کرے گا کیونکہ ان روایتی معاشروں اور مذہبی تہذیبوں میں آزادی اور مساوات قدر بذاتہ معیار نہیں ہیں معیار اور قدر وحی الٰہی یا تاریخی روایات، اساطیر اور دیو مالا ہیں لہٰذا اس خارجی ذریعۂ علم اور منہاج کی روشنی میں یہ رویہ خدا کی مرضی کے خلاف ہے لہٰذا خالص غیر عقلی رویہ ہے جسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کو آزادی اس بات کی دی گئی ہے کہ وہ خدا کی اطاعت کرے ان تہذیبوں میں کپڑے پہننے کی آزادی ہے کپڑے اتارنے کی آزادی نہیں ہے۔ کپڑا کتنا پہنا جائے؟ ستر کہاں سے کہاں تک ہو؟ یہ تہذیبیں اپنی علمیت سے اصول اخذ کر کے ستر کا تعین کرتی ہیں جب بھی اخلاقیات کی سرحدیں شروع ہوں گی آزادی کی حدود متعین ہو جائے گی، وہ ایک خاص پیمانے، جامے اور حصار میں سمٹ جائے گی، اسے بے کراں، بے پناہ، اصول، قدر، حق کے طور پر قبول نہیں کیا جائے گا۔ وہ کسی اصول حق قدر سے متعین ہوگی اس کے تابع ہوگی اس کی روشنی میں قبول اور رد کی جائے گی۔ مغرب کی عقلیت اور منہاج علم میں لذت کا تصور آزادی میں مسلسل اضافے سے مشروط ہے جس کا انحصار زیادہ سے زیادہ سرمایے کی فراہمی پر ہے۔ جس کے پاس

زیادہ سرمایہ ہے وہ زیادہ آزاد ہے کیونکہ وہ زیادہ مادی لذت حاصل کرسکتا ہے، انسان مغربی معاشیات اور فلسفے میں ایک لذت پرست جانور ہے، اس کا مقصد مسلسل اور مستقل لذتوں میں اضافہ کرتے رہنا ہے لہٰذا لذتوں کی خاطر مرد وعورت جنسی اعمال میں مصروف ہوتے ہیں مگر نکاح نہیں کرتے خاندان نہیں بناتے، بچے نہیں پیدا کرتے، اولاد اور ماں باپ کو ساتھ نہیں رکھتے کہ یہ سب چیزیں انسانی لذتوں میں اضافہ نہیں ہونے دیتیں، کمی کر دیتی ہیں اور مسلسل ذمہ داریوں میں اضافہ کرتی ہیں۔ عورت اگر بچہ پیدا کرے تو درد زہ برداشت کرنا پڑے گا، بوائے فرینڈز، آوارگی، سیاحت سب ترک کرنا ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے لہٰذا مغرب میں عدل اور عقل کا تقاضا لذت کا یہی تصور ہے ان کا تصور عدل وعقل لذت پرستی سے نکلتا ہے، اس کے برعکس روایتی تہذیبوں اور مذہبی معاشروں میں عدل اور عقل کا تقاضہ لذت سے نہیں حقیقت [Reality] سے متعین ہوتا ہے، یعنی علمیت مابعد الطبیعیات اور تصورات حقیقت سے برآمد ہوتی ہے، یہ تصورات ہی عقل اور عدل کا دائرہ طے کرتے ہیں، ان تہذیبوں میں زندگی اطاعت وعبادت رب سے عبارت تھی اسے روحانی لذت نفس مطمئنہ کہا جاسکتا ہے۔ ماں باپ کی خدمت اولاد کو پالنا، بچے پیدا کرنا، بچوں کی پرورش ونگہداشت عورت کے لیے آزار، مصیبت، آفت، شامت اعمال، ہلاکت اور بربادی نہیں ایک دینی فریضہ ایک غیر معمولی ذمہ داری، ایک روحانی اور نورانی کام اور نفس مطمئنہ کے حصول کے مختلف ذرائع ہیں۔ یہ مغرب اور روایتی مذہبی تہذیبوں کی عقلیت اور عدل کے تصورات کا وہ نتیجہ ہے جو دو مختلف مابعد الطبیعیات سے برآمد ہوتی ہیں۔

اسلامی تہذیب وتاریخ کے تصور عقل وتصور عدل کے تحت مرد کا ایک سے زیادہ شادی کرنا، جائز کام ہے لیکن عیسائیت اور امریکہ اور یورپ کے تصور عدل وتصور عقل میں ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ مغرب میں عورت عورت سے مرد مرد سے شادی کرسکتے ہیں کیونکہ حقوق انسانی کے منشور [Human Right Declaration] کے تحت دونوں انسان [Human] آزاد [Free] برابر [Equal] ہیں اور اس منشور کی ایک شق [Right of Association] کے تحت کوئی جنس کسی بھی ہم جنس سے تعلق رکھ سکتا ہے لہٰذا مغرب کی عدالتوں میں ہم جنسوں کی شادیوں کو قانونی تحفظ دے دیا گیا ہے، جو اس فیصلے کو نہ مانے وہ غیر روادار [non tolerant] انسان تصور کیا جاتا ہے۔ عیسائیت چار شادیوں کی اجازت نہیں دیتی مغرب چار سو داشتاؤں سے بالرضا تعلقات رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا زنا بالرضا مغرب میں حلال ہے۔ مذہبی تہذیبوں میں حرام ہے کیونکہ زنا شرف انسانیت یعنی عبودیت کے خلاف کام ہے اور خدا کی رضا کے برعکس رویہ ہے لہٰذا عدل وعقل کا تقاضا یہ ہے کہ زانی کو سزا دی جائے، روایتی اور مذہبی تہذیبوں میں نکاح نہ کرنے پر کوئی سزا نہیں ہے اور کسی کی شادی جبراً نہیں کرائی جاتی لیکن کسی کو زنا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی خواہ وہ کنوارا ہو یا شادی شدہ ہو، ان تہذیبوں کے تصور عدل وعقل کے مطابق شادی کرنے کی اجازت ہے زنا کرنے کی اجازت کسی حالت

میں نہیں ہے۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں بالرضا زنا کی اجازت ہے اگر جبراً کوئی زنا کرے تو زانی کے خلاف کارروائی صرف اس وقت ہوگی جب مقدمہ درج ہوگا۔ یہ مقدمہ بھی فریقین میں قابل صلح ہے اگر فریقین راضی ہوں تو سزا نہیں ملے گی، مذہبی تہذیبوں میں خدا کی رضا کے خلاف جرم کا ارتکاب یعنی گناہ کبیرہ نا قابل معافی جرم تھا خدا کی سزا کوئی انسان معاف نہیں کر سکتا لیکن مغرب میں ریاست اس مقدمے میں فریق نہیں ہوگی یہ دو افراد کا ذاتی معاملہ ہے جب کہ مذہبی و روایتی معاشروں میں یہ مذہبی جرم ہے اور خدا کی رضا کے خلاف ہے۔ یہ تذلیل عبدیت ہے اور مالک الملک کی ناراضگی کو دعوت دینے کا عمل ہے لہٰذا ریاست خود اس میں مدعی ہوگی، مغرب میں تو اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کے نہ چاہنے کے باوجود اس سے مواصلت کرلے تو اسے سنگین جرم سمجھا جاتا ہے اور اس جرم [marital rape] کے مجرم یعنی عورت کے قانونی شوہر کو پانچ سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے، لیکن بالرضا زنا کوئی جرم نہیں یہ عمل مغرب کی تہذیب تاریخ و علمیت میں آزادی کی وسعتوں کو چھو لینے والا آسمان کا ایک نورانی ٹکڑا ہے۔ یہ مغرب کی رواداری [tolerance] ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے اس کی رضا کے خلاف اپنے نفس کے تقاضے کو پورا کرلے تو وہ مجرم ہے وہاں رواداری کا یہی مطلب ہے کیونکہ شوہر اور بیوی دو الگ وجود [separate entities] ہیں یہ فاعل خود مختار [self autonomus] ہیں لہٰذا دوسرے کی آزادی [Freedom] میں مداخلت جرم ہے کیونکہ مغرب میں آزادی اصل قدر اور حق [Real Value & Truth] ہے تمام اقدار [Values] اسی ایک قدر پر جانچی پرکھی، ناپی، تولی اور برتی جاتی ہے لہٰذا آزادی کی قدر [Value of Freedom] کو پامال کرنا مغرب میں سنگین جرم ہے۔ اسلامی تہذیب میں اصل قدر [Real Value] خدا کی رضا ہے [Will of the God]۔ خدا کی رضا، اس کی معرفت اور اس کی محبت کا حصول کیسے ممکن ہے؟ یہ علمیت اسلامی علمیات [Epistemology] بتاتی ہے جو سنت رسالت مآبؐ کے ذریعے امت تک منتقل ہوئی اور تعامل امت اور اجماع امت اس سنت کی حفاظت کرتا ہے لہٰذا اسلامی تہذیب اور مذہبی تہذیبوں میں انسان اپنی آزادی کو خدا کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس سے دستبردار ہو کر ارادۂ خداوندی کو اپنا ارادہ بنالیتا ہے۔ اب قدر، پیمانہ اور منہاج قرآن و سنت ہو جاتے ہیں اس قدر [Value] کے خلاف جہاں جہاں کوئی کام ہوگا وہاں وہاں آپ کو ہدایت اور سزا دی جا سکتی ہے۔ آپ کے نفس کے مطالبے آپ کی خواہشات خدا کی مرضی کے تابع ہوں گے اللہ تعالیٰ کی غلامی شرف انسانیت ہے۔ مغرب میں یہ تصور تذلیل انسانی ہے کہ اصل خدا انسان [Human] کسی اور خدا کے لیے دستبردار ہو جائے اور کسی خارجی ذریعے [external authority] کو علم، حق، خیر، ہدایت، روشنی اور رہنمائی کا ذریعہ تصور کرے۔ کانٹ کا اہم ترین مضمون What is Enlightenment? اس اجمال کی فلسفیانہ تفصیل مہیا کرتا ہے۔

اسلامی تصور عدل و عقل کے مطابق سات سال سے پہلے بچے پر نماز فرض نہیں، سات سال

کے بعد نماز نہ پڑھنے پر بچے کو سزا دی جا سکتی ہے لیکن مغرب میں بچے کے لیے سیکولر تعلیم فرض ہے اگر ماں باپ بچے کو اسکول نہ بھیجیں تو وہ جیل بھیجے جا سکتے ہیں۔ اسلام میں نشوز پر آمادہ عورت کو شوہر سزا دے سکتا ہے۔ مغرب میں اگر آپ نے اس اسلامی حکم پر عمل کیا تو جیل میں ہوں گے۔ شوہر سے سرکشی، بغاوت، گھر کے سکون اور نظم و نسق میں خلل پیدا کرنا مغرب کے فلسفے میں کوئی جرم نہیں۔ اگر آپ نے اپنے بچے پر نماز پڑھنے کے لیے سختی کی تو دوسرے کی آزادی میں مداخلت کے جرم میں آپ کو سزا بھگتنا ہوگی، اگر آپ نے اپنی بیٹی کے کسی نامحرم لڑکے کے ساتھ جانے اور گھومنے کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کی تو آپ کی آزادی اسی لمحے سلب کر لی جائے گی۔ اگر بچے پر آپ نے غلطی سے ہاتھ اٹھا لیا تو آپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔ یہ مثالیں اس لیے دی گئی ہیں کہ ہمارے اہل قرآن دوست جان لیں کہ عقل اور عدل خود معیار [Standard]، حق [Truth]، اصول [Principle]، منہاج [Paradigm] پیمانہ [Parameter] قدر [Value] خیر [good] کسوٹی اور میزان نہیں ہیں یہ کسی اور معیار پر پرکھے جاتے ہیں، مغرب میں اس کا معیار بنیادی انسانی حقوق کا منشور، عیسائیت میں انجیل اور عالم اسلام میں قرآن حکیم وسنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے ان تین مختلف مابعد الطبیعیات اور علوم ذرائع علم سے تین مختلف قسم کے تصور عدل و عقل برآمد ہوتے ہیں اور تینوں کے نتائج، طریقے، ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

جدیدیت ماڈرن ازم کا فیصلہ ہے کہ جدیدیت پسند، ماڈرن مین، Enlightened آدمی وہ ہے جو کسی خارجی ذریعۂ علم پر بھروسا نہیں کرتا اپنے نفس اور عقل کو ذریعہ علم سمجھتا ہے اپنے سے باہر ہر ذریعۂ علم کا انکار کرتا ہے خواہ وہ وحی ہو، روایت ہو، اساطیر یا تاریخی آثار ہوں، یہ جدیدیت پسند انسان کی خاص علامات ہیں۔ اسی لیے جدیدیت کا خاص وصف ماضی کا انکار تاریخ کا استرداد، ایک نئی دنیا اور نئے انسان کی تخلیق کا دعویٰ ہے جو سترہویں صدی سے پہلے دنیا کے کسی معاشرے کسی تاریخ، کسی تہذیب اور کسی مذہب میں وجود نہیں رکھتا تھا۔ یعنی انسان [Self Autonomus Human Being] خلق جدید [Modern Man] اور جدیدیت [Modernity] تو اصلاً سترہویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں۔ کانٹ کے الفاظ میں:

Enlightenment is man's emergence from his self imposed immaturity. Immaturity is the inability to use one's understanding without guidance from another. This immaturity is self imposed lack of understanding.

اس مختصر عبارت میں کانٹ نے علم کے ہر خارجی ذریعے کا انکار کر کے علم کا سرچشمہ انسان کے اندرون کو قرار دیا ہے کہ پیمانۂ علم باہر نہیں انسان کے اندر ہے یعنی نفس، عقل، ذہن، وجدان، طبیعت

اور حواس خمسہ وغیرہ وغیرہ۔

دین کے احکامات عقل، لغت، وجدان، علم حسی، Hermeneutics، جدید علم تشریح و توجیہہ وتوضیح وتعبیر سے طے اور حل نہیں ہوتے، وہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح ہوتے اور صحابہ کرام کے ذریعے علمیت اسلامی کا حصہ بنتے اور امت کے تواتر اجماع اور تعامل سے طے پاتے ہیں، مثلاً سورہ نساء میں کلالہ کی میراث کا دو جگہ ذکر ہے ایک سورہ نساء کی ۱۲ ویں آیت میں اور دوسری جگہ سورہ نساء کی ۱۷۶ ویں آیت میں، پہلی جگہ ذکر ہے کہ اگر کلالہ کا بھائی یا بہن ہو تو ہر ایک کا حصہ چھٹا ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔

جب کہ سورہ نساء کی آخری آیت میں ذکر ہے کہ اگر کلالہ کی بہن ہو تو اس کو نصف ملے گا، اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو دو تہائی ملے گا اور اگر بہن بھائی دونوں ہوں تو مرد کو عورت کے مقابلے میں دگنا ملے گا۔

ان دونوں آیات میں پہلی جگہ بہن بھائی کا حصہ چھٹا، جب کہ دوسری جگہ بہن کا حصہ نصف ذکر کیا گیا ہے، اس میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت کوئی تعارض نہیں، کیونکہ پہلی جگہ اخیافی بہن بھائیوں کا ذکر ہے اور دوسری جگہ حقیقی بہن بھائیوں کا ذکر ہے۔ پہلی جگہ اخیافی کے بجائے حقیقی بہن بھائی مراد نہیں لیے سکتے ورنہ دونوں آیات میں تعارض لازم آئے گا۔

اور پہلی جگہ اخیافی [یعنی ماں شریک بہن بھائی] کے مراد ہونے کی دلیل صحابہ کرام کے اقوال اور اجماع امت ہے۔ صحابہ کرام کو یہ توضیح وتشریح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ملی ہے کیونکہ صاحب قرآن نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ ذمہ داری عائد فرمائی کہ وہ قرآن کی تعلیم، تشریح، توضیح اور تبیین فرمادیں: بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ [۱۶:۴۴] صحابہ کرام اس علم کے وارث تھے جو سنت رسول سے انھیں منتقل ہوا تھا اور یہی علم اجماع اور تعامل امت سے صبح محشر تک امت کو تواتر سے منتقل ہوتا رہے گا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے مروی ہے کہ ''ولہ اخ'' سے مراد ماں شریک بھائی ہے۔ بلکہ بعض حضرات نے نقل کیا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی قرأت ہی 'ولہ اخ من امہ'' تھی۔ تاہم یہ قرأت شاذہ ہے، قرأت متواترہ نہیں ہے، اور ہمارے پاس جو قرآن مجید موجود ہے یہ قرأت متواترہ پر مشتمل ہے، اس لیے شاذ قرأت کے الفاظ کو قرآن نہیں کہا جاسکتا البتہ وہ قرأت بطور تفسیر کے معتبر ہوتی ہے۔

''واضح رہے کہ اس آیت میں اخیافی [ماں شریک] بہن بھائی کا حصہ بتایا گیا ہے، اگرچہ قرآن کریم کی اس آیت میں یہ قید مذکور نہیں ہے لیکن یہ قید بالا جماع معتبر ہے۔

قرآن کریم کے احکام میں کوئی تعارض نہیں۔ پہلی جگہ اخیافی بہن بھائی مراد ہیں اور دوسری جگہ اخیافی کے علاوہ بہن بھائی مراد ہے، اور اس میں کوئی تعارض نہیں، ہاں اگر کوئی شخص یہ پہلی جگہ بھی غیر

اخیافی یعنی علاتی مراد لے تو تعارض لازم آئے گا۔

کلالہ کی تفسیر یہ کرنا کہ کلالہ وہ شخص ہے جس کی صرف اولاد نہ ہو اگرچہ باپ زندہ ہو، شاذ تفسیر ہے اور شاذ تفسیر پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اگر اس تفسیر کو لیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ باپ کی موجودگی میں میت کی بہن یا بھائی کو بھی حصہ ملے، حالانکہ یہ بات اجماع کے خلاف ہے، باپ کی موجودگی میں میت کے بہن بھائیوں کو بالا جماع حصہ نہیں ملتا۔ تفسیر البحر المحیط میں ہے: "واجمعت الامة علی ان الاخوة لا یرثون مع ابن ولا اب و علی هذا مضت الاعصار و الامصار"۔

اس دلیل کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آیات قرآنی کی ایسی تفسیر پیش کرنا جو خیر القرون، عہد صحابہ، تابعین، تبع تابعین، تواتر وتعامل امت، اجماع اور صلحائے امت کی بیان کردہ تفسیر اور طریقے سے صریحاً متصادم ہو تو ایسے تفرد کو امت کی علمیت معتبر تسلیم نہیں کرتی خواہ یہ تفرد کرنے والا کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا قرآن کی تفسیر صرف عقل، وجدان اور کشف کی بنیاد پر نہیں کی جا سکتی اس کی تفسیر نقل سے ہی ممکن ہے تفسیر جدید کے سلسلے میں مغربی علم تعبیر وتشریح سے مدد لینا اسلامی علمیت کے لیے ممکن ہی نہیں کیونکہ اسلامی علمیت اور اس سے متعلق تمام متون ایک خاص تاریخ وتہذیب اس علمیت کی شارح ہستی ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے تربیت یافتہ صحابہ کے فیضان، روایت، تواتر، تعامل اور اجماع کے ذریعے منتقل ہوئے ہیں، لہٰذا جدید فلسفیانہ علم تفسیر، تشریح وتعبیر کے اصول یہاں ہرگز قابل عمل نہیں ہیں۔ Hermenutic کا ترجمہ علم تفسیر کرنا غیر عاقلانہ رویہ ہے، علم تفسیر ایک خاص مابعد الطبیعیات اور خاص تاریخ وتہذیب سے نکلا ہے اس کو جانے بغیر مغرب کے ایجاد کردہ فلسفیانہ علم تشریح و تعبیر کی فنکاری کو اسلامی علمیت کے روایتی علم تفسیر کا مترادف سمجھنا نادانی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی جیسے سنجیدہ نقاد اپنی کتاب "تعبیر کی شرح" کے اہم ترین مضمون میں جو اسی نام سے کتاب کے آخر میں موجود ہے اسلامی علم تفسیر اور مغربی فن تشریح وتعبیر Hermeneutic میں یہ فرق ملحوظ رکھنے سے قاصر رہے کیونکہ وہ دینی وشرعی علوم اور مغربی علوم فلسفہ کی گہرائی سے واقف نہ تھے لہٰذا اسلامی علم تفسیر کا پورا ذخیرہ ان کے خیال میں تفردات کا شاہکار ہے جو بالکل غلط استدلال ہے۔

اگر عقلی بنیادوں پر ہر حکم خداوندی کا استدلال ہو تو پھر سوال یہ ہے کہ فجر کی نماز طلوع سحر سے پہلے کیوں بعد میں کیوں نہیں کہ اس وقت تک سب اٹھ جاتے ہیں، سب ہی نماز پڑھ لیں گے لہٰذا نماز کا وقت بدل دیا جائے۔ جو شخص اب نماز فجر نہیں پڑھ رہا کیا وہ نماز کا وقت آگے بڑھ جانے سے نماز پڑھ لے گا؟ جسے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل مقصود ہے وہ ہر حال میں تعمیل کرے گا احکامات کی مشروط تعمیل کرنے والا عبد نہیں معبود ہے۔ معبود کسی دوسرے معبود کی عبادت کیسے کر سکتا ہے؟ وہ سوال اٹھا سکتا ہے احرام میں سفید غیر سلے کپڑے کیوں کالے، ہرے اور سلے ہوئے کپڑے کیوں نہیں صاف بھی رہیں گے اور گندگی بھی نظر نہیں آئے گی لیکن بات یہ ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے ہمیں اسی طرح عمل

کر کے دکھایا ہے عقلی اعتراضات کی تو کوئی حد ہی نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمان اپنے ہاتھ سے بنایا ہے [۵۱:۴۷] بعض اور آیات میں یہی بات مختلف چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمائی کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنا ئیں اب معترض یہ سوال اٹھا دے کہ کیا اللہ تعالیٰ مادی وجود رکھتا ہے اس کے ہاتھ بھی ہیں اس نے آسمان اپنے ہاتھ سے خود کیوں بنایا؟ پوری کائنات اس کے اشارے پر چلتی ہے تو اس نے یہ شے بنانے کے لیے کسی کو حکم کیوں نہیں دیا؟

ایسے من گھڑت سوالوں کا جواب دیتے ہوئے نہایت دانائی اور باریک بینی کی ضرورت ہے، عصر حاضر میں نوجوان اس قسم کی علمی موشگافیاں کرنے میں بہت جری ہو گئے ہیں جس کا سبب ٹی وی کے ٹاک شوز ہیں جہاں جہلاء ایک منظم منصوبے کے تحت احمقانہ موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے ہیں اور نوجوانوں کے ذہنوں کو دانستہ مسموم کر کے ان میں عقلی موشگافیوں کا مزاج پیدا کرتے ہیں، ایسے نوجوانوں کو عمدہ مثالوں سے لاجواب کیا جا سکتا ہے۔ فتنۂ خلق قرآن کے سلسلے میں مامون کے دربار میں عبدالعزیزؒ الکنانی اور بشر المریسی کا مناظرہ ایک عمدہ مثال ہے۔ بشر نے پوچھا قرآن نے صدہا مقام پر اللہ تعالیٰ کو خـالق کـل شـيء کہا ہے یا نہیں؟ یعنی خدا ہر چیز کا خالق ہے کنانی نے جواب دیا وہی ہر شے کا خالق ہے۔ بشر نے پوچھا قرآن بھی شے ہے یا نہیں؟ شیخ کنانی نے کہا پہلے شے کی حقیقت سن لو پھر جواب مانگو۔ بشر نے کہا میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا میرے سوال کا جواب دو۔ مامون نے بھی غصے سے کہا سوال کا جواب ہاں یا ناں میں دو۔ شیخ نے کہا اچھا میں تسلیم کرتا ہوں قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے۔ مامون اور بشر نے کہا تو پھر قرآن مخلوق ہوا۔ نہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا شیخ کنانی نے جواب دیا۔ قرآن کہتا ہے ویـحـذر کـم الله نفسهٗ یعنی اللہ تم کو اپنے نفس سے ڈراتا ہے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھی نفس ہے پھر قرآن کہتا ہے کـل نفس ذائقه الموت [ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے] پس اگر اشیاء میں قرآن داخل ہو کر مخلوق ہو گیا تو کیا خدا بھی کل نفس میں داخل ہو کر اور نفس ہو کر موت کا مزا چکھے گا؟ معتزلہ کو مناظرے میں شکست ہوگئی۔ عباسی دربار کے مسخرے نے خلیفہ کو مسئلہ خلق قرآن کے سلسلے میں صرف ایک دلیل سے قائل کر کے معتزلہ کے حلقے سے الگ کر دیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ یا خلیفۃ المسلمین اگلے سال تراویح میں مسلمان کیا پڑھیں گے؟ خلیفہ نے جواب دیا قرآن۔ مسخرے نے نہایت تعجب سے پوچھا کہ قرآن تو مخلوق ہے اگر اگلے برس سے پہلے انتقال کر گیا تو رمضان میں کیا پڑھا جائے گا؟ خلیفہ قائل ہو گیا اس نے معتزلہ کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیا۔

ایسی دو اور مثالیں پیش خدمت ہیں عقل اور منطق کے ذریعے دین کو ثابت کرنے کی ہمہ وقت کوشش لایعنی ہے، مثلاً ایک شخص ایک حلوائی کی دکان میں داخل ہوا اور اس سے ایک سیر لڈو طلب کیے، حلوائی نے اسے ایک سیر لڈو دے دیے تو اس نے لڈو واپس کر دیے اور کہا کہ یہ مٹھائی بدل دو اور اس کے بدلے میں ایک سیر گلاب جامن دے دو، حلوائی نے مٹھائی تبدیل کر کے ایک سیر گلاب جامن اس کے سپرد کیے تو وہ شخص مٹھائی لے کر دکان سے باہر جانے لگا، حلوائی نے آواز دے کر روکا اور اس سے کہا کہ

بھائی ایک سیر مٹھائی کے پیسے دینا آپ بھول گئے ہیں وہ دیتے جایئے، خریدار نے نہایت حیرت سے پوچھا کس بات کے پیسے؟ حلوائی نے کہا جناب ایک سیر گلاب جامن کے، خریدار نے جواب دیا یہ ایک سیر گلاب جامن تو میں نے ایک سیر لڈو کے بدلے میں لیے ہیں، اس لیے اس کی قیمت کا کیا سوال؟ حلوائی نے عرض کیا حضور تو چلیے ایک سیر لڈو کے پیسے عنایت کیجیے، حلوائی کی پسپائی دیکھ کر خریدار تنک کر بولا بھائی ایک سیر لڈو تو میں آپ کو واپس کر چکا ہوں، اس کے پیسے آپ مجھ سے کیسے طلب کر سکتے ہیں؟ واقعہ دلچسپ، پر لطف ہے اور خریدار کی ذہانت اور حاضر جوابی کی داد دینا پڑتی ہے لیکن اس منطقی حاضر جوابی سے آپ لوگوں کو مسکرانے پر مجبور کر سکتے ہیں حلوائی سے مفت میں مٹھائی نہیں لے سکتے، اگر آپ اصرار کریں کہ حلوائی صاحب میں نے آپ کو دلیل دی ہے آپ دلیل سے اس کا جواب دیں تو یہاں دلیل کا کام ختم ہو جائے گا اور علامہ اقبال کے مصرع کا کام شروع ہو جائے گا:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ایسے مشکل مقامات عصائے کلیمی سے حل ہوتے ہیں عقلی دلیل اور منطق یہاں جواب دے جاتی ہے۔

اسی طرح ریاضیاتی اصول سے عقلی طور پر آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر ایک کمرہ سو مزدور دس دن میں بنا سکتے ہیں تو دو سو مزدور یہ کمرہ پانچ دن میں بنالیں گے۔ چار سو مزدور ڈھائی دن میں، آٹھ سو مزدور سوا دن میں، سولہ سو مزدور ۱۴ گھنٹے میں، بتیس سو مزدور سات گھنٹے میں بتیس ہزار مزدور سات سکنڈ میں لیکن کیا عملاً کوئی کمرہ سات سیکنڈ میں بن سکتا ہے؟ ریاضیاتی طور عقلی منطقی خیالی طور پر ایسا کمرہ ضرور بن سکتا ہے لیکن صرف اعداد و شمار کے ذریعے، عملاً نہیں۔ لہٰذا بہت سی باتیں جو عقلی، منطقی اور ریاضیاتی طریقوں سے ثابت کر دی جائیں تب بھی عملی زندگی میں ناقابل عمل ہو جاتی ہیں۔ خود ذاکر نائیک صاحب نے عقلی استدلال کی مخالفت میں ایک عمدہ مثال اسلام دہشت گردی یا عالمی بھائی چارے والے خطبے میں دی ہے: اس مناظرے میں گوشت خوری کے مخالفین کی دلیل یہ تھی کہ ٹھیک ہے پودے بھی جاندار ہیں لیکن ان کے اندر صرف تین حواس ہوتے ہیں جبکہ گائے بکری بکرے میں پانچ حواس ہوتے ہیں لہٰذا جانوروں کو مارنا بڑا جرم ہے اور پودوں کو مارنا اس کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹا جرم ہے، ذاکر نائیک نے جواب دیا کہ اچھا چلو یہ فرض کرو کہ تمہارا ایک چھوٹا بھائی ہے جو پیدائشی گونگا بہرا ہے اس میں عام انسانو ں کے مقابلے میں دو حسیات کم ہیں اب فرض کیجیے کہ کوئی آپ کے بھائی کو مار دیتا ہے کیا اس وقت آپ جج کے سامنے جا کر یہ کہنے کے لیے تیار ہوں گے کہ مائی لارڈ چوں کہ میرے بھائی میں دو حواس کم تھے لہٰذا مجرم کو کم سزا دی جائے نہیں بلکہ آپ کہیں گے کہ

مجرم کو دگنی سزا دی جائے کیوں کہ اس نے ایک معصوم اور مجبور شخص پر ظلم کیا لہٰذا اسلام میں بھی یہ منطق نہیں چلتی[1] ہمیں خوشی ہے کہ ذاکر نائیک صاحب نے خود تسلیم کرلیا کہ اسلام میں عقلی منطق نہیں چلتی، کبھی کبھی چل بھی جاتی ہے لیکن صرف اس منطق اور عقلیت پر دین کے فہم کو منحصر رکھنا یا مقید کرنا عقل کا تقاضا نہیں ہے۔

ایک عالم کا عقلی دلیل کی فضیلت، اہمیت اور برتری کے سلسلے میں ایک شخص سے مباحثہ ہوا۔ موقف یہ تھا کہ عقلی دلیل ہی ترجمان ساطع، برہان قاطع اور تفسیر واضح ہوتی ہے۔ اس سے عالم نے کہا کیا احنف بن قیس اور ایک چھوٹا بچہ دونوں کو شہید کردیا جائے تو دونوں کا قصاص یکساں ہوگا؟ یا احنف بن قیس کی عقل و حلم کی وجہ سے ان کا کچھ زیادہ ہوگا؟ اس نے کہا نہیں دونوں کا برابر ہوگا۔ عالم نے فرمایا: پھر صرف عقلی و منطقی دلیل کوئی چیز نہیں۔

سب سے پہلے ابلیس نے منطق و عقلی دلیل کا آغاز کیا۔ اسے جب حکم ملا کہ حکم الٰہ پر عمل کرو اور آدم کو سجدہ کرو تو اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ابلیس نے صرف عقل محض [Pure reason] پر دلیل کی بنیاد رکھی جو صرف طبعی مسائل [Physical Domain] میں تجزیہ کی صلاحیت رکھتی ہے، اس جزوی عقل [Partial rationality] نے اسے دھوکا دیا لہٰذا خیر، الحق اور سچ کا معیار [Standard of Good & Truth] عقل نہیں ہوسکتی۔ عقل جزئی حقیقت تک رسائی نہیں کرسکتی ہے۔ بہترین عقل وہ ہے جو مالک الملک کے حکم کو درست سمجھے یہ وہ عقل ہے جس کو پرکھنے کا پیمانہ عقل سے نہیں نکلتا باہر سے آتا ہے، وہ پیمانہ وحی الٰہی ہے یعنی وحی بتائے گی کہ انسان عاقل ہے یا نہیں اور عقلیت کا پیمانہ یہ ہے کہ انسان مقام عبدیت کو قبول کرلے اور حقیقت مطلق کی اطاعت و اتباع میں خوشی محسوس کرے قرآن بتاتا ہے: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ [۸:۲۲]، اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ [۸:۵۵]، اَمَّنْ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَۃَ وَیَرْجُوْا رَحْمَۃَ رَبِّہٖ قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ [۳۹:۹]، اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا [۶۵:۱۰] ان آیات کا لب لباب یہی ہے کہ عقل سے کام نہ لینے والے خدا کے نزدیک بدترین جانور اور بہرے و گونگے لوگ ہیں، الحق کا انکار کرنے والے بدترین مخلوق ہیں، نصیحت عقل والے قبول کرتے ہیں، معیار عقل قبولیت نصیحت ہے جو القرآن، الکتاب اور الحق کو قبول نہ کرے وہ صاحب عقل ہی نہیں ایمان لانے والے لوگ ہی صاحبِ عقل ہیں اور اللہ سے انھیں ڈرنا چاہیے۔ عقل جب وحی الٰہی کی تقلید قبول کرتی ہے تو وہ صرف عقل نہیں رہتی وہ ایمان کے زمرے میں آتی ہے جو علم کا اصل سرچشمہ ہے۔

ایک راسخ العقیدہ عالم نے ایک عقلیت پسند عالم سے پوچھا مجھے ایسا کلمہ بتلایئے جس کا اول

---

[1] ذاکر نائیک، ''اسلام: دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ'' مشمولہ خطبات ذاکر نائیک، صفحہ ۶۲۔

شرک اور آخرایمان ہو؟ عالم نے کہا میں نہیں جانتا پہلے عالم نے جواب دیا یہ لا الہٰ الا اللہ ہے۔ اگر کوئی لا الہٰ کہہ کر رک گیا تو کافر ہو جائے گا۔ اسی کلمہ کا اول شرک اور آخر ایمان ہے۔ دوسرا سوال پوچھا کہ اچھا بتایئے کہ قتل جو اللہ تعالیٰ کے یہاں حرام ہے زیادہ بڑا گناہ ہے یا زنا؟ انھوں نے کہا قتل۔ انھوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے قتل کے لیے دو شہادتیں قبول فرمائی ہیں لیکن زنا کے لیے چار ضروری ہیں۔ عقل و منطق یہاں آپ کے لیے کہاں فائدہ مند رہی؟ ــــ اور پھر پوچھا بتایئے خدا کے یہاں روزہ بڑا ہے یا نماز؟ عقلیت پسند مفتی نے کہا نماز، انھوں نے فرمایا عورت حیض سے فراغت کے بعد روزوں کی قضا کرتی ہے لیکن نماز کی نہیں، معلوم ہوا کہ صرف عقل کی بنیاد پر مذہبی امور کے فیصلے اور ان کی حکمت معلوم کرنا ممکن نہیں۔

حضرت عباسؓ نے خارجیوں سے گفتگو کی تو ان کے عقلی دلائل کا اس خوبصورتی سے ایمانی و عرفانی جواب دیا کہ وہ دنگ رہ گئے۔ حضرت عباسؓ بتاتے ہیں کہ خارجیوں نے ان سے کہا کہ ہمیں حضرت علیؓ کی تین باتیں بہت بری لگیں۔ وہ یہ کہ حَکَم انھوں نے آدمیوں کو بنایا جب کہ حکمِ خداوندی ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [حکم تو اللہ ہی کا ہے]

میں نے کہا کہ خرگوش کے سلسلے میں چوتھائی درہم کا معاملہ اللہ تعالیٰ ہی نے بندوں کے سپرد کیا اور انھیں حَکَم بنا دیا ہے۔ جواب میں اس آیت کریم کی طرف اشارہ ہے: فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ۔[پارہ ۷، المائدہ] تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ جیسا اس نے قتل کیا ویسا ہی جانور دے اور تم میں کے دو ثقہ اس کا فیصلہ کریں۔ احرام پہنے ہوئے حاجی کے شکار سے متعلق یہ حکم ہے یعنی اگر خرگوش کو حالت احرام میں شکار کیا تو بدلے میں خرگوش ہی دینا ہوگا۔ اور زوجین کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے: فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا [پ ۵، النساء][ایک حَکَم مرد والوں کی طرف سے اور ایک عورت والوں کی طرف سے بھیجو]

خرگوش، زوجین اور بندے کے معاملات میں حَکَم بنانا افضل ہے اور امت کے معاملات میں جس سے خوں ریزی بند ہو کر اختلاف اتحاد و اتفاق میں تبدیل ہو جائے؟ کیا وہاں حَکَم نہ بنانا افضل ہو سکتا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں صحیح ہے!

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے امیر المومنین بننے سے توقف کیا اور علیحدہ رہے وہ امیر الکافرین ہیں [معاذ اللہ] میں نے کہا اگر قرآن و سنت سے میں سے دلیل دوں تو مان لو گے؟ انھوں نے کہا ہاں! میں نے کہا میں نے سنا ہے اور میرا خیال ہے کہ تمھیں بھی معلوم ہوگا کہ صلح حدیبیہ کے روز سہیل بن عمرو کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو ہوئی تو آپ نے حضرت علی سے کہا لکھیے:

"هذا ما صالح عليه محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم"

ان سبھوں نے کہا کہ اگر ہم آپ کو خدا کا رسول مان لیں تو جنگ ہی نہ کریں۔ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: علیؓ! اسے مٹا دو ــــ ابن عباسؓ نے کہا کیا میں تمھاری اس بات کا جواب دے دیا

ان سبھوں نے کہا ہاں!

اب رہا جنگِ جمل وصفین کے بارے میں تمھارا یہ کہنا کہ انھوں نے قتال کیا لیکن قیدی نہ بنائے اور نہ مال غنیمت حاصل کیا۔ کیا تم اپنی ماؤں کو قیدی بنا کر دوسری عورتوں کی طرح انھیں بھی اپنے لیے حلال سمجھو گے؟ اگر ہاں کہو گے تو انکار کتاب اللہ کرو گے اور اسلام سے نکل جاؤ گے۔ اب تم دو گمراہیوں کے درمیان گھر گئے ہو۔

کوئی بھی چیز پیش کر کے میں کہتا کیا اس سے نکل گیا؟ وہ کہتے ہاں! اس طرح ان میں سے دو ہزار خارجی ہمارے ساتھ واپس آ گئے اور صرف چھ سو باقی رہ گئے۔ تفصیل کے لیے اعلام الموقعین کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ خارجی قتل و غارت گری اور اپنے مخالفین کی خونریزی میں مشہور تھے لیکن جب حق و صواب اور حکمت و موعظت کے ساتھ ان سے گفتگو کی گئی تو ان میں سے اکثر قبول حق پر آمادہ ہو گئے اور جب انھیں قرآن حکیم پڑھ کر سنایا گیا تو انھوں نے اس سے عبرت و نصیحت حاصل کی۔ انھیں مناسب طریقہ سے گفتگو کی دعوت دی گئی تو کھلے دل کے ساتھ انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ جب متشدد لوگوں کو دعوت و نصیحت اور نرمی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے تو عہد حاضر کے ملحد، بے دین، دین بے زار اور متشکک لوگوں کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔

عصر حاضر کا مسئلہ یہ ہے کہ فقہا، متکلمین واعظین علماء نے لا ادری کہنا ترک کر دیا ہے لہٰذا وہ ہر مسئلے کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور عوام کی درست رہنمائی سے قاصر رہتے ہیں۔ نائیک صاحب نہایت اخلاص کے ساتھ ادھورے علم کے ذریعے امت کی اصلاح کے لیے نکلے ہیں کاش وہ کہہ سکتے کہ لا ادری تو اس بڑی ذمہ داری سے بچ جاتے جسے انھوں نے رضا کارانہ طور پر خود قبول کر لیا ہے ایک ایسی ذمہ داری جوامت کے لیے مصائب کے نئے دریچے کھول رہی ہے۔

اعتراضات کرنے والے قسم قسم کے اعتراض کر سکتے ہیں مثلاً سورۂ نحل کی آیت: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَ حَفَدَةً وَّ رَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ [۱۶:۷۲] میں اللہ تعالیٰ نے بیٹے اور پوتوں کا ذکر کیوں کیا ہے؟ بیٹی اور نواسوں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اور نواسوں کا ذکر بھی کیوں نواسیوں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ یہ تو صریحاً صنفی امتیاز محسوس ہوتا ہے [نعوذ باللہ]، جب آپ عہد حاضر کے غالب تعقل کی روشنی میں چیزوں کو ایک خاص زاویے، خاص نقطۂ نظر اور خاص مابعد الطبیعیات کے ذریعے پرکھتے ہیں تو اسی قسم کے کمالات، تحقیقات، ایجادات اور انکشافات کا دریچہ وا ہوتا ہے اور سائنسی، منطقی، تجربی، حسی اور طبعی ذہن قرآنی دلیل کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ معترض یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں کہا ہے کہ یہ پہاڑ میخیں ہیں جو زمین کو ڈھلکنے سے روکے ہوئے ہے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَن رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا هَلْ يَسْتَوُونَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ...... وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ [۱۶:۷۵،۷۶] لیکن دیکھیے دنیا میں ہزاروں پہاڑ کاٹ دیے گئے اگر پہاڑوں کو کاٹا نہ جائے تو اس میں سے معدنیات کے ذخائر یعنی پتھروں کی انواع واقسام سے کیسے فیض اٹھایا جائے؟ ظاہر ہے نائیک صاحب یہاں کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔ وہ یہ اعتراض بھی اٹھا سکتا ہے کہ سورہ نحل میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے گھوڑے اور خچر پیدا کیے تا کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمھاری زندگی کی رونق بنیں [۸:۱۶] لیکن عہد حاضر میں تو جدید تہذیب وتمدن کے ظہور کے بعد گھوڑے اور خچر تو زینت حیات دنیا ہی نہیں رہے، دنیا کے اکثر حصوں میں علمائے دین بھی گدھے اور گھوڑے پر سواری کو قابل عزت شے نہیں سمجھتے کیا آپ ''شیخ الاسلام'' کا اکرام اس طرح کریں گے کہ انھیں گھوڑے یا گدھے پر بٹھا کر لے جائیں؟ بہ ظاہر یہ اعتراض درست لگتا ہے کیونکہ عصر حاضر کے تعقل نے عیش وعشرت اور سہولت کی جو سواریاں پیدا کی ہیں ان کے سامنے گھوڑے اور گدھے واقعی حیات دنیا کی زینت نظر نہیں آتے اور کسی عالم کو خچر یا گدھے پر سواری کی دعوت دینا جدید حسی ذہن کو فی الواقع توہین نظر آئے گا، کیونکہ یہ طرز عمل عہد حاضر کے غالب طرز تعقل کے خلاف ہے، مگر یہ نظر کا قصور ہے، برطانیہ کی ملکہ سعودی عرب کے شاہ کے خصوصی استقبال کے لیے شاہی بگھی میں لے کر انھیں بکنگھم پیلس جاتی ہے تو پوری دنیا اور خود شہنشاہ اسے خصوصی اکرام واعزاز سمجھتے ہیں کیونکہ یہ تعظیم عہد حاضر کے تعقل سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، قرآن بتاتا ہے کہ جانوروں میں تمھارے لیے جمال ہے جب کہ تم صبح انھیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور جب کہ شام انھیں واپس لاتے ہو [۶:۱۶] لیکن عہد حاضر کے فلسفۂ جمال میں جانوروں کے اس حسن، کمال اور جمال کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے فلیٹ شہر اور جانور ایک ساتھ نہیں رہ سکتے جدید طرز زندگی فطری حقیقی اصل طرز زندگی کو باقی ہی نہیں رہنے دیتا نہ شہروں میں باغات میں نہ کھیت نہ چراگاہیں تو جانور کیسے رہیں گے اور اس کا حسن و جمال کون دیکھے گا؟ لہٰذا جمالیات کے نئے نظریات میں اس فطری حسن و جمال کا کوئی ذکر نہیں ہوتا لیکن عید قربان کے موقعے پر پوری امت اور اس کے امراء عالیشان محلوں میں رہنے والے متکبرین کے بچے جانوروں کے جمال سے جس طرح لطف اٹھاتے ہیں اور ان کے ساتھ جس طرح وقت گزارتے ہیں وہ اس آیت کی سچائی کی محکم دلیل ہے مگر سائنسی ذہن اس دلیل کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

قرآن حکیم بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو نو معجزے دیے گئے تھے لیکن ذکر صرف دو معجزوں کا کیا گیا ہے: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا [سورۂ بنی اسرائیل:۱۰۱]، وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ [سورۂ النمل:۱۲]

قرآن بقیہ سات معجزوں کے بارے میں خاموش ہے اب یہاں خامشی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان سات معجزوں کی تحقیق میں عمر بسر کردی جائے کیونکہ مقصود صرف یاددہانی ہے، بیان واقعہ ہے کہ قوم فرعون معجزوں کے سامنے بے بس ہوگئی، اس کے جادوگر بھی بے بس ہوگئے، آیت کا مقصد اس تحقیق اور تلاش وجستجو میں وقت ضائع کرنا نہیں ہے کہ بقیہ سات معجزے کیا تھے، ان کا ذکر کیوں نہیں ہوا ان معجزوں میں کیا دکھایا گیا تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ صرف عقل کی بنیاد پر کسی کو دین وایمان کی توفیق نہیں ملتی یہ توفیق انھیں ملتی ہے جو عقل کے ذریعے کسی حقیقت کو پالینے کے بعد قلب میں تبدیلی محسوس کرتے ہیں تو انھیں ایمان کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے، عقل صرف سوچنے کا ذریعہ ہے وہ حقیقت کو پانے والے، ڈھونڈنے والے آلات [Instruments] میں سے ایک آلہ ہے یہ آلہ خود مطلوب ومقصود نہیں ہے۔ کفار مکہ نے علم، عقل اور فطرت کے آلات کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصل بیت اللہ کو پہچان لیا تھا قرآن کے الفاظ میں مشرکین مکہ اور اہل کتاب ذات رسالت مآب کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے تھے اسی طرح وہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کی اصلیت سے بھی واقف تھے لیکن ان کے قلب نے انکار کردیا ان کے نفس نے تعقل قلبی سے استفادہ نہیں کیا وہ خواہش نفس کے الٰہ کی پرستش میں مبتلا رہے۔ قلب اس تفکر کو گہرائیوں کے ساتھ ایمان کے قالب میں ڈھالنے کا وسیلہ ہے، اس لیے پیغمبر جب بھی آتے ہیں لوگوں کے قلوب کو بدلتے ہیں، ان کے فواد کو مخاطب کرتے ہیں، ان کے دروازۂ دل پر دستک دیتے ہیں، ان کے دل کی دنیا بدلنے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں کیوں کہ قرآن کے الفاظ میں ''ایک شخص کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے'' لہٰذا اس ایک دل کو خالق حقیقی کے لیے خالص کردینا پیغمبروں کی کوشش ہوتی ہے۔ منافقین بہ ظاہر ایمان لے آئے تھے مگر ان کے ایمان کو اللہ نے تسلیم نہیں کیا انھوں نے رسالت مآب کا انکار نہیں کیا لیکن دل سے آپ کی تصدیق نہیں کی، اسی لیے قرآن نے ارشاد کیا کہ یہ منہ سے کہتے ہیں مگر دل سے ایمان نہیں لاتے: يَـٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ لَا يَحْزُنكَ ٱلَّذِينَ يُسَـٰرِعُونَ فِى ٱلْكُفْرِ مِنَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِأَفْوَٰهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِن قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ ٱلَّذِينَ هَادُوا۟ ۛ سَمَّـٰعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّـٰعُونَ لِقَوْمٍ ءَاخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ مِنۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهِۦ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَـٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَٱحْذَرُوا۟ ۚ وَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ فِتْنَتَهُۥ فَلَن تَمْلِكَ لَهُۥ مِنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ لَمْ يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا خِزْىٌ ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ [۵:۴۱]

اگر ایمان عقلی دلائل پر منحصر ہوتا تو اہل کتاب ایمان لے آتے، قرآن کے الفاظ میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں وہ عقلی طور پر آپ کی بعثت سے متفق تھے لیکن ان کا دل اسے تسلیم نہیں کرتا تھا، ان کی خواہش نفس اور تکبر ضد اور اپنی قوم کی عظمت اس عقلی دلیل کو قلبی دلیل میں تبدیل کرنے پر آمادہ نہ تھی، لہٰذا عقلی یقین کے باوجود وہ آخر تک قلبی یقین سے محروم رہے اور دنیا و آخرت دونوں برباد کرلی۔ اسی لیے قرآن نے واضح کردیا کہ جس نے دل کی رضامندی

سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ [۱۰۶:۱۶]۔ ابوجہل کعبہ کے پردوں میں چھپ کر قرآن سنتا تھا اس کا دل پگھل جاتا تھا لیکن اس کا تکبر آڑے آتا تھا کہ یہ قرآن اس شہر کے دو بڑے آدمیوں پر کیوں نہیں اترا؟

سورۃ انبیاء میں حضرت ابراہیم اور اس عبادت گاہ کے مقتدیوں کا مکالمہ آیت ۵۹ تا ۶۷ میں تفصیل سے آیا ہے، جب حضرت ابراہیمؑ نے تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا اور کفار مندر میں عبادت کے لیے گئے تو بڑے ناراض ہوئے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا، انھیں بتایا گیا کہ ایک نوجوان ابراہیم ہے جو بتوں کو برا بھلا کہتا ہے انھیں لوگوں کی موجودگی میں طلب کیا گیا اور سوال حضرت ابراہیمؑ سے یہ پوچھا گیا کہ: قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ [سورۃ الانبیاء:۶۲] ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام تم نے کیا؟ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ [سورۃ الانبیاء:۶۳] آپ نے فرمایا "ان کے بڑے بت سے معلوم کرو اگر یہ بولتے ہوں"۔

کفار اس عقلی دلیل پر ششدر رہ گئے: فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ [الانبیاء:۶۴] اور آپس میں کہنے لگے بیشک ہم ہی ظالم ہیں: ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ [الانبیاء:۶۵] پھر شرمندہ ہو کر سر نیچا کر لیا اور کہنے لگے تم جانتے تو ہو کہ یہ بولتے نہیں اس پر حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ پھر تم اللہ کو چھوڑ کر کیوں ایسے بتوں کو پوجتے ہو جو نہ تمھیں کوئی فائدہ دے سکیں نہ نقصان پہنچا سکیں؟ کفار عقلی طور پر مطمئن تھے لیکن قلبی طور پر مطمئن نہ تھے۔ قلب اور فواد جب تک عقل کا ساتھ نہ دیں ایمان کی توفیق نہیں ملتی اس لیے انبیاء لوگوں کے قلوب کو تسخیر کرتے ہیں۔ دلوں کو فتح کرنا ہی اصل فتح ہے عقل تو آسانی سے مغلوب ہو جاتی ہے لیکن عقل سے قلب تک کا فاصلہ جو بہت مختصر ہے دنیا کا طویل ترین راستہ ہے، مشرکین مکہ کو نبوت اور رسالت سے انکار نہیں تھا وہ تو پیغمبر کے منتظر تھے لیکن ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ نبوت بنی ہاشم کو کیوں عطا کی گئی؟ ان کا اعتراض صرف یہ تھا کہ "کہتے ہیں یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ اترا کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں" [الزخرف آیت ۳۱] وہ قرآن اور نبوت کا نزول طائف اور مکہ کے کسی رجل رشید پر چاہتے تھے لیکن رحمت الٰہی کفار مشرکین کی خواہش سے تقسیم نہیں ہوتی۔ انبیاء اور ان کے صحابہ کی اپنی امتوں سے ٹوٹ کر محبت اس راستے کو طے کرتی ہے یہ محبت ہی کفار کے قلوب بدلنے کا ذریعہ بنتی ہے یہ محبت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ رسالت مآبؐ اور صحابہ کرام کو ہدایت فرماتے ہیں کہ:

هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ ۔مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ [سورۃ آل عمران:۱۱۹] تم ان سے محبت رکھتے ہو لیکن وہ

تم سے محبت نہیں رکھتے، رسالت مآبؐ یعنی رحمت اللعالمین کو اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اے نبی کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آیئے: یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْھِمْ وَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ [سورۃ التوبہ:۷۳]

رسالت مآبؐ اپنی قوم کے انکار پر کس قدر افسردہ اور دل گرفتہ تھے، ان کو جہنم سے جنت کی طرف لانے میں کس قدر بے تاب تھے کہ اللہ تعالیٰ سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دل گرفتگی اور دل سوزی نہ دیکھی گئی اور قرآن کی آیت نازل ہوئی کہ اگر یہ کفار ایمان نہ لائیں گے تو کیا آپ ان کے غم میں اپنی جان دے دیں گے: ''لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ'' ترجمہ: ''کیا آپ اپنے کو اس فکر میں ہلاک کر کے رہیں گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے''۔ [سورۃ الشعراء:۱] فلا تذھب نفسک علیھم حسرات [الفاطر:۳] ''ان لوگوں کے حال پر غم کر کے کہیں آپ جان نہ دے بیٹھیں''۔ ترجمہ: وہ اپنی تبلیغ پر کوئی اجر نہیں مانگتے [السباء:٦] وہ صرف ان کی اصلاح کے حریص، آخرت کی بہتری کے طالب، ان کی اخروی کامیابی کے لیے بے تاب ہوتے ہیں اور یہ اخلاص کی انتہا ہے۔ پیغمبروں کو اپنی امت سے کس قدر محبت ہوتی ہے اس کا ایک اور ثبوت روز قیامت اللہ تعالیٰ کا حضرت عیسیٰؑ سے وہ مکالمہ ہے جو سورہ مائدہ میں بیان ہوا ہے آیت ۱۰۹ سے ۱۱۵ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے وہ انعامات گنائے جو حضرت عیسیٰؑ کو ملے تھے اس کے بعد یہ احسانات یاد دلا کر پوچھا ''اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟ تو وہ جواب میں عرض کریں گے سبحان اللہ یہ میرا کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا، میں نے تو ان سے اس کے سوا کچھ نہ کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو یا جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی میں، اس وقت تک ان کا نگران تھا جب تک میں ان کے درمیان تھا، جب آپ نے مجھے واپس بلالیا تو آپ ان پر نگران تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگران ہیں''۔ اپنی امت کے شرک، کفر، عصیان اور طغیان کا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ذریعے علم ہونے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر گناہ کی بخشش ہے سوائے شرک کے حضرت عیسیٰؑ کی وہ التجا دل کو پارہ پارہ کر دیتی ہے اللہ کی طرف سے آپ کی امت کے شرک کے اعلان کے باوجود بارگاہ رب العزت میں التجا کے الفاظ دیکھیے: اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ وَ اِنْ تَغْفِرْلَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ''اے اللہ اب اگر آپ انھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب و دانا ہیں'' [۵:۱۱۸]۔ کاش حضرت عیسیٰ کی یہ آرزو تمنا ہمارے متحارب دینی گروہوں کے قلب سے گزرتی تو وہ کلمہ گو مسلمانوں کے بارے میں انہی جذبات کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہوتے اور روئے زمین پر اللہ کی عدالت قائم کرنے کی کوشش نہ فرماتے۔

پیغمبر اور ان کے امتی جب کفار مشرکین سے اس درجہ محبت کر کے انھیں دعوت ایمان دیتے

ہیں تو وہ ایمان لے آتے ہیں۔ لیکن مذاکرے، مناظرے، مجادلے، سیمنار، کانفرنس، ٹاک شوز، شو برنس کے انداز و اسلوب اختیار کر کے، تالیاں پیٹ کر اور واہ واہ کے نعرے لگوانے سے دین کی نصرت نہیں ہوتی۔ کفار کو دین کی جانب راغب کرنے کے لیے سائنس کے ہتھیار سے وسیلے کا کام لینا احسن رویہ نہیں کفار مکہ یہی کہتے تھے کہ ہم تو بس بتوں کو اس لیے پوجتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں [الزمر:۱] عہد جدید کے مفکرین کا سائنس کے بارے میں کم و بیش یہی موقف ہے کہ ہم سائنس کو اس لیے پوجتے ہیں کہ اس کے ذریعے کفار کو اسلام سے قریب لے آئیں، جدیدیت پسندی کے شوق میں اور کفار کو مطمئن کرنے کے لیے ہمارے دانشور بعض عجیب دلائل قرآن سے نکال لاتے ہیں۔

معجزات موسیٰ سے جدیدیت پسندوں کا استدلال اور اس کی حقیقت:

حضرت موسیٰ نے جادوگروں کو اپنے عصاء اور ید بیضاء سے شکست دینے کے بعد کیا دنیا بھر میں جادو کے کمالات دکھانے والے ادارے قائم کیے؟ جہاں سے جادوگروں کو دعوت مبارزت دے کر ان کے جادو کا توڑ پیش کیا جاتا اور معجزے دکھا کر دین کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا جاتا تھا۔

ظاہر ہے ذاکر نائیک صاحب کے فلسفے کے تحت حضرت موسیٰ کو گلی گلی جادو توڑ مراکز قائم کر کے دنیا بھر میں حق کی اشاعت کرنی چاہیے تھی اور پوری دنیا کو اس کے ذریعے مسلمان کر لینا چاہیے تھا اسی فلسفے کے تحت وہ سائنس کے ذریعے عہد حاضر کے کفار کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ سائنس کے حامیوں کا ایک عام استدلال یہ بھی ہے کہ ہر نبی کو اس کے زمانے کے مطابق علم دیا جاتا ہے کیوں کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں مصر میں جادو کا بہت زور تھا لہٰذا انھیں جادو کا علم دیا گیا جس سے انھوں نے اپنے عہد کی علیت کو شکست دے کر خدا کے وجود کا اعلان کیا، یہ کمزور دلیل دینے والے یہ نہیں بتا سکتے کہ حضرت موسیٰ نے جب جادوگروں کو شکست دے دی تو فرعون اور اس کی قوم حضرت موسیٰ پر ایمان کیوں نہیں لائی؟ صرف جادوگران فرعون نے ایمان کا اعلان کیوں کیا؟ اور ان کے سوا پوری قوم مذہب فرعون پر کیوں قائم رہی؟ اور حضرت موسیٰ سے شکست کھانے کے بعد حق پر ایمان لانے کے بجائے حضرت موسیٰ کو قتل کرنے پر کیوں آمادہ ہوگئی؟ جادوگروں کو شکست جوابی جادو نے دی یا معجزے نے؟ حضرت موسیٰ کو صرف ید بیضاء اور عصا کا معجزہ دیا گیا تھا یا کچھ اور معجزے بھی ملے تھے قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کو نو نشانیاں عطا کیں تھیں: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا [۱۷:۱۰۱] جن میں ید بیضا اور عصا بھی شامل تھے۔

سوال یہ ہے کہ بقیہ سات نشانیوں یا معجزات کا قوم فرعون پر کیا اثر ہوا؟ کیا وہ تمام معجزات بھی جادو سے متعلق تھے؟ ظاہر ہے یہ بالکل غلط طرز استدلال ہے ان معجزات کی تفصیل سورۃ اعراف میں پڑھی جا سکتی ہے۔ جادو حضرت موسیٰ کی قوم سے خاص نہیں جادو اور سحر کے کمالات دنیا کی ہر قوم میں موجود

تھے۔اور آج بھی دنیا کے اربوں لوگ جادو سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ امریکہ یورپ میں جادوگروں کو اہم سمجھا جاتا ہے اور انھیں غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تسلیم کیا جاتا ہے۔ جادوگر آج بھی حیران کن کمالات دکھاتے ہیں امریکہ کا ایک مشہور جادوگر جس نے مجسمۂ آزادی کو ہزاروں لوگوں کے سامنے کئی منٹ تک کے لیے غائب کر دیا اور شدید سردی میں نقطۂ انجماد کے باوجود کئی گھنٹے گرم لباس کے بغیر کھلی فضا میں کھڑا رہا۔

انبیاء پر کفار کا مشترکہ اعتراض: ساحر و مجنون:

قرآن حکیم بتاتا ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر اپنی قوم کے پاس آتا ہے تو کفار و مشرکین اسے ساحر، اس کے کلام کو جادو، اس کے علم کو جادوگری یا پیغمبر کو ساحر و مجنون قرار دیتے ہیں: كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ...... اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ [۵۱:۵۲تا۵۳] ترجمہ: یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انھوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے معجزے کی تمنا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ [۶:۷] ترجمہ: اگر ہم لکھی لکھائی کتاب اتار دیتے تب بھی کفار یہی کہتے کہ یہ سحر مبین ہے۔ قرآنی آیات میں جہاں جہاں سحر اور جادو کا ذکر ہے وہاں بیشتر آیات حضرت موسیٰ اور فرعون کی قوم سے متعلق ہیں اس لیے متجددین کو یہ خلط مبحث ہوا کہ قوم فرعون کا اختصاص جادوگری تھا لہٰذا اسی علم سے اس کا ازالہ اور امالہ کیا گیا۔ اس محرف دلیل کو تخلیق کرنے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی تاکہ مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا جا سکے کہ حضرت موسیٰ کے راستے پر چلو جس طرح انھوں نے اپنے دور میں اپنی قوم سے مقابلے کے لیے اس قوم کے علم سے مماثل مگر اعلیٰ ترین علم جادو حاصل کر کے اپنی قوم کو شکست دی بالکل اسی طرح تم بھی اپنے دشمن یعنی مغرب کے علم سائنس کے مقابلے میں اس سے اعلیٰ ترین علم سائنس حاصل کر کے اسے شکست دے سکتے ہو اگر تم یہ کام نہ کر سکے تو امت مسلمہ کو دنیا میں کبھی عروج نہیں مل سکتا اور زوال اس کا مقدر رہے گا۔ یہ دلیل دیتے ہوئے وہ امت کو قرآن کے بتائے ہوئے راستے سے منحرف کرنا چاہتے ہیں جو واضح کرتا ہے کہ انبیاء اپنے عہد میں اپنی دعوت اپنے منہاج علم کے مطابق دیتے ہیں کفار کے منہاج علم سے مشترکہ منہاج تلاش کر کے دعوت نہیں دیتے اسی لیے قوم موسیٰ کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تم تعلیم بالغان کے مراکز قائم کرو اور فرعونی سائنس و ٹیکنالوجی میں کمال حاصل کر کے اس کا مقابلہ کرو بلکہ ان کو حکم دیا گیا کہ تم نے صلوٰۃ کا نظام ترک کر دیا ہے، لہٰذا سب سے پہلے نظام صلوٰۃ قائم کرو: وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ [۱۰:۸۷] کہ نماز مومن کی معراج ہے، یہی دین کا ستون ہے، جب دین کا ستون باقی نہ رہے تو امت کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ اور اگر رہے گی تو حالت غلامی

میں رہے گی جیسا کہ بنی اسرائیل کا حال تھا۔ جو امت اپنی عبادت گاہوں کو فراموش کر دے جہاں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور عبادت ترک کر دے وہ امت غلام نہ بنے تو اور کیا کرے، جو امت اللہ کی غلامی سے نکل جاتی ہے اسے غلام بنانے کے لیے دنیا کی ساری قومیں لاؤ لشکر لے کر چڑھ دوڑتی ہیں۔ امت مسلمہ کا حال بنی اسرائیل سے کچھ بہتر اس لیے ہے کہ اس کی عبادت گاہیں ابھی موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ظاہری کا عمل جاری و ساری ہے مگر عبادت و اطاعت قلبی کے خاتمے کے باعث یہ امت در بدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف حضرت موسیٰ کو جادوگر کا خطاب نہیں ملا ہر پیغمبر، رسول اور نبی کے ساتھ یہی صورتِ حال رہی، حضرت صالحؑ کو بھی ان کی قوم نے جادوگر قرار دیا: قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ [۲۶:۱۵۳] حضرت شعیبؑ کو بھی یہی الزام دیا گیا: قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ [۲۶:۱۸۵]۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بھی جادوگری کا بہت چرچا تھا: وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ [۲:۱۰۲] لوگ دوسرے کی بیوی کو جادو سے الگ کر کے شادی کر لیتے تھے، حضرت موسیٰ اور ان کی قوم بھی جادوگری اور سحر کاری کے مخمصے میں گرفتار تھی اس کی تفصیل قرآن مجید میں درج ذیل آیات میں بیان ہوئی ہے۔ ۷:۱۱۶، ۵:۱۱۰، ۱۰:۷۰،۷۶، ۱۰:۷۷،۷۹،۸۰،۸۱، ۲۰:۵۸،۶۳،۶۹، ۲۰:۶۳، ۷۱،۷۳، ۲۶:۳۷،۳۸،۴۰،۴۱،۴۶،۴۹، ۲۷:۱۳، ۲۸:۳۶، ۲۰:۵۷،۷۰، ۲۶:۳۵،۴۰، ۲۰:۶۳،۶۶، ۷:۱۰۹،۱۱۲،۱۱۳،۱۲۰، ۴۰:۲۴، ۴۹:، ۵۱:۳۹، ۲۶:۳۴،۴۱،۴۶،۵۳، ۷:۱۳۲

کفار مکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر اور مجنون کہتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں [اے محمدؐ!] اگر ہم اُن پر آسمان کا دروازہ کھول دیں اور وہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے لگیں تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے: وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ...... لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ [۱۵:۱۴،۱۵] یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں کہ یہ [محمدؐ] تو ایک سحر زدہ آدمی ہے جس کے پیچھے تم جا رہے ہو: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا [۱۷:۴۷] یہ ظالم کہتے ہیں تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو: اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا

مَّسۡحُوۡرًا [۸:۲۵] اے پیغمبرؐ! اگر تمھارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے: وَ لَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ کِتٰبًا فِیۡ قِرۡطَاسٍ فَلَمَسُوۡہُ بِاَیۡدِیۡهِمۡ لَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ [۷:۶] اب اگر اے نبیؐ! آپ کہتے ہیں کہ لوگو مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو منکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے: وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرۡشُهٗ عَلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَیَقُوۡلَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ [۱۱:۷] اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے پھر کیا تم آنکھوں دیکھے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے: لَاهِیَةً قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجۡوَی ٭ۖ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ هَلۡ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ [۳:۲۱] ان کافروں کے سامنے جب حق آیا [حضورؐ معہ الکتاب] تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے: وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا هٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّصُدَّکُمۡ عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُکُمۡ ۚ وَ قَالُوۡا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکٌ مُّفۡتَرًی ؕ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ۙ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ [۴۳:۳۴] کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے: وَ قَالُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ [۱۵:۳۷] مگر جب وہ حق [القرآن] ان کے پاس آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں: وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ کٰفِرُوۡنَ [۳۰:۴۳] ان کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آجاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے: وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ۙ هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ [۷:۴۶] قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہوا جادو ہے: اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انۡشَقَّ الۡقَمَرُ ...... وَ اِنۡ یَّرَوۡا اٰیَةً یُّعۡرِضُوۡا وَ یَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ [۲،۱:۵۴] [ولید بن مغیرہ] آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو [قرآن] جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ [۲۴:۷۴] منکرین کہنے لگے کہ یہ [محمد] ساحر ہے: وَ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ ۫ وَ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ هٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ [۴:۳۸] [کفار مکہ نے کہا] دونوں جادو ہیں [تورات اور قرآن] جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں: فَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡا لَوۡ لَاۤ اُوۡتِیَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی ؕ اَوَ لَمۡ یَکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ۚ قَالُوۡا سِحۡرٰنِ تَظٰهَرَا ٝ وَ قَالُوۡۤا اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوۡنَ [۴۸:۲۸] اس پر منکرین نے کہا کہ یہ شخص [محمدؐ] تو کھلا جادوگر ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جادوگری کا علم ہر قوم میں موجود رہا ہے لہٰذا ہر قوم اپنے انبیاء کا

انکار کرنے کے لیے ان پر جادوگری کا الزام عائد کر کے ان کی نبوت سے منکر ہو گئی، یہ معاملہ صرف حضرت موسیٰ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ رسالت مآب کو بھی انہی الزامات کا سامنا کرنا پڑا یہ تمام کفار، تمام منکرین حق اور اقوامِ عالم کے تمام اشرار کا اجتماعی تاریخی رویہ ہے جو قرآن سے ثابت ہے، اسی لیے قرآن نے کہا ''کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے: كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ..... اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ [۵۱:۵۲-۵۳] قرآن کے ان نصوص کی روشنی میں حضرت موسیٰ سے متعلق اس استدلال کی حقیقت بالکل غلط ثابت ہوتی ہے کہ جادو اس زمانے کا غالب علم تھا۔

حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو اس دور کے علم کے مطابق دعوت دین نہیں دی بلکہ اسے مابعد الطبیعیاتی حقائق کی بنیاد پر دین کی دعوت دی، شیشے کا فرش اس کے لیے بچھایا گیا کہ وہ حقیقت اور ظاہر میں فرق سمجھ سکے اور حقیقت الحقائق کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے، اس ظاہری دنیا کے حجاب میں مستور نورِ ازلی وابدی کو پہچان لے اور اس کے حضور سجدہ ریز ہو جائے: قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [۴۴:۲۷]۔ وہ سمجھی کہ اسے پانی سے گزرنا ہے اس نے پائنچے اوپر چڑھا لیے تب اسے بتایا گیا کہ یہ شیشے کا فرش ہے اور وہ اس استعارے کا مطلب لمحے میں سمجھ گئی کہ حقیقت اردگرد اور سامنے حاضر و موجود ہو کر بھی اس سے اسی طرح مستور تھی لیکن حجاب علم حجابِ حقیقت بن گیا تھا، شیشے کے فرش نے بتا دیا کہ چیزیں دیکھنے میں کچھ اور ہوتی ہیں لیکن ان چیزوں کی حقیقت فی الحقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور حضرت سلیمانؑ نے دعوت دین کے ذریعے اسے اس حقیقت ازلی وابدی سے واصل کر دیا، اسی لیے رسالت مآبؐ نے دعا فرمائی کہ ''اے اللہ مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ حقیقت میں ہیں''۔ حضرت ابراہیمؑ اور نمرود میں مکالمہ ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے دلیل دی کہ زندگی اور موت میرے رب کے اختیار میں ہے نمرود نے کہا زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے حضرت ابراہیمؑ سمجھ گئے کہ نمرود کا اشارہ کس طرف ہے انھوں نے دلیل بدل دی اور کہا کہ میرا رب سورج مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال کر دکھا دے: ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ'' [۲:۲۵۸] انھوں نے یہ معجزہ نہیں دکھایا کہ مردے کو زندہ کر دیتے اور نمرود کے دعوے کا فوری جواب دیتے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے کہ اے اللہ اس کی یہ قوت کہ پھانسی کے مستحق قیدی کو رہا کر دے اور کسی مظلوم کو قتل کر دے سلب کر لے اور اسے اس قوت کے استعمال سے پہلے دنیا سے اٹھا لے تاکہ اس کا دعویٰ غلط ثابت ہو جائے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے سرداروں پر حق واضح ہو چکا تھا جب آپ

نے ان کے خداؤں یعنی بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور اس عمل کی پوچھ گچھ کے دوران سرداروں سے کہا کہ ان بتوں ہی سے پوچھ لو اگر یہ بول سکتے ہیں؟ قرآن بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ جملہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور اپنے دلوں میں کہنے لگے کہ واقعی ہم خود ظالم ہیں مگر پھر ان کی نیت پلٹ گئی اور عصبیت جاہلیہ عود کر آئی: قَالُوْٓا ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ...... قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ...... فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ [۲۱:۶۲ تا ۶۴]۔ اسی لیے رسالت مآبؐ کی خواہش کے باوجود آپ کو کفار کے مقابلے کے لیے کفار کے مطالبے پر معجزے نہیں دیے گئے بلکہ یہ کہا گیا کہ پہلے بھی یہ معجزے طلب کرتے تھے اور معجزہ دیکھنے کے بعد ایمان نہیں لاتے تھے اور اب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے لہٰذا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے ہم انھیں رفتہ رفتہ خود تباہ کر دیں گے۔ کیونکہ انبیاء کا اصل معجزہ اور حقیقی کمال ان کی دعوت ہوتی ہے ، یہ دعوت عالمی، آفاقی، ابدی، حتمی اور قطعی اور یہ زمان ومکان سے ماوراء ہے، عاد ثمود قوم فرعون وغیرہ کے پاس بھیجے جانے والے انبیاء نے ان قوموں کا مقابلہ ان کی علیت سے نہیں کیا کیونکہ اس صورت میں برتری افضلیت اور اہمیت ان تہذیبوں تمدنوں اور ان کے علوم مابعدالطبیعیات اور انہی کی علیت کی قائم ہوتی، حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو یہ نہیں کہا کہ پہلے تعلیم بالغان کے مراکز کھولو، مصری سائنس میں کمال حاصل کرو، مصریوں کی ٹکر کی علمی سطح، آلات، اقدار اور ہتھیار جمع کرو پھر فرعون کو دعوت مبارزت دیں گے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ کچھ کرے لے کر باجماعت نماز کا اہتمام کرو: وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ [۱۰:۸۷] جادوگر حضرت موسیٰ کے جادو پر، ان کے چمکتے ہوئے ہاتھ پر، ان کے عصا کے بل کھا کر نکلنے اور سانپوں کو ہڑپ کرنے کے منظر پر یا حضرت موسیٰؑ پر ایمان نہیں لائے بلکہ اس رب پر اس کے مبعوث کردہ پیغمبر حضرت موسیٰ کے ذریعے اور وسیلے سے ایمان لائے جس کی عظمت، ہیبت اور شوکت کا مظاہرہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا وہ اپنے جادو کی حقیقت سے تو واقف تھے لیکن اس کے ظاہری رعب وکمال سے لوگوں کو مرعوب کر کے اپنے کاروبار چلاتے تھے۔ حضرت موسیٰ جب اس شعبدے اور رعب سے مرعوب نہ ہوئے تو ان کو یقین آ گیا کہ یہ ہستی صادق اور سچی ہے اور جس رب کی طرف دعوت دے رہی ہے یقیناً وہی الحق ہے: وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ...... قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [۷:۱۲۰، ۱۲۱] لہٰذا انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ کے رب پر ایمان لاتے ہیں، جادوگر حضرت موسیٰ کے عصا اور ید بیضاء پر ایمان نہیں لائے بلکہ خالق کائنات پر ایمان لائے جو ان دیکھا تھا مگر جس کا جلوہ انھوں نے اپنے قلب میں محسوس کر لیا اور چشم باطن سے اس عالم ظاہر کے اصل خالق کا مشاہدہ کر لیا۔ اس ایمان کی طاقت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ جب فرعون نے ان کو دھمکی دی کہ میں تمھارے ہاتھ پیر کٹوا دوں گا میری اجازت کے بغیر تم ایمان کیسے لے آئے؟ تو وہ اس دھمکی سے مرعوب

نہ ہوئے اور راہ حق میں جان دینے پر آمادہ ہوگئے: قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ..... رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ..... قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ..... لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ..... قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ..... وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ [۷:۱۲۱تا۱۲۶]۔افسوس کہ عہد حاضر کے جدیدیت پسند مسلم مفکرین جادوگران فرعون کے ایمان کی حلاوت، حرارت، اور گہرائی سے یک سر محروم ہیں، اسی لیے مغرب سے اس قدر مرعوب ہیں، اس کے برعکس عہد فرعون کے جادوگروں کا ایمان و یقین کس درجے کا تھا، قرآن بتاتا ہے کہ اپنی موت سامنے دیکھ کر ساحروں کا ایمان بڑھ گیا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے ''بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انھیں مان لیا اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں''۔ جب تک امت مسلمہ کو یہ ایقان ویقین اور لذت ایمان حاصل نہ ہوگا اسے کبھی عروج نہیں مل سکتا، خواہ وہ سائنس وٹیکنالوجی میں مغرب سے بھی آگے بڑھ جائیں، مسابقت کا میدان قرآن کی نظر میں دین وایمان مابعد الطبیعیات کا میدان ہے اپنے رب کا ذکر کرو سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا [۷۳:۸] اصل میدان نظریاتی میدان ہے، نہ کہ اسباب دنیا یعنی سائنس وٹیکنالوجی۔ جب تک امت اس نکتے کی گہرائی تک نہیں پہنچے گی عروج کی خاطر قوم بنی اسرائیل کی طرح مادیت کے صحراؤں میں بھٹکتی رہے گی۔ انبیاء اپنی مابعد الطبیعیات ایمانیات کی بنیاد پر اپنے عہد کے کفر، ضلالت، جہالت وجاہلیت کو دعوت مبارزت دیتے ہیں۔ جب سائنس کی بنیاد پر کسی قوم کو، امت یا فرد کو دعوت دی جاتی ہے تو سب سے پہلے آپ اس بات پر ایمان لایا جاتا ہے کہ اس فرد، امت یا قوم کا علمی منہاج یعنی راست حقیقت، اصل سچ اور اصل کسوٹی سائنس ہے ان کے جعلی حق سے الحق کی تائید وتصدیق یا توجیہہ انبیاء کا طریقہ کار نہیں ہے۔ انبیاء اپنے علمی منہاج اور اپنی مابعد الطبیعیات کے سوا ہر شئے فلسفے، علم، تصور علم اور منطق کا انکار کرتے ہیں اور صرف اپنے منہاج علم کے ذریعے دعوت دین دیتے ہیں، اسی لیے حضرت ابراہیمؑ کا موقف قرآن نے بیان کرتے ہوئے قیامت تک کے لیے واضح کر دیا کہ اسلام اور کفر میں مصالحت ممکن نہیں دونوں کا منہاج علم اور مابعد الطبیعیات مختلف ہے۔ جو ہماری مابعد الطبیعیات اور منہاج علم پر ایمان نہ لائے توحید خالص قبول نہ کرے اس سے ہماری عداوت ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ

مِنْ شَیْءٍ رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا وَاِلَیْکَ اَنَبْنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ [الممتحنہ:۴]

دعوت کے نبوی طریق سے انحراف: خطرناک نتائج:

انبیاء کرام مشرکین کے سامنے خالص دعوت حق پیش کرتے تھے اور وہ دعوت قبول کر لی جاتی تھی لہٰذا آج بھی انبیاء کے بتائے ہوئے طریقے سے دین کی دعوت ہی مطلوبِ دین ہے اس کے سوا دوسرے طریقے محض بدعت ہیں اور یقیناً ناپائیدار بھی اور ان کے نتائج نہایت خطرناک ہیں یہ خطرے تین قسم کے ہیں:

[۱] پہلا خطرہ یہ ہے کہ جس فرد یا قوم کو آپ سائنس کی بنیاد پر دعوت دیتے ہیں اگر سائنس کا وہ مفروضہ کل غلط ثابت ہوا تو آپ کی پوری عمارت منہدم ہوگئی اور دین اس امت اور قوم کے لیے ابدی طور پر نا قابل قبول ہوگیا۔

[۲] دوسرا خطرہ یہ ہے کہ دعوت دین کے لیے انبیاء کا طریقہ ترک کر کے نیا طریقہ ایجاد و اختیار کرنا ہوگا۔ ایسا طریقہ جو مخاطب اور داعی کے مابین مشترک ہو یعنی دعوت مشترکہ اتفاقی نکات کے تناظر میں ہی دی جائے گی، چونکہ توحید و شرک میں اتحاد ممکن نہیں تو دعوت کا مشترکہ نکتہ صرف جدید سائنس ہوگا جس پر کفر و اسلام متفق ہوں گے، جس شے، یعنی سائنس، پر دونوں گروہ متفق ہوں گے تو اس کے نتیجے میں بہترین، اعلیٰ اور افضل علم تو سائنس قرار پایا، جس کے باعث دو متحارب اور مخالف گروہوں میں اشتراک کی صورت پیدا ہوگئی۔ سائنس سے حاصل علم عقلی، تجربی، حسی اور اختیاری یعنی طبیعی ہوتا ہے جو اس مادی دنیا سے نکلتا اور اس مادی دنیا میں کام آتا ہے، وحی الٰہی اور پیغام نبوی جو خارجی دنیا سے آتے ہیں، پیمانۂ حق ہمیشہ اس دنیا سے باہر ہوتا ہے، اب اس دنیا کے اندر آ گیا اور یہ پیمانہ بھی عقلی، تجربی اور طبیعی ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں پیمانہ یہ طبیعی دنیا اور اس دنیا کا انسان اور اس کا طبیعی علم سائنس بن گئے یہ خطرناک ترین راستہ ہے۔

[۳] تیسرا خطرہ جو مسلمانوں کو درپیش ہے وہ یہ کہ جب قرآن کی علمی تفسیر یعنی سائنسی تفسیر سائنسی دلائل کی بنیاد پر لوگوں کا ایمان تازہ کرے گی تو یہی ان کا مزاج یعنی لوگوں کا شعور فطری شعور کے بجائے سائنسی شعور بنتا چلا جائے گا تازگی ایمان کے لیے روزانہ تازہ سائنسی دلیلیں مہیا کرنا ہوں گی اور سائنس کے بدلتے ہوئے دھارے کے ساتھ ساتھ قرآن کے تفسیری مطالب بھی بدلنے ہوں گے ورنہ عوام الناس غیر سائنسی تفسیر قبول نہ کریں گے۔ جس طرح آج کل آبِ زم زم کے کمالات علم آبیات کے مختلف سائنس داں ثابت کر رہے ہیں کہ اس میں نمکیات، حیاتیات اور بے پناہ فوائد کا خزانہ چھپا ہوا ہے، اب مسلمان آبِ زم زم اگر اس لیے پی رہے ہیں کہ سائنس نے اس کی شہادت دی ہے گویا آبِ زم زم کی برکت پر ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و ہدایت سے منتقل ہو کر سائنس کے اعداد شمار اور شبہات پر قائم ہوگیا، کل کوئی بہت بڑا سائنس داں اپنے تجربات و تحقیقات سے ثابت کر دے کہ آبِ زم

زم صحت کے لیے ہمیشہ سے خطرناک رہا ہے اس کا استعمال ترک کر دینا چاہیے تو جدید سائنسی ذہن جس کی بنیاد سائنس کے منہاج علم پر تعمیر ہوئی ایک لمحے کے توقف کے بغیر آب زم زم کا استعمال یقیناً ترک کر دے گا کیونکہ عقل و عشق کی تربیت سائنسی منہج [Scientific Paradigm] پر ہوئی ہے، اگر عشق و عقل کی تربیت ایمانیات کی سطح پر عقیدے کے منہاج میں ہو تو مسلمان قیامت تک آب زم زم پیتے رہیں گے۔ خواہ سائنس اس پانی کے استعمال کے ایک لاکھ نقصانات ثابت کر دے، یہ رویہ پیغمبر کی اتباع میں ہوگا نہ کہ سائنس کی تقلید میں۔ مسلمان حج و عمرے کے موقع پر سر منڈواتے ہیں اب اس کی سائنسی تشریح و توجیہہ اس عمل کے حق میں کر دی جائے تو لوگ بغیر حج و عمرہ کے بھی سائنسی صحت کی خاطر سر منڈانے لگیں گے کہ اس کے بہت سے سائنسی طبی، مادی، طبیعی اور نفسیاتی فائدے ہیں، لیکن اگر کل یہ سائنسی توجیہہ آ جائے کہ اُسترے سے سر منڈایا جائے تو بالوں کی نشو و نما متاثر ہوتی ہے سر کی باریک رگیں سکڑ جاتی ہیں جس سے خون کی روانی میں فرق آ جاتا ہے اور گنج پن کے خطرات نوے فی صد بڑھ جاتے ہیں تو لوگ سر منڈانا ترک کر دیں گے بلکہ عقیقے کی رسم بھی ختم ہو جائے گی۔ تحنیک کی سنت جس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کھجور چبا کر نومولود کے تالو پر لگا دیتے تھے اب امت مسلمہ میں تقریباً متروک ہوگئی ہے ،اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ لوگوں کو یہ سنت یاد ہی نہیں رہی اور جدیدیت کے طوفان باد و باراں میں بے شمار روایتوں کے ساتھ ساتھ یہ دینی روایت بھی گرد و غبار میں دب گئی ہے، دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اب محلوں اور بڑے گھرانوں سے بزرگوں کا تقریباً خاتمہ ہوگیا ہے پہلے ہر محلے ہر گھرانے میں کوئی نہ کوئی بزرگ ہستی ایسی موجود رہتی تھی جس کا علم اور ایمان اور عمل اس بستی، محلے، علاقے اور خاندان کے لیے سورج کی طرح روشن ہوتا تھا۔ جدید تعلیم کے عام ہونے کے بعد ایسی نسل ختم ہوگئی اور جدید تہذیب کے بوڑھے بھی جوانوں سے آگے نکل گئے ہیں لہٰذا لوگ اس رسم کو زندہ کرنے کے لیے کن کے پاس جائیں؟ بزرگوں کی جگہ اب دنیادار بوڑھے رہ گئے ہیں جو دنیا داری میں جوانوں سے پیچھے نہیں رہتے۔ جدید سائنس سے مرعوب اذہان اور قلوب و دماغ فوراً کہہ دیں گے کہ کھجور میں لعاب ہوتا ہے لعاب غیر سائنسی شے ہے اس میں جراثیم ہوتے ہیں لعاب کا تالو پر لگانا حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے تو کیا سائنس کی تائید میں سنت رسول ترک کر دی جائے؟ سائنسی ذہن ترکِ سنتِ رسولؐ میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ ہم سر اپنے پیغمبر کی سنت کے اتباع میں منڈاتے ہیں خواہ سر پر بال آئیں یا ہم ہمیشہ کے لیے فارغ البال ہو جائیں، اتباع سنت محمدیؐ لازم ہے اس کی بنیاد نقلی دلیل پر ہے عقلی دلائل کی اساس پر نہیں۔ یہ سوال کہ اگر اس عمل کی کوئی عقلی سائنسی منطقی توجیہہ مل جائے تو کیا حرج ہے؟ قاس ضمن میں تمام سابقہ دلائل اس حرج کی شرح و تفصیل میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

قرآن نے حکم دیا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اسے خاموشی سے سنا جائے اس حکم کی موجودگی میں اگر آیات قرآنی پیش کرنے پر حاضرین تالیاں پیٹیں تو یہ عمل نص کی خلاف ورزی

ہے۔ قرآن العلم ہے جسے علم کے حاصل ہو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قرآن سن کر سجدے میں گر جاتا ہے: قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا [۱۷:۱۰۷] علم کا تقاضا سجدہ ہے جو سجدے سے محروم ہے وہ علم اور علم کی روح اور لذت سے محروم ہے اسی لیے فقیہہ اگر عابد، اور ساجد نہ ہو تو وہ فقیہہ نہیں علم ڈھونے والی مخلوق ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ [۵:۶۲] جس کی آواز خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے: وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ [۱۹:۳۱] قرآن نے العلم اور الحق سے منہ موڑنے والے کو جنگلی گدھے سے بھی تشبیہ دی ہے جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑتے ہیں: كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ [۷۴:۵۰] فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ [۷۴:۵۱] اس کے برعکس قرآن اہل علم اور اہل سجدہ کا مرتبہ بتاتا ہے کہ یہ وہ خوش نصیب لوگ جن کے لیے دنیا میں بھی بھلائی تھی اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر تھا [۱۶:۳۰] جو یوم آخرت اپنے اصل علم کی بناء پر نفس کو علم سمجھنے والوں کے بارے میں بتائیں گے۔ اہل علم اہل سجدہ ہیں جن کو قیامت کے دن کیا اعزاز حاصل ہوگا؟ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ [۱۶:۲۷]۔ اس لیے قرآن میں اہل علم کی شان یہ بتائی گئی کہ جب وہ رحمان کی آیات سنتے ہیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہیں: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا [۱۹:۵۸] بے علم وہاں سجدہ نہ کر سکے گا اسی لیے پروفیسر کیتھ مور سجدے کی نعمت سے محروم ہیں۔ یہ اہل علم ہوتے تو سجدے میں گر جاتے، علم کا تقاضا مطالبہ اور حاصل صرف سجدہ ہے جو عالم ساجد اور عابد نہ بنے وہ عالم نہیں جاہل ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو گدھے [حمار] اور کتے [کلب] سے تشبیہ دی، انھیں مخلوقات میں سب سے بدترین مخلوق [شر الدواب] قرار دیا ہے۔ سورۃ اعراف میں طالب دنیا دین داروں کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا گیا کہ اس کی حالت کتے جیسی ہوگی: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ...... وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ [۷:۱۷۵، ۱۷۶]۔ اسی لیے قرآن بتاتا ہے کہ جو دنیا میں علم حاصل کر کے یا علم کے بغیر سجدہ نہیں کرتا وہ قیامت کے دن بھی سجدہ نہ کر سکے گا جو نفس، مال اور دنیا کی سجدہ گاہ پر سر نیاز جھکاتا ہے وہ حقیقی الٰہ کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے؟ جو پیشانی غیر اللہ کے سامنے جھک جائے وہ اللہ کے سامنے جھکنے کے

شرف سے محروم ہو جاتی ہے:۔ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ [۴۲:۸۶] خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ [۴۳:۸۶] قرآن بتاتا ہے کہ یہ لوگ دنیا میں علم والے تھے انھیں دنیا میں بھی آخرت کا علم حاصل تھا دنیا کو جاننے اور آخرت کی حقیقت پہچاننے کے لیے العلم کی ضرورت ہوتی ہے یہی علم دنیا بھی سنوارتا ہے اور آخرت بھی بناتا ہے، اہل دنیا اس علم کو علم ہی نہیں سمجھتے۔

اس سوال پر غور کی ضرورت ہے کہ نائیک صاحب کی خطابت سے مسحور ہونے والے قرآن سن کر سجدے کرنے کے بجائے تالیاں کیوں بجاتے ہیں؟ ان دونوں کے مابین کیا رشتہ ہے؟ داعی، مناظر اور متکلم کا کام لوگوں تک صرف علم پہنچانا، صرف دلائل کا طومار لگانا، صرف حوالوں پر حوالے پیش کرنا محض خطابت کا جادو جگانا، صرف لفظوں کی جھنکار اور لہجے کی للکار سے سحر طاری کرنا نہیں بلکہ ان کی تربیت، تزکیہ، اصلاح اور تذکیر کرنا بھی ہے، اسلامی تاریخ میں کبھی قرآن کی آیات پر تالیاں پیٹنے کی روایت نہیں ملتی قرآن کی آیات پڑھنا پڑھانا اور سننا سنانا اس کا حوالہ دینا اس سے استدلال کرنا عین عبادت ہے، اس عبادت کے درمیان تالیاں پیٹنا یا پٹوانا مشرکین مکہ کا طرز عمل تھا جس کی قرآن نے جا بجا مذمت کی سورۃ انفال میں اس معاملے کی منظر کشی کرتے ہوئے خالق ارض وسماء فرماتے ہیں: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ [سورۂ انفال: ۳۵] ترجمہ: بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں، ذاکر نائیک صاحب نے اپنے خطیبانہ معرکوں میں داد وصول کرنے کے لیے آیات قرآن پر تالیاں بجوانے کی جس روایت وثقافت کو فروغ دیا ہے وہ روایت اسلامی تہذیب واخلاقیات کے ملبے پر تعمیر ہوئی ہے۔ پندرہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں کسی مناظر، مفکر، مفسر، محدث کی خطابت تقریر، درس، وعظ، مجلس، محفل میں قرآنی آیات کے حوالوں پر نہ کبھی تالی بجائی گئی نہ کبھی بجوائی گئی۔ دین سنجیدگی، تحمل اور بردباری کا نام ہے، شو بزنس، چھچھورپن، شور شرابے، دھوم دھڑکے اور ملے گلے کا نام نہیں، جناب ذاکر نائیک نے اپنی نشستوں میں قرآنی آیات پر تالیوں کے ذریعے امت مسلمہ کی پندرہ سو سالہ تاریخ وتہذیب وروایت بدل دی ہے اور اس امت کو احساس تک نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا، وہ خطابت کے سحر میں اور تالیاں پیٹنے کے مرض میں مبتلا ہیں، جو قومیں صرف تالیاں بجا کر فتح کے شادیانے نکالتی ہیں وہ تاریخ میں تالیوں کی گونج بن کر مقید ہو جاتی ہیں۔ دین، ہزل، لہو ولعب، میلے ٹھیلے، ہنگامے، شور شرابے، دھوم دھڑکے اور تماشے کا نام نہیں، عصر حاضر کے مسلمانوں کو دین بھی اسی رنگ وآہنگ اور اسی اسلوب میں پسند آتا ہے جو مغرب کو مطلوب ہے۔ قرآن نے اہل کفر کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ وہ جب اللہ کی آیات سنتے ہیں تو شور وغل کرتے: هزوا اور لهو و لعب میں مبتلا ہوتے تالیاں پیٹتے سیٹیاں بجاتے مسخرہ پن کرتے مضحکہ اڑاتے ہیں فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ

[۱۱۰:۲۳] یہ وہ لوگ ہیں جو شک میں پڑے کھیل رہے ہیں: بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ [۹:۴۴] یہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے تو ان سے کہو کیا تمھاری ہنسی اور دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہی ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ [۶۵:۹]۔ جبکہ مومنین بردبار اور متحمل مزاج ہوتے ہیں لیکن قیامت کے دن کفار پر ضرور ہنسیں گے: فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ [۳۴:۸۳] اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ [۹۸:۱۶] قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھو: اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا [۴:۷۳]، اور جب قرآن پڑھایا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ [۲۰۴:۷] قرآن اپنے منکرین کا رویہ یہ بتاتا ہے کہ وہ قرآن سن کر تالیاں پیٹتے ہنستے ہیں مگر روتے نہیں ہیں اور گا بجا کر انھیں ٹالتے ہیں جبکہ قرآن حکم دیتا ہے کہ تالیاں نہ پیٹو، سیٹیاں نہ بجاؤ، گا بجا کر ٹالنے کی کوشش نہ کرو بلکہ جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجالاؤ: اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ...... وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ...... وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ...... فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا [۵۹:۵۳، ۶۰، ۶۱، ۶۲] عہد حاضر کے خدا سائنس پر ایمان اور اس کائنات کے حقیقی الٰہ مالک الملک پر یقین ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔ سائنس سے اسلام کو ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مادی خدا کے ذریعے حقیقی الٰہ تک رسائی حاصل کی جائے لہٰذا سائنس اور اسلام کی بات کرنے والے عملاً دو خداؤں کے ذریعے اس کائنات کی تفہیم و ادراک پر اصرار کرتے ہیں، جبکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ دو خدا نہ بنالو خدا تو بس ایک ہی ہے: وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ [۵۱:۱۶]، پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر کسی اور سے ڈرو گے: وَ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ [۵۲:۱۶]۔ ان تمام دلائل کی روشنی میں ہم ذاکر نائیک صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کریں گے: قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ [البقرہ ۱۶] تم کہو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ کو زیادہ علم ہے۔

ـــــــــــــ ضمیمہ ـــــــــــــ

بارہواں باب

فلسفہ سائنس کے مورّخ اے۔ایف چامر کی تحقیقات کا خلاصہ

عہد حاضر میں سائنس کو اصل علم بلکہ العلم کا درجہ دے دیا گیا ہے، مارکس ازم جیسے مفروضات پر مبنی نظریے کا بھی دعویٰ ہے کہ وہ سائنسی ہے، لہٰذا پیائش، مشاہدہ، شک، تجربہ اور تردید کے عناصر ترکیبی "Measurement, observation, Doubt experiment اور refutation" ہی علم کی بنیاد بن گئے اور یہ ظنی غیر یقینی، غیر معتبر علم ہی عہد حاضر میں "العلم" قرار پایا۔ کسی موضوع سے متعلق اصولوں کی نوعیت طے کرنے کے لیے کیے گئے مشاہدے، مطالعے اور تجربے سے ماخوذ منظّم علم کو سائنس کہا جاتا ہے، یہ علم تجربے اور مفروضے کے لیے واقعات، اصول اور نتائج کی تحقیق و تنظیم کے لیے موثر ہے۔ سائنس عالم طبیعی کا منظّم علم ہے جو منظّم ترتیب کی اساس پر قائم فنی قابلیت یا ہنرمندی سے معمور ہے، یہ مشاہدہ، تجربہ، پیائش اور ان واقعات کی عمومی تشریح کے لیے ماخوذ کلیات پر مبنی عالم مادی و طبیعی کے رویے اور فطرت کے منظّم مطالعے، فنی قابلیت و ہنرمندی کا امتزاج ہے بالفاظ دیگر سائنس وہ علم ہے جو صرف اور صرف طبیعی دنیا سے متعلق مشاہدے، تجربے، پیائش اور معلومات کے نظم اور ان سب کی تنظیم کا مجموعہ ہو۔ اس علم کا تحقیق، پڑتال، تکذیب، تجربہ، معائنہ اور تصدیق کے قابل ہونا ضروری ہو۔ یہ تمام معاملات سائنسی منہاج کے تحت ہی قابل تصدیق ہوں جو چیز ہمہ وقت خود تصدیق و توثیق کی محتاج ہو اور جس کی تردید و تکذیب بار بار تصدیق کے باوجود ہمہ وقت ممکن ہو، وہ علم مصدقہ علم کیسے ہوسکتا ہے۔ منظّم علم کی اصطلاح سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، اگر سائنس منظّم علم کا نام ہے تو کیا منظّم جرائم کو بھی سائنس کے دائرے میں داخل کرلیا جائے؟ سائنٹفک اسٹرکچر پر کوہن کے نظریات کا نقد، پاپر، لے کاٹوش اور فیرابینڈ نے اپنے اپنے انداز کیا ہے، Feyerabend نے اپنے مضمون On the Critique of Scientific Reason میں لکھا ہے کہ کوہن نے سائنس کے دفاع میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منظّم جرم اور آکسفورڈ کا فلسفہ بھی سائنس کے معیار پر پورا اترتا ہے، لہٰذا سائنس کہلا سکتا ہے۔ چامر کے الفاظ میں بحث کا خلاصہ پڑھیے:

"Kuhn's demarcation criterion has been criticized by Popper

on the grounds that it gives undue emphasis to the role of criticism in science; by Lakatos because, among other things, it misses the importance of competition between research programmes (or paradigms); and by Feyerabend on the grounds that Kuhn's distinction leads to the conclusion that organized crime and Oxford philosophy qualify as science."[1]

کیا قرآن سائنس کی طرح ایک منظم علم کا نام ہے؟ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ قرآن سائنسی علم ہے یا سائنٹفک میتھڈ کے معیار پر پورا اترتا ہے تو کیا یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن قابل تکذیب ہے؟ کیوں کہ سائنٹفک میتھڈ وہ طریقہ ہے جس میں تکذیب وتردید کا امکان یقینی طور پر تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جس نتیجے، نظریے، اور اصول کو لازمی، حتمی، ابدی، یقینی اور ناقابل تغیر تسلیم کیا جائے اسے سائنس علم تسلیم نہیں کرتی وہ دائرہ علم سے باہر کی شے ہے۔ اس لیے قرآن وسنت اور اجماع نہ سائنسی علم کہلا سکتا ہے نہ سائنٹفک میتھڈ پر پورا اتر سکتا ہے کیونکہ ان کی تکذیب وتردید ممکن نہیں، قرآن سائنسی علم نہیں کیوں کہ یہ حقیقت مطلق کی جانب سے نازل کردہ علم کلی ہے۔ یہ لوح محفوظ پر ثبت ہے۔ اس علم میں شک، شبہے، تردید اور تکذیب کا ذرہ بھر امکان نہیں۔ قرآن صرف اسی وقت سائنسی ہو سکتا ہے جب ہم قرآن میں کسی بھی وقت تردید، تنسیخ، تکذیب یا ترمیم کے امکان کو تاریخ کے کسی بھی دور میں یقینی تصور کر لیں یہ یقین قرآن کو سائنسی علم کے دائرے میں داخل کر سکتا ہے۔ سائنسی علم وہ ہے جس پر یقین کے ساتھ شک کیا جا سکتا ہو یقینی شک ——— جہاں علم کا آغاز شک ہو اور انجام بھی ہمیشہ شک رہے شک سے ماوراء علم سائنس کی دنیا میں علم کہلانے کا مستحق ہی نہیں لہٰذا تمام دینی علوم، الہامی کتابیں، مذاہب، جو شک سے ماوراء علم مہیا کرتے ہیں سائنسی علم کے دائرے سے خود بخود خارج ہو جاتے ہیں۔ سائنس صرف قرآن کو ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی مذہبی کتابوں اور مذہبی دعووں، مابعد الطبیعیاتی افکار اور فلسفے کو بھی علم تسلیم نہیں کرتی۔ سائنس کے بارے میں مغرب کے مختلف مفکرین کے افکار کا خلاصہ پڑھ لینے کے باوجود یہ سوال پھر بھی باقی ہے کہ اگر یہ سب علوم سائنس کی اقلیم سے باہر ہیں تو پھر خود سائنس کیا ہے؟ اس سلسلے میں فلسفۂ سائنس کے فلسفی چامرکا موقف پڑھیے:

Marxists are keen to insist that historical materialism is a science. In addition, Library Science, Administrative Science,

---

1. A. F. Chalmers, *What Is This Thing Called Science?: An Assessment of the Nature and Status of Science and its Methods*, U.S.A.:Open University Press , 1988, p. 109.

Speech Science, Forest Science, Dairy Science, Meat and Animal Science. and even Mortuary Science are all currently taught or were recently taught at American colleges or universities. Self-avowed "scientists" in such fields will often see themselves as following the *empirical* method of physics, which for them consists of the collection of "facts" by means of careful observation and experiment and the subsequent derivation of laws and theories from those facts by some kind of logical procedure. I was recently informed by a colleague in the history department, who apparently had absorbed this brand of empiricism, that it is not at present possible to write Australian history because we do not as yet have a sufficient number of facts. An inscription on the facade of' the Social Science Research Building at the University of Chicago reads, "If you cannot measure, your knowledge is meagre and unsatisfactory". No doubt, many of its inhabitants, imprisoned in their modern laboratories, scrutinize the world through the iron bars of the integers, failing to realize that the method that they endeavour to follow is not only necessarily barren and unfruitful but also is not the method to which the success of physics is to be attributed.

The mistaken view of science referred to above will be discussed and demolished in the opening chapters of this book. Even though some scientists and many pseudo-scientists voice their allegiance to that method, no modern philosopher of science would be unaware of at least some of its shortcomings. Modern developments in the philosophy of science have pinpointed and stressed

deep-seated difficulties associated with the idea that science rests on a sure foundation acquired through observation and experiment and with the idea that there is some kind of inference procedure that enables us to derive scientific theories from such a base in a reliable way. There is just no method that enables scientific theories to be proven true or even probably true. Later in the book, I will argue that attempts to give a simple and straightforward logical reconstruction of the "scientific method" encounter further difficulties when it is realized that there is no method that enables scientific theories to be conclusively disproved either.[1]

سائنس کے بارے میں عموماً یہ غلط فہمیاں عام ہیں کہ سائنس معروضی علم، عالمگیر، سچ اور آفاقی علم ہے اور ناقابل تردید حقیقت —— سائنسی نتائج و تجربات کی تردید ممکن ہی نہیں ہے۔ اس موقف کی بلیغ ترجمانی درج ذیل نثر پارے میں کی گئی ہے:

Scientific knowledge is proven knowledge. Scientific theories are derived in some rigorous way from the facts of experience acquired by observation and experiment. Science is based on what we can see and hear and touch, etc. Personal opinion or preferences and speculative imaginings have no place in science. Science is objective. Scientific knowledge is reliable knowledge because it is objectively proven knowledge.[2]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام مندرجہ بالا دعوے جھوٹے، کاذب، باطل، لغو، غلط، بے بنیاد، اور فی

---

1. A.F. Chalmers, *What is This Thing Called Science? An Assessment of the Nature and Status of Science and its Methods*.pXVi

2. Ibid., p.1

ضمیمہ

الاصل سائنسی علم اور سائنٹفک میتھڈ سے کامل ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ اس جھوٹ کی حقیقت جاننے کے لیے P.K Feyerabend کی کتاب *Against Method* کا مطالعہ ضروری ہے۔ مغرب کا اہم ترین فلسفی Hume اصول استقرا [induction] کی منطقی اور تجربی توجیہہ کو ناممکن تصور کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ سائنس کو عقلی طور پر واضح نہیں کیا جاسکتا۔ ہیوم کی اصول استقرا پر تنقید Treatise on Human Nature Part-III میں دیکھی جاسکتی ہے۔ رسل نے اپنی کتاب *Problems of Philosophy* کے باب چھ میں اس موضوع پر نفیس بحث کی ہے۔ پاپر نے اپنی کتاب *Objective Knowledge* میں My Solution to the Problem of Induction کے زیر عنوان اصول استقرا پر بہترین روشنی ڈالی ہے لیکن عالم اسلام کے مفکرین ان مباحث سے ناواقف ہیں۔ وہ ابھی تک سائنس کے اصول استقرا سے اسلام و سائنس کو ثابت کر رہے ہیں۔

سائنس اور دوسرے علوم میں کوئی فرق نہیں، قدیم اساطیر اور Voodoo سائنس کی سطح پر ہی کھڑے ہیں۔ سائنس کی عصر حاضر میں پرستش اسی طرح کی جا رہی ہے جس طرح ماضی میں خدا کی عبادت کی جاتی تھی۔ عہد حاضر مذہب سائنس [Religion of Science] کا عہد ہے جس طرح لوگ مذہبی عقائد اور ایمانیات پر کوئی سوال نہیں اٹھاتے بالکل اسی طرح سائنس کے ظنی، قیاسی، اساطیری نظریات کو مذہبی اعتقادات کا درجہ دے کر اس مذہب کی عالمگیر عبادت ہو رہی ہے۔ اس موقف کا ترجمان Paul Feyerabend ہے، اس کا موقف چامر کے قلم سے پڑھیے:

One reaction to the realization that scientific theories cannot be conclusively proved or disproved and that the reconstructions of philosophers bear little resemblance to what actually goes on in science is to give up altogether the idea that science is a rational activity operating according to some special method or methods. It is a reaction somewhat like this that has recently led philosopher and entertainer Paul Feyerabend to write a book with the title *Against Method: Outline of an Anarchistic Theory of Knowledge* and a paper with the title "Philosophy of Science: A Subject with a Great Past". According to the most extreme view that has been read into Feyerabend recent writings, science has no special features that render it intrinsically superior to other

branches of knowledge such as ancient myths or Voodoo. A high regard for science is seen as the modern religion, playing a similar role to that played by Christianity in Europe in earlier eras. It is suggested that the choice between theories boils down to choices determined by the subjective values and wishes of individuals. This kind of response to the breakdown of traditional theories of science is resisted in this book. An attempt is made to give an account of physics that is not subjectivist or individualist, which accepts much of the thrust of Feyerabend's critique of method, but which itself is immune to that critique.[1]

ہیوم کے خیال میں سائنس کی عقلی توجیہہ ممکن ہی نہیں ہے اسے عقل کے ذریعے ثابت نہیں کیا جا سکتا، وہ سائنسی نظریات اور قوانین پر ایمان و یقین کو نفسیاتی عادتوں کے طور پر دیکھتا ہے، چامر کے الفاظ میں:

There are a number of possible responses to the problem of induction. One of them is a sceptical one. We can accept that science is based on induction and Hume's demonstration that induction cannot be justified by appeal to logic or experience, and conclude that science cannot be rationally justified. Hume himself adopted a position of that kind. He held that beliefs in laws and theories are nothing more than psychological habits that we acquire as a result of repetitions of the relevant observations.[2]

پاپر جیسا فلسفی تسلیم کرتا ہے کہ سائنس کوئی معروضی حقیقت [Objective Reality] نہیں، سائنس میں ہم اپنی غلطیوں [errors] سے سیکھتے ہیں سائنسی ترقی trial & error کے اصول کے ذریعے ہی ممکن ہے، کیونکہ مشاہداتی بیانات کے ذریعے منطقی طور پر آفاقی قوانین اور نظریے وضع کرنا

---

1. Ibid., p. xvii.
2. Ibid., p.19.

امر محال ہے۔ ہم ہر لمحے سچ کے بارے میں زیادہ جان سکتے ہیں اور سچ کے قریب پہنچ سکتے ہیں دوسرے معنوں میں ہم سچ کو مطلق طور پر پانے کی جدو جہد ہی کرتے رہتے ہیں لیکن اسے کبھی حاصل نہیں کر پاتے:

I can therefore gladly admit that falsificationists like myself much prefer an attempt to solve an interesting problem by a bold conjecture, *even (and especially) if it soon turns out to be false*, to any recital of a sequence of irrelevant truisms. We prefer this because we believe that this is the way in which we can learn from our mistakes; and that in finding that our conjecture was false we shall have learnt much about the truth, and shall have got nearer to the truth.[1]

سائنس، نظریے اور تجربات کے سہارے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ نظریے بنتے رہتے ہیں اور تجربات ہوتے رہتے ہیں نظریہ تخلیق کرنے والے بسا اوقات اپنے نظریے کے تجربی نتائج سے لاعلم ہوتے ہیں۔ دونوں کے مابین لازماً کوئی ربط و تعلق نہیں ہوتا لیکن کام چلتا رہتا ہے۔ ترقی ہوتی رہتی ہے۔ سائنس ایک سماجی تجربہ [social practice] ہے جس کی صورت گری میں ہزاروں لوگ مختلف سطحوں پر دن رات سرمایہ داروں کے اربوں کھربوں روپے کی سرمایہ کاری [capital] کے ساتھ مصروف عمل رہتے ہیں تب جا کر یہ نظری قضیہ مادی تجربے میں تبدیل ہوتا اور ایجاد کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایک سائنس داں اچانک کھڑا ہو گیا اس نے کوئی خیال، نکتہ پیش کر دیا پھر اسے تجربے سے گزار کر دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ محض نادانوں کا خیال ہوتا ہے لیکن سائنس کی تاریخ سے واقف اور سائنسی ایجادات کے مراحل سے آگاہ محققین جانتے ہیں کہ حکومت، ریاست، سرمایہ [capital]، سرمایہ دارانہ نظام [capitalism]، سرمایہ دارانہ نظم زندگی [market]، سرمائے کے بازی گر اداروں منی مارکیٹ، فنانشل مارکیٹ، کی قوتیں اور ہزاروں قسم کے ذہین دماغ مختلف سطحوں پر مختلف مراحل کے ذریعے مل جل کر کسی سائنسی نتیجے تک پہنچتے ہیں جب تمام قوتیں ایک ہی سمت میں اور ایک ہی نتیجے کے حصول کے لیے مصروف عمل رہتے ہیں تب کوئی ایجاد ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ کسی فرد کی تنہا کوشش کا مادی ظہور نہیں ہوتا بلکہ ایک بہت بڑے اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر اس عظیم اجتماعی کوشش میں سے ریاست، حکومت یا سرمایہ [capital] کو نکال دیا جائے تو

---

1. K. R. Popper , *Conjectures & Refutation*, London: Routledge & Kegan Paul, 1969, p. 231; A. F. Chalmers, *What Is This Thing Called Science?* p.43.

ــــــــــ ضمیمہ ــــــــــ

سائنس کا پھولتا پھلتا غبارہ لمحوں میں پھٹ کر زمین پر گر جائے گا۔ جب دنیا کی تمام قوتیں افراد، ریاست، حکومت اور سرمایہ اور ادارے، ہی سمت اور ہی پر ایک ہی کام میں مصروف ہوں تو سائنسی ترقی کیوں ممکن نہ ہو! چامر کے الفاظ میں:

The maze af propositions involved in a body of knowledge at some stage in its development will, in a similar way, have properties that individuals working on it need not be aware of. The theoretical structure that is modern physics is so complex that it clearly cannot be identified with the beliefs of anyone physicist or group of physicists. Many scientists contribute in their separate ways with their separate skills to the growth and articulation of physics, just as many workers combine their efforts in the construction of a cathedral. And just as a happy steeplejack may be blissfully unaware of the implication of some ominous discovery made by labourers digging near the cathedral's foundations, so a lofty theoretician may be unaware of the relevance of some new experimental finding for the theory on which he works. In either case, relationships may objectively exist between parts of the structure independently of any individual's awareness of that relationship.[1]

So far I have outlined an objectivist view that focuses on theories as explicitly expressed in verbal or mathematical propositions. However, there is more to science than this. There is also the practical aspect of a science. A science, at some stage in its development, will involve a set of techniques for articulating, applying and testing the theories

---

1. Ibid., p.116.

of which it is comprised. The development of a science comes about in a way analogous to that in which a cathedral comes to be built as a result of the combined work of a number of individuals each applying their specialized skills. As J. R. Ravetz has put it, "Scientific knowledge is achieved by a complex social endeavour, and derives from the work of many craftsmen in their very special interaction with the world of nature". A full objectivist characterization of a science would include a characterization of the skills and techniques that it involves.[1]

سائنس کتنی معروضی [objective] ہے اور کتنی موضوعی [subjective]۔ سائنس کے جس نظریے کو سائنس دانوں اور ماہرین کے نزدیک درست، حق، سچ اور بالکل صحیح سمجھا جا رہا ہو عین ممکن ہے کہ وہ بالکل غلط ہو اور سائنس داں جس نظریے کو بالکل غلط سمجھ رہا ہو عین ممکن ہے کہ وہی بالکل درست ہو یعنی نہ سچ کا پتا ہے نہ جھوٹ کی خبر۔ کچھ ہوتا رہتا ہے صحیح اور غلط ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فلسفۂ سائنس کے علماء کہتے ہیں کہ سائنس کے نظریات کی نہ کلی تصدیق ممکن ہے نہ کلی تردید، کبھی تصدیق رہ جاتی ہے کبھی تردید ہو جاتی ہے آج جو صحیح ہے کل غلط ہو سکتا ہے اور پرسوں غلط صحیح ہو سکتا ہے سائنس اسی اٹکل پچو عمل اور ردعمل کا نام ہے۔ چیزیں موجود ہوتی ہیں، بہت سی تخلیقات، مصنوعات وجود رکھتی ہیں لیکن ان کے اندر کیا کمالات پوشیدہ ہیں ان کو کس کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان سے کیا کیا مادی فائدے اور فتوحات حاصل کی جا سکتی ہیں اس کے لیے ایک خاص ذہنیت، خاص نظریے، خاص فلسفے، خاص فکر، خاص مزاج اور موضوعیت [Subjectivity] کی ضرورت ہوتی ہے، اس نظریے اور موضوعیت کے بغیر، جو اپنی جڑیں مابعد الطبیعیات میں رکھتا ہے، اشیا کے وجود سے کوئی نئی شے تخلیق ہی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جس سرزمین عرب پر تشریف لائے وہاں تیل موجود تھا جو اب عربوں کی معیشت کا خاص ہتھیار ہے لیکن اس تیل کو صدیوں تک استعمال نہیں کیا گیا آخر کیوں؟ کیا اسے استعمال کر کے اسلام شرق و غرب میں نہیں پھیلایا جا سکتا تھا؟ مگر اس کے باوجود تیل اور اس کی متعلقات سے اسلامی تہذیب و تاریخ کا کوئی تعلق کبھی ظاہر نہ ہو سکا تو کیوں؟ عدسے ۱۲۸۵ء میں دریافت ہو گئے تھے مگر عدسوں کو ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر اس سے دوربین بنانے کا عمل تین سو سال بعد وقوع پذیر ہوا آخر دوربین بننے میں تین سو سال کیوں لگ گئے؟ ظاہر ہے عدسہ کا ہونا کوئی واقعہ نہیں عدسوں کو ایک خاص

---

1. Ibid., p.119.

طریقے سے رکھنا اس کے لیے ایک خاص قسم کے ذہن کا ہونا لازمی ہے جو ایک خاص تاریخ و تہذیب اور زماں و مکاں میں ظاہر ہو کر نتیجہ اخذ کرنے کا موضوعی ذہن [subjective mind set] رکھتا ہو اس نظریے کے بغیر جو خاص مابعد الطبیعیات اور زماں و مکان کے زیر اثر ظہر پذیر ہوا۔ عدے کبھی آگے پیچھے رکھے نہیں جا سکتے تھے۔ چالمرز اس کی وضاحت کرتے ہوئے پاپر کے حوالے سے لکھتا ہے:

My . . . thesis involves the existence of two different senses of knowledge or of thought: [1] *knowledge or thought in the subjective sense*, consisting of a state of mind or of consciousness or a disposition to behave or to act, and [2] knowledge or thought in an objective sense, consisting of problems, theories, and arguments as such. Knowledge in this objective sense is totally independent of anybody's claim to know; it is also independent of anybody's belief, or disposition to assent; or to assert, or to act. Knowledge in the objective sense is *knowledge without a knower; it is knowledge without a knowing subject.*[1]

Lakatos fully supported Popper's objectivism and intended his methodology of scientific research programmes to constitute an objectivist account of science. He talked of "the cleavage between objective knowledge and its distorted reflection's in individual minds and in a longer passage he observed,

...a theory may be pseudoscientific even though it is eminently "plausible" and everybody believes it, and it may be scientifically valuable even if it is unbelievable and nobody believes it. A theory may even be of supreme

1. K.R. Popper, *Objective Knowledge*, Oxford: Oxford University Press, 1979, pp.108-9.

scientific value even if no one *understands* it, let alone believe it.

The cognitive value of a theory has nothing to do with its *psychologihcal* influence on people"s minds. Belief, commitment, understanding are states of the human mind. . . But the objective, scientific value of a theory. . . independent of the human mind which creates it or understands it.[1]

Lakatos insisted that it was essential to adopt an objectivists position when writing the history of the internal development of a science. "A Popperian internal historian will not need to take any interest whatsoever in the persons involved, or in their beliefs about their own activities."[2] Consequently, a history of the internal development of a science will be "the history of disembodied science".[3]

The works of Ptolemy and Al Hazen provided opportunities for the development of optics that were not taken advantage of until the time of Galileo and Kepler. In his investigation of that problem, V. Ronchi, writes,[4]

Although we do not know who first invented spectacle lenses, we do know with some exactness when

---

1. J. Worrall and G. Currie[eds.], *Imre Lakatos. Philosophical papers Volume 1: The Methadology of Scientific Programmes*, Cambridge: Cambridge University Press, 1987, p.1.

2. Lakatos, "*History of Science and its Rational Reconstraction*", p.127.

3. Ibid., pp. 120-121.

4. V. Ronchi, "The INfluence of the Early Development of Opticks on Science and Philosophy", In *Galileo: Man of Science*, [ed., E. McMullil], New York:Basic Books, 1967, pp.195-206.

they were first introduced: somewhere between 1280 and

1285. Yet the first telescope did not appear until around 1590. Why did it take three whole centuries to put one spectacle lens in front of another?[1]

فیرابینڈ نے مذہب سائنس [Religion of Science] کے بارے میں دوصدیوں سے خواہ مخواہ قائم مرعوبیت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی کتاب *Against Method* سائنس کی حقیقت کھول کر رکھ دیتی ہے۔ فیرابینڈ نے اپنی تمام تحریروں میں سائنس کے بارے میں خود ساختہ عقائد اور نظریات پر تابڑ توڑ حملے کیے ہیں۔ اس کے حملوں کا کوئی تا حال موثر جواب نہیں دیا جا سکا۔ دوصدیوں تک مذہب سائنس کے اندھیروں میں بھٹکنے والے مغربی مفکرین فیرابینڈ کی مہیا کردہ روشنی میں حیران ہو کر رہ گئے کہ ہم کس دھوکے میں تھے۔ سائنس اور علم —— سائنس اور حقیقت —— وراء الورا کا علم تاریخ انسانی کا سب سے بڑا دھوکا تھا۔ فیرابینڈ سائنس اور دیگر علوم، فلسفے، جادو، دیو مالا، اساطیر وغیرہ وغیرہ میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ فیرابینڈ کے افکار کا سہل ترین خلاصہ اور بہترین وضاحت چامر کے الفاظ میں پڑھیے:

Feyerabend makes a strong case for the claim that none of the methodologies of science that have so far been proposed are successful. The main, although not the only, way in which he supports his claim is to show how those methodologies are incompatible with the history of physics. Many of his arguments against the methodologies which I have labelled inductivism and falsificationism resemble those that appear in the earlier chapters of this book. Indeed, the views expressed there owe some debt to Feyerabend's writings. Feyerabend convincingly argues that methodologies of science have failed to provide rules adequate for guiding the activities of scientists. Furthermore, he suggests that, given the complexity of history, it is most implausible to expect that science be explicable on the basis of a few simple methodological rules. To quote Feyerabend at some length:

1. Ibid., pp. 127-128.

The idea that science can, and should, be run according to fixed and universal rules, is both *unrealistic vernicious*. It is unrealistic, for it takes too simple a view of the talents of man and of the circumstances which encourage, or cause, their development. And it is pernicious for the attempt to enforce the rules is bound to increase our professional qualifications at the expense of our humanity. In addition, the idea is *detrimental* to science, for its neglects the complex physical and historical conditions which influence scientific change. It makes science less adaptable and more dogmatic.....

Case studies such as those reported in the preceding chapters. . . speak *against* the universal validity of any rule. All methodologies have their limitations and the only "rule" that survives is "anything goes"[1] ....

...A passage from an article by Feyerabend written a decade before Against Method illustrates the fact that "anything goes" should not be interpreted it too wide a sense.In that passage, Feyerabend attempts to distinguish between the reasonable scientist and the crank.

The distinction does not lie in the fact that the former ["respectable" people] suggest what is plasible and promises success, whereas the latter [cranks] suggest what is implausible, absurd, and bound to fail. It cannot lie in this because we never know in advance which theory will be successful and which theory will fail. It takes a long time to

1. Paul Feyerabend, *Against Method: Outline of an Anarchistic Theory of Knowledge*, London: New Left Bokks, 1975.

decide this question and every single step leading to such a decision is again open to revision. . . No, the distinction between the crank and the respectable thinker lies in the research that is done once a certain point of view is adopted. The crank usually is content with defending the point of view in its original, undeveloped, metaphysical form, and he is not at all prepared to test its usefulness in all those cases which seem to favour the opponent, or even to admit that their exists a problem. It is this further investigation, the details of it, the knowledge of the difficulties, of the general state of knowledge the recognition of objections, which distinguishes the "respectable thinker" from the crank. The original content of his theory does not. If he thinks that Aristotle should be given a further chance, let him do it and wait for the results. If he rests content with this assertion and does not start elaborating a new dynamics, if he is unfamiliar with the initial difficulties of his position, then the matter is of no further interest. However, if he does not rest content with Aristotelianism in the form in which it exists today but tries to adapt it to the present situation in astronomy, physics, and microphysics, making new suggestions, looking at old problems from a new point of view, then be grateful that there is at last somebody who has unusual ideas and do not try to stop him in advance with irrelevant and misguided arguments.[1]

---

1. Paul Feyerabend, "Realism and intrumentalism: Comments on the Logic of Factual Sapport", In *The Critical Approache to Science and Philosophy*, [ed., M. Bunge], New york : Free press, 1964,p.305.

Feyerabend's anarchist theory of knowledge and interpretations of concepts and the observation statements that employ them will depend on the theoretical context in which they occur. In some cases the fundamental principles of two rival theories may be so radically different that it is not possible even to formulate the basic concepts of one theory in terms of the other with the consequence that the two rivals do not share any observation statements. In such cases it is not possible to compare the rival theories logically. It will not be possible to logically deduce some of the consequences of one theory from the tenets of its rival for the purposes of comparison. The two theories will be incommensurable.

One of Feyerabend's examples of incommensurability is the relationship between classical mechanics and relativity theory. According to the former - interpreted realistically, that is, as attempting to describe how the world, both observable and unobservable, really is - physical objects have shape, mass and volume. Those properties exist in physical objects and can be changed as a result of physical interference. In relativity theory, interpreted realistically, properties such as shape, mass and volume no longer exist, but become relations between objects and a reference frame and can be changed, without any physical interaction, by changing from one reference frame to another. Consequently, any observation statement referring to physical objects within classical mechanics will have a different meaning to a similar looking observation statement in relativity theory. The two theories are incommensurable

and cannot be compared by comparing their logical consequences. To quote Feyerabend himself,

The new conceptual system that arises (within relativity theory) does not just *deny* the existence of classical states of affairs, it does not even permit us to formulate statements expressing such states of affairs. It does not, and cannot, share a single statement with its predecessor ——— assuming all the time that we do not use the theories as classificatory schemes for the ordering of neutral facts. . . the positivist scheme of progress with its "Popperian spectacles", breaks down.[1]

Other pairs of incommensurable theories mentioned by Feyerabend include quantum mechanics and classical mechanics, impetus theory and Newtonian mechanics, and materialism and mind-body dualism.

It does not follow from the fact that a pair of rival theories are incommensurable that they cannot be compared in any way. One way of comparing such a pair of theories is to confront each of them with a series of observable situations and to keep a record of the degree to which each of the rival theories is compatible with those situations, interpreted in its own terms. Other ways of comparing theories referred to by Feyerabend involve considerations of whether they are linear or non-linear, coherent or incoherent, whether they are daring or safe approximations and so on.[2]

1. *Against Method*, pp.275-76.

2. "*Changing Pattrns of Reconstruction*", p.365

If we are concerned with the problem of theory choice, then a problem arises concerning which of the several criteria of comparison are to be preferred in situations where the criteria conflict. According to Feyerabend, the choice between criteria and, consequently, the choice between incommensurable theories is ultimately subjective.

Transition to criteria not involving content thus turns theory choice from a "rational" and "objective" and rather one-dimensional routine into a complex discussion involving conflicting preferences, and propaganda will play a major role in it, as it does in all cases involving preferences.

In Feyerabend's view, incommensurability, although it does not remove all means of comparing rival incommensurable theories, leads to a necessarily subjective aspect of science.

What remains [after we have removed the possibility of logically comparing theories by comparing sets of deductive consequences] are aesthetic judgements, judgements of taste, metaphysical prejudice, religious desires, in short, *what remains are our subjective wishes.*[1]

I accept Feyerabend's view that some rival theories cannot be compared by merely logical means. However, I suggest that his drawing of subjectivist consequences from this fact needs to be countered in a number of ways. If we are to focus on the issue of theory choice, then I am prepared to admit that there will be some subjective element involved

1. *Against Method*, p.285.

when a scientist chooses to adopt or work on one theory rather than another, although those: choices will be influenced by "external" factors such as career prospects and availability of funds in addition to the kinds of consideration mentioned by Feyerabend in the above quotations. However, I think it needs to be said that, although individual judgments and wishes are in a sense subjective and cannot be determined by logically compelling arguments, this does not mean that they are immune to rational argument. The preferences of individuals can be criticized, for example, by showing that they are seriously inconsistent or by showing that they have consequences that the individual holding them would not welcome. I am aware that the preferences of individuals are not solely determined by rational argument and am aware that they will be strongly moulded and influenced by the material conditions in which the individual exists and acts. (A major change in career prospects is likely to have a greater effect on an individual's preferences than a rational argument, to give a superficial example.) Nevertheless, the subjective judgements and wishes of individuals are not sacrosanct and are not simply given. They are open to criticism and to change by argument and by alteration of the material conditions. Feyerabend welcomes his conclusion that science contains a subjective element because it offers the scientist a degree of freedom absent from the "more pedestrian parts" of science. I will have more to say about Feyerabend's conception of freedom in a later section.

My second kind of response to Feyerabend's remarks on

incommensurability takes us away from the issue of theory. Choice. Zahar's case study of the rivalry between Lorentz's and Einstein's
theories, suitably modified in the light of my objectivist account-of theory change, explains how and why Einstein's theory eventually replaced Lorentz's. The explanation is in terms 07 the extent to which Einstein's theory offered more objective opportunities for development than Lorentz's, and the extent to which those opportunities bore fruit when taken advantage of. That explanation is possible in spite of the fact that the theories are at least in part incommensurable in Feyerabend's sense, although h is not subjectivist. It must be conceded that subjective decisions and choices will be involved in the conditions specified by the sociological assumption on which my objectivist account of theory change depends. The account assumes that there are scientists with the appropriate
skills and resources to take advantage of opportunities for development that present themselves. Different scientists and groups of scientists may make different choices when responding to the same situation, but my account of theory change does not depend on the individual preferences guiding those choices.

3. Science not necessarily superior to other fields

Another important aspect of Feyerabend's view of science concerns the relationship between science and other forms of knowledge. He points out that many methodologists take for granted, without argument, that science (or, perhaps, physics) constitutes the paradigm of

rationality. Thus Feyerabend writes of Lakatos,

Having finished his "reconstruction" of modern science, he [Lakatos] turns it against other fields *as if it had already been established* that modern science is superior to magic or to Aristotelian science, and that it has no illusery results. However, there is not a shred of an argument of this kind. "Rational reconstructions" take "basic scientific wisdom" for *granted*, they do not *show* that it is better than the "basic wisdom" of witches and warlocks.[1]

Feyerabend complains, with justification, that defenders of science typically judge it to be supperior to other forms of knowledge without adequately investigating those other forms. He observes that "critical rationalists" and defenders of Lakatos have examined science in great detail but that their "attitude towards Marxism or astrology, or other traditional heresies is very different. Here the most superficial examination and most shoddy arguments are deemed sufficient" He backs up his claim with examples.

Feyerabend is not prepared to accept the necessary superiority of science over other forms of knowledge. Further, in the light of his incommensurability thesis, he rejects the idea that there ever can be a decisive argument in favour of science over other forms of knowledge incommensurable with it. If science is to be compared with other forms of knowledge then it will be necessary to investigate the nature, aims and methods of science and those other forms of knowledge. This will be done by the

1. *Against Method*, p.205.

study of "historical records textbooks, original papers, records of meetings and private conversations, letters and the like". It cannot even be assumed, without further investigation, that a form of knowledge under investigation must conform to the rule of logic as they are usully understood by contemporary philosophers and rationalists. Failure to conform to the demands of classical logic may well be, but is not necessarily, a fault. An example offered by Feyerabend concerns modern quantum mechanic. To consider the question whether the modes of reasoning involved in some version of that theory violate the dictates of classical logic or not, it is necessary to investigate quantum mechanics and the way in which it functions. Such an investigation may reveal a new kind of logic operating which can be shown to have certain advantages, in the context of quantum mechanics, over more traditional logic. On the other hand, of course, the discovery of violations of logic constitute a serious criticism of quantum mechanics. This would be the case, for example, if contradictions were discovered that had undesirable consequences; for example, if it were discovered that for every event predicted by the theory, the denial of that event is also predicted. I do not think Feyerabend would disagree with this latter point, but neither do I think he gives it due emphasis.

Voodoo, astrology and the like is not a pressing problem in our society, here and new. We are simply not in a position to. have a "free choice" between science and Voodoo, are Western rationality and that of the Nuer tribe.

Feyerabend defends what he refers to as the

"humanitarian attitude". According to that attitude, individual humans should be free and possess liberty in something like the sense John Stuart Mill defended in his essay "On Liberty". Feyerabend is in favour of "the attempt to increase liberty, to lead a full and rewarding life" and supports Mill in advocating "the cultivation of individuality which alone produces, or can produces, well developed human beings. From this humanitarian point of view, Feyerabend's anarchistic view of science gains support because, within science, it increases the freedom of individuals by encouraging the removal of all methodological constraints, whilst in a broader context it encourages a freedom for individuals to choose between science and other forms af knowledge.

From Feyerabend's point of view the institutionalizations of science in our society is inconsistent with the humanitarian attitude. In schools, far example, science is taught as a matter of course. "Thus, while an American can now choose the religion he likes, he is still not permitted to demand that his children learn magic rather than science at school. There is a separations between state and Church, there is no separations between state and science". What we need to do in the light of this, writes Feyerabend, is to. "free society from the strangling hold of an ideologically petrified science just as our ancestors freed *us* from the strangling hold of the One True Relgion!" In Feyeraband's image of a free society science will not be given preference over other forms of knowledge or other traditions. A mature citizen in a free society is "a person who

has learned to make up his mind and who. has then *decided* in *favour* of what he thinks suits him best". Science will be studied as a historical phenomenon "together with other fairy tales such as the myths of 'primitive' societies" so that each individual "has the information needed for arriving at a free decision". In Feyerabend's ideal society the state is ideologically neutral. Its function is to orchestrate the struggle between ideologies to ensure, that individuals maintain freedom choice and do not have an ideology imposed on them against their will.[1].

The notion of liberty and freedom of the individual that Feyerabend has taken over from Mill is open to a standard objection. That notion, which views freedom as freedom from all constraint, overlooks the positive half of the issue, namely, the possibilities within a social structure to which individuals have access. For example, if we analyze freedoms of speech in our society solely in terms of freedom from censorship, we overlook issues such as the extent to which various individuals have access to the media. The eighteenth century philosopher, David Hume, nicely illustrated the point I am getting at when he critized John Locke's idea of the Social Contract. Locke had construed the social contract as being freely adopted by members of a democratic society and argued that anyone not wishing to subscribe to the contract was free to emigrate. Hume replied, Can we seriously say, that a poor peasant or artisan has a

1. *Science in a Free Society*, London: New Left Books, 1978.

free choice to leave his country, when he knows no foreign language or manners, and lives from day to day, by the small wages which he acquires? We may as well assert that a man, by remaining in a vessel, freely conserts to the domination of the master; though he was carried on board while asleep, and must leap into the ocean and perish, the moment he leaves her.[1]

Each individual is born into a society that pre-exists and, in that sense, is not freely chosen. The freedom an individual possesses will depend on the position he occupies in the social structure, so that an analysis of social structure is a pre-requisite for an understanding of freedom of the individual. There is at least one place in *Against Method* where Feyerabend indicates that he is aware of this kind of point. In a footnote to a remark about freedom of research he notes:

The scientist is still restricted by the properties of his instruments, the amount of money available, the intelligence of his assistants, the attitudes of his colleagues, his playmates - he or she is restricted by innumerable physical, physiological, sociological, historical constraints.[2]

Feyerabend's subsequent talk of freedom of the individual fails to give adequate attention to the

---

1. The quotation from Hume's "Of the Original Contract" is in E.Barker,*Social Contract: Essays by Lock, Hume and Rousseau*, London: Oxford University Press, 1976,p.156.

2. Against Method, p.187.

constraints operating in society.[1]

سائنسی عمل کے نظری حصے حقیقت کی توجیہہ سے قاصر ہیں۔ سائنسی نظریات کو حقیقت جاننے کا عمل تصور کرنا محض غلط فہمی ہے۔ اکثر سائنسی نظریات محض افسانوی کہانیاں ہیں، جو ہر دور میں لوگوں کو فریب دیتی ہیں اور ہر مرتبہ یہ افسانوی حقیقتیں بدلتی چلی جاتی ہیں، یہ کیسی حقیقت ہے جو تصورات ذہنی کی طرح اڑتے ہوئے بادلوں کی طرح بدلتی رہتی ہیں۔ Realism کا بھی سچائی سے کوئی تعلق نہیں، دنیا فی الحقیقت کیا ہے؟ یہ کائنات اصل میں کیسی ہے؟ کوئی سائنسی نظریہ اس کی حقیقت بتا ہی نہیں سکتا اور جو کچھ حقیقت یا جزوی حقیقت بہ ظاہر معلوم بھی ہوتی ہے اس کے بارے میں ہمیں کیسے معلوم ہو کہ یہ وہی حقیقت ہے جو خالق حقیقت کے تصورِ حقیقت سے ہم آہنگ ہے، ظاہر ہے سائنس کے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں کیوں کہ جب تک حقیقت کا راست پیمانہ آپ کے پاس موجود نہ ہو آپ حقیقت کو کیسے مطابق حقیقت پائیں گے! اصلاً حقیقت کچھ نہیں ہوتی کانٹ کے الفاظ میں ہم حقیقت کو پا ہی نہیں سکتے لہٰذا ہم حقیقت تخلیق کر سکتے ہیں یا اپنے ذہن کے خیالات، تصورات کو زمانے پر مسلط کر سکتے ہیں اور اسے ہی حقیقت قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ سائنس تلاش حقیقت، حقیقت مطلق کی جستجو، خالق کائنات کی حقیقی آرزو کا نام ہے، محض خام خیالی ہے۔ سائنسی نظریات حقیقت [Reality] بیان کرنے سے عاجز و قاصر ہیں۔ Realism کیا حقیقت سے آگہی کا کوئی طریقہ ہے؟ اس کا دعویٰ تو یہی ہے لیکن اس دعوے پر یقین کرنے کی شہادتیں بہت کم ہیں اور جو کچھ میسر ہیں وہ انتہائی غیر معتبر ہیں۔ چامر لکھتا ہے:

According to an alternative view, which I will call instrumentalism, the theoretical component of science does not describe reality. Theories are understood as instruments designed to relate one set of observable states of affairs with others. For the instrumentalist, the moving molecule's referred to by the kinetic theory of gases are convenient fictions enabling scientists to relate and make predictions about observable manifestations of the properties of gases, whilst the fields and charges of electromagnetic theory are fictions enabling scientists to do likewise for magnets, electrified bodies and current-carrying circuits.

1. What Is This Things Called Science? pp. 136-143.

ضمیمہ

Realism typically involves the notion of truth. For the realist, science aims at true descriptions of what the world is really like. A theory that correctly describes some aspect of the world and its mode of behaviour is true, whilst a theory that incorrectly describes some aspect of the world and its mode of behaviour is false. According to realism, as typically construed, the world exists independently of us as knowers, and is the way it is independently of our theoretical knowledge of it. True theories correctly describe that reality. If a theory is true, it is true because the world is the way it is. Instrumentalism will also typically involve a notion of truth but in a more restricted way. Descriptions of the observable world will be true or false according to whether or not they correctly describe it. However, the theoretical constructs, that are designed to give us instrumental control of the observable world, will not be judged in terms of truth or falsity but rather in terms of their usefulness as instruments.

The idea that science aims at a true characterization of reality is often used as a counter to relativism. Popper, for example, uses truth in this way. According to that usage, a theory can be true even though nobody believes it and can be false even if everybody believes it. True theories, if they are indeed true, are not true relative to the beliefs of individuals or groups. Truth, understood as a correct characterization of reality, is objective truth for realists such as Popper.

Later in this chapter I will argue that the notion of truth typically incorporated into realism is problematic.

Before doing that I will take a more detailed look at instrumentalism and show how, on the face of it, realism seems to have distinct advantages over it.[1]

سائنس کے نظریے پہلے وجدانی، خیالی، افسانوی اور نظری سطح پر بیان کیے جاتے ہیں کوئی تصور، خیال، وجدان اور احساس سائنس داں کو متحرک کر دیتا ہے۔ پھر بہت عرصے بعد یہ افسانہ حقیقت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، جیسے کیکول کا وجدان، بینزین رنگ کے بارے میں، میکسویل کی الیکٹرو میگنیٹک تھیوری جسے آخر کار تجربے کی آنکھ سے مشاہدہ کیا گیا، کاپرنیکس کا نظریہ جو بالکل درست تھا کہ زمین گردش کر رہی ہے لیکن وہ اسے مشاہدات کی بنیاد پر تجربات سے بیان نہ کر سکا اور انسانی آنکھ سے نہیں دکھا سکا اسے پایہ ثبوت تک پہنچنے کے لیے کئی سال صرف ہو گئے۔ گیلی لیو نے اس کے علم کی صداقت کو دوربین کی آنکھ سے دکھا دیا:

The fact that theories can lead to novel predictions is an embarrassment for instrumentalists. It must seem a strange kind of accident to them that theories, that are supported to but mere calculating devices, can lead to the discovery of new kinds of observable phenomena by way of concepts that are theoretical fictions. The development of theories concerning the molecular structure or organic chemical compounds provides a nice example. The idea that the molecular structure of some compounds, benzene for instance, should consist of closed rings of atoms was first proposed by Kekule. Kekule himself had a somewhat instrumentalist attitude towards his theory and regarded his ring structure as useful theoretical fictions. On this view, it must be regarded as a remarkable coincidence that these theoretical fictions can nowadays be seen almost "directly" through electron microscopes. Likewise, instrumentalist

---

1. Ibid., pp. 146-147.

defenders of the kinetic theory of gases should have been somewhat taken aback to observe the results of collisions of their theoretical fictions with smoke particles in the phenomenon of Brownian motion. Finally, Hertz himself reported that he had been able to produce the fields of Maxwell's electromagnetic theory in a "visible and almost tangible form". Episodes such as these undermine the naive instrumentalist claim that theoretical entities have a fictitious or unreal existence in way that observable entities do not. Further difficulties with instrumentalism will come to light in section 4. [1]

Some contemporaries of Copernicus and Galileo took an instrumentalist attitude to the Copernican theory. Osiander, the author of the preface to Copernicus's main work, *The Revolutions of the Heavenly Spheres*, wrote:

...it is the duty of an astronomer to compose the history of the celestial motions through careful and skilful observation. Then turning to the causes of these motions or hypotheses about them, he must conceive and devise, since he cannot in any way attain to the true, causes, such hypotheses as, being assumed, enable the motions to be calculated correctly from the principles of geometry, for the future as well as the past. The present author [Copernicus] has performed both these duties excellently. For these hypotheses need not be true nor even probable; if they

1. Ibid., p. 149.

provide a calculus consistent with the observations that alone is sufficient.[1]

That is, the Copernican theory is not to be taken as a description of what the world is really like. It does not assert that the earth really moves around the sun. Rather, it is a calculating device enabling one set of observable planetary positions to be connected with other sets. The calculations become easier if the planetary system is treated as if the sun were at the centre.[1]

---

3. The correspondence theory of truth

As indicated in section I, the typical realist position incorporates a notion of truth in such a way that true theories can be said to give a correct description of some aspect of the real world. In this section I will investigate attempts that have been made to make more precise the notion of truth operative in this connection. Although I will not argue it here, I take it that the so-called "correspondence theory of truth" is the, only viable contender for an account of truth able to fulfill the demands of the realist, and I will restrict myself to discussion and criticism of that theory.

The general idea of the corrspondence theory of truth seems straightforward enough and can be illustrated by examples from common discourse in a way that makes it appear almost trivial. According to the correspondence

---

1. E.Rosen, *The Copernican Treatises*,NewYork: Dover, 1962,p.125.

1. Ibid., p. 150.

theory a sentence is true if it corresponds to the facts. Thus the sentence "the cat is on the mat" is true if it corresponds to the facts, that is, if there is indeed a cat on the mat, whilst the sentence is false if there is no cat on the mat. A sentence is true if things are as the sentence says they are and false otherwise.

One difficulty with the notion of truth is the ease with which use of it can lead to paradoxes. The so-called liar paradox provides an example. If I say "I never tell the truth" then if what I have said is true, then what I have said is false. Another well known example goes as follows: We imagine a card, on one side of which is written "The sentence written on the other side of this card is true", while on the other side of the card is written, "The sentence written on the other side of this card is false". It is not difficult to see how, given this situation, one can arrive at the paradoxical conclusion that either sentence on the card is both true and false.

The logician Alfred Tarski demonstrated how, for a particular language system, paradoxes can avoided. The crucial step was his insistence that, when one is talking of the truth or falsity of the sentences in some language system, one must carefully and systematically distinguish sentences in the language system that is being talked about, the "object language", from sentenes in the language system in which talk about the object language is carried out the "metalanguage". Referring to the paradox involving the card, if we adopt Tarski's theory then we must decide whether the sentences on the card are within the language system being talked about or within the language system in which the

talking is being done. If the sentences on both side of the card are taken to be in the object language then they cannot also be taken as referring to each other. If one follows the rule that each of the sentences must be in either the object language or the metalanguage but not in both, so that neither sentence can both refer to the other and be referred to by the other, then no paradoxes arise.

A key idea of Tarski's correspondence theory, then, is that if we are to talk about truth for the sentences of a particular language, then we need a more general language, the metalanguage in which we can refer both to the sentences of the object language and to the facts with which those object language sentences are intended to correspond. Tarski needed to be able to show how the correspondence notion of truth can be systematically developed for all sentences within the object language in a way that avoids paradoxes. The reason that this was a technically difficult task is that for any interesting language there is all infinite number of sentences. Tarski achieved his task for languages involving a finite number of single placed predicates, that is, predicates such as "is white" or "is a table". His technique involved taking as given what it means for a predicate to be satisfied by an object, x. Examples from everyday language sound trivial. For instance, the predicate "is white" is satisfied by object x, if and only if, x is white and the predicate "is a table" is satisfied by x, if and only if, x is a table Given this notion of satisfactioi1 for all the predicates of a language, Tarski showed how the notion of truth can be built up from this starting point for all the sentences of the

language. To use technical terminology, taking the notion of primitive satisfaction as given, Tarski defined truth recursively.

Tarski's result was certainly of major technical importance for mathematical logic. It had a fundamental bearing on model theory and also had ramifications for proof theory. It also showed why it is that contradictions can occur when truth is discussed in natural languages and indicated how such contradictions can be avoided. Did Tarski achieve more than this? In particular, did he go any way towards explicating the notion of truth in a way that might help us to understand the claim that truth is the aim of science? Tarski himself did not think so. He regarded his account as "epistemologically neutral". Others have not shared Tarski's view. Popper, for example, writes, "Tarski . . . rehabilitated the cor-respondence theory of absolute or objective truth which had become suspect. He vindicated the free use of the intuitive idea of truth as correspondence to the facts". Let us look at Popper's use of Tarski to see if he [Popper] is able to sustain the claim that it is meaningful to talk of truth as the aim of science.[1]

Apart from some minor aspects, such as the words used to denote the pre-existing features of the world, the end-point of a branch of science, the truth, will not be a social product at all. It is pre-ordained by the nature of the world before science is ever embarked on. Science, which is a social product, if it were ever to reach its end-point, so

1. Ibid., pp. 151-152.

conceived, would abruptly change from being a human, social product to being something that, in one strong sense, is not a human product at all. I, for one find this implausible to say the least.

An Important contribution of Popper's to the projest of construing science as a search for truth was his recognition of the importance of the idea of approximation An important contribution of Popper's to the project of construing science as a search for truth was his recognit to the truth. For Popper, the fallibalist, past theories that have; been replaced, such as the mechanics of Galileo or Newton, are false in the light of our current theories, whilst as far as modern Einsteinian or quantum physics is concerned, we cannot know that they are true. Indeed, they are most likely false and liable to be replaced by superior theories in the future. In spite of this falsity or likely falsity of our theories, falsificationists such as Popper wish to say that science has progressed ever closer to the truth; For example, they need to be able to say that Newton's theory is closer to the truth than Galileo's, even though both are false. Popper realized that it was important for him to make sense of the idea of approximation to the truth, so that, for instance, it makes sense to say that Newton's theory is a better approximation to the truth than Galileo's.

Popper attempted to make sense of approximation to the truth, or *verisimilitude* as he called it, in terms of the true consequences and false consequences of a theory. If we call the class of all true consequences of a theory its

truth-content, and the class of all false consequences of a theory its content, then we can say, quoting Popper,

> assuming that the truth-content and the falsity content of two theories t_1 and t_2 are comparable, we can say that t_2 is more closely similar to the truth, or corresponds better to the facts, than it if and only if either (a) the truth-content but not the falsity-content of t_2 exceeds that of t_1. (b) the falsity-content of t_1 but not its truth-content, exceeds that of t_2.[1]

We can say that the verisimilitude of a theory is something like the measure of its truth-content minus the measure of its falsitycontent. The claim that a science approaches the truth can now be restated, "as a science progresses, the verisimilitude of its theories steadily increases".[2]

I do not think this move of Popper's enables him to overcome the objections to the application of the correspondence theory to physics discussed in the previous section. Further, I think it can be shown that Popper's view of progress as successive approximation to the truth has an instrumentalist character out of keeping with his realist aspirations.

If we consider revolutionary changes in the development of physics, then not only is the theory that is replaced as a result of the , revolution inadequate in the light of the theory that replaces it, but it attributes features to the

1.K.R.Popper, *Conjecturesand Refutations*, p.233.

world that it does not possess. For instance, Newton's theory attributes a property "mass" to all systems or parts of systems in the world, whereas, from the point of view of Einstein's theory there is no such property. Einsteinian mass is a relation between a physical system and a reference frame. As we have seen, both Kuhn and Feyerabend have stressed the extent to which the mechanical world as described by Newton's theory is very different from the world as described by Einstein's theory. The outmoded and inadequate conceptions of mass, force, space and time, that are utilized in the formulation of Newtonian theory, are transmitted to all its deductive consequences. Therefore, strictly speaking, if we are talking in terms of truth and falsity, all of those deductive consequences are false. The truth content of Newton's theory is zero, as is the truth content of all mechanical theories prior to Einstein, The truth content of Einstein's theory itself may prove to be zero after some future scientific revolution. Viewed in this way, Pepper's attempt to compare "false" theories by comparing their truth and falsity contents, and thereby to construe science as approaching the truth, breaks down.

There is a way in which Popper's conception of approach to the truth can be rendered immune to this kind of criticism. This involves interpreting theories instrumentally. If, for example, we add to the claims of Newton's theory certain practical procedures for putting it to the test, definite procedures for measuring mass, length and time, we can say that a large class of the predictions of

Newtonian theory, interpreted in terms of readings on scales and clocks, and the like, will turn out to be correct within the limits of experimental accuracy. When interpreted in this way, the truth content of Newton's and other false theories will not be zero, and it may well be possible to apply Popper's conception of approximation to the truth to some series of theories within physics. However, this interpretation of Popper's theory of verisimilitude introduces an instrumentalist element that clashes with Popper's realist intentions as expressed elsewhere. It clashes, for instance, with the claim that "what we attempt in science is to describe and (as far as possible) explain reality".[1] In the next chapter I will give a strong argument to the effect that this instrumentalist retreat from realism is inadequate.[2]

---

1. K.R.Poper, *Obejective Knowledge*, Oxford: Oxford University Press,1972,p.40.

2. A.F.Chalmerrs, *What is this thing Called Science*, pp. 157-159.

Science
Claude Alvares

I was born into a culture that continues the exercise greater influence and power over behavior than modern science does, or will ever do. If that were properly understood, then this obituary were not appear either scandalous or scurrilous. Every culture enjoins on its members respect for certain entities, modern science does not find a place in our pantheon.

Far from it. From this side of Suez, in fact, modern science appears a kin to an imported brand of toothpaste. It contains elaborate promises and much sweetness and glamour. It can be used, if often used [many times pointlessly]. Yet can be dispensed with at any time precisely because it is still largely irrelevant of life.

Toothpaste has become a significant universal commodity: for some, it has even evolved into a category of mind. For decades now, it has remind [with the toothbrush] an essential adjunct of modern civilization, available from Managua to Manila. Those who have ingratiated themselves with modernity are prone to find any absence of toothpaste

[either for themselves or for others] a source of acute anxiety.

In our society, however, the moment we find toothpaste unavailable, we return to neem sticks, or cashew or mango leaves, or mixture composed of ginger, charcoal and salt. All excellent, locally available and dependant material for keeping the mouth fresh and disinfected and teeth clean.

Now modern science is universal commodity too, also distinctly recognizable form Managua to Manila, also approved my many whose devotion to its tenets and its propagation is more often than not related to its ability to provide high living wage and, often, in addition, power, prestige and chauffeur-driven car. Like the early morning toothbrush, science is considered a pre condition for a freshly mind world view uncontaminated by unlearned or unemancipated perception. For its parts, it offers to flush out the many disabling superstition from all those hidden services from a societies soul, to eliminate any and every offending bacteria, to produce a clean ordered world. Most important , it promises a materialist paradise for the world's unprivileged through its awesome, magical powers. But not for any reason difficult to understand, it also continues to require as big and advertising budget as toothpaste. There is something about modernity's leading prestige product that is actually so bland it has to be rendered spectacular by sensational copy and a fertile imagination.

Such an irreverent view of modern science will not be comfortable for those who have been chosen to remain imprisoned within the dominant present-day perception of

the age. But for us, it always was another culture's product, a recognizably foreign entity. We eventually came to see it as an epoch-specific, ethnic [Western] and culture-specific [culturally entombed] project, one that is a politically directed, artificially induced stream of consciousness invading and distorting, and often attempting to takeover, the larger more stable canvas of human perception and experience. In a world consisting of dominating and dominated societies, some cultures are bound be considered more equal than others. This heritage of inequality, inaugurated and cemented during colonialism, has remained still largely intact today. So the culture products of the West including its science our able to claim compelling primacy and universal validity only because of their [as we shall see later] congenital relationship with the political throne of global power.

Colonialism, we know, subjects, undermines, subordinates, and then replaces what it eliminates with its own exemplar. It is natural to accept that Western science, an associate of colonial power, would function not any less brazenly and effectively: extending its hegemony by intimidation, propaganda, catechism, and political force. In fact, being a culture product, it was only to be expected that it would be associated with the various [mostly aggressive] thrusts of that culture. It would attempt to extend its hegemony to other cultures through an elite class, with social commentators today call 'modernizers', whose distinguishing characteristics, following period of schooling at Oxbridge , was a thoroughgoing alienation from the life

and culture of their own people. And true to its origins, this science has remained in the service of Western culture to this day, a crucial component in the hysterically active hegemony of the West.

However, due to stupendous and unrecognized inner strengths, the cultures on which modern science was sought to be imposed were able to prevent themselves from being fully incorporated. Its inability to deliver the goods and its general incompetence to deal with specific problems have also led to its decline. A global overview today of its hegemony would, in fact, be quiet distressing to its devotees. In many areas of the non-Western world, it has been reduced to the status of a commodity [like toothpaste] or a gadget [to be purchased with money]. Its promise to transform the world into a materialist paradise and thereby put an end to poverty and oppression has lost all credibility. There is evidence indeed to show that it has accomplished just the contrary. As for its offer of a new metaphysical world view to provide us with ethical guidance, this has also been largely rejected. Dharma, conversion, community, interaction with sacred entities and their associated symbols, still remains prime movers within our societies. One even encounters significant, desertions from the imperium of science in the very citadels of Western culture.

Thus, the geographical areas of its influence has turned out to be far less than as originally desired or attempt. In comparison, other ideas have dominated [and sometimes unsettled] human societies for far longer periods of time. Buddhism, for example, which like Western science had its

own theory of causation, was born on Indian soil, from where it was exported to entire civilizations. In societies like Japan, it exercised influenced for centuries. It unsettled most South and South East Asian societies with its radically new notions of what society should be like and of the relationship between the sangha and state. In comparison with Buddhism, the sway of modern science to impressive, but less pervasive. We should also remember that Buddhism, in contrast to science, was not propagated and imposed by violence.

The actual self perception of modern science as a recognizably distinct human activity does not go back more than 200 years in Western society. The very term 'scientist' [used an analogy to the word 'artist'] was first suggested by William Whewell as late as 1833 at a meeting of the British association for the advancement of science. It was only used without distastes by its practitioners towards the end of the first quarter of this century.

This is not to deny that the world's citizenry did suffer greatly from the temptation of modern science. It did. Just as did until recently from the promises of development. But just as one now routinely encounters the 'stink of development', one is also compelled to concede that three centuries of science have raised their own trail of disturbing odors. Not surprisingly, therefore, one discovers that whatever is being said in obituaries about development can equally be said about modern science.

Science and Development: A Congenital Relationship

What has been responsible for the gross influence of science

over the imagination of men in our times? One major factor has been the intimate relationship between science and development. They cannot be understood in isolation from each other, as India's policy makers made clear 30 years ago:

The key to national prosperity, apart from the spirit of people, lies, in the modern age, in the effective combination of three factors, technology, raw materials and capital, of which the first is perhaps the most important, since the creation and adaptation of new scientific techniques can in fact make up for a deficiency in national sources and reduce the demands of capital.1

Generally speaking development was merely modern science's latest associates in the exercise of its political hegemony. Earlier, science had linked itself with enlightenment and millennial claims, before going on to associate itself with racism, sexism, imperialism and colonialism, and then settling down with development, an idea in which most of these earlier inheritances are encoded.

If one, in fact, reflects on the events of recent decades, one is indeed reminded that development and science have run through the period, tied together as intimately as a horse and carriage. Development was desired by us non-Western societies precisely because it was associated with science. What obtained prior to development, either in the form of pure nature or non-Western subsistence, did not have, we were told, the rationality, slickness and efficiency of modern science. People, societies, nature itself were backward because of its absence. Planners labeled entire zones 'backward' simply because they lacked factories. [The factory

has remained until today a concrete symbol of the new processes developed by science.] Backward was to be substituted by development, an allegedly better way of organizing man and nature based on the rich insights of up-to-date science.

Science, intern, was desired because it made development possible. If one developed its associated skills, one could have unlimited development and riches. Science and development both reinforced the need of each other, each legitimized the other in a circular fashion popularly rendered: 'I scratch your back, you scratch mine.'

If development had had no special relationship with science, there would have been no need to displace subsistence and the new standard of living that development proposed.

However, the relationship between modern science and development was much more than merely intimate: it was congenital. This congenital relationship can be traced back to the industrial revolution when a relationship was first established between science and industry. This should not unduly surprise the reader. Some of the principle laws of science arose originally out of industrial experience. For instance, the second Law of Thermodynamics resulted from effort to improve the working of the engine with a view to advancing industry.

The Indian scientist, C.V. Seshadri, in a paper on 'Development and Thermodynamics', has provided some original clues to the historical development of this relationship between industry and science. Seshadri found

the Second Law of Thermodynamics, on close scrutiny, ethnocentric. He charged that, due to its industrial origins, the Second Law had consistently favored the definition of energy in a way calculated to further allocation of resources solely for big industry purposes [as opposed to craft]. In a related paper co-authored with V. Balaji, Seshadri wrote:

The law of entropy, backed by its authority, provides a criterion of utilization of energy available from various resources. This criterion, known as the concept of efficiency, is a corollary to the law of entropy and came into existence along with the law. The efficiency criterion stipulates that the loss of available energy in a conversion becomes smaller as temperature at which the conversion is effected is higher above the ambient. Therefore, high temperatures are of high value and so are resources such as petroleum, coal, etc., which can help achieve such temperatures. In this sense, the law of entropy provides a guideline for the extraction of resources and their utilization.2

Efficiency, perceived in such terms, came to be the leading criterion for judging technologies and productive work. In the light of modern science, more efficiency of this kind was considered synonymous with more development. Yet, in reality, the central concept of modern science is thus fused with a particular kind of resource utilization.

An economy based on this kind of science not only provides itself with a self-serving criterion with which to legitimize itself, it also assumes thereby that it has a justification for taking over all resources hither to outside its domain and untouched by modern science. Just as

economics invented the idea of scarcity to further its domain, so science assumed the idea of thermodynamic efficiency in order to dislodge competition.

Base Against Nature and Handicraft

As Seshadri pointed out, both nature and non-Western man proved to be losers when the thermodynamic definition of efficiency became the criterion for development. Both, by definition, overnight became undeveloped or underdeveloped. A tropical monsoon, for example, transporting millions of tonnes of water across the tropics became by definition inefficient since it performed work at ambient [and not high] temperatures.

S. N. Nagarajan agrees:

This is not merely confined to the organic world. Even the evaporation of water, which forms clouds and desalinizes, is not done at 100o C. Life could not have emerged by a process similar to what scientists use, at high temperatures. Scientists are incompetent to construct higher organizations at low temperatures. Tropical agricultural practices were built upon such a kind of knowledge. The two different kinds of approaches have different criteria of efficiency. So the two have a different understanding of development.3

And he adds:

Nature's way is slow, peaceful, non-harmful, non-explosive, non-destructive, both for others and for itself. Take for example, the production of fibre by plants and animals, compared to machines. The end result of plants and machines processes may appear to be the same: fibre and rayon. The machine also produces a large quantity in a short

time. But at what cost? The costs are borne by the weaker sections and by nature. The people who are chained to the machine [workers] are also consumed by it.

In fact, all processes are work effected at ambient temperatures are discounted in the suzerainty of modern science, thus tribals, bamboo workers, honeybees and silkworms all process the resources of the forest at ambient temperatures, and hence without the polluting side-effects of waste heat and affluent associated with big industrial processes. However, in the eyes of development, it is only the high energy input rayon and pulp units that really process the forest resources and contribute to economic growth and production.

Yet modern science still insists: 'The efficiency criterion stipulates that the loss of available energy in a conversion becomes smaller as the temperature at which the conversion is effected is higher above the ambient.'. By this means, it in fact destabilizes and exorcizes entire industries and livelihoods. A final illustration from the various kinds of sugar in India can drive home the point.

India produces different forms of sugar. The most important of these are white sugar and gur. According to the official opinion the processes used for the extraction and production of white sugar are superior to those that lead to gur. Not only is the extractive efficiency of the large mills higher, the product [white sugar] stores well it can be transported and hoarded, and otherwise abused for the reasons of state. The attendant pollution wreaked by sugar mills is acknowledged, but is considered a small price to pay

for the benefits of progress.

Gur, on the other hand, is mostly manufactured in open furnaces, using agricultural waste, timber or baggasse. The extraction of sugar cane juice is not as high as in the big industry process. The final product also does not keep well beyond a certain period. However, no pollution results from the production process; neither the earth nor its atmosphere is damaged. And, of course, hoarding and speculation in gur is less easy.

From a bare accounting of the two processes, it would seem to be in the public interest for the state to support the replacement of gur production with modern sugar mills. Development is white sugar. And this is what has occurred in countries like ours in the post-independence period. Credit policy towards the farmers in the vicinity of large sugar mills stipulates that if farmers take loans for growing sugar cane from government financial institutions, they are duty bound to sell all their sugar cane only to large refineries. They may not make gur out of it. Special officers of government, designated Sugar Commissioners, actually oversee such development. Indeed, this authoritarianism of development has been upheld by the Supreme Court of India. A farmer was ordered by a Sugar Commissioner to deposit all his sugar cane to with a large sugar mill. He refused he wanted to process it into gur instead. The matter went up to the Supreme Court. The Court upheld the orders of the Sugar Commissioner.

A different picture emerges, however, when a closer investigation is made of the qualities of the two processes

and their end products. We then discover how modern science highlights certain qualities to the exclusion of others and how the blind adaptation of its producers can lead us to emphasize the wrong values. White sugar is dangerous to health for a number of reasons long tested and proven. The bodily processes involved in the metabolism of white sugar end up destabilizing the health of the consumer. In addition, the human body has no psychological requirement for white sugar as such. It recognized that white sugar is, after all, nothing but empty calories. Gur, on the other hand, is a food. It contains not merely sugar, but iron and important vitamins and minerals.

Thus, if the two sugars are compared in the round, gur would make a positive contribution of human welfare whereas white sugar would not. This, however, is not apparent in any comparison of the mere production processes that produce white sugar and gur, and in any case the criterion of this comparison resides only in the particular, and biased terrain of modern science's view of efficient energy conversion. The technology for white sugar production is simply assumed to be more efficient than the technology used in the production of gur. Besides, whether it is worth producing commodity that is harmful to human health and also damages the environment [waste heat and effluents] is not part of the efficiency debate.4

Symbolic, nevertheless, of the new status sought for modern science by Third World ruling elites was an international conference on the Role of Science in the Advancement of New States held in August 1960, in Israel.

At that conference S. E. Imoke, Minister of Finance for Eastern Nigeria, told his audience:
We do not ask for the moon nor are we anxious for a trip there with you just yet. All we seek is your guidance, assistance and cooperation in our efforts to gather the treasures of our lands, so that we may rise above the subsistence level to a life more abundant.5

Revamping Society
The drive to advance big industry in the West was paralleled by an equally powerful project to recognize society along scientific [i.e. efficient] lines. August Comte set out the general design. His version of applying the principle of rationality, empiricism and enlightenment to human society in every detail has already had a pervasive influence of the so-called advanced societies.

A roughly similar Comtean vision received a fresh lease of life with the political independence of Third World nations. Here science [the archetypal instrument] was entrusted with the turn-key role of promising undreamed of standards of material well-being to the so-called poor of the planet.

The most well-known specimen of the innocent worldview was Jawaharlal Nehru, the first Prime Minister of free India. No leader of the Third World was as enamored of the glamour and promise associated with modern science as Nehru. For him development and science were synonymous. The original Comtean vision is starkly revealed in Nehru's insistence in scientific temper as a sine qua non of material

advancement. According to him [in his Discovery of India], it was science and science alone that 'could solve the problems of hunger and poverty, of insanitation and illiteracy, of superstition and deadening custom and tradition of vast resources running to waste, of a rich country inhabited starving people.'

This alarming naivety was passed on by him to the country's leading bureaucrats. India adopted a science policy resolution in March 1958, which read in part:

The dominating feature of the contemporary world is the intense cultivation of science on a large scale, and its application to meet a country's requirements. It is this which, for the first time in man's history, has given to the common man in countries advanced in science, a standard of living in social and cultural amenities, which were once confined to a very small privileged minority of the population. Science has led to the growth and diffusion of culture to an extent never possible before. It has not only radically altered man's material environment, but, what is of still deeper significance, it has provided new tools of through and has extended man's mental horizon. It has this even influenced the basic values of life, and given to civilization a new vitality and a new dynamism.

Science and technology can make up for deficiencies in raw materials by providing substitutes or, indeed, by providing skills which can be exported in return for raw materials. In industrializing a country, a heavy price has to be paid in importing science and technology in the form of plant and machinery, highly paid personnel and technical consultants.

An early and large development of science and technology in the country could therefore greatly reduce the drain in capital during the early and critical state of industrialization.

Science has developed at an ever-increasing pace since the beginning of the century so that the gap between the advanced and backward countries has widened more and more. It is only by adopting the most vigorous measures and by putting forward our utmost efforts into the development of science that we can bridge the gap. It is an inherent obligation of a good country like India, with its tradition for scholarship and original thinking an its great cultural heritage, to participate fully in the march of science, which is probably mankind's greatest enterprise today.6

Likewise, the authors of the country's First Five Year Plan noted: 'In the planned economy of a country, science much necessarily play a specially important role...Planning in science in action, and the scientific method means planning.'

These great 'self-evident truths', however, did not seem so obvious to many ordinary people in the Third World, particularly tribals, peasants and others not yet converted to the Western paradigm. In fact, if the benefits of modern science were not immediately obvious to them, neither did development seem to symbolize a better way of doing routine tasks. On the contrary, development seemed more of a con-game to ordinary folk. To these perspective observers, it actually demanded greater sacrifices, more work, and more boring work, in return for a less secure livelihood. It required the surrender of subsistence [and its related economy] in exchange for the dependence and

insecurity of wage slavery.

Left to its own, development would have made little headway across the globe. That it did eventually get moving was due purely to the coercive power of the new nation-states which now assumed, in addition to the earlier controlling function, a conducting function as well. Every nation-state stepped in voluntarily to force development, often with the assistance of police and magistrates. If their citizens were so ignorant that they were unable on their own to recognize the 'benefits of development', the new states would have no option but to 'force them to be free'.

Development became coercion: forced relocation to ujamaa villages, compulsory co-operative, and tying people up in new forms of organization 'for their own good'. Said Abel Alier, Sudan's Southern Regional President, during an Assembly discussion of the controversial Jonglei Canal: 'If we have to drive our people to paradise with sticks, we will do so for their good and the good of those who come after us.'7 The modern state does not understand, much less accept, the right of people not to be developed.

We must recognize the state's commitment to development stemmed for its equal commitment to modern science. Science was an ideal choice because it claimed to be able to remake reality. It redefined and invented concepts and laws, and thereby remade reality as well. It manufactured new theories about how nature worked, or more important, should work.

Therefore, when the state in the non-Western world assumed the role of developer, desirous of creating a new

society and economy, with an entirely new set of temples and all, science naturally became the most attractive and crucial instrument for the purpose. It was Nehru, after all, who called mammoth development projects the 'temples of today'.

Neither people nor nature have been spares as victims of a science-fuelled developmentalism driven on by the state. Today, the remaking of nature has become a major preoccupation of officialized ecology. A classic illustration comes from the approach of scientists to what is called forest development. Foresters are unable to recreate natural forests. But that does not bother them. Instead they redefine forests as plantation, and carry out monocultures under the label of scientific forestry. Nature is thus replaced with a substandard substitute. In reality, the afforestation engineered by modern science becomes the deforestation of nature.

The state claims its rights to 'develop' people and nature on the basis of a vision of progress set out in blueprints supplied by modern science, itself a cultural product of the West. The people have no role other than as spectators or cogs in this 'great adventure'. In exchange, they, or some of them at least, are privileged to consume the technological wonders that result from the heady union of development and science. In the eyes of a patronizing state, this is adequate compensation for a surrender of their natural rights. As for those who cannot or will not participate, they must lose their rights. They can be displaced from the resource arena, their resources being

transferred instead to big industry.

A Totalitarian Edge

The democratic idea remains the one potential element available to counter these twin oppressions of modernity. For democracies are based on the principle of fundamental human rights. Let us turn to how this potential for this totalitarianism of modernity was, however, effectively undermined.

We have probed the congenital links between modern science and development, and the implied bias in science against both nature and handicraft production. We have also discussed how the new nation-states, heavily committed to development, found in this science an attractive instrument for their project of remaking their people in the image of what they believed was an advanced form of man.

Both these features of the modern science/modern state relationship indirectly undermined the natural rights of man. In the first instance, science dismissed all existing processes in nature and traditional technics as inferior or of marginal value, thus enabling big industry [capitalist or statist] to substitute the blueprints supplied by science. Yet in human history, at least up until the scientific and industrial revolutions, the technical knowledge necessary for survival had mostly remained non-centralized and radically dispersed. Literally millions of arts and technologies existed - all using a vast variety of accumulated knowledge and productive of huge quantum of goods, cultural ideas and symbols stemming from the rich diversity of human

experience, and based principally on exploiting processes at ambient temperatures. In many ways, this technical diversity of the human species more or less paralleled the genetic diversity of nature itself.

In the second instance, the very conception of what constituted human normality was itself redefined. People lost the right to claim that they could function as competent human beings unless they underwent the indoctrination required by modernity. It was a priori assumed that they were deficient as human beings and had to be remade. As the scientific policy resolution quoted earlier noted: 'India's enormous resources of manpower can only become an asset in the modern world when trained or educated'. If in the process they emerged as pale caricatures of human beings in more powerful cultures, this was nothing to worry about. Science and its experts would decide how human beings would be brought up, trained, and entertained, and what they should consume.

This is not too difficult for modern science to achieve primarily because it claims to be associated not only with greater efficiency but also to have greater explanatory power. What is more, it claims its explanatory power to superior to anything ever achieved before in the human past, because it alone is impartial and therefore objective. Objectivity was also easy to associate with equality and democracy, since neutrality was beneficial to all. [The biases of monarchial forms administration, for instance, were notorious.] Modern science therefore seemed ideally suited for modern democracies.

By implication, everything 'non-scientific' was devalued as subjective and arbitrary, of marginal value, and could hardly be made the foundation of public policy.

The so-called scientific revolution of the 17th century constituted a watershed in thinking about thinking. The revolution was successful in insinuating a general consensus that, for the first time in human history, human beings and succeeded in unraveling a method of gaining knowledge as certain as the knowledge that earlier had only been available via revealed scripture. This technique of knowledge acquisition was so reliable that the knowledge acquired thereby was for all practical purposes non-negotiable. It was this claim which would soon conflict with the natural rights of man.

The indisputable knowledge that science presumed to offer was kept outside the arena of politics: in no way was it the consequence of bargaining or choice. In fact, one was no longer at liberty to choose scientific knowledge as an option from among other systems of knowledge. Scientific knowledge was a given. No one was any longer free [and often encouraged] to reject its statements of religion or art. The individual who refused to accept the basic scientific worldview risked being labeled not merely ignorant, but obscurantist, deviant or irrational.

Two important points here. First, fallible beings, equipped with an equal fallible instrumentality, reason, were now staking a claim to an infallible method of generating and certifying knowledge. Second, rationality itself was being reduced to nothing more than narrow and biased rationality

which has precious little to do with how the human mind actually thinks, although much to do with how some people think the mind ought to think.

We have to acknowledge that, in its drive for power, modern Western science could hardly afford to diffident about the nature of its claims. It was compelled by its own premises to concentrate and arbitrate all epistemes, and to pretend to do so impersonally. As the need for certification increased, so did modern science become less democratic and access to knowledge itself turned into a matter of privilege and special training. The layman was now seen as an empty receptacle to be filled up with the contents of science. He was to forgo his own knowledge and knowledge-rights.

Another curious paradox here. Scientific reason operated with a logic that was allegedly independent of personal factors or whims. It aimed at the formulation of laws existing independently of persons. Yet it certifiers were persons, often persons who had a vested interest in the power of science, and who were dependent on it for their livelihood. Fallible individuals this exploited the prestige associated withier discipline to gain a share of political power. The ballot was surreptitiously replaced, increasingly by the new scientific priesthood indoctrinated by its shared assumptions.

This, of course, was diametrically opposed to democratic functioning where rights are unique and universal and belong to individuals primarily because they are members of the species. Such rights include the right to claim true knowledge and the right to reject impersonal knowledge. A

right which, in other words, includes the power to certify knowledge. Under the new tyranny of modern science, such rights were first assaulted, then extinguished, and ordinary people were no longer considered as being capable by the fruit of their own activity of providing or obtaining true and certain knowledge of the world. This political right was taken away from all people falling within the ambit of science's dictatorship. In fact, for the ruling classes which felt that human rights had been too early democratized, or unnecessarily so, science now provided an instrument by which they could take back with one hand what they earlier been compelled to give away with the other.

Thus planning, science and technology - the technocracy - now became the principle means for usurping the people's rights to the domasins of knowledge and production, for dismissing the people's right to create knowledge, and diminishing their right to intervene in matters of public interest or affecting their own subsistence and survival.

The non-negotiability of modern science, the much vaunted objectivity of scientific knowledge, the seeming neutrality of its information, all these seemed positive features to most reasonable and educated men of different religions, values and nations. Rationality, the scientific temper and modern education seemed indisputable and necessary assets of human life.

However, while science itself advanced its knowledge by dissent, by the clash of hypotheses, it summarily dismissed dissent from outside the scientific imperium regarding either its content or its methods and mode of rationality. The

non-negotiability of scientific assumptions, methods and knowledge became a powerful myth elaborately constructed over several centuries, fed by a feigned ignorance among its propagandists concerning how it had actually negotiated its rise and apparently unassailable position.

Scientific knowledge - seen as above emotion, caste, community, language, religion, and transitional - became the preferred and primary instrument for transformation not only above the interest of all, but more importantly, enforceable on all. Never, in fact, was there so much agreement among the intellectuals of so many nations, whether liberals, communists, reactionaries, Gandhians, conservatives, or even revolutionaries: all succumbed to the totalitarian temptation of science.

What we have said concerning the power relationship of modern science with other epistemologies is also true of what came to obtain between it and technics. Development based on it came to constitute a dynamic [actively colonizing] power, committed to a compromising the survival possibilities and niches of larger and larger masses of people. By and large, it found the people's knowledge competitive and therefore offensive. And since it maintained a contemptuous attitude towards folk science, it also treated people's rights to use resources in their own way with scant respect.

Most important of all, the modern state's interest in such development itself owed much to the latter's constant search for ways and means to compromise, erode, and oftentimes severely diminish, personal autonomy, and the creativity

and political freedom that went with it. In a democracy, people can govern themselves, but they can hardly do so if their governments are seriously attempting at the same time to see whether they can successfully managed and changed.

Once the ordinary people's epistemologic rights were devalued, the state could proceed to use allegedly scientific criteria to supplant such rights with officially sponsored and defined perceptions and needs.

Science's propaganda, that it alone provided a valid description of nature, was turned into a stick with which to beat trans-scientific, or folk-scientific, descriptions of nature. The various 'people's science movements' in India took this job quite seriously, by functioning as an unofficial establishment, gallantly attempting to replace the science of the village sorcerer or tantrik with the barbarism of modern science's electric shock treatment or frontal lobotomies.

This expansion of the domain of scientific epistemology involved the most sustained deprivation of others' epistemologic rights. State policy being committed to this one epistemology exclusively, abused or ignored others. In medicine, to take just one example, the bias exercised against Indian systems of healing in favour of imported allopathy needs little documentation.

All imperium are intolerant and breed violence. The arrogance of science concerning its epistemology led it actively to replace alternatives with its own, superimposing on nature new and artificial processes. Naturally, the exercise provoked endless and endemic violence and suffering as the perceptions of modern science sat clumsily

and inappropriately on natural systems. Thus, Justas the Europeans eliminated millions of indigenous Indians from North and South America and other indigenous populations elsewhere to make place for their own kind, and Just as their medicine uprooted other medicine, and their seeds displaced other seed, so their knowledge project called modern science attempted to ridicule and wipe out all other ways of seeing and doing and having.

Knowledge is power, but power is also knowledge. Power decides what is knowledge and what is not knowledge. Thus modern science actually attempted to suppress even non-competitive, but different ways of interacting with man, nature and the cosmos. It warred to empty the planet of divergent streams of episteme in order to assert the unrivalled hegemony of its own batch of rules and set of perceptions, the latter being clearly linked with the aggressive thrusts of Western culture.

It is an illusion to think that modern science expanded possibilities for real knowledge. In actual fact, it made knowledge scarce. It over-extended certain frontiers, eliminated or blocked others. Thus it actually narrowed the possibilities for enriching knowledge available to human experience. It did appear to generate a phenomenonal information explosion. But information is information, not knowledge. The most that can be said of information is that it is but knowledge degraded distorted form. Science should have been critically understood not as an instrument for expanding knowledge, but for colonizing and controlling the direction of knowledge, and consequently human

behaviour, within a straight and narrow path conducive to the design of the project.

Is, then, the defeat total? No. The planet has not succumbed to appropriation by modern science everywhere. Indeed the outward symbols of science - agribusiness food, nuclear reactors, gigantic dams - are facing rebellion across the globe. And if those who have tasted the empty fruits of modern science are disillusioned with them, others have refused to taste them at all. Millions of farmers for instance, reject the modern rice strains manufactured by cereal research centres controlled by agribusiness. Citizens across the planet are rejecting modern allopathic medicine to varying degrees. Millions of ordinary people reject the idea of living by the distorting [and distorted] values associated with modern science.

In a country like India, 40 years of state sponsorship of science and all its works have been unable to bolster its failing reputation. In 1976, the late Prime Minister Mrs Indira Gandhi made the propagation of scientific temper one of the fundamental duties of Indian citizens, and amended the Constitution accordingly. Despite this there is an even greater sense of crisis among the Indian scientific community, which finds itself every decade more and more out of tune with Indian society's principal preoccupations.

This sense of failure has irreversibly crippled much of the thrust to push India into the strait-jacket prepared for it by the project of modern science. The people in non-Western societies do not merely not co-operate with the principal designs, they indicate they do not care a fig for the West and

its creations.

In many areas, the non-cooperation has become aggressive. People, groups, villages have openly rejected modernizing development and stubbornly insisted on maintaining their ways of life, their ambient interactions with nature, and the arts of subsistence. The revolt against development is bound to be at another level a revolt against modern science and the violence it symbolizes. This was Mahatma Gandhi's view. It will eventually become the view of those interested in protecting the natural rights of man and nature everywhere.

References:

1. Indian Science Policy Resolution, 1958, in W. Morehouse, Science in India, Bombay: Popular Prakashan, 1971, p. 138.

2. C.V. Seshadri and V. Balaji, Towards a New Science of Agriculture, Madras: MCRC, undated, p. 4.

3. S.N. Nagarajan, in a personal communication to the author dated 7th May 1990.

4. See Claude Alvares, Science, Development and Violence, New Delhi: Oxford University Press, forthcoming for a detailed argument.

5. In Ruth Gruber (ed.), Science and the New Nations, London: Andre Deutsch, 1963, p. 34.

6. The entire Science Policy resolution is to be found in Ward Morehouse, op. cit., pp. 138-40.

7. Qouted in E. Goldsmith and N. Hildyard, The Social and Environmental Effects of Large Dams, Wadebridge: Wadebridge Ecological Centre, 1984, p. 18.

ضمیمہ

"Seeking New Laws of Nature"
Richard Feynman

What I want to talk about in this lecture is not, strictly speaking, the character of physical law. One might imagine at least that one is talking about nature when one is talking about the character of physical law; but I do not want to talk about nature, but rather about how we stand relative to nature now. I want to tell you . . . what there is to guess, and how one goes about guessing. Someone suggested that it would be ideal if, as I went along, I would slowly explain how to guess a law, and then end by creating a new law for you. I do not know whether I shall be able to do that. . . .

In general we look for a new law by the following process. First we guess it. Then we compute the consequences of the guess to see what would be implied if this law that we guessed is right. Then we compare the result of the computation to nature with experiment or experience, compare it directly with observation, to see if it works. If it disagrees with experiment it is wrong. In that simple statement is the key to science. It does not make any difference how beautiful your guess is. It does not make any difference how smart you are, who made the guess, or what his name is- if it disagrees with experiment it is wrong. That is all there is to it. It is true that one has to check a little to make sure that it is wrong, because whoever did the experiment may have reported incorrectly, or there may

have been some feature in the experiment that was not noticed, some dirt or something; or the man who computed the consequences, even though it may have been the one who made the guesses, could have made some mistake in the analysis. These are obvious remarks, so when I say if it disagrees with experiment it is wrong, I mean after the experiment has been checked, the calculations have been checked, and the thing has been rubbed back and forth a few times to make sure that the consequences are logical consequences from the guess, and that in fact it disagrees with a very carefully checked experiment.

This will give you a some what wrong impression of science. It suggests that we keep on guessing possibilities and comparing them with experiment, and this is to put experiment into a rather weak position. In fact experimenters have a certain individual character. They like to do experiments even if nobody has guessed yet and they very often do their experiments in a region in which people know the theorist has not made any guesses. For instance, we may know a great many laws, but do not know whether they really work at high energy, because it is just a good guess that they work at high energy. Experimenters have tried experiments at higher energy, and in fact every once in a while experiment produces trouble; that is, it produces a discovery that one of the things we thought right is wrong. In this way experiment can produce unexpected results, and that starts us guessing again. One instance of an unexpected result is the M meson and its neutrino, which was not guessed by anybody at all before it was discovered, and even today nobody yet has any method of guessing by which this would be a natural result.

You can see, of course, that with this method we can attempt to disprove any definite theory. If we have a definite

theory, a real guess, from which we can conveniently compute - consequences which can be compared with experiment, then in principle we can get rid of any theory. There is always the possibility of proving any definite theory wrong; but notice that we can never prove it right. Suppose that you invent a good guess, calculate the consequences, and discover every time that the consequences you have calculated agree with experiment. The theory is then right? No, it is simply not proved wrong. In the future you could compute a wider range of consequences, there could be a wider range of experiments; and you might then discover that the thing is wrong. That is why laws like Newton's laws for the motion of planets last such a long time. He guessed the law of gravitation, calculated all kinds of consequences for the system and it took several hundred years before the slight error the motion of Mercury was observed. During all that time the theory had not been proved wrong. and could be taken temporarily to be right. But it could never be proved right, because tomorrow's experiment might succeed in proving wrong what you thought was right. We never are definitely right. we can only be sure we are wrong. However. it is rather remarkable how we can have some ideas which will last so long.

One of the ways of stopping science would be only to do experiments in the region where you know the law. But experimenters search most diligently, and with the greatest effort, in exactly those places where it seems most likely that we can prove our theories wrong. In other words we are trying to prove ourselves wrong as quickly as possible, because only in the way can we find progress. For example, today among ordinary low energy phenomena we do not know where to look for trouble, we think everything is all right, and so there is no particular big programme

looking for trouble in nuclear reactions, or in super-conductivity. In these lectures I am concentrating on discovering fundamental laws. The whole range of physics, which is interesting, includes also an understanding at another level of these phenomena like super-conductivity and nuclear reactions, in terms of the fundamental laws. But I am talking now about discovering trouble, something wrong with fundamental laws, and since among low energy phenomena nobody knows where to look, all the experiments today in this field of finding out a new law, are of high energy.

Another thing I must point out is that you cannot prove a vague theory wrong. If the guess that you make is poorly expressed and rather vague, and the method that you use for figuring out the consequences is a little vague —you are not sure, and you say, "I think everything's right because its all due to so and so, and such and such do this and that more or less, and I can sort of explain how this works. . . ," then you see that this theory is good, because it cannot be proved wrong! Also if the process of computing the consequences is indefinite, then with a little skill any experimental results can be made to look like the expected consequences. You are probably familiar with that in other fields. "A" hates his mother. The reason is, of course, because she did not caress him or love him enough when he was a child. But if you investigate you find out that as a matter of fact she did love him very much, and everything was all right. Well then, it was because she was over-indulgent when he was a child! By having a vague theory it is possible to get either result. The cure for this one is the following. If it were possible to state exactly, ahead of time, how much love is not enough, and how much love is over-indulgent, then there would be a perfectly legitimate theory against which

you could make tests. It is usually saidwhen this is pointed out, "When you are dealing with psychological matters things can't be defined so precisely." Yes, but then you cannot claim to know anything about it.

You will be horrified to hear that we have examples in physics of exactly the same kind. We have these approximate symmetries, which work something like this. You have an approximate symmetry, so you calculate a set of consequences supposing it to be perfect. When compared with experiment, it does not agree. Of course ———— the symmetry you are supposed to expect is approximate, so if the agreement is pretty good you say, "Nice!," while if the agreement is very poor you say, "Well, this particular thing must be especially sensitive to the failure of the symmetry." Now you may laugh, but we have to make progress in that way. When a subject is first new, and these particles are new to us, this jockeying around, this "feeling" way of guessing at the results, is the beginning of any science. The same thing is true of the symmetry proposition in physics as is true of psychology, so do not laugh too hard. It is necessary in the beginning to be very careful. It is easy to fall into the deep end by this kind of vague theory. It is hard, to prove it wrong, and it takes a certain skill and experience not to walk off the plank in the game. . . .

Because I am a theoretical physicist, and more delighted with this end of the problem, I want now to concentrate on how to make the guesses.

As I said before, it is not of any importance where the guess comes from; it is only important that it should agree with experiment, and that it should be as definite as possible. "Then," you say, "that is very simple. You set up a machine, a great computing machine, which has a random wheel in it that makes a succession of guesses, and each time

it guesses a hypothesis about how nature should work it computes immediately the consequences, and makes a comparison with a list of experimental results it has at the other end." In other words, guessing is a dumb man's job. Actually it is quite the opposite, and I will try to explain why.

The first problem is how to start. You say, "Well I'd start off with all the known principles." But all the principles that are known are inconsistent with each other, so something has to be removed. We get a lot of letters from people insisting that we ought to make holes in our guesses. You see, you make a hole, to make room for a new guess. Somebody says, "You know, you people always say that space is continuous. How do you know when you get to a small enough dimension that there really are enough points in between, that it isn't just a lot of dots separated by little distances?" Or they say, "You know those quantum mechanical amplitudes you told me about, they're so complicated and absurd, what makes you think those are right? May be they aren't right." Such remarks are obvious and are perfectly clear to anybody who is working on this problem. It does not do any good to point this out. The problem is not only what might be wrong but what, precisely, might be substituted in place of it. In the case of the continuous space, suppose the precise proposition is that space really consists of a series of dots, and that the space between them does not mean anything, and that the dots are in a cubic array. Then we can prove immediately that this is wrong. It does not work. The problem is not just to say something might be wrong, but to replace it by something —— and that is not so easy. As soon as any really definite idea is substituted it becomes almost immediately apparent that it does not work.

The second difficulty is that there is an infinite

number of possibilities of these simple types. It is something like this. You are sitting working very hard, you have worked for a long time trying to open a safe. Then some Joe comes along who knows nothing about what you are doing, except that you are trying to open the safe. He says "Why don't you try the combination 10:20:30?" Maybe you know already that the middle number is 32, not 20. Maybe you know as a matter of fact that it is a five-digit combination. . . . So please do not send me any letters trying to tell me how the thing is going to work. I read them—— I always read them to make sure that I have not already thought of what is suggested—— but it takes too long to answer them, because they are usually in the class "try 10:20:30." As usual, nature's imagination far surpasses our own, as we have seen from the other theories which are subtle and deep. To get such a subtle and deep guess is not so easy. One must be really clever to guess, and it is not possible to do it blindly by machine.

I want to discuss now the art of guessing nature's laws. It is an art. How is it done? One way you might suggest is to look at history to see how the other guys did it. So we look at history.

We must start with Newton. He had a situation where he had incomplete knowledge, and he was able to guess the laws by putting together ideas which were all relatively close to experiment; there was not a great distance between the observations and the tests. That was the first way, but today it does not work so well.

The next guy who did something great was Maxwell, who obtained the laws of electricity and magnetism. What he did was this. He put together all the laws of electricity, due to Faraday and other people who came before him, and he looked at them and realized that they were

mathematically inconsistent. In order to straighten it out he had to add one term to an equation. He did this by inventing for himself a model of idler wheels and gears and so on in space. He found what the new law was—— but nobody paid much attention because they did not believe in the idler wheels. We do not believe in the idler wheels today, but the equations that he obtained were correct. So the logic may be wrong but the answer is right.

In the case of relativity the discovery was completely different. There was an accumulation of paradoxes; the known laws gave inconsistent results. This was a new kind of thinking, a thinking in terms of discussing the possible symmetries of laws. It was especially difficult, because for the first time it was realized how long something like Newton's laws could seem right, and still ultimately be wrong. Also it was difficult to accept that ordinary ideas of time and space, which seemed so instinctive, could be wrong.

Quantum mechanics was discovered in two independent ways—— which is a lesson. There again, and even more so, an enormous number of paradoxes were discovered experimentally, things that absolutely could not be explained in any way by what was known. It was not that the knowledge was incomplete, but that the knowledge was too complete. Your prediction was that this should happen—— it did not. The two different routes were one by Schrodinger, who guessed the equation, the other by Heisenberg, who argued that you must analyze what is measurable. These two different philosophical methods led to the same discovery in the end.

More recently, the discovery of the laws of the weak decay I spoke of, when a neutron disintegrates into a proton, an electron and an anti-neutrino—— which are still only

partly known—— add up to a somewhat different situation. This time it was a case of incomplete knowledge, and only the equation was guessed. The special difficulty this time was that the experiments were all wrong. How can you guess the right answer if, when you calculate the result, it disagrees with experiment? You need courage to say the experiments must be wrong. I will explain where that courage comes from later.

Today we have no paradoxes—maybe. We have this infinity that comes in when we put all the laws together, but the people sweeping the dirt under the rug are so clever that one sometimes thinks this is not a serious paradox. Again, the fact that we have found all these particles does not tell us anything except that our knowledge is incomplete. I am sure that history does not repeat itself in physics, as you can tell from looking at the examples I have given. The reason is this. Any schemes—— such as "think of symmetry laws," or "put the information in mathematical form", or "guess equations"—— are known to everybody now, and they are all tried all the time. When you are struck, the answer cannot be one of these, because you will have tried these right away. There must be another way next time. Each time we get into this log-jam of too much trouble, too many problems, it is because the methods that we are using are just like the ones we have used before. The next scheme, the new discovery, is going to be made in a completely different way. So history does not help us much. . . .

It is not unscientific to make a guess, although many people who are not in science think it is. Some years ago I had a conversation with a layman about flying saucers —— because I am scientific I know all about flying saucers! I said "I don't think there are flying saucers." So my antagonist said, "Is it impossible that there are flying saucers? Can you

prove that there are flying saucers? Can you prove that it's impossible?" "No," I said, "I can't prove it's impossible. It's just very unlikely." At that he said, "You are very unscientific. If you can't prove it impossible then how can you say that it's unlikely?" But that is the way that is scientific. It is scientific only to say what is more likely and what is less likely, and not to be proving all the time the possible and impossible. To define what I mean, I might have said to him, "Listen, I mean that from my knowledge of the world that I see around me, I think, that it is much more likely that the reports of flying saucers are the results of the known irrational characteristics of terrestrial intelligence than of the unknown rational efforts of extraterrestrial intelligence." It is just more likely, that is all. It is a good guess. And we always try to guess the most likely explanation, keeping in the back of the mind the fact that if it does not work we must discuss the other possibilities. . . .

That reminds me of another point, that the philosophy or ideas around a theory may change enormously when there are very tiny changes in the theory. For instance, Newton's ideas about space and time agreed with experiment very well, but in order to get the correct motion of the orbit of Mercury, which was a tiny, tiny difference, the difference in the character of the theory needed was enormous. The reason is that Newton's laws were so simple and so perfect, and they produced definite results. In order to get something that would produce a slightly different result it had to be completely different. In stating a new law you cannot make imperfections on a perfect thing; you have to have another perfect thing. So the difference in philosophical ideas between Newton's and Einstein's theories of gravitation are enormous.

What are these philosophies? They are really tricky

ways to compute consequences quickly. A philosophy, which is sometimes called an understanding of the law, is simply a way that a person hold the laws in his mind in order to guess quickly at consequences. Some people have said, and it is true in cases "like Maxwell's equations, "Never mind the philosophy, never mind anything of this kind, just guess the equations. The problem is only to compute the answers so that they agree with experiment, and it is not necessary to have a philosophy, or argument, or words, about the equation." That is good in the sense that if you only guess the equation you are not prejudicing yourself, and you will guess better. On the other hand, maybe the philosophy helps you to guess. It is very hard to say.

For those people who insist that the only thing that is important is that the theory agrees with experiment, I would like to imagine a discussion between a Mayan astronomer and his student. The Mayans were able to calculate with great precision predictions, for example, for eclipses and for the position of the moon in the sky, the position of Venus, etc. It was all done by arithmetic. They counted a certain number and subtracted some numbers, and so on. There was no discussion of what the moon was. There was no discussion even of the idea that it went around. They just calculated the time when there would be an eclipse, or when the moon would rise at the full, and so on. Suppose that a young man went to the astronomer and said, "I have an idea May be those things are going around, and there are balls of something like rocks out there, and we could calculate how they move in a completely different way from just calculating what time they appear in the sky." "Yes," says the astronomer, "and how accurately can you predict eclipses?" He says, "I haven't developed the thing very far yet." Then says the astronomer, "Well, we can calculate eclipses more

accurately than you can with your model, so you must not pay any attention to your idea because obviously the mathematical scheme is better." There is a very strong tendency, when someone comes up with an idea and says, "Let's suppose that the world is this way," for people to say to him, "What would you get for the answer to such and such a problem?" And he says, "I haven't developed it far enough." And they say, "Well, we have already developed it much further, and we can get the answers very accurately." So it is a problem whether or not to worry about philosophies behind ideas.

Another way of working, of course, is to guess new principles. In Einstein's theory of gravitation he guessed, on top of all the other principles, the principle that corresponded to the idea that the forces are always proportional to the masses. He guessed the principle that if you are in an accelerating car you cannot distinguish that from being in a gravitational field, and by adding that principle to all the other principles, he was able to deduce the correct laws of gravitation.

That outlines a number of possible ways of guessing. I would now like to come to some other points about the final result. First of all, when we are all finished, and we have a mathematical theory by which we can compute consequences, what can we do? It really is an amazing thing. In order to figure out what an atom is going to do in a given situation we make up rules with marks on paper, carry them into a machine which has switches that open and close in some complicated way, and the result will tell us what the atom is going to do! If the way that these switches open and close were some kind of model of the atom, if we thought that the atom had switches in it, then I would say that I understood more or less what is going on. I

find it quite amazing that it is possible to predict what will happen by mathematics, which is simply following rules which really have nothing to do with what is going on in the original thing. The closing and opening of switches in a computer is quite different from what is happening in nature.

One of the most important thing in this "guess-compute consequences— compare with experiment" business is to know when you are right. It is possible to know when you are right way ahead of checking all the consequences. You can recognize truth by its beauty and simplicity. It is always easy when you have made a guess, and done two or three little calculations to make sure that it is not obviously wrong, to know that it is right— at least if you have any experience— because usually what happens is that more comes out than goes in. Your guess is, in fact, that something is very simple. If you cannot "see immediately that it is wrong, and it is simpler than it was before, then it is right. The inexperienced, and crackpots, and people like that, make guesses that are simple, but you can immediately see that they are wrong, so that does not count. Others, the inexperienced students, make guesses that are very complicated, and it sort of looks as if it is all right, but I know it is not true because the truth always turns out to be simpler than you thought. What we need is imagination, but imagination in a terrible straitjacket. We have to find a new view of the world that has to agree with everything that is known, but disagree in its predictions somewhere, otherwise it is not interesting. And in that disagreement it must agree with nature. If you can find any other view of the world which agrees over the entire range where things have already been observed, but disagrees somewhere else, you have made a great discovery. It is very nearly impossible,

but not quite to find any theory which agrees with experiments over the entire range in which all theories have been checked, and yet gives different consequences in some other range, even a theory whose different consequences do not turn out to agree with nature. A new idea is extremely difficult to think of. It takes a fantastic imagination.

What of the future of this adventure? What will happen ultimately? We are going along guessing the laws; how many laws are we going to have to guess? I do not know. Some of my colleagues say that this fundamental aspect of our science will go on; but I think there will certainly certainly not be perpetual novelty, say for a thousand years. This thing cannot keep on going so that we are always going to discover more and more new laws. If we do, it will become boring that there are so many levels one underneath the other. It seems to me that -what can happen in the future is either that all the laws become known——that is, if you had enough laws you could compute consequences and they would always agree with experiment, which would be the end of the line — or it may happen that the experiments get harder and harder to make, more and more expensive, so you get 99.9 per cent of the phenomena, but there is always some phenomenon which has just been discovered, which is very hard to measure, and which disagrees; and as soon as you have the explanation of that one there is always another one, and it gets slower and slower and more and more uninteresting. That is another way it may end. But I think it has to end in one way or another.

We are very lucky to live in an age in which we are still making discoveries. It is like the discovery of America—— you only discover it once. The age in which we live is the age in which we are discovering the fundamental

laws of nature, and that day will never come again. It is very exciting, it is marvellous, but this excitement will have to go. Of course in the future there will be other interests. There will be the interest of the connection of one level of phenomena to another——phenomena in biology and so on, or, if you are talking about exploration, exploring other planets, but there will not still be the same things that we are doing now.

Another thing that will happen is that ultimately, if it turns out that all is known, or it gets very dull, the vigorous philosophy and the careful attention to all these things that I have been talking about will gradually disappear. The philosophers who are always on the outside making stupid remarks will be able to close in, because we cannot push them away by saying, "If you were right we would be able to guess all the rest of the laws," because when the laws are all there they will have an explanation for them. For instance, there are always explanations about why the world is three-dimensional. Well, there is only one world, and it is hard to tell if that explanation is right or not, so that if everything were known there would be some explanation about why those were the right laws. But that explanation would be in a frame that we cannot criticize by arguing that type of reasoning will not permit us to go further. There will be a degeneration of ideas, just like the degeneration that great explorers feel is occurring when tourists begin moving in on a territory.

In this age people are experiencing a delight, the tremendous delight that you get when you guess how nature will work in a new situation never seen before. From experiments and information in a certain range you can guess what is going to happen in a region where no one has ever explored before. It is a little different from regular

exploration in that there are enough clues on the land discovered to guess what the land that has not been discovered is going to look like. These guesses, incidentally, are often very different from what you have already seen—they take a lot of thought.

What is it about nature that lets this happen, that it is possible to guess from one part what the rest is going to do? That is an unscientific question: I do not know how to answer it, and therefore I am going to give an unscientific answer. I think it is because nature has a simplicity and therefore a great beauty.[1]

1. Richard Feynmer, "Seeking NewLaws of Nature" in The character of Physical Law

مؤلف کی دیگر زیرِ تالیف اور زیرِ طبع کتابیں

[۱] اسلام اور جدیدیت ـــــ ایک نیا تناظر ڈاکٹر منظور احمد کے افکار و خیالات کا ناقدانہ جائزہ

[۲] رینے گینوں کا دبستان روایت ـــــ ایک تحقیقی مطالعہ

[۳] کیا علومِ عقلیہ کا انحطاط زوال امت کا حقیقی سبب ہے؟

[۴] احسان یا تصوف ـــــ اعتراضات کی حقیقت

[۵] تاریخِ اسلامی کیسے پڑھی جائے؟ مطالعۂ تاریخ کا روایتی منہاج کیا ہے؟

[۶] مسئلہ اجتہاد اور مقاصدِ شریعت: اصول، شرائط اور حدود

[۷] معرکۂ عقل و نقل: عقل کی حدود اور نارسائی حکمائے اسلام اور فلاسفہ مغرب کی نظر میں

[۸] مقالاتِ تفہیمِ مغرب

E-mail:nawadraat8@gmail.com

۲۳۲۔ فتح شیر کالونی نزد ایوب مسجد مین مارکیٹ ساہیوال پنجاب